گئودان

مُصنّفہ

منشی پریم چند

عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ انارکلی لاہور

قیمت [illegible] روپے

بید خلی نہیں ہوئی؟ کس پر کُڑکی (قرقی) نہیں آئی؟ جب دوسروں کے پاؤں تلے اپنی گردن دبی ہوئی ہے تو ان کو سہلانے ہی میں بھلائی ہے۔"

دھنیا دُنیوی معاملات میں اتنی ہوشیار نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہم نے زمیندار کے کھیت جوتے ہیں تو وہ اپنا لگان ہی تو لے گا۔ اس کی خوشامد کیوں کریں؟ اُس کے تلوے کیوں سہلائیں؟ اگرچہ اُسے اپنی متاہلانہ زندگی کے ان بیس برسوں میں اس بات کا کافی تجربہ ہو گیا تھا کہ چاہے جتنی کتربیونت کرو، کتنا ہی پیٹ کاٹو؛ چاہے ایک ایک کوڑی دانت سے پکڑو پر لگان کا ادا ہو جانا مشکل ہے، پھر بھی وہ ہار نہ مانتی تھی اور اس مسئلے پر آئے دن جھگڑے ہوتے ہی رہتے تھے۔ اُن کی چھ اولادوں میں اب صرف تین زندہ تھیں۔ ایک لڑکا گوبر اب کوئی سولہ سال کا تھا۔ دو لڑکیاں تھیں۔ سونا اور روپا ان کی عمر بارہ اور آٹھ سال تھی۔ تین لڑکے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ اس کا دل آج بھی کہتا تھا۔ کہ ان کی دوا دارو ہوتی تو بچ جاتے! مگر وہ ایک دمڑی کی دوا بھی نہ منگا سکی تھی۔ ابھی اس کی عمر بھی کیا تھی؟ چھتیسواں سال ہی تو تھا مگر سر کے سارے بال پک گئے تھے۔ چہرے پر جھریاں تھیں۔ جسم ڈھل گیا تھا۔ خوبصورت گندمی رنگ۔ سانولا پڑ گیا تھا اور آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ یہ سب کچھ پیٹ کے فکر ہی کے سبب تو تھا۔ کبھی تو جینے کا سُکھ نہ ملا! اس دائمی خستہ حالی نے اس کی خودداری کو بیدلی میں تبدیل کر دیا تھا۔ جس گرہستی میں پیٹ کو روٹیاں بھی نہ مل سکیں اس کے لئے اتنی خوشامد کیوں؟ ان حالات سے اُس کا دل برابر بھڑکتا رہتا تھا اور دو چار جھڑکیاں سُن لینے ہی پر اُسے اصلیت کا پتہ چلتا تھا۔

اُس نے ہار کر ہوری کی لاٹھی، مرزئی، پگڑی، جوتے، تمباکو کا بٹوا، سب لا کر اس کے سامنے پٹک دیے۔

ہوری نے اس کی طرف تیوری چڑھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ کیا سُسرال جانا ہے جو پانچوں پوساگ لائی ہے؟ وہاں بھی تو کوئی جوان سالی سرہج نہیں بیٹھی ہے جسے جاکر دکھاؤں۔"

ہوری کے گہرے سانولے پچکے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ دھنیا نے شرماتے ہوئے کہا۔" ایسے ہی تو بڑے سجیلے جوان ہو کہ سالی سرہجیں دیکھ کر ریجھ جائیں گی۔"

ہوری نے پھٹی مرزئی بڑی جو کسی سے تہہ کر کے چارپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔" تو کیا تو سمجھتی ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا؟ ابھی تو چالیس برس بھی پورے نہیں ہوئے مرد ساٹھے پر پاٹھا ہوتا ہے۔"

"جاکر شیشے میں منہ دیکھو۔ تم جیسا مرد ساٹھے پر پاٹھا نہیں ہوتا دودھ گھی آنکھیں آنجنے تک کو تو ملتا نہیں، پاٹھے ہوں گے! تمہاری دسا دیکھ دیکھ کر تو میں اور سوکھی جاتی ہوں کہ بھگوان! یہ بڑھاپا کیسے کٹے گا۔ کس کے دوارے بھیک مانگیں گے؟"

ہوری کے وہ عارضی مسکراہٹ حقیقت کے اس آنچ میں گویا جھلس گئی۔ لاٹھی سنبھالتا ہوا بولا" ساٹھے تک پہنچنے کی نوبت نہ آنے پائے گی، دھنیا! اس کے پہلے ہی چل دیں گے۔"

دھنیا نے آزردگی سے کہا۔" اچھا رہنے دو، منہ سے اشبھ نہ نکالو، تم سے کوئی اچھی بات بھی کہے تو کوسنے لگتے ہو۔"

ہوری لاٹھی کندھے پر رکھ کر گھر سے نکلا تو دھنیا دروازے پر کھڑی ہوئی اُسے دیر تک دیکھتی رہی اس کے مایوسانہ الفاظ نے دھنیا کے چوٹ کھائے ہوئے دل میں ہلچل سی پیدا کر دی تھی وہ گویا استری دھرم کے پوری تپسیا کے ذریعہ

اپنے شوہر کو بلاؤں سے بچائے رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے دل سے گویا ایک گڑھ (حصار) سا نکل کر ہوری کو محسور کئے لیتا تھا۔ مصیبت کے اس اتھاہ ساگر میں صرف سہاگ ہی وہ تنکا تھا جس کے سہارے وہ اُسے پار کر رہی تھی۔ ہوری کے دل شکن الفاظ شاید سچ ہونے پر بھی گویا جھٹکا دے کر اُس کے ہاتھ سے اس کمزور سہارے کو چھین لینا چاہتے تھے۔ بلکہ الفاظ کے سچ ہونے کا امکان ہی انہیں اتنا تکلیف دہ بنا رہا تھا۔ کانے کو کانا کہنے سے جو دکھ ہوتا ہے کیا دو آنکھوں والے آدمی کو ہو سکتا ہے؟

ہوری قدم بڑھائے چلا جاتا تھا۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف ایکھ کے پودوں کی لہراتی ہوئی ہریالی کو دیکھ کر اس نے دل میں کہا "بھگوان کہیں ٹھیک برکھا کر دیں اور پیڑ بھی ٹھیک سے رہیں تو ایک گائے جرور لے گا۔ دیسی گائیں تو نہ دودھ دیں اور نہ ان کے بچھڑے ہی کسی کام کے ہوں۔ ہاں بہت ہوا تو تیلی کے کولھو میں چلے! نہیں، وہ پچھائیں گائے لے گا۔ اس کی پوری سیوا کرے گا۔ کچھ نہیں تو چار پانچ سیر دودھ ہوگا۔ گوبر دودھ کے لئے ترس کر رہ جاتا ہے۔ اس عمر میں نہ کھایا پیا تو پھر کب کھائے گا؟ سال بھر بھی دودھ پا جائے تو نہ دیکھتے بنے۔ بچے بھی اچھے بیل نکلیں گے۔ دو سو سے کم کی جوڑی نہ ہوگی۔ پھر گؤ سے تو دروازے کی شوبھا ہے۔ سبیرے سبیرے گؤ کے درشن ہو جائیں تو کیا کہنا۔ نہ جانے کب یہ سادھ پوری ہوگی، وہ شبھ دن کب آئے گا؟"

ہر گرہست آدمی کی طرح ہوری کے دل میں بھی گائے رکھنے کی خواہش مدت سے تھی۔ یہی اس کی زندگی کا بہترین خواب، اس کے دل کی سب سے بڑی لگن تھی۔ بینک کے سود سے لطف اٹھانے یا زمین خریدنے یا محل بنانے کے لمبے چوڑے منصوبے اس کے ننھے سے دل میں کیسے سما سکتے تھے؟

جیٹھ کا سورج آموں کے جھرمٹ سے نکل کر آسمان پر چھائی ہوئی سرخی کو اپنی صاف اور تیز روشنی سے چمکاتا ہوا بلند ہو رہا تھا۔ ہوا گرم ہونے لگی تھی۔ طرف کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اُسے دیکھ کر "رام رام" کہتے اور آدر کے ساتھ چلم پینے کے لئے بلاتے مگر ہوری کو اتنی فرصت کہاں تھی؟ اس آدر سے اس کے دل میں رہنے والی عزت کی خواہش، اس کے خشک چہرے پر غرور کی جھلک لا رہی تھی۔ مالکوں سے ملتے رہنے ہی کا تو یہ پھل ہے کہ آج سب اُس کا آدر کرتے ہیں۔ نہیں تو کون پوچھتا؟ پانچ بیگھے کے کسان کی بساط ہی کیا؟ یہ کم عزت نہیں ہے کہ تین تین چار چار ہل والے مہتو لوگ بھی اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔

اب وہ کھیتوں کے درمیانی راستہ کو چھوڑ کر ایک نشیب میں آگیا تھا۔ جہاں برساتی پانی بھر جانے کے سبب کچھ نمی رہتی تھی اور جیٹھ میں بھی کچھ ہریالی نظر آجاتی تھی۔ قریب کے گاؤں کی گائیں وہاں چرنے آیا کرتی تھیں اس امس میں بھی وہاں کی ہوا میں کچھ تازگی اور ٹھنڈک تھی۔ ہوری نے دو تین روز کے سانس لیئے۔ جی میں آیا، کچھ دیر یہیں بیٹھ جائے؛ دن بھر تو لو، میں مرنا ہی ہے! کئی کسان اس جگہ کا پٹہ لکھانے کو تیار تھے، اچھی رقم دیتے تھے مگر بھگوان بھلا کرے رائے صاحب کا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ یہ زمین چرائی کے لئے چھوڑی گئی ہے اور کسی مول پر بھی نہ دی جائے گی۔ کوئی سوار تھی (خود غرض) زمیندار ہوتا تو کہتا، گائیں جائیں بھاڑ میں ہمیں روپئے ملتے ہیں، کیوں چھوڑیں؟ مگر رائے صاحب ابھی تک پرانی آن نبھائے جاتے ہیں۔ جو مالک رعیت کو نہ پالے وہ بھی کوئی آدمی ہے؟

دفعتاً اس نے دیکھا کہ بھولا اپنی گائیں لئے اُسی طرف چلا آرہا ہے۔ وہ اسی گاؤں سے ملے ہوئے مزرعے کا گوالا تھا اور دودھ مکھن کا کاروبار کرتا تھا۔ اچھی قیمت مل جائے پر کبھی کبھی کسانوں کے ہاتھ گائیں بیچ بھی ڈالتا۔ ہوری کا دل گایوں

کو دیکھ کر للچا گیا۔ اگر بھولا وہ آگے والی گائے اُسے دے دے تو کیا کہنا۔ روپئے آگے پیچھے لیتا رہے گا۔ وہ جانتا تھا کہ گھر میں روپئے نہیں ہیں۔ ابھی تک لگان نہیں چکایا جا سکا۔ بسیشر ساہ کا دینا بھی پڑا ہے، جس پر ایک آنہ روپئے کا سود چڑھ رہا ہے۔

لیکن مفلسی میں ایک طرح کی کوتاہ اندیشی ہوتی ہے، وہ بے حیائی جو تقاضا، گالی اور مار سے خوف نہیں کھاتی، اس نے ہوری کو حوصلہ دلایا وہ سادھ جو برسوں سے من میں تھی، اُس نے طبیعت کو بےچین کر دیا۔ وہ بھولا کے پاس جا کر بولا۔ رام رام بھولا بھائی، کہو کیا رنگ ڈھنگ ہیں؟ سُنا ہے ابکی میلے سے نئی گائیں لائے ہو؟"

بھولا نے اس کے دل کی بات تاڑ لی تھی، رکھائی سے جواب دیا "ہاں، دو بچھیاں اور دو گائیں لایا۔ پہلے والی گائیں سب سوکھ گئی تھیں۔ بندھی جگہ دودھ نہ پہنچے تو گزر کیسے ہو؟"

ہوری نے آگے والی گائے کے پُٹھے پر ہاتھ رکھ کر "دُدھار تو جان پڑتی ہے، کتنے میں لی؟"

بھولا نے شان جمائی "اب کی بازار بہت چڑھا ہوا تھا مہتو، اس کے اسّی روپئے دینے پڑے۔ آنکھیں نکل آئیں۔ تیس تیس تو دونوں بچھیوں کے دیئے۔ اس پر گاہک روپے کے آٹھ سے دودھ مانگتا ہے"

"بڑا بھاری کلیجہ ہے تم لوگوں کا بھائی! لیکن پھر لائے بھی تو وہ مال کہ یہاں دس پانچ گاؤں میں تو کسی کے پاس نکلے گا نہیں و"

بھولا پر نشہ چڑھنے لگا۔ بولا "بھئی رائے صاحب اس کے نوّے روپئے دیتے تھے اور دونوں کلوروں کے پچاس پچاس، پر ہم نے نہ دیا۔ بھگوان نے چاہا تو سو روپے اسی بیانے (جننے) میں پیٹ لوں گا۔"

"اس میں کیا شک ہے بھائی۔ مالک کیا کھا کے لیں گے؟ بھینٹ نجرانے

میں مل جائے تو بھلے ہی لے لیں۔ یہ تمہیں لوگوں کا گردہ ہے کہ آنچل بھر روپئے بھاگ کے بھروسے گن دیتے ہو۔ یہی جی چاہتا ہے کہ اس گائے کو دیکھتا رہے۔ دھنیہ ہے تمہارا جینا کہ گئووں کی اتنی سیوا کرتے ہو۔ ہمیں تو گائے کا گوبر بھی میسر نہیں۔ گرہست کے گھر میں ایک گائے بھی نہ ہو تو کتنے لاج کی بات ہے۔ سال کا سال بیت جاتا ہے۔ گئو رس کے درسن نہیں ہوتے۔ گھر والی بار بار کہتی ہے، بھولا بھیا سے کیوں نہیں کہتے؟ میں کہہ دیتا ہوں، کبھی ملیں گے تو کہوں گا۔ تمہارے سبھاؤ سے بڑی کھُس رہتی ہے۔ کہتی ہے، ایسا مرد ہی نہیں دیکھا، جب بات کریں گے تو نیچی آنکھیں کر کے، کبھی سر نہیں اُٹھاتے۔"

بھولا پر جو نشہ چڑھ رہا تھا اُس کو اس بھرے ہوئے پیالے نے اور گہرا کر دیا۔ بولا "بھلا آدمی وہی ہے جو دوسروں کی بہو بیٹی کو اپنی بہو بیٹی سمجھے۔ جو دُشٹ کسی عورت کو تاکے اُسے گولی مار دینی چاہئے۔"

"جس طرح مرد کے مر جانے سے عورت بے سہارے ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عورت کے مر جانے سے مرد کے ہاتھ پاؤں کٹ جاتے ہیں۔ میرا تو گھر اُجڑ گیا مہتو، کوئی ایک لوٹا پانی دینے والا نہیں۔"

پار سال بھولا کی عورت لو، لگ جانے سے مر گئی تھی، یہ ہوری جانتا تھا۔ لیکن پچاس برس کا کھانکھڑ بھولا اپنے اندر اتنی چکناہٹ رکھتا ہے، اِسے وہ نہ جانتا تھا۔ عورت کی چاہ میں اس کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں، ہوری کو سہارا مل گیا۔ اس کی کاروباری کاشتکارانہ عقل جاگ اُٹھی۔

"پُرانی مثل جھوٹی تھوڑی ہے۔ بن گھرنی گھر بھوت کا ڈیرا، کہیں سگائی ٹھیک نہیں کر لیتے؟"

"تاک میں مہتو، پر کوئی پھنستا نہیں۔ سو پچاس کھرچ کر کے بھی تیار ہوں

جیسی بھگوان کی مرجی۔"

"اب میں بھی کھوج میں رہوں گا۔ بھگوان چاہیں گے تو جلدی گھر بس جائے گا۔"

"بس یہی سمجھ لو کہ اُبار لو گے بھیّا۔ گھر میں کھانے کو بھگوان کا دیا بہت ہے۔ چار پنسیری دودھ روج ہو جاتا ہے۔ لیکن کس کام کا؟"

"میری سسرال میں ایک عورت ہے۔ تین چار سال ہوئے کہ اس کا آدمی اُسے چھوڑ کر کلکتہ چلا گیا تھا۔ بیچاری پسائی کر کے دن کاٹ رہی ہے۔ بال بچہ بھی کوئی نہیں۔ دیکھنے سننے میں بھی اچھی ہے۔ بس لچھمی سمجھو۔"

بھولا کا سکڑا ہوا چہرہ جیسے پھول اُٹھا۔ اُمید میں کتنا امرت ہے۔ بولا "اب تو تمہارا ہی آسرا ہے مہتو۔ چھٹی ہو تو چلو ایک دن دیکھ آئیں۔"

"میں ٹھیک ٹھاک کر کے تب تم سے کہوں گا۔ بہت جلدی کرنے سے بھی کام بگڑ جاتا ہے۔"

"جب تمہاری مرجی ہو چلو؛ جلدی کاہے کی! اس کبری گائے پر جی للچایا ہو تو لے لو۔"

"یہ گائے میرے بس کی نہیں دادا۔ میں تمہیں نکسان نہیں پہونچانا چاہتا۔ اپنا دھرم یہ نہیں کہ دوستوں کا گلا دبائیں۔ جیسے اتنے دن بیتے ہیں ویسے اور بھی بیت جائیں گے۔"

"تم تو ایسی باتیں کرتے ہو ہوری، جیسے ہم تم دو ہیں۔ تم گائے لے جاؤ۔ دام جو چاہے دے دینا۔ جیسے میرے گھر رہی ویسے تمہارے گھر۔ اسّی میں لی تھی تم اسّی ہی دے دینا جاؤ۔"

"میرے پاس نگد نہیں ہے دادا، سمجھ لو۔"

"تم سے نگد مانگتا کون ہے بھائی!"

ہوری کا سینہ گز بھر کا ہو گیا۔ اسّی روپے میں گائے مہنگی نہ تھی۔ ایسا اچھا ڈیل ڈول، دونوں وقت میں چھ، سات سیر دودھ اور پھر سیدھی ایسی کہ ایک بچہ بھی دودھ لے اُس کا تو ایک ایک بچھڑا سو سو کا ہوگا۔ دروازے پر بندھے گی تو سوبھا بڑھ جائے گی اسے ابھی کوئی چار سو روپئے دینے تھے۔ لیکن ادھار کو ایک طرح سے مفت سمجھتا تھا۔ کہیں بھولا کی سگائی ٹھیک ہو گئی تو وہ بولے گا بھی نہیں۔ سگائی کا بھی ہوئی تو ہوری کا کیا بگڑتا ہے۔ یہی تو ہوگا کہ بھولا بار بار تقاضا کرنے آئے گا، بگڑے گا، گالیاں دے گا۔ مگر ہوری کو اس کی زیادہ شرم نہ تھی۔ اس برتاؤ کا وہ عادی تھا۔ کسان کی زندگی کا تو یہ چڑھاوا ہے۔ بھولا کے ساتھ وہ دغا کر رہا تھا اور ایسا کرنا اس کی شان کے شایاں نہ تھا۔ اب بھی لین دین میں اس کے لئے لکھا پڑھی ہونے اور نہ ہونے میں کوئی فرق نہ تھا۔ قحط اور سیلاب کی بلائیں اس کے دل کو کمزور بناتی رہتی تھیں۔ خدا کی قہر آلود شکل ہمیشہ اس کے سامنے رہتی تھی۔ مگر یہ دغا اس کے خیال میں دغا نہ تھی۔ یہ صرف اپنا مطلب گانٹھنا تھا اور یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ایسی دغا تو وہ دن رات کرتا رہتا تھا۔ گھر میں دو چار روپئے پڑے رہنے پر بھی مہاجن کے سامنے قسمیں کھا جاتا تھا کہ ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔ سن کو کچھ نم کر دینا اور روئی میں کچھ بنولے بھر دینا اس کے دھرم میں جائز تھا۔ اور یہاں تو صرف خود غرضی نہ تھی تھوڑا سا دل بہلاؤ بھی تھا۔ بوڑھوں کی بدشوقی ہنسنے کی چیز ہو اور ایسے بوڑھوں سے اگر کچھ اینٹھ بھی لیا جائے تو کوئی گناہ نہیں۔

بھولا نے گائے کے گلے کی ڈور ہوری کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ لے جاؤ مہتو تم بھی کیا یاد کرو گے۔ بیاہتے ہی چھ سیر دودھ لینا۔ چلو میں تمہارے گھر تک پہنچا دوں۔ شاید تمہیں انجان سمجھ کر راہ میں کچھ تنگ کرے۔ اب تم سے سچ کہتا ہوں مالک نے اسّی روپے دیتے تھے۔ پر ان کے یہاں گؤوں کی کیا قدر؟ مجھ سے

لے کر کسی حاکم حکام کو دے دیتے۔ حاکموں کو گؤ کی سیوا سے کیا مطلب؟ وہ تو کھون چوسنا جانتے ہیں۔ جب تک دودھ دیتی، رکھتے پھر کسی کے ہاتھ بیچ ڈالتے۔ کس سے پالا پڑتا کون جانے؟ روپیہ ہی سب کچھ نہیں ہے بھیّا، کچھ اپنا دھرم بھی تو ہے۔ تمہارے گھر آرام سے رہے گی تو۔ یہ تو نہ ہوگا کہ تم آپ کھا کر سو رہو اور گائے بھوکی کھڑی رہے اس کی سیوا کرو گے، اُسے پیار کرو گے، چمکارو گے، گؤ ماتا اسیس دے گی۔ تم سے کیا کہوں بھیّا، گھر میں چٹکی بھر بھی بھوسا نہیں رہا، روپے سب بجار میں اٹھ گئے۔ سوچا تھا کہ مہاجن سے کچھ لے کر بھوسہ لے لیں گے، پر مہاجن کا پہلا روپیہ ہی نہیں چُکا۔ اس نے انکار کر دیا۔ اتنے جانوروں کو کیا کھلائیں، یہی بھکمارے ڈالتی ہے چٹکی چٹکی بھر کھلاؤں تو من بھر روج لگے۔ بھگوان ہی پار لگا دیں۔"

ہوری نے ہمدردی کے لہجے میں کہا "تم نے ہم سے پہلے کیوں نہ کہا؟ ہم نے ایک گاڑی بھوسہ بھیج دیا۔"

بھولا نے پیشانی ٹھونک کر کہا "اسی لئے نہیں کہا بھیّا، کہ سب سے اپنا دُکھڑا کیوں رووں؟ بانٹتا کوئی نہیں، ہنستے سب ہیں۔ جو گائیں دودھ نہیں دیتیں ان کا دکھ نہیں، اپنی ستی کھلا کر جلا لوں گا۔ پر اب یہ تو راتب بنا نہیں رہ سکتی۔ ہو سکے تو دس بیس روپے بھوسے کے لئے دے دو۔"

کسان پکّا سوارتھی ہوتا ہے۔ اس میں شبہہ نہیں اس کی گانٹھ سے رشوت کے پیسے بڑی مشکل سے نکلتے ہیں۔ بھاؤ تاؤ میں بھی وہ چوکس ہوتا ہے، سود کی ایک ایک پائی چھڑانے کے لئے وہ مہاجن کی گھنٹوں خوشامد کرتا ہے۔ جب تک پورا یقین نہ ہو جائے وہ کسی کے بہکانے میں نہیں آتا، لیکن اس کی ساری زندگی قدرت کا پورا ساتھ دیتے ہوئے گزرتی ہے، پیڑوں میں پھل لگتے ہیں جنہیں سب کھاتے ہیں، کھیتوں میں اناج ہوتا ہے جو دنیا کے کام آتا ہے، گائے کے تھن میں دودھ

ہوتا ہے جیسے وہ خود پینے نہیں جاتی۔ بلکہ دوسرے ہی پیتے ہیں، بادل سے پانی برستا ہے جس سے زمین آسودہ ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں مذموم خودغرضی کی گنجائش کہاں؟ ہوری کسان تھا اور کسی کے جلتے ہوئے گھر میں ہاتھ سینکنا اُس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ بھولا کا دکھڑا سنتے ہی اس کی طبیعت بدل گئی ڈور بھولا کے ہاتھ میں واپس کرتا ہوا بولا۔ روپئے تو دادا میرے پاس نہیں ہیں، ہاں تھوڑا سا بھوسا بچا ہے وہ تمہیں دوں گا چل کر اُٹھوالو۔ بھوسے کے لئے تم گائے بیچو گے اور میں لوں گا، میرے ہاتھ نہ کٹ جائیں گے!"

بھولا نے بھرے گلے سے کہا۔ "تمہارے بیل بھوکوں نہ مریں گے؟ تمہارے پاس ہی ایسا کون بہت سا بھوسہ رکھا ہے"

"نہیں دادا، اب کی بھوسہ اچھا ہو گیا تھا"

"میں نے تم سے ناحق بھوسے کی چرچا کی تھی"

"تم یہ کہتے اور نہیں سے مجھے معلوم ہوتا تو بڑا رنج ہوتا کہ تم نے مجھے اتنا غیر سمجھ لیا ہو کے پر بھائی کی مدد بھائی نہ کرے تو کام کیسے چلے؟"

"اجی گائے کو تو لینے جاؤ"

"کبھی نہیں دادا، پھر لے لوں گا"

"تو بھوسے کے دام دودھ میں کٹوا لینا"

ہوری نے غمگین لہجے میں کہا۔ "دام کوڑی کی اس میں کون بات ہے، دادا؟ میں ایک دو جون تمہارے گھر کھا لوں تو تم مجھ سے دام مانگو گے؟"

"لیکن تمہارے بیل بھوکوں مریں گے کہ نہیں؟"

"بھگوان کوئی نہ کوئی راہ نکالیں گے۔ اساڑھ سر پر ہے۔ کربی بولوں گا"

"مگر یہ گائے تمہاری ہو گئی جب چاہو کر لے جانا"

"کسی بھائی کا نیلام پر چڑھا ہوا بیل لینے میں جو پاپ ہے وہی اس سمے تمہاری گائے لینے میں ہے۔"

ہوری میں بال کی کھال نکالنے کی طاقت ہوتی تو وہ خوشی سے گائے لے کر گھر کی راہ لیتا، بھولا جب نقد روپے نہیں مانگتا تو ظاہر تھا کہ وہ بھوسے کے لئے گائے نہیں بیچ رہا تھا اس کا منشا کچھ اور ہے۔ لیکن جیسے پتوں کے کھڑکنے پر گھوڑا اچانک رک جاتا ہے اور مار نے پر بھی نہیں بڑھتا وہی حالت ہوری کی تھی۔ مصیبت کی چیز لینا پاپ ہے یہ بات جنم دن سے اس کے دل کا جزو بن گئی تھی۔

بھولا نے پوچھا "تو کسی کو بھیج دوں بھوسے کے لئے؟"

ہوری نے جواب دیا "ابھی میں رائے صاحب کی ڈیوڑھی پر جا رہا ہوں وہاں سے گھڑی بھر میں لوٹوں گا تب کسی کو بھیجنا۔"

بھولا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے" بولا "تم نے آج مجھے اُبار لیا ہوری بھائی! مجھے اب معلوم ہوا کہ میں سنسار میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرا بھائی کوئی ساتھی ہے۔" ایک لمحے کے بعد اس نے پھر کہا "اس بات کو بھول نہ جانا۔"

ہوری آگے بڑھا تو اس کا دل خوش تھا، طبیعت میں ایک عجیب زندہ دلی تھی۔ کیا ہوا دس پانچ من بھوسہ چلا جائے گا، بیچارے کو مصیبت میں پڑ کر اپنی گائے تو نہ بیچنی پڑے گی۔ جب پاس چارہ ہو جائے گا تب گائے کھول لاؤں گا۔ بھگوان کریں۔ مجھے کوئی عورت مل جائے پھر تو کوئی بات ہی نہیں۔

اس نے مڑ کر دیکھا تو وہی کبری گائے دم سے مکھیاں اڑاتی، سر ہلاتی مستانہ وار آہستہ آہستہ جھومتی چلی جاتی تھی، جیسے لونڈیوں کے بیچ میں کوئی رانی ہو۔ کیسا مبارک ہوگا وہ دن جب وہ گائے اس کے دروازہ پہ بندھے گی!۔

۲

سمری اور بیلاری دونوں صوبہ اودھ کے گاؤں ہیں۔ ضلع کا نام بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہوری بیلاری میں رہتا ہے اور رائے صاحب اگرپال سنگھ سمری میں۔ دونوں گاؤں میں صرف پانچ میل کا فاصلہ ہے۔ پچھلی ستیہ گرہ کی لڑائی میں رائے صاحب نے بڑا نام کمایا تھا۔ کونسل کی ممبری چھوڑ کر جیل گئے تھے۔ جبھی سے ان کے علاقے کے آسامیوں کو ان سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی۔ یہ نہیں کہ ان کے علاقے میں آسامیوں کے ساتھ کوئی خاص رعایت کی جاتی ہو یا ڈانڈ اور بیگار کی سختی کچھ کم ہو، مگر یہ ساری بدنامی مختاروں کے سر تھی۔ رائے صاحب کی نیک نامی میں بٹہ نہ لگ سکتا تھا۔ وہ بیچارے بھی تو اسی ضابطہ کے غلام تھے۔ ضابطہ کا کام جیسے ہوتا چلا آیا ہے ویسا ہی ہو گا۔ رائے صاحب کی شرافت اس پر کوئی اثر نہ ڈال سکتی تھی۔ اسی لئے آمدنی اور اختیارات میں جو بھر کی کمی نہ ہونے پر بھی ان کی نیک نامی میں منوں اضافہ ہو گیا تھا۔ آسامیوں سے وہ ہنس کر بولتے تھے۔ یہی کیا کم تھا؟ شیر کا کام تو شکار کرنا ہے۔ اگر وہ گرجنے اور غرانے کے بجائے میٹھی بولی بول سکتا تو اسے گھر بیٹھے من چاہا شکار مل جاتا، شکار کی کھوج میں اسے جنگل میں نہ بھٹکنا پڑتا۔

رائے صاحب قوم پرست ہوتے پر بھی حاکموں سے میل جول قائم رکھتے تھے۔ ان کی نذریں اور ڈالیاں جیوں کی تیوں چلی جاتی تھیں۔ علم ادب اور موسیقی سے دلچسپی تھی، ڈرامے کے شائق، اچھے مقرر، اچھے مضمون نگار اور اچھے نشانہ باز تھے۔ ان کی بیوی کو مرے آج دس سال ہو چکے تھے، دوسری شادی نہ کی تھی۔ ہنس بول کر اپنی تنہا زندگی مزے میں کاٹتے رہتے تھے۔ ہوری ڈیوڑھی پر پہنچا تو دیکھا کہ جلیٹھ کے

دسہرہ پر ہونے والے دھنش یگیہ کی تیاریاں بڑے زوروں سے ہو رہی ہیں۔ کہیں اسٹیج بن رہا ہے، کہیں پنڈال، کہیں مہمان خانہ اور کہیں دکانیں۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ مگر رائے صاحب خود کام میں لگے ہوئے تھے۔ اپنے باپ کی دولت کے ساتھ انہوں نے رام کی بھگتی بھی پائی تھی اور دھنش یگیہ کو ناٹک کا روپ دے کر اُسے مہذب دل بہلاؤ کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ اس موقع پر ان کے دوست احباب اور حکام سبھی مدعو ہوتے تھے اور علاقے میں دو تین دن بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ رائے صاحب کا کنبہ بہت بڑا تھا۔ کوئی ڈیڑھ سو سردار ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ کئی چچا تھے، درجنوں چچازاد بھائی، کئی حقیقی بھائی اور بیسیوں رشتہ کے بھائی۔ ایک چچازاد صاحب جی کے بڑے بھگت تھے اور برابر بندر بن میں رہا کرتے تھے۔ بھگتی کے کتنے ہی گیت بنا ڈالے تھے اور وقتاً فوقتاً انہیں چھپوا کر دوستوں میں تقسیم بھی کر دیتے تھے۔ ایک اور چچا بھی تھے جن کو رام سے بڑی عقیدت تھی اور فارسی میں رامائن کا ترجمہ کر رہے تھے۔ ریاست سے سب کے وظیفے مقرر تھے۔ کسی کو کوئی کام کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

ہوری باہر کھڑا سوچ رہا تھا کہ اپنے آنے کی اطلاع کیسے دے کہ یکایک رائے صاحب اسی طرف آ نکلے اور اُسے دیکھتے ہی بولے "ارے تو آ گیا ہوری، میں تو تجھے بلانے ہی والا تھا۔ دیکھ، اب کی تجھے راجہ جنک کا مالی بننا پڑے گا، سمجھ گیا نا؟ جس وقت شری جانکی جی مندر میں پوجا کرنے جاتی ہیں اُس وقت تو ایک گلدستہ لئے کھڑا رہے گا اور جانکی جی کی بھینٹ کرے گا۔ غلطی نہ کرنا اور دیکھ، آسامیوں سے تاکید کر کے کہہ دینا کہ سب کے سب شگون کرنے آئیں۔ میرے ساتھ کوٹھی میں آ، تجھ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

وہ آگے آگے کوٹھی کی طرف چلے، ہوری پیچھے پیچھے چلا۔ وہیں ایک گھنے پیڑ کے

سامنے بیں وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور ہوری کو زمین پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے بولے۔ سمجھ گیا میں نے کیا کہا ؟ کارکن کو تو جو کچھ کرنا ہے وہ کرے ہی گا، مگر آسامی جس قدر دل سے آسامی کی باتیں سنتا ہے کارکن کی نہیں سنتا۔ ہمیں ان ہی پانچ سات دنوں میں بیس ہزار کا بندوبست کرنا ہے۔ کیسے ہو گا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ تم سوچتے ہو گے کہ مجھ ٹکے کے آدمی سے مالک کیوں اپنا دکھڑا رونے بیٹھے۔ کس سے اپنے من کی کہوں ؟ نہ جانے کیوں تمہارے اوپر اعتبار ہوتا ہے۔ اتنا جانتا ہوں کہ دل میں مجھ پر ہنسو گے نہیں اور ہنسو بھی تو تمہاری ہنسی میں برداشت کر سکتا ہوں۔ البتہ ان کی ہنسی نہیں سہ سکتا جو اپنے برابر کے ہیں کیونکہ ان کی ہنسی میں حسد، بغض اور طنز ہے۔ اور وہ کیوں نہ ہنسیں ؟ میں بھی تو ان کی تکلیف مصیبت اور پست حالی پر ہنستا ہوں دل کھول کر تالیاں بجا کر دولت اور ہمدردی میں بیر ہے۔ ہم بھی دان دیتے ہیں، دھرم کرتے ہیں، لیکن جانتے ہو کیوں ؟ صرف اپنے برابر والوں کو نیچا دکھانے کے لئے۔ ہمارا دان اور دھرم محض غرور اور خالص غرور ہے۔ ہم میں سے کسی پر ڈگری ہو جائے، کسی کی قرقی ہو، بقایا مال گزاری کی علت میں حوالات ہو جائے، کسی کا جوان لڑکا مر جائے، کسی کی بیوہ بہو نکل جائے، کسی کے گھر میں آگ لگے، کوئی کسی بیسوا کے ہاتھوں اُلّو بن جائے یا اپنے آسامیوں سے پٹ جائے تو اس کے اور سبھی بھائی اس پر ہنسیں گے اور بغلیں بجائیں گے۔ گویا انہیں کل دنیا کی دولت مل گئی اور ملیں گے تو اتنی محبت سے گویا ہمارے پسینے کی جگہ خون بہائیں گے ! ارے اور تو اور، ہمارے چچازاد، پھوپھوزاد، ددھیال اور خالو زاد بھائی جو ایسی ریاست کی بدولت مزے اڑا رہے ہیں شعر کہہ رہے ہیں اور جوا کھیل رہے ہیں، وہ بھی مجھ سے جلتے ہیں اور اگر آج مر جاؤں تو گھی کے چراغ جلائیں۔ میرے دکھ کو دکھ سمجھنے والا کوئی نہیں۔ ان کی نگاہوں میں مجھے دکھی ہونے

کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ میں اگر روتا ہوں تو غم کا مضحکہ اُڑاتا ہوں! میں اگر بیمار ہوتا ہوں تو مجھے سُکھ ہوتا ہے میں اگر بیاہ کر کے اپنے گھر میں جھگڑا نہیں بڑھاتا تو یہ میری خود غرضی ہے اور اگر بیاہ کر لوں تو وہ عیش پسندی ہو گی۔ اگر شراب نہیں پیتا تو میری کنجوسی ہے، شراب پینے لگوں تو وہ رعایا کا خون ہو گی۔ اگر عیاشی نہیں کرتا تو خشک مزاج ہوں، عیاشی کرنے لگوں تو پھر کہنا ہی کیا۔ ان لوگوں نے مجھے عیش و عشرت میں مبتلا کرنے کے لئے کم چالیں نہیں چلیں اور اب تک چلے جاتے ہیں۔ ان کی یہی خواہش ہے کہ میں اندھا ہو جاؤں اور وہ لوگ مجھے لوٹ لیں اور میرا فرض یہ ہے کہ میں سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہ دیکھوں، سب کچھ جان کر بھی گدھا بنا رہوں۔"

رائے صاحب نے گاڑی آگے بڑھانے کے لئے دو بیڑے پان کھائے اور ہوری کے منہ کی طرف تاکنے لگے گویا اُس کے دلی خیالات کو جاننا چاہتے ہوں۔

ہوری نے ہمت کر کے کہا "ہم سوچتے تھے کہ ایسی باتیں ہمیں لوگوں میں ہوتی ہیں، پر جان پڑتا ہے کہ بڑے آدمیوں میں بھی ان کی کمی نہیں ہے۔"

رائے صاحب نے منہ پان سے بھر کر کہا "تم ہمیں بڑا آدمی سمجھتے ہو۔ ہمارے نام بڑے ہیں مگر درشن چھوٹے! غریبوں میں اگر حسد یا دشمنی ہے تو صرف پیٹ کے لئے یا پیٹ کے لئے! ایسی حسد اور دشمنی کو میں معافی کے قابل سمجھتا ہوں۔ ہمارے منہ کا لقمہ کوئی چھین لے تو اس کے حلق میں انگلی ڈال کر نکالنا ہمارا دھرم ہو جاتا ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو دیوتا ہیں۔ بڑے آدمیوں کا حسد اور دشمنی صرف لطف اٹھانے کے لئے ہے۔ ہم اتنے بڑے آدمی ہو گئے ہیں کہ ہمیں مکاری اور کمینہ پن ہی میں پورا مزہ آتا ہے ہم دیوتا پن کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں جب ہمیں اوروں کے رونے پر ہنسی آتی ہے۔ اسے تم تھوڑی ریاضت نہ سمجھو۔ جب اتنا بڑا

کنبہ ہے تو کوئی نہ کوئی تو ہمیشہ ہی بیمار رہے گا۔ اور بڑے آدمیوں کے روگ بھی بڑے ہوتے ہیں۔ وہ بڑا آدمی ہی کیا جسے کوئی چھوٹا عارضہ ہو؟ معمولی بخار بھی آ جائے تو ہمیں سرسام کی دوا دی جاتی ہے، ذرا سی پھنسی بھی نکل آئے تو وہ زہرباد بن جاتی ہے۔ اب چھوٹے سرجن اور منجھلے سرجن اور بڑے سرجن تار سے بلائے جا رہے ہیں، مسیح الملک کو لانے دہلی آدمی بھیجا جا رہا ہے اور راج وید کو لانے کے لئے کلکتہ۔ ادھر مندر میں درگا پاٹ ہو رہا ہے اور جوتشی مہاراج زائچہ دیکھ رہے ہیں اور منتر جنتر والے گرو، اپنے کام میں مصروف ہیں۔ راجہ صاحب کو جمراج (فرشتہ اجل) کے منہ سے نکالنے کے لئے دوڑ لگی ہوئی ہے، حکیم اور ڈاکٹر اس تاک میں رہتے ہیں کہ کب ان کا سر دکھے اور کب ان کے گھر میں سونے کی برکھا ہو اور یہ روپئے تم سے اور تمہارے بھائیوں سے وصول کئے جاتے ہیں، بھالے کی نوک پر! تجھے تو یہی تعجب ہوتا ہے کہ کیوں تمہاری آہوں کی آگ ہمیں بھسم نہیں کر ڈالتی مگر نہیں، تعجب کی کوئی بات نہیں۔ بھسم ہونے میں تو بہت دیر نہیں لگتی تکلیف بھی ذرا ہی دیر کی ہوتی ہے ہم جو [illegible] انگل انگل کر کے جلتے جا رہے ہیں اس بلا سے بچنے کے لئے ہم پولیس کی، حاکموں کی، عدالت کی اور وکیلوں کی پناہ لیتے ہیں اور خوبصورت عورت کی طرح سبھی کے ہاتھوں کا کھلونا بنتے ہیں، دنیا جانتی ہے ہم بڑے سکھی ہیں۔ ہمارے پاس علاقے، محل، سواریاں، نوکر چاکر، قرض، بیسوائیں، کیا نہیں ہیں؟ مگر جس کے دل میں طاقت نہیں، خودداری نہیں، وہ اور چاہے کچھ ہو انسان نہیں ہے۔ جسے دشمن کے خوف سے رات کو نیند نہ آتی ہو، جس کے دکھ پر سب ہنسیں اور رونے والا کوئی نہ ہو، جس کی چوٹی دوسروں کے پیروں کے نیچے دبی ہو، جو عیش و عشرت کے نشے میں اپنے کو بالکل بھول گیا ہو، جو حاکموں کے تلوے چاٹتا ہو اور اپنے ماتحتوں

کا خون چوستا ہو، اسے میں سکھی نہیں کہتا وہ تو دنیا کا سب سے بڑا بد نصیب جاندار ہے۔ صاحب شکار کھیلنے آئیں یا دورے پر، میرا فرض ہے کہ ان کی دم کے پیچھے لگا رہوں، ان کے ابروؤں پر شکن پڑی اور ہماری جان نکلی۔ انہیں خوش کرنے کے لئے ہم کیا نہیں کرتے اگر وہ سب کہنے لگیں تو شاید تمہیں یقین نہ آئے۔ ڈالیوں اور رشوتوں تک خیر غنیمت ہے، ہم سجدے کرنے کو بھی تیار رہتے ہیں۔ مفت خوری نے تو ہمیں بے ہاتھ پیر کا بنا دیا ہے، ہمیں اپنی مردیت پر ذرا بھی بھروسہ نہیں، صرف افسروں کے آگے دم ہلا ہلا کر کسی طرح انہیں مہربان رکھنا اور ان کی مدد سے اپنی رعایا پر رعب جمانا ہی ہمارا کام ہے۔ چاپلوسوں کی خوشامد نے ہمیں اتنا مغرور اور تنک مزاج بنا دیا ہے کہ ہم سے شرافت، عاجزی اور خدمت سب رخصت ہو گئی ہیں۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر سرکار ہمارے علاقے چھین کر ہمیں اپنی روزی کے لئے محنت کرنا سکھا دے تو ہم پر بڑا احسان ہو اور یہ تو یقینی ہے کہ اب سرکار بھی ہماری حفاظت نہ کرے گی۔ اب ہم سے اس کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ علامات سے ظاہر ہے کہ ہمارا طبقہ بہت جلد مٹ جانے والا ہے۔ میں اس دن کا خیر مقدم کرنے کو تیار بیٹھا ہوں۔ ایشور وہ دن جلد لائے! وہ ہمارے اودھار کا دن ہو گا۔ ہم موجودہ حالتوں کے شکار بنے ہوئے ہیں۔ وہی ہمارا ستیاناس کر رہی ہیں اور جب تک پونجی کی یہ بیڑیاں ہمارے پیروں سے نہ نکلیں گی تب تک یہ نحوست ہمارے سر پر منڈلاتی رہے گی۔ ہم انسانیت کا وہ درجہ نہ پا سکیں گے جس پر پہنچنا زندگی کا انتہائی مقصد ہے۔"

رائے صاحب نے پھر گلوریدان نکالا اور کئی بیڑے منہ میں رکھ لئے۔ کچھ اور کہنے والے تھے کہ ایک چپراسی نے آکر کہا "سرکار، بیگاروں نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے، کہتے ہیں کہ جب تک ہمیں کھانے کو نہ ملے گا ہم کام نہ کریں گے۔

ہم نے دھمکایا تو سب کام چھوڑ کر الگ ہو گئے۔"

رائے صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ آنکھیں نکال کر بولے "چلو میں اِن بدمعاشوں کو ٹھیک کرتا ہوں، جب کبھی کھانے کو نہیں دیا گیا تو آج یہ نئی بات کیوں؟ ایک آنہ روز کے حساب سے مزدوری جو ہمیشہ ملتی رہی ہے اسی مزدوری پہ انہیں کام کرنا ہوگا، سیدھے کریں یا ٹیڑھے۔"

پھر ہوری کی طرف دیکھ کر بولے "تم اب جاؤ ہوری، اپنی تیاری کرو۔ جو بات میں نے کہی ہے اس کا خیال رکھنا۔ تمہارے گاؤں سے مجھے کم از کم پانچ سو کی امید ہے۔"

رائے صاحب جھلاتے ہوئے چلے گئے۔ ہوری نے دل میں سوچا کہ ابھی یہ کیسی کیسی دھرم کی باتیں کر رہے تھے اور یکایک اتنے گرم ہو گئے۔

سورج سر پر آگیا تھا۔ اس کی تپش سے متاثر ہو کر پیڑوں نے اپنا پھیلاؤ سمیٹ لیا تھا۔ آسمان غبار آلود ہو رہا تھا اور سامنے کی زمین کانپتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔

ہوری نے اپنی لاٹھی اٹھائی اور گھر چلا۔ شگون کے روپے کہاں سے آئیں گے یہی فکر اُس کے سر پر سوار تھی۔

۳

ہوری اپنے گاؤں کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ابھی تک گوبر کھیت میں ایکھ گوڑ رہا ہے اور دونوں لڑکیاں بھی اس کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ لو چل رہی تھی، بگولے اٹھ رہے تھے، زمین جل رہی تھی، جیسے قدرت نے ہوا میں آگ بھر دی ہو۔ یہ سب ابھی تک کھیت میں کیوں کام کے پیچھے جان دینے پر تلے ہوئے ہیں؟

وہ کھیت کی طرف چلا اور دُور ہی سے چلا کر بولا۔ "آتا کیوں نہیں گوبر، کیا کام ہی کرتا رہے گا؟ دوپہر ڈھل گئی، کچھ سوجھتا ہے کہ نہیں۔"

اُسے دیکھتے ہی تینوں نے کدالیں اٹھالیں اور ساتھ ہو لئے، گوبر سانولا، لمبا، اکہرے بدن کا نوجوان تھا جسے اس کام سے دلچسپی نہ معلوم ہوتی تھی۔ چہرے پر خوشی کی جگہ بے اطمینانی اور بے دلی تھی۔ وہ اس لئے کام میں لگا ہوا تھا کہ وہ دکھانا چاہتا تھا کہ اُسے کھانے پینے کی کچھ فکر نہیں ہے۔ بڑی لڑکی سونا شرمیلی لڑکی تھی، سانولی مُنڈول، تیز اور خوش۔ گاڑھے کی سرخ ساڑی جسے وہ گھٹنوں سے موڑ کر کمر میں باندھے ہوئے تھی۔ اس کے ہلکے بدن پر کچھ لدی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اور اسے پختگی کا رنگ دے رہی تھی۔ چھوٹی لڑکی روپا پانچ چھ سال کی چھوکری تھی، میلی، سر پر بالوں کا ایک گھونسلا سا بنا ہوا، ایک لنگوٹی کمر میں لگی ہوئی، بڑی شریر اور رونے والی۔

روپا نے ہوری کے پیروں سے لپٹ کر کہا۔ "کاکا دیکھو میں نے ایک ڈھیلا بھی نہیں چھوڑا۔ بہن کہتی ہے، جا پیڑ تلے بیٹھ۔ ڈھیلے نہ توڑے جائیں گے کاکا تو مٹی کیسے برابر ہوگی؟"

ہوری نے اسے گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا کیا بیٹی، چل گھر چلیں۔"

کچھ دیر اپنی بیدلی کو دبائے رہنے کے بعد گوبر بولا۔ "یہ تم روج روج مالکوں کی کھشامد کرنے کیوں جاتے ہو۔ لگان نہ چکے تو پیادہ آکر گالیاں سناتا ہے، بیگار دینی ہی پڑتی ہے۔ نجر نجرانہ سب تو ہم سے بھرایا جاتا ہے، پھر کسی کی کیوں سلامی کرو؟"

اس وقت یہی خیالات ہوری کے دل میں بھی آ رہے تھے۔ مگر لڑکے کے

باغیانہ جذبے کو دبانا ضروری تھا بولا "سلامی کرنے نہ جائیں تو رہیں کہاں؟ بھگوان نے جب غلام بنا دیا ہے تو اپنا کیا بس ہے؟ اسی سلامی کی برکت ہے کہ دُوارے پر جھونپڑی بنا لی اور کسی نے کچھ نہ کہا۔ گھورے نے دوارے پر کھونٹا گاڑا تھا جس پر کارندہ نے دو روپے ڈانڑ لے لئے تھے۔ تلیا سے ہم نے کتنی مٹی کھودی، کارندہ نے کچھ نہیں کہا۔ دوسرا کھودے تو نجر دینی پڑے۔ اپنے مطلب کے لئے سلامی کرنے جاتا ہوں۔ پاؤں میں سنیچر نہیں ہے اور سلامی کرنے میں کچھ سکھ ملتا ہے۔ گھنٹوں کھڑے رہو تب مالک کو کہیں خبر ہوتی ہے۔ کبھی باہر نکلتے ہیں، کبھی کہلا دیتے ہیں کہ فرصت نہیں ہے۔"

گوبر نے طنز سے کہا "بڑے آدمیوں کی ہاں میں ہاں ملانے میں تھوڑا بہت سکھ ملتا ہے، نہیں تو لوگ ممبری کے لئے کیوں کھڑے ہوں؟"

"جب سر پر پڑے گی تب معلوم ہوگا بیٹا، ابھی جو چاہے کہہ لو۔ پہلے میں بھی ایسا ہی سوچا کرتا تھا پر اب معلوم ہوا کہ ہماری گردن دوسروں کے پاؤں تلے دبی ہوئی ہے، اکڑ کر نباہ نہیں ہو سکتا۔"

گوبر باپ پر اپنا غصہ اُتار کر کچھ ٹھنڈا ہو گیا اور چپ چاپ چلنے لگا۔ سونا نے دیکھا کہ روپا باپ کی گود میں چڑھی ہے تو حسد ہوا اسے ڈانٹ کر بولی "اب گود سے اُتر کر پاؤں پاؤں کیوں نہیں چلتی پاؤں ٹوٹ گئے ہیں؟"

روپا نے باپ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر ڈھٹائی سے کہا "نہ اُتریں گے جاؤ۔ کاکا! بہن ہم کو چڑھاتی ہے کہ تو روپا ہے میں سونا ہوں۔ میرا نام کچھ اور رکھ دو۔"

ہوری نے سونا کو بناوٹی غصے سے دیکھ کر کہا "تو اُسے کیوں چڑھاتی ہے سونیا؟ سونا تو دیکھنے کو ہے، نباہ تو روپا سے ہوتا ہے۔ روپا نہ ہو تو روپے کہاں

سے بنیں بتا؟

سونا نے اپنی بات رکھنے کے لئے کہا "سونا نہ ہو تو مہر کیسے بنے، نتھنی کہاں سے آوے، کنٹھا کیسے بنے؟"

گوبر بھی اس تفریحی بحث میں شامل ہو گیا۔ روپا سے بولا "تو کہہ دے کر سونا کو سو گھی پتی کی طرح پیلا ہوتا ہے، روپا تو اُجلا ہوتا ہے جیسے چندرماں۔"

سونا بولی "بیاہ میں پیلی ساڑھی پہنی جاتی ہے۔ اُجلی ساڑھی کوئی نہیں پہنتا۔"

روپا اس دلیل سے ہار گئی۔ گوبر اور ہوری کی کوئی دلیل اس کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ اس نے روتی آنکھوں سے ہوری کو دیکھا۔

ہوری کو ایک نئی بات سوجھ گئی "سونا بڑے آدمیوں کے لئے ہے، ہم غریبوں کے لئے تو روپا ہی ہے۔ جیسے جَو کو راجا کہتے ہیں، گیہوں کو چمار۔ تو اسی لئے کہ گیہوں بڑے آدمی کھاتے ہیں اور جَو ہم لوگ کھاتے ہیں؟"

سونا کے پاس اس زبردست دلیل کا کوئی جواب نہ تھا۔ ہار کر بولی "تم سب ایک ہو گئے، نہیں روپا کو رلا کر چھوڑتی۔"

روپا نے ہاتھ مٹکا کر کہا "اے راجا سونا چمار! اے راجا سونا چمار!"

اس جیت کی اسے اتنی خوشی ہوئی کہ باپ کی گود میں نہ رہ سکی زمین پر کود پڑی اور اچھل اچھل کر یہ رٹ لگانے لگی "روپا راجا سونا چمار! روپا راجا سونا چمار!"

یہ لوگ گھر پہنچے تو دھنیا دروازے پر کھڑی ان کی راہ دیکھ رہی تھی، خفا ہو کر بولی "آج اتنی دیر کیوں کی، گوبر؟ کام کے پیچھے کوئی جان تھوڑے ہی دے دیتا ہے۔" پھر شوہر سے گرم ہو کر کہا "تم بھی وہاں سے کمائی کر کے لوٹے تو کھیت

پہنچے، کھیت کہیں بھاگا جاتا تھا؟"

دروازے پر کنواں تھا۔ ہوری اور گوبر نے ایک ایک کلسیا پانی سر پہ ڈالا، روپا کو نہلایا اور کھانا کھانے گئے۔ جَو کی روٹیاں تھیں مگر گیہوں کی سی سفید اور چکنی۔ ارہر کی دال تھی جس میں کچا آم پڑا تھا۔ روپا باپ کی تھالی میں کھانے بیٹھی۔ سونا نے اُسے حسد بھری نگاہوں سے دیکھا، گویا کہہ رہی تھی "واہ رے دُلار!"

دھنیا نے پوچھا "مالک سے کیا بات چیت ہوئی؟"

ہوری نے لوٹا بھر پانی چڑھاتے ہوئے کہا "یہی تحصیل وصول کی بات تھی اور کیا۔ ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑے آدمی بڑے سکھی ہوں گے پر سچ پوچھو تو وہ ہم سے بھی ادھک دکھی ہیں۔ ہمیں اپنے پیٹ ہی کی فکر ہے انہیں تمام فکریں گھیرے رہتی ہیں۔"

رائے صاحب نے اور کیا کیا کہا تھا وہ ہوری کو یاد نہ تھا۔ اس کل بیان کا لُبِ لُباب ہی اس کے حافظے میں باقی رہ گیا تھا۔

گوبر نے طنز سے کہا "تو اپنی ریاست دے دیتے؟ اپنے کھیت، بیل، ہل، کدالی سب انہیں دینے کو تیار ہیں۔ کریں گے بدلہ؟ یہ سب ڈھونگ ہے، نری مٹّ مردی! جسے دکھ ہوتا ہے وہ درجنوں موٹر نہیں رکھتا، محلوں میں نہیں رہتا، حلوا پوری، نہیں کھاتا اور نہ ناچ رنگ میں پھنسا رہتا ہے۔ آرام سے راج کا سکھ بھوگ رہے ہیں، اس پر دکھی بنتے ہیں!"

ہوری نے جھنجھلا کر کہا "اب تم سے حجت کون کرے بھائی؟ ریاست کسی سے چھوڑی جاتی ہے کہ وہی چھوڑ دیں گے۔ ہمیں کو کھیتی سے کیا ملتا ہے؟ ہر آدمی کے حساب سے ایک آنہ روج کی مجوری بھی تو نہیں پڑتی۔ جو دس روپئے مہینے کا بھی نوکر ہے وہ ہم سے اچھا کھاتا پیتا ہے۔ پر کھیتوں کو چھوڑا تو نہیں جاتا۔ کھیتی چھوڑ دیں تو

اور کریں گے کیا؟ نوکری کہیں ملتی ہے! پھر مرجاؤ بھی تو پالنا ہی پڑتی ہے۔ کھیتی میں جو مرجاد ہے نوکری میں تو نہیں ہے۔ اسی طرح جمیداروں کا حال بھی سمجھنا۔ اُن کی جان کو بھی تو سینکڑوں روگ لگے ہوئے ہیں۔ حاکموں کو رسد پہونچاؤ، ان کی سلامی کرو۔ عملوں کو کھش کرو، تاریکھ پر مالگجاری نہ چکادیں تو حوالات ہو جائے، کڑکی کی نوبت آجائے۔ ہمیں تو کوئی حوالات نہیں لے جاتا۔ دو چار گالیاں یا جھڑکیاں ہی تو مل کر رہ جاتی ہیں۔"

گوبر نے احتجاج کیا۔ "یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ہم لوگ دانے دانے کو محتاج ہیں، سمو چے بدن پر کپڑے نہیں ہیں، چوٹی کا پسینہ ایڑی تک جاتا ہے تب بھی گجر نہیں ہوتی۔ انہیں کیا، آرام سے گدا مسند لگائے بیٹھے ہیں، سیکڑوں نوکر چاکر ہیں، ہجاروں آدمیوں پر حکومت ہے، روپئے چاہے نہ ہوتے ہوں پر سکھ تو سبھی طرح کا ملتا ہے۔ روپیہ لے کر آدمی اور کیا کرتا ہے؟"

"تو تمہاری سمجھ میں ہم اور وہ برابر ہیں؟"

"بھگوان نے تو سب کو برابر ہی بنایا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے بیٹا، چھوٹے بڑے بھگوان کے گھر سے بن کر آتے ہیں دھن بڑی تپسیا سے ملتا ہے۔ انہوں نے پہلے جنم میں جیسا کام کیا اُس کا سکھ اٹھا رہے ہیں۔ ہم نے کچھ نہیں جمع کیا تو ملے کیا؟"

"یہ سب من کو سمجھانے کی باتیں ہیں، بھگوان سب کو برابر بناتے ہیں یہاں جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے وہ چھوٹوں کو کچل کر بڑا بن جاتا ہے۔"

"یہ تمہارا بھرم ہے۔ مالک آج کل بھی نت چار گھنٹے بھگوان کا بھجن کرتے ہیں۔"

کس کے بل پر یہ بھجن اور دان دھرم ہوتا ہے؟

"اپنے بل پر۔"

"نہیں کسانوں کے بل پر اور مجوروں کے بل پر! یہ پاپ کا دھن پچے کیسے!
اسی لئے دان دھرم کرنا پڑتا ہے۔ بھگوان کا بھجن بھی اسی لئے ہوتا ہے۔ بھوکے ننگے
رہ کر بھگوان کا بھجن کریں تو ہم بھی دیکھیں، ہمیں کوئی دونوں جون کھانے کو دے
تو ہم آٹھوں پہر بھگوان کا بھجن ہی کرتے رہیں۔ ایک دن کھیت میں اوکھ گوڑنا پڑے
تو ساری بھگتی بھول جائیں۔"

ہوری نے ہار کر کہا "اب تمہارے منہ کون لگے بھائی؟ تم تو بھگوان کی لیلا میں
بھی ٹانگ اڑاتے ہو۔"

تیسرے پہر گوبر کدال لے کر چلا تو ہوری نے کہا "جرا ٹھہر جاؤ بیٹا، ہم بھی
چلتے ہیں تب تک تھوڑا بھوسہ نکال کر رکھ دو۔ میں نے بھولا کو دینے کے لئے کہا
ہے بیچارہ آج کل بہت تنگ ہے۔"

گوبر نے عدول حکمی کے انداز سے دیکھ کر کہا "اب ہمارے پاس بیچنے کو بھوسہ
نہیں ہے۔"

"بیچتا نہیں ہوں بھائی، یوں ہی دے رہا ہوں۔ وہ سنکٹ میں ہے۔ اس
کی مدد تو کرنی ہی پڑے گی۔"

"ہمیں تو اس نے کبھی ایک گائے نہیں دے دی۔"

دھنیا مٹک کر بولی "گائے نہیں وہ تو دے رہا تھا! انہیں گائے دے
دے گا! آنکھیں آ بجنے بھر کو کبھی دودھ تو بھیجا نہیں، گائے دے دے گا! بڑا دینے
والا ہے۔"

ہوری نے قسم کھائی "نہیں جوانی کسم اپنی پچھائیں گائے دے رہے تھے۔ ہاتھ
تنگ ہے، بھوسہ چارہ نہیں رکھ سکے۔ اب ایک گائے بیچ کر بھوسہ لینا چاہتے

ہیں۔ میں نے سوچا سنکٹ میں پڑے آدمی کی گائے کیا لوں۔ تھوڑا سا بھوسہ دیئے دیتا ہوں، کچھ روپئے ہاتھ آجائیں گے تو گائے لے لوں گا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے چکا دوں گا۔ اسّی روپے کی ہے مگر ایسی کہ آدمی دیکھتا رہے "

گوبر نے آڑے ہاتھوں لیا "تمہارا یہی دھرماتما پن تو تمہاری دُرگت کر رہا ہے۔ سا پچ تو بات ہے۔ اسّی روپے کی گائے ہے، ہم سے بیس کا بھوسہ لے لیں، اور گائے دے دیں۔ ساٹھ رہ جائیں گے وہ ہم دھیرے دھیرے دے دیں گے "

ہوری رازدارانہ طور پر مسکرایا "میں نے ایسی چال سوچی ہے کہ گائے یوں ہی ہاتھ آجائے۔ کہیں بھولا کا بیاہ ٹھیک کرنا ہے۔ بس، دو چار من بھوسہ تو اپنا رنگ جمانے بھر کو دیتا ہوں "

گوبر نے حقارت سے کہا "تو تم اب سب کا بیاہ ٹھیک کرتے پھرو گے؟"

دھنیا نے تیکھی نگاہوں سے دیکھ کر کہا "اب یہی ایک کام تو رہ ہی گیا ہے۔ نہیں دینا ہے ہمیں بھوسہ کسی کو۔ یہاں بھولی بھولا کسی کا ادھار نہیں کھایا ہے "

ہوری نے اپنی صفائی دی "اگر میری تدبیر سے کسی کا گھر بس جائے تو کون سی برائی ہے؟"

گوبر نے چلم اٹھائی اور آگ لینے چلا گیا۔ اُسے یہ جھمیلا بالکل پسند نہ تھا۔

دھنیا نے سر ہلا کر کہا "جو اُن کا گھر بسائے گا وہ اسّی روپے کی گائے لے کر چپ نہ ہو گا، ایک تھیلی گنوائے گا "

ہوری نے پچاڑا دیا "یہ میں جانتا ہوں لیکن اس کی بھلمنسی کو بھی تو دیکھو کر مجھ سے جب ملتا ہے تیرا ہی گن گان کرتا ہے ایسی لچھمی ہے، ایسی سلیقے وار "

دھنیا کے چہرے پر آب آگئی۔ "میں ان کے بکھان کی بھوکی تھیں، وہ اپنا بکھان دھرے رہیں۔"

بھولا نے محبت کی مسکراہٹ سے کہا۔ "میں نے تو کہہ دیا کہ بھیا وہ ناک پر مکھی بھی بیٹھنے نہیں دیتی، گالیوں سے تو بات کرتی ہے، پر وہ یہی کہے جائے کہ عورت نہیں لچھمی ہے۔ بات یہ ہے اس کے گھر والی بڑے کڑے سو بھاؤ کی تھی۔ بیچارہ اس کے ڈر سے بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ کہتا تھا کہ جس دن تمہاری گھر والی کا منہ تڑکے دیکھ لیتا ہوں اس دن کچھ نہ کچھ جرور ہاتھ لگتا ہے۔ میں نے کہا تمہارے ہاتھ لگتا ہوگا، یہاں تو روج دیکھتے ہیں پر کبھی پیسے سے بھینٹ نہیں ہوتی۔"

"تمہارے بھاگ ہی کھوٹے ہیں تو میں کیا کروں۔"

"لگا اپنی عورت کی برائی کرنے کہ بھکاری کو بھیک تک نہ دیتی تھی، جھاڑو مارنے دوڑتی تھی، لالچن ایسی کہ نمک تک اوروں کے گھر سے مانگ لاتی تھی۔"

"مرنے پر کسی کی کیا برائی کروں، مجھے دیکھ کر جل جاتی تھی۔"

"بھولا بڑا گمگھور تھا کہ اس کے ساتھ نباہ کیا۔ اور ہوتا تو بس کھاکر مرجاتا۔ مجھ سے دس سال بڑے ہوں گے بھولا، پر رام رام پہلے ہی کہتے ہیں۔"

"تو کیا کہتے تھے کہ جس دن تمہاری گھر والی کا منہ دیکھ لیتا ہوں تو کیا ہوتا ہے؟"

"اس دن بھگوان کہیں نہ کہیں سے کچھ بھیج دیتے ہیں۔"

"بہوئیں بھی تو ویسی چٹوری آئی ہیں۔ اب کی لسوں نے دو روپے کے کھر بجے انتھار کھا ڈالے ادھار مل جاتے تو انہیں چنتا نہیں ہوتی کہ دینا بھی پڑے گا یا نہیں۔"

"اور بھولا روتے کاہے کو ہیں"

گوبر آکر بولا "بھولا دادا آگئے، من دو من بھوسہ ہے سو انہیں دے دو، پھر ان کا بیاہ کھوجنے نکلو۔"

دھنیا نے سمجھایا "دو آدمی دوارے پر بیٹھا ہے۔ اُس کے لئے کھاٹ واٹ تو ڈال نہیں دی اوپر سے لگے بھنبھنانے، کچھ تو بھلمنسی سیکھو، کلسا لے جاؤ۔ پانی بھر کر رکھ دو، ہاتھ منہ دھوئیں، کچھ سربت پانی کھا لو، مصیبت ہی میں تو آدمی دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔"

ہوری بولا "سربت وربت کا کام نہیں، کون کوئی مہمان ہیں۔"

دھنیا نے بگڑ کر کہا "مہمان اور کیسے ہوتے ہیں؟ روج روج تمہارے دوارے پر نہیں آتے۔ اتنی دور سے دھوپ گھام میں آئے ہیں۔ پیاس لگی ہی ہو گی۔ روپا! دیکھ ڈبے میں تماکھو ہے کہ نہیں، گوبر کے مارے کاہے کو بچی ہو گی، دوڑ کر ایک پیسے کی تماکھو سیٹھانی کی دوکان سے لے لے۔"

بھولا کی آج جتنی خاطر ہوئی اور کبھی نہ ہو گی۔ گوبر نے چارپائی ڈال دی، سونا شربت بنا لائی۔ روپا تمباکو بھر لائی۔ دھنیا دروازے پر کواڑ کی آڑ میں کھڑی اپنے کانوں سے اپنی تعریف سننے کے لئے بیقرار ہو رہی تھی۔

بھولا نے چلم ہاتھ میں لے کر کہا "اچھی گھرنی گھر میں آجائے تو سمجھ لو کہ لچھمی آگئی۔ وہی جانتی ہے کہ چھوٹے بڑے کا آدر ستکار کیسے کرنا چاہیئے۔"

دھنیا کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی، فکر اور مایوسی اور مفلسی سے گھرا ہوا دل ان الفاظ میں نرمی اور تسکین کا احساس کر رہا تھا۔

ہوری جب بھولا کا کھانچا اٹھا کر بھوسہ لانے اندر گیا تو دھنیا بھی پیچھے پیچھے چلی۔ ہوری نے کہا "نہ جانے کہاں سے اتنا بڑا کھانچا مل گیا۔ کسی بھڑ بھونجے

سے مانگ لایا ہوگا۔ من بھر سے کم میں نہ بھرے گا۔ دو کھانچے دیئے تو دو من بھوسہ نکل جائے گا۔"

دھنیا خوش تھی، ملامت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی "یا تو کسی کو نیوتہ نہ دو اور دو تو بھر پیٹ کھلا دو، تمہارے پاس پان پھول لینے تھوڑے آئے ہیں کہ ٹوکری سے کر چلتے، دیئے ہی ہو تو تین کھانچے دے دو۔ بھلا آدمی اپنے لڑکوں کو کیوں نہیں لایا؟ اکیلا کہاں تک ڈھوئے گا جان نکل جائے گی۔"

"تین کھانچے تو میرے دیئے نہ دیئے جائیں گے۔"

"تب کیا ایک کھانچا دے کر ٹالو گے؟ گوبر سے کہہ دو کہ اپنا کھانچا بھر کر ان کے ساتھ چلا جائے۔"

"گوبر اوکھ گوڑنے جا رہا ہے۔"

"ایک دن نہ گوڑنے سے اوکھ نہ سوکھ جائے گی۔"

"یہ تو ان کا کام تھا کہ کسی کو ساتھ لاتے۔ بھگوان کے دیئے دو دو بیٹے ہیں۔"

"نہ ہوں گے گھر پر، دودھ لے کر ہاٹ گئے ہوں گے۔"

"یہ تو اچھی دل لگی ہے کہ اپنا مال بھی دو، دیا سے گھر تک پہونچا دو۔ لاد دے لدا دے اور لادنے والا ساتھ دے۔"

"اچھا بھائی کوئی مت جائے، میں پہونچا دوں گی، بڑوں کی سیوا کرتے میں لاج نہیں ہے۔"

"اور تین کھانچے انہیں دے دوں تو اپنے بیل کیا کھائیں گے؟"

"یہ سب تو جھوٹا دینے سے پہلے ہی سوچ لینا تھا۔ نہ ہو تو تم اور گوبر دونوں چلے جاؤ۔"

"مروت مروت کی طرح کی جاتی ہے۔ اپنا گھر اٹھا کر نہیں دے دیا جاتا۔"

"ابھی جمعدار کا پیادہ آجائے تو اپنے سر پر بھوسہ لاد کر پہنچاؤ گے۔ تم، تمہارا لڑکا اور لڑکی سب۔ اور وہاں سائت میں دو من لکڑی بھی چیرنی پڑے۔"

"جمعدار کی بات اور ہے۔"

"ہاں وہ ڈنڈے کے بل کام لیتا ہے نا۔"

"اس کے کھیت نہیں ہوتے ہیں؟"

"کھیت جوتتے ہیں تو لگان نہیں دیتے ہیں؟"

"اچھا بھائی جان نہ کھا، ہم دونوں چلے جائیں گے۔ کہاں سے انہیں یہ سنک بھوسہ دینے کو کہہ دیا۔ یا تو چلے ہی گی نہیں، اگر چلے گی تو دوڑانے لگے گی۔"

تینوں کھانچے بھوسے سے بھر دیئے گئے۔ گوبر کڑھ رہا تھا۔ اُسے اپنے باپ کے برتاؤ پر ذرا بھی اعتبار نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جہاں جاتے ہیں وہیں کچھ نہ کچھ گھر سے دے آتے ہیں۔ دھنیا خوش تھی، ہوری وہ دھرم اور سوارتھ کے بیچ میں ڈوبتا اترتا جا رہا تھا۔

ہوری اور گوبر مل کر ایک کھانچا باہر لائے۔ بھولا نے فوراً اپنے انگوچھے کی گنڈری بنا، سر پر رکھتے ہوئے کہا: "میں اسے رکھ کر ابھی بھاگا آتا ہوں۔ ایک کھانچا اور لوں گا۔"

ہوری بولا: "ایک نہیں ابھی دو، دو بھرے دھرے ہیں۔ اب تمہیں نہ آنا پڑے گا۔ میں اور گوبر ایک ایک کھانچا لے کر تمہارے ساتھ ہی چلتے ہیں۔"

بھولا ششدر ہو گیا۔ اُسے ہوری اپنا بھائی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر معلوم ہوا۔ اُسے اپنے دل میں ایک ایسی آسودگی کا احساس ہوا جس نے اس کی پوری زندگی کو تر و تازہ کر دیا۔

تینوں بھس لے کر چلے تو آپس میں باتیں ہونے لگیں۔

بھولا نے پوچھا ”دوسہرہ آرہا ہے، مالکوں کے یہاں تو بڑی دھوم دھام ہوگی؟“

”ہاں تنبو، سامیانہ گڑ گیا ہے۔ اب کی رام لیلا میں میں بھی کام کروں گا۔ رائے صاحب نے کہا ہے کہ مجھے راجا جنک کا مالی بننا پڑے گا۔“

”مالک تم سے بہت خوش ہیں۔“

”ان کی دیا ہے۔“

ایک لمحے کے بعد بھولا نے پھر پوچھا ”سگن کرنے کے لئے روپیوں کا کچھ بندوبست کر لیا ہے؟ مالی بن جانے سے تو گلا نہ چھوٹے گا۔“

ہوری نے منہ کا پسینہ پونچھ کر کہا ”اسی کی چنتا تو مارے ڈالتی ہے دادا، اناج تو سب کا سب کھلیان میں تل گیا۔ جمیندار نے اپنا لیا، مہاجن نے اپنا لیا، میرے لئے پانچ سیر اناج بچ رہا۔ یہ بھوسہ تو میں نے راتوں رات ڈھو کر چھپا دیا تھا۔ نہیں تنکا بھی نہ بچتا۔ جمیندار تو ایک ہی ہے پر مہاجن تین ہیں۔ سیٹھانی الگ، منگرو الگ اور داتا دین پنڈت الگ، کسی کا بیاج بھی پورا نہ چکا۔ جمیندار کے بھی آدھے روپے دینے رہ گئے۔ سیٹھانی سے پھر روپے ادھار لئے تب کام چلا۔ سب طرح کفایت کر کے دیکھ لیا بھیا کچھ نہیں ہوتا۔ ہمارا جنم اسی لئے ہوا ہے کہ اپنا لہو بہا دیں اور بڑوں کا گھر بھریں۔ روپیہ کا دونا سود بھر چکا پر روپیہ جیوں کا تیوں سر پر سوار ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شادی غمی میں، تیرتھ برت میں ہاتھ باندھ کر خرچ کرو۔ پر راستہ کوئی نہیں بتاتا۔ رائے صاحب نے بیٹے کے بیاہ میں بیس ہزار لٹا دیئے، ان سے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ منگرو نے اپنے باپ کے کریا کرم میں پانچ ہزار لگائے، ان سے کوئی کچھ نہیں پوچھتا۔ ویسی ہی مرجاد تو سب کی ہے۔“

بھولا نے درد آمیز لہجے میں کہا ”بڑے آدمیوں سے برابری کیسے کر سکتے ہو

بھائی؟"

"آدمی تو ہم بھی ہیں"

"کون کہتا ہے کہ ہم تم آدمی ہیں؟ ہم میں آدمیت ہے؟ آدمی وہ ہیں جن کے پاس دھن ہے، بل ہے اور بدھیا۔ ہم لوگ تو بیل ہیں اور جتنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اس پر ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتا۔ میل کا نام نہیں ہے۔ ایک کسان دوسرے کے کھیت پر نہ چڑھے تو کوئی اجا پھا کیسے کرے؟ پریم تو سنسار سے اٹھ گیا ہے۔"

بوڑھوں کے لئے ماضی کی راحتوں، حال کی تکلیفوں اور مستقبل کی تباہیوں سے زیادہ دلچسپ اور کوئی موضوع نہیں ہوتا۔ دونوں دوست اپنا اپنا دکھڑا روتے رہے۔ بھولا نے اپنے بیٹوں کی کرتوتیں کہہ سنائیں۔

ہوری نے اپنے بھائیوں کا رونا رویا اور پھر ایک کنوئیں پر بوجھ رکھ کر پانی پینے کے لئے بیٹھ گئے گوبر نے بنئے سے کوٹا اور کلسا مانگا اور پانی کھینچنے لگا۔

بھولا نے ہمدردی سے پوچھا "الگ ہوتے ہوئے تو تمہیں بڑا رنج ہوا ہوگا بھائیوں کو تم نے بیٹوں کی طرح پالا تھا۔"

ہوری کا گلا بھر آیا بولا "کچھ نہ پوچھو دادا، جی چاہتا تھا کہ کہیں جاکر ڈوب مروں، میرے جیتے جی سب کچھ ہوگیا۔ جن کے لئے اپنی جوانی دھول میں ملا دی میرے مدعی ہوگئے اور جھگڑے کی کیا تھی؟ کہ میری گھر والی بار میں کام کرنے کیوں نہیں جاتی۔ پوچھو، گھر دیکھنے والا بھی تو کوئی چاہئے کہ نہیں؟ لینا، دینا، دھونا اٹھانا یہ سب کون کرے؟ پھر، گھر پہ بیٹھی تو نہیں رہتی، جھاڑو، رسوئی، چو لڑکوں کی دیکھ بھال، یہ کوئی تھوڑا کام ہے؟ سو بھا کی عورت گھر سنبھال لیتی کہ ہیرا کی عورت میں یہ ڈھنگ تھا؟ جب سے الگا ہوا، دونوں گھروں میں ایک

جون روٹی بنتی ہے۔ نہیں تو سب کو دن میں چار چار بار بھوک لگتی تھی۔ اب کھائیں چار بار تو دیکھوں اس مالک پن میں گوبر کی ماں کی جو درگت ہوئی وہ میں ہی جانتا ہوں، بچاری اپنی دیورانیوں کے پھٹے پرانے کپڑے پہن کر دن کاٹتی تھی۔ خود بھوکی سو رہی ہوگی پر بہوؤں کے لئے جل پان تک کا دھیان رکھتی تھی۔ اپنے تن پر گہنے کے نام کچا دھاگا نہ تھا پر دیورانیوں کے لئے چار چار گہنے بنوائے۔ سونے کے نہ سہی چاندی کے تو ہیں۔ ڈاہ یہی تھی کہ یہ مالک کیوں ہے۔ بہت اچھا ہوا کہ الگ ہو گئے، میرے سر سے بلا ٹلی۔"

بھولا نے ایک لوٹا پانی چڑھا کر کہا، "یہی حال گھر گھر کا ہے بھیا، بھائیوں کی بات ہی کیا یہاں تو لڑکوں سے بھی نہیں پٹتی اور پٹتی اس لئے نہیں کہ میں کسی کی کچال دیکھ کر منہ بند نہیں رکھ سکتا۔ تم جوا کھیلو گے، چرس پیو گے، گانجے کی دم لگاؤ گے مگر آوے گا کس کے گھر سے؟ خرچ کرنا چاہتے ہو تو کماؤ، پر کمائی تو کسی سے نہ ہوگی، خرچ دل کھول کر کریں گے۔ بڑا لڑکا کامتا سودا لے کر بازار جائے گا تو آدھے پیسے غائب؛ پوچھو تو کوئی جواب نہیں۔ چھوٹا جنگی ہے وہ سنگت کے پیچھے متوالا رہتا ہے، سانجھ ہوئی اور ڈھول مجیرا لے کر بیٹھ گیا۔ سنگت کو میں برا نہیں کہتا، گانا بجانا عیب نہیں، پر یہ سب کام فرصت کے ہیں۔ یہ نہیں کہ گھر کا کوئی کام نہ کرو، آٹھوں پہر اسی دھن میں رہو۔ جاتی ہے میرے سر! چارہ پانی میں کروں، گائے بھینس میں دوہوں، دودھ لے کر ہاٹ میں جاؤں، یہ گرہستی کا جنجال ہے۔ گڑ بھرا ہنسیا نہ اگلتے بنے نہ نگلتے بنے۔ لڑکی ہے جھنیا وہ بھی نصیبے کی کھوٹی۔ تم تو اس کی سگائی میں آئے تھے۔ کتنا اچھا گھر بر تھا۔ اس کا آدمی بمبئی میں دودھ کی دکان کرتا تھا۔ ان دنوں وہاں ہندو مسلمانوں میں دنگا ہوا تو کسی نے اس کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا۔ گھر ہی چوپٹ ہو گیا۔ اب لڑکی

کا وہاں نباہ نہ تھا۔ جا کر لے آیا کہ دوسری سگائی کر دوں گا، پر وہ مانتی نہیں اور دونوں بھاوجیں ہیں کہ رات دن اُسے جلاتی رہتی ہیں۔ گھر میں مہابھارت مچا رہتا ہے۔ بیچاری بپتا کی ماری یہاں آئی تو یہاں بھی چین نہیں۔"

ان ہی دُکھڑوں میں راستہ کٹ گیا، بھولا کا گاؤں تھا تو چھوٹا مگر بہت گنوار زیادہ تر اہیر ہی بستے تھے اور کسانوں کے دیکھتے ان کی حالت بہت بری نہ تھی بھولا گاؤں کا مکھیا تھا، دروازے پر بڑی سی چھپرنی تھی جس پر دس بارہ گائیں بھینسیں کھڑی سانی کھا رہی تھیں، باہر دالان میں ایک بڑا سا تخت پڑا تھا۔ جو شاید دس آدمیوں سے بھی نہ اٹھتا۔ کسی کھونٹی پر ڈھول لٹک رہی تھی، کسی پر مجیرا تھا۔ ایک طاق پر کوئی کتاب بستے میں بندھی رکھی تھی جو شاید رامائن تھی۔ دونوں بہوئیں سامنے بیٹھی گوبر پاتھ رہی تھیں اور جھنیا چوکھٹ پر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ناک کے سرے پر بھی سرخی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ابھی رو کر اٹھی ہے۔ اس کے بھرے ہوئے، تندرست اور سڈول اعضا میں گویا شباب انگڑائیاں لے رہا تھا۔ چہرہ بڑا اور گول تھا، گال پھولے ہوئے، آنکھیں چھوٹی اور اندر دھنسی ہوئیں، ماتھا تنگ، مگر سینے کا ابھار اور جسم کا گدگدا پن آنکھوں کو کھینچ لیتا تھا۔ اس پر چھپی ہوئی گلابی ساڑھی اور بھی زینت بڑھا رہی تھی۔ بھولا کو دیکھتے ہی اس نے لپک کر ان کے سر سے کھانچا اتروا لیا۔ بھولا نے گوبر اور ہوری کے کھانچے اتروائے اور جھنیا سے بولے "پہلے ایک چلم بھر لا اور تھوڑا شربت بنا لے، پانی نہ ہو تو کلسا لا، میں کھینچ دوں۔ ہوری مہتو کو پہچانتی ہے نا؟"

پھر ہوری سے بولے "گھرنی بنا گھر نہیں رہتا۔ بھیا۔ پرانی کہاوت ہے۔ ناٹی کھیتی بہوویں گھر۔ ناٹے بیل کیا کھیتی کریں گے اور بہوویں کیا گھر سنبھالیں گی؟ جب سے اس کی ماں مری ہے جیسے گھر کی برکت ہی اٹھ گئی، بہوویں آٹا پاتھ لیتی ہیں

پر گرستی چلانا کیا جانیں؟ ہاں منہ چلانا خوب جانتی ہیں۔ لونڈے کہیں پڑے ہوں جمے ہوں گے۔ سب کے سب آسی ہیں، کام چور۔ جب تک جیتا ہوں ان کے پیچھے پچتا ہوں، مر جاؤں گا تو آپ سر پہ ہاتھ دھر کر روئیں گے۔ لڑکی بھی ویسی ہی ہے۔ تھوڑا سا کہنا بھی کہے گی تو بھنبھنا کر۔ میں تو سہ لیتا ہوں، مرد تھوڑے ہی سہے گا۔"

جھنیا ایک ہاتھ میں بھری ہوئی چلم، دوسرے میں شربت کا لوٹا لئے بڑی تیزی سے آپہنچی۔ پھرتی اور کلسا لے کر پانی بھرنے چلی۔ گوبر نے اس کے ہاتھ سے کلسا لینے کے لئے ہاتھ بڑھا کر جھینپتے ہوئے کہا "تم رہنے دو، میں بھرے لاتا ہوں۔"

جھنیا نے کلسا نہ دیا، کنوئیں کی جگت پر جا کر مسکراتی ہوئی بولی "تم ہمارے مہمان ہو، کہو گے کہ ایک لوٹا پانی بھی کسی نے نہ دیا۔"

"مہمان کاہے سے ہو گیا، تمہارا پڑوسی ہی تو ہوں۔"

"پڑوسی سال بھر میں ایک بار بھی صورت نہ دکھاوے تو مہمان ہی ہے۔"

"روج روج آنے سے تو مرجاد نہیں رہتی۔"

جھنیا ہنس کر ترچھی نگاہوں سے تاکتی ہوئی بولی "وہی مرجاد تو دے رہی ہوں۔ مہینے میں ایک بار آؤ گے تو ٹھنڈا پانی دوں گی، پندرھویں دن آؤ گے تو چلم پاؤ گے، ساتویں دن آؤ گے تو بیٹھنے کو ماچی دوں گی، روج روج آؤ گے تو کچھ نہ پاؤ گے۔"

"درسن تو دو گی؟"

"درسن کے لئے پوجا کرنی پڑے گی۔"

یہ کہتے کہتے جیسے اسے کوئی بھولی بات یاد آگئی، اس کا چہرہ اداس ہو گیا۔ وہ بیوہ ہے۔ اس کے استری برت کی ڈیوڑھی پر پہلے اس کا شوہر محافظ بنا بیٹھا

تھا اور وہ بے فکر تھی اب اس کی جگہ کوئی نگہبان نہ تھا۔ اس لئے وہ دروازے کو سدا بند رکھتی ہے۔ کبھی کبھی گھر کے سونے پن سے اُکتا کر وہ دروازہ کھولتی ہے۔ مگر کسی کو آتا دیکھ کر خوف سے دونوں کواڑ بند کر دیتی ہے۔"

گوبر نے گلاس بھر کر نکالا، سب نے شربت پیا اور ایک چلم تمباکو پی کر لوٹ پڑے۔ بھولا نے کہا "کل تم آکر گائے لے جانا گوبر، اس سمے تو سانی کھا رہی ہے۔"

گوبر کی آنکھیں اسی گائے پر لگی ہوئی تھیں اور وہ دل ہی دل میں مست ہوا جاتا تھا۔ گائے اتنی اچھی اور سندر ہے، اس کا اسے شان وگمان بھی نہ تھا۔

ہوری نے لالچ روک کر کہا "منگوا لوں گا، جلدی کیا ہے؟"

"تمہیں جلدی نہ ہو، ہمیں تو جلدی ہے۔ اُسے دروازے پر دیکھ کر تمہیں وہ بات یاد رہے گی۔"

"اس کی مجھے بڑی پھکر ہے دادا۔"

"تو کل گوبر کو بھیج دینا۔"

دونوں نے اپنے کھانچے سر پر رکھے اور روانہ ہوئے۔ دونوں اتنے خوش تھے گویا بیاہ کر کے لوٹے ہوں۔ ہوری کو تو اپنی دیرینہ خواہش کے پوری ہونے کی خوشی تھی اور وہ بھی بلا پیسے کے، گوبر کو اس سے بھی زیادہ قیمتی چیز مل گئی تھی۔ اس کے دل میں بھی ایک سوئی ہوئی تمنا جاگ اٹھی تھی۔

موقع پا کر اُس نے پیچھے کی طرف دیکھا۔ جھنیا دروازے پر کھڑی تھی۔ اُمید کی استی میں بے صبر اور بے قرار۔

۴

ہوری کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ نیم کے پیڑ تلے اپنی بانس کی چارپائی پر پڑا بار بار تاروں کی طرف دیکھتا تھا۔ گائے کے لئے ایک ناند گاڑنی ہے اُس کی ناند بیلوں سے الگ رہے تو اچھا ہو۔ ابھی تو رات کو باہر ہی رہے گی لیکن چوماسے میں اُس کے لئے کوئی دوسری جگہ ٹھیک کرنا ہوگی۔ باہر لوگ نظر لگا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ٹونا ٹوٹکا کر دیتے ہیں کہ گائے کا دودھ ہی سوکھ جاتا ہے۔ تھن میں ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتی، لات مارتی ہے۔ نہیں، باہر باندھنا ٹھیک نہیں اور باہر ناند ہی کون گاڑنے دے گا؟ کارندہ صاحب نذر کے لئے منہ پھیلائیں گے، چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے رائے صاحب کے پاس فریاد لے کر جانا تو ٹھیک نہیں اور کارندے کے آگے میری سنتا ہی کون ہے؟ ان سے کچھ کہوں تو کارندہ بیری بن جائے پانی میں رہ کر مگر سے بیر کرنا نادانی ہے۔ اندر ہی باندھوں گا۔ آنگن ہے تو چھوٹا پر ایک جھونپڑی ڈال لینے سے کام چل جائے۔ ابھی پہلا ہی بیانا ہے۔ پانچ سیر سے کم دودھ نہ دے گی۔ سیر بھر تو گوبر ہی کو چاہیئے۔ روپیا دودھ دیکھ کر کیسی للچاتی رہتی ہے، اب پئے جتنا چاہیئے! کبھی کبھی دو چار سیر مالکوں کو بھی دے آیا کروں گا۔ کارندہ صاحب کی پوجا بھی کرنی ہی ہوگی اور بھولا کے روپئے بھی دے دینا چاہیئے۔ سگائی کے ڈھکوسلے میں اسے کیوں ڈالوں؟ جو آدمی اپنے اوپر اتنا بسواس کر کے اسے دھوکا دینا نیچوں کا کام ہے۔ اسی روپئے کی گائے میرے بسواس پر دے دی ہے، نہیں یہاں کوئی ایک پیسے کو نہیں پتیاتا۔ سن میں کیا کچھ نہ ملے گا؟ اگر اگر پچیس روپئے بھی دے دوں تو بھولا کو ڈھارس ہو جائے۔ دھنیا سے ناحق بتلا دیا۔ چپکے سے گائے لا کر باندھ دیتا تو چکرا جاتی۔ لگتی پوچھنے کہ کس کی گائے

ہے، کہاں سے لائے ہو؟ کھوب دک کر کے بتاتا، پر جب پیٹ میں بات پچے بھی۔ کبھی دو چار پیسے اوپر سے آجاتے ہیں۔ انہیں بھی تو نہیں چھپا سکتا۔ اور یہ اچھا بھی ہے اسے گھر کی چنتا رہتی ہے اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ ان کے پاس بھی پیسے رہتے ہیں تو پھر نکھرے بگھاڑنے لگے، گوبر کچھ آلسی ہے، نہیں، تو گئو کی ایسی سیوا کرتا جیسی چاہیئے آلسی واسی کچھ نہیں ہے، اس عمر میں کون آلسی نہیں ہوتا؟ میں بھی دادا کے سامنے مٹر گشتی کیا کرتا تھا، بیچارے پہر رات سے کر بی کاٹنے لگتے، کبھی دوار پر جھاڑو لگاتے، کبھی کھیت میں کھاد ڈالتے، میں پڑا سوتا رہتا، کبھی جگا دیتے تو میں بگڑ جاتا اور گھر چھوڑ کر بھاگ جانے کی دھمکی دیتا۔ لڑکے جب اپنے ماں باپ کے سامنے بھی جندگی کا تھوڑا سا سکھ نہ پائیں گے تو پھر جب اپنے سر پر پڑ گئی تو کیا پائیں گے؟ دادا کے مرتے ہی کیا میں نے گھر نہیں سنبھال لیا؟ سارا گاؤں یہی کہتا تھا کہ ہوری گھر بگاڑ دے گا، لیکن سر پہ بوجھ پڑتے ہی میں نے ایسا چولا بدلا کہ لوگ دیکھتے رہ گئے۔ سوبھا اور ہیرا الگ ہی ہو گئے، نہیں آج اس گھر کی اور بات ہوتی۔ تین ہل ایک ساتھ چلتے تھے، اب تینوں الگ الگ چلتے ہیں۔ سب سمے کا پھیر ہے، دھنیا کا کیا دوکھ تھا؟ بیچاری جب سے گھر میں آئی کبھی تو چین سے نہ بیٹھی، ڈولی سے اُترتے ہی سارا کام سر پہ اٹھا لیا۔ اماں کو پان کی طرح پھیرتی رہتی تھی، جس نے گھر کے پیچھے اپنے کو مٹا دیا وہ اگر دیورانیوں سے کام کرنے کو کہتی تھی تو کیا بُرا کرتی تھی؟ آخر اُسے بھی تو کچھ آرام ملنا چاہیئے، پر بھاگ میں آرام لکھا ہوتا تب تو ملتا۔ تب دیوروں کے لئے مرتی تھی، اب اپنے بچوں کے لئے مرتی ہے۔ وہ اتنی سیدھی، گمگھور، بے چھل کپٹ کی نہ ہوتی تو آج سوبھا اور ہیرا جو موچھوں پہ تاؤ دیتے پھرتے ہیں، کہیں بھیک مانگتے ہوتے۔ آدمی کتنا مطلبی ہوتا ہے! جس کے لئے مرو وہی بیری بن جاتا ہے۔ ہوری نے پھر پورب کی طرف دیکھا۔ ساینت سبیرا ہو رہا ہے۔ گوبر کا ہے

کو جاگنے لگا؟ نہیں، کہہ کے تو یہی سویا تھا کہ میں منہ اندھیرے ہی چلا جاؤں گا۔ جا کر ناند تو گاڑ ہی دوں، پر نہیں، جب تک گائے نہ آ جائے ناند گاڑنا ٹھیک نہیں۔ کہیں بھولا بدل گئے یا اور کسی کارن سے گائے نہ دی تو سارا گاؤں ہنسے گا کہ چلے تھے گائے لینے! پٹھے نے اتنی پھرتی سے ناند گاڑ دی جیسے اسی کی کسر تھی! بھولا ہے تو اپنے گھر کا مالک پر جب لڑکے سیانے ہو گئے تو باپ کی کہاں چلتی ہے؟ کامتا اور جنگی اکڑ جائیں تو کیا بھولا اپنے من سے گائے دے دیں گے؟ کبھی نہیں۔"

یکایک گوبر چونک کر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا بولا "ارے یہ تو بھور ہو گیا تم نے ناند گاڑ دی دادا؟"

ہوری گوبر کے گٹھے ہوئے بدن اور چوڑے سینے کی طرف غرور سے دیکھ کر اور دل میں یہ سوچتے ہوئے کہ اگر اسے کہیں دودھ گھی ملتا تو کیسا پٹھا ہو جاتا۔ بولا "نہیں ابھی نہیں گاڑی، سوچا کہ کہیں نہ ملے تو ناحق بھد ہو۔"

گوبر نے تیوری چڑھا کر "ملے گی کیوں نہیں؟"

"ان کے من میں کوئی چور بیٹھ جائے تو؟"

"چور بیٹھے یا ڈاکو، گائے تو انہیں دینی ہی پڑے گی۔"

گوبر نے اور کچھ نہ کہا، لاٹھی کندھے پر رکھی اور چل دیا۔ ہوری اسے جاتا ہوا دیکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتا رہا۔ اب لڑکے کی سگائی میں دیر نہ کرنی چاہیئے۔ سترھواں سال لگ گیا، پر کریں کیسے؟ کہیں پیسے کے بھی درسن ہوں۔ جب سے تینوں بھائیوں میں الگاؤ ہو گیا، گھر کی ساکھ جاتی رہی۔ مہتو لڑکا دیکھنے آتے ہیں پر گھر کی دسا دیکھ کر منہ پھیکا کر کے چلے جاتے ہیں۔ دو ایک راجی بھی ہوئے، تو روپے مانگتے ہیں، دو تین سو لڑکی کے دام چکائے اور اتنا ہی اوپر سے کھرچ کرے تب جا کر بیاہ ہو۔ کہاں سے ہو؟ اور اب تو سونا بیاہنے لایک ہو گئی ہے۔ لڑکے کا بیاہ نہ ہوا نہ سہی۔ لڑکی

کا بیاہ نہ ہوا تو ساری برادری میں ہنسی ہو گی۔ پہلے تو اسی کی سگائی کرنی ہے، پیچھے دیکھا جائے گا۔

ایک آدمی نے رام رام کیا اور پوچھا، تمہارے کوٹھی میں کچھ بانس ہو، ہاگے مہتو؟

ہوری نے دیکھا، دمڑی بانس والا سامنے کھڑا ہے۔ ناٹا، کالا، خوب موٹا، چوڑا منہ، بڑی بڑی مونچھیں، سُرخ سُرخ آنکھیں، کمر میں بانس کاٹنے کی کٹار، کھونسے ہوئے۔ سال میں ایک دو بار آ کر چقیں، کرسیاں، مونڈھے، ٹوکریاں وغیرہ بنانے کے لئے کچھ بانس کاٹ لے جاتا تھا۔

ہوری خوش ہو گیا۔ مٹھی گرم ہونے کی کچھ آس بندھی۔ چودھری کو لے جا کر اپنی تینوں کوٹھیاں دکھائیں، مول بھاؤ کیا، اور پچاس روپئے سیکڑے میں پچاس بانسوں کا بیعانہ لے لیا۔ پھر دونوں لوٹے۔ ہوری نے اُسے چلم پلائی۔ ناشتہ کرایا، اور تب رمز کے لہجے میں بولا، ہمیرے بانس کبھی تیس روپئے سے کم میں نہیں جاتے۔ مگر تم گھر کے آدمی ہو، تم سے کیا بھاؤ تاؤ کرتا؟ تمہارا وہ لڑکا جس کی سگائی ہوئی تھی، ابھی پردیس سے لوٹا کہ نہیں؟

چودھری نے چلم کا دم لگا کر کھانستے ہوئے کہا، اس لونڈے کے پیچھے تو مر مٹا مہتو۔ جوان عورت گھر میں بیٹھی تھی اور وہ برادری کی ایک دوسری عورت کے ساتھ پردیس میں موج کرنے چل دیا۔ بہو بھی دوسرے کے ساتھ نکل گئی۔ عورت کی بڑی بڑی جات ہے مہتو، کسی کی نہیں ہوتی۔ کتنا سمجھایا کہ تو جو چاہے کھا، میری ناک نہ کٹا، پر کون سنتا ہے؟ عورت کو بھگوان سب کچھ دے، روپ نہ دے، نہیں وہ قابو میں نہیں رہتی۔ کوٹھیاں تو بنٹ گئی ہوں گی؟

ہوری نے آسمان کی طرف دیکھا اور گویا اس کی وسیع فضا میں اُڑتا ہوا بولا

"سب کچھ بنٹ گیا چودھری۔ جن کو لڑکوں کی طرح پالا پوسا وہ اب برابر کے حصے دار ہیں۔ مگر بھائی کا حصہ کھانے کی نیت نہیں ہے۔ ادھر تم سے روپئے ملیں گے اُدھر دونوں بھائیوں کو بانٹ دوں گا۔ چار دن کی جندگانی میں کیوں کسی سے چھل کپٹ کروں؟ نہیں کہہ دوں کہ بیس روپئے سیکڑے میں بیچے ہیں تو انہیں کیا پتہ چلے گا؟ تم ان سے کہنے تھوڑے ہی جاؤ گے؟ تمہیں تو میں نے برابر اپنا بھائی سمجھا ہے۔"

برتاؤ میں ہم بھائی کے معنی کا کتنا ہی بیجا استعمال کریں لیکن اس کے تصور میں جو پاکیزگی ہے وہ ہماری سیاہ دلی سے کبھی آلودہ نہیں ہو سکتی۔

ہوری نے درپردہ یہ تجویز پیش کرکے چودھری کے منہ کی طرف دیکھا کہ وہ منظور کرتا ہے یا نہیں۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسا جھوٹا عاجزانہ انداز تھا جو بھیک مانگتے درخت پرٹے بھکاریوں کے چہرے پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ چودھری نے ہوری کا آسن پاکر چابک جمایا۔ "ہمارا تمہارا پرانا بھائی چارا ہے مہتو، ایسی بات ہے بھلا۔ پر بات یہ ہے کہ آدمی ایمان بیچتا ہے تو کسی لالچ سے۔ بیس روپئے نہیں میں پندرہ کہہ دوں گا مگر جو بیس روپئے دام لو تو۔"

ہوری نے کھسیا کر کہا، "تم تو چودھری اندھیر کرتے ہو، بیس روپے میں کہیں ایسے بانس ملتے ہیں؟"

"ایسے کیا، اس سے اچھے بانس آتے ہیں دس روپئے میں، ہاں دس کوس اور پچھم چلے جاؤ۔ دام بانس کا نہیں ہے، شہر کے پاس ہونے کا ہے۔ آدمی سوچتا ہے کہ جتنی دیر وہاں جانے میں لگے گی اتنی دیر میں تو دو چار روپئے کا کام ہو جائے گا۔"

سودا پٹ گیا۔ چودھری نے مرزئی اُتار کر چھپر پر رکھ دی اور بانس کاٹنے لگا۔

اکھ کی سنچائی ہو رہی تھی۔ ہیرا کی عورت کلیا لے کر کھیتوں پر جا رہی تھی۔ چودھری

کو بانس کاٹتے دیکھ کر گھونگھٹ کے اندر سے بولی "کون بانس کاٹتا ہے یہاں؟ بانس نہ کٹیں گے۔"

چودھری نے ہاتھ روک کر کہا "بانس مول لئے ہیں، پندرہ روپے سیکڑے کا بیعانہ ہوا ہے، سینت میں نہیں کاٹ رہے ہیں۔"

یہ عورت اپنے گھر کی مالکہ تھی۔ اسی کی مخالفت سے بھائیوں میں علیحدگی ہوئی تھی۔ دھنیا کو شکست دے کر شیر ہو گئی تھی۔ ہیرا کبھی کبھی اس کی مرمت کر دیتا تھا ابھی حال میں اتنا مارا تھا کہ وہ کئی دن تک کھاٹ سے نہ اٹھ سکی تھی۔ لیکن وہ اپنے اختیارات سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھی۔ ہیرا غصے میں اُسے مارتا تھا۔ مگر چلتا تھا۔ اسی کے اشاروں پہ، اس گھوڑے کی طرح جو کبھی کبھی مالک کو لات مار کر بھی اسی کی سواری میں چلتا ہے۔

کلیوا کی ٹوکری سر سے اُتار کر بولی "پندرہ روپئے میں ہمارے بانس نہ جائیں گے۔"

چودھری عورت ذات سے اس بارے میں بات چیت کرنا خلاف مصلحت سمجھتے تھے۔ بولے "جا کر اپنے آدمی کو بھیج دے، جو کچھ کہنا ہو آ کر کہیں۔"

عورت کا نام پنی تھا۔ بچے دو ہی ہوئے تھے لیکن بدن ڈھل گیا تھا۔ بناؤ سنگار کے ذریعہ وقت کے ہاتھوں ہونے والی بربادی کو چھپایا جا سکتا ہے مگر ہمتی ہیں کھانے ہی کا ٹھکانا نہ تھا سنگار کے لئے پیسے کہاں سے آتے؟ اس مفلسی اور مجبوری نے اس کی فطرت کی نرمی کو جذب کر کے اسے سخت اور خشک بنا دیا تھا جس پہ ایک ضربہ تو پھاوڑا بھی پڑ کر اُچٹ جاتا۔

وہ قریب جا کر چودھری کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی "آدمی کو کیوں بھیج دوں؟ جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو نا! میں نے کہہ دیا کہ میرے بانس

دکھیں گے۔"

چودھری ہاتھ چھڑاتا تھا اور پنّی بار بار پکڑ لیتی تھی۔ ایک منٹ تک یہی ہاتھا پائی ہوتی رہی۔ آخر چودھری نے اسے زور سے ڈھکیل دیا۔ پنّی دھکا کھا کر گر پڑی مگر پھر بھی اور پاؤں سے تلی نکال کر چودھری کے سر، منہ، پیٹھ پر اندھا دھند جمانے لگی۔ بانس والا ہو کر اُسے ڈھکیل دے۔ اس کی یہ بے عزتی! مارتی جاتی تھی اور روتی بھی جاتی تھی۔ چودھری اسے دھکا دے کر عورت سے طاقت آزمائی کر کے ٹھیس کھا چکا تھا۔ بس کھڑے کھڑے مار کھانے کے سوا اس مصیبت سے بچنے کا اس کے پاس اور کوئی علاج نہ تھا۔ پنّی کا رونا سن کر ہوری بھی دوڑا ہوا آیا۔ پنّی نے اسے دیکھ کر اور زور سے چلّانا شروع کیا۔ ہوری نے سمجھا کہ چودھری نے پنیا کو مارا ہے۔ خون نے جوش مارا اور وہ الگاوے کے اونچے بند کو توڑتا ہوا سب کچھ اپنے اندر سمیٹ لینے کے لئے باہر اُبل پڑا۔ چودھری کو زور سے ایک لات جما کر بولا۔

اب اپنا بھلا چاہتے ہو تو چودھری، یہاں سے چلے جاؤ، نہیں تمہاری لہاس اُٹھے گی۔ تم نے اپنے کو سمجھا کیا ہے؟ تمہاری اتنی مجال کہ میری بہو پہ ہاتھ اٹھاؤ۔"

چودھری قسمیں کھا کھا کر اپنی صفائی دینے لگا۔ تلیوں کی چوٹ میں اس کا گھمنڈ اور دل خاموش تھا۔ یہ لات اُسے بلا قصور ملی اور اس کے پھولے ہوئے گال آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ اُس نے تو بہو کو چھوا بھی نہیں کیا وہ اتنا گنوار ہے کہ مہتو کے گھر کی عورت پر ہاتھ اُٹھائے گا؟

ہوری نے بے اعتباری سے کہا۔ "آنکھوں میں دھول مت جھونکو۔ تم نے کچھ کیا نہیں تو بہو جھوٹ موٹ روتی ہے؟ روپے کی گرمی ہے وہ نکال دی جائیگی۔ الگ ہیں تو کیا ہوا، ہے تو ایک کھون۔ کوئی ترچھی آنکھ سے دیکھے تو آنکھ نکال لیں۔"

پنی چنڈی بنی ہوئی تھی، گلا پھاڑ کر بولی "تو نے مجھے دھکا دے کر گرا نہیں دیا؟ کھا جا اپنے بیٹے کی سوگند!"

ہیرا کو بھی خبر ملی کہ چودھری اور پنیا میں جنگ ہو رہی۔ چودھری نے پنیا کو دھکا دیا۔ پنیا نے اسے تلبوں سے پیٹا۔ اس نے پُروہیں چھوڑا اور پرادگی (بیلوں کا چابک) لئے واردات کے موقع کی طرف چلا۔ وہ گاؤں میں اپنے غصے کے لئے مشہور تھا چھوٹا قد، گٹھا ہوا بدن، آنکھیں کوڑی کی طرح نکل آتی تھیں اور گلے کی رگیں تن گئی تھیں۔ مگر اُسے چودھری پر غصہ نہ تھا بلکہ غصہ تھا پنیا پر۔ وہ کیوں چودھری سے لڑی؟ کیوں اس کی عزت مٹی میں ملا دی؟ بانس والے سے جھگڑنے سے اُسے کیا مطلب؟ اُسے جا کر ہیرا سے کل ماجرا بیان کر دینا چاہیئے تھا، وہ جیسا مناسب سمجھتا کرتا۔ وہ اس سے لڑنے کیوں گئی؟ اس کی چلتی تو وہ پنیا کو پردے میں رکھتا۔ پنیا کسی بڑے سے منہ کھول کر باتیں کرے، یہ اسے ناگوار تھا۔ وہ خود جتنا گرم مزاج تھا پنیا کو اتنا ہی زیادہ ٹھنڈا رکھنا چاہتا تھا۔ جب بھیا نے پندرہ روپئے میں سودا کر لیا تو وہ بیچ میں کودنے والی کون تھی؟

اس نے آتے ہی پنیا کا ہاتھ پکڑ لیا اور گھسیٹتا ہوا الگ سے جا کر لگا لاتیں مارنے "حرامجادی! تو ہماری ناک کٹانے پر لگی ہوئی ہے۔ تو چھوٹے چھوٹے آدمیوں سے لڑتی پھرتی ہے۔ کس کی پگڑی نیچی ہوتی ہے بتا! (ایک لات اور جما کر) ہم تو وہاں گلیوا کی باٹ جوہ رہے ہیں تو یہاں لڑائی ٹھانے بیٹھی ہے۔ اتنی بے حیائی کا پانی ایسا گر گیا! کھود کر گاڑ دوں گا۔"

پنیا ہائے ہائے کرتی جاتی تھی۔ "تیری مٹی اُٹھے، تجھے مرگی آوے، دیبی بھیا تجھے لیل جائیں، بھگوان کرے تو کوڑھی ہو جائے۔ ہاتھ پاؤں کٹ کٹ کر گریں۔"

اور گالیاں تو ہیرا اکڑا کھڑا سنتا رہا لیکن یہ پچھلی گالی اُسے لگ گئی۔ ہیضہ وغیرہ

میں کوئی خاص تکلیف نہ تھی، اِدھر بیمار پڑے اُدھر چل دیئے مگر کوڑھ ایہ گھن کی موت اور اس سے بھی گھن کی زندگی! وہ تلملا اٹھا، دانت پیستا ہوا پھر پُنیا پر جھپٹا اور بال پکڑ کر اُس کا سر زمین پر رگڑتا ہوا بولا "ہاتھ پاؤں ٹوٹ کر گر جائیں گے تو میں تجھے لے کر چاٹوں گا؟ تو ہی میرے بال بچوں کو پالے گی؟ ایں، تو ہی اتنی بڑی گرہستی چلائے گی؟ تو تو دوسرا بھتار کر کے کنارے کھڑی ہو جائے گی؟"

چودھری کو پُنیا کی اس دُرگت پر رحم آگیا۔ ہیرا کو سمجھانے لگا "ہیرا جتو اب جانے دو، بہت ہوا۔ کیا ہوا بہو نے مجھے مارا، میں تو چھوٹا نہیں ہو گیا۔ دھنیا بھاگ کہ بھگوان نے یہ دن تو دکھایا۔"

ہیرا نے چودھری کو ڈانٹا "تم چپ رہو چودھری، میرے گتنے بیں پڑ جاؤ گے تو بُرا ہو گا۔ عورت جات اسی طرح بہکتی ہے۔ آج کو تم سے لڑ گئی ہے، کل کو دوسروں سے لڑ جائے گی۔ تم بھلے مانس ہو، ہنس کر ٹال گئے۔ دوسرا تو برداشت نہ کرے گا۔ کبھی اس نے بھی ہاتھ چلا دیئے تو کتنی آبرو رہ جائے گی، بتاؤ!"

اس خیال نے اس کے غصے کو پھر بھڑکایا۔ لپکا ہی تھا کہ ہوری نے دوڑ کر پکڑ لیا اور اُسے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا "ارے تو ہر گیا! دیکھ لیا دنیا نے کہ تم بڑے بہادر ہو۔ اب کیا اسے پیس کر پی جاؤ گے؟"

ہیرا اب بھی بڑے بھائی کا ادب کرتا تھا۔ براہ راست نہ لڑتا تھا۔ چاہتا تو ایک جھٹکے میں اپنا ہاتھ چھڑا لیتا مگر اتنی بے ادبی نہ کر سکا۔ چودھری کی طرف دیکھ کر بولا "اب کیا کھڑے تاکتے ہو؟ جا کر اپنے بانس کاٹو! میں نے سہی کر دی۔ چندو روپے بیکر سے ہی ملے ہوئے۔"

کہاں تو بیٹھی رو رہی تھی اور کہاں جھٹک کر اٹھی اور اپنا سر پیٹ کر بولی "لگا دے گھر میں آگ، انگوڑے! مجھے کیا کرتا ہے؟ بھاگ پھوٹ گیا کہ تجھ جیسے

کسائی کے پالے پڑی۔ لگا دے گھر میں آگ!"

اس نے کلیوا کی ٹوکری وہیں چھوڑ دی اور گھر کی طرف چلی۔ ہیرا گرجا، "وہاں کہاں جاتی ہے چڑیل؟ چل کنوئیں پر۔ نہیں تو کھون پی لوں گا۔"

پنیا کے بیچ میں گھٹے۔ وہ اس ناٹک کا دوسرا کھیل نہ کھیلنا چاہتی تھی، چپکے سے ٹوکری اٹھائی اور روتے ہوئے کنوئیں کی طرف چلی۔ ہیرا بھی پیچھے پیچھے چلا۔

ہوری نے کہا، "اب پھر مار پیٹ نہ کرنا، اس سے عورت بے شرم ہو جاتی ہے۔"

دھنیا نے دروازے پر آکر بانگ لگائی، "تم وہاں کھڑے کیا تماشا دیکھ رہے ہو؟ کوئی تمہاری سنتا بھی ہے کہ یوں ہی سمجھا رہے ہو؟ اس دن اس بہو نے تمہیں گھونگھٹ کی آڑ سے داڑھی جار کہی تھی، بھول گئے؟ بہریا ہو کر پرائے مردوں سے لڑے گی تو ڈانٹی نہ جائے گی؟"

ہوری دروازے پر آکر نٹ کھٹ پن کے ساتھ بولا، "اور جو میں اسی طرح تجھے ماروں، تو؟"

"کیا کبھی مارا نہیں جو مارنے کی سادھ بنی ہوئی ہے؟"

"اتنی بے دردی سے مارتا تو تو گھر چھوڑ کر بھاگ جاتی۔ پنیا بڑی گمکھوڑ ہے۔"

"او ہو! ایسے ہی بڑے دردوالے ہو تم! ابھی تک مار کا داغ بنا ہوا ہے۔ ہیرا مارتا ہے تو ڈلارتا بھی ہے، تم نے تو مارنا ہی سیکھا ہے، ڈلار کرنا سیکھا ہی نہیں۔ میں ہی ایسی ہوں کہ تمہارے ساتھ نباہ ہوا۔"

"اچھا رہنے دے، بہت اپنا بکھان نہ کر! تو ہی روٹھ روٹھ کر میکے بھاگتی تھی، جب مہینوں منوتی کرتا تھا تب کہیں جاکر آتی تھی!"

"جب اپنی گرج سناتی تھی تب منانے جاتے تھے لالا، میرے ڈر سے نہیں جاتے تھے۔"

"اسی سے تو میں سب سے تیرا بکھان کرتا ہوں۔"

ازدواجی زندگی کی صبح میں تمنا اپنے گلابی نشے کے ساتھ طلوع ہوتی ہے اور دل کے آسمان کو پورے طور پر اپنی سنہری کرنوں سے رنگ دیتی ہے۔ پھر دوپہر کی تیز تپش کا وقت آتا ہے، دمبدم بگولے اٹھتے ہیں اور زمین کانپنے لگتی ہے تمنا کا سنہرا پردہ ہٹ جاتا ہے اور اصلیت اپنی عریانی میں آگے آ کھڑی ہوتی ہے۔ اس کے بعد آرام وہ شام آتی ہے۔ سرد اور سکون افزا، جب ہم تھکے ہوئے مسافروں کی طرح دن بھر کی مسافت کا حال کہتے اور سنتے ہیں بے غرضانہ انداز سے، گویا ہم کسی اونچی چوٹی پر جا بیٹھے ہیں جہاں نیچے کا شور و غل ہم تک نہیں پہنچتا۔

دھنیا نے تنگ کر کہا "چلو چلو، بڑے بکھان کرنے والے! ذرا سا کوئی کام بگڑ جائے تو گردن پر سوار ہو جاتے ہو۔"

ہوری نے میٹھے اولہنے کے ساتھ کہا "لے اب یہی تیرا اپنا پن مجھے اچھا نہیں لگتا۔ دھنیا بھولا سے پوچھ کہ میں نے اس سے تیرے بارے میں کیا کہا تھا؟"

دھنیا نے بات بدل کر کہا، "دیکھو گوبر گائے لے کر آتا ہے کہ خالی ہاتھ۔"

بھولا اچھا آدمی ہے، پر لڑکے بڑے کپوت ہیں۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں سبھوں نے گول مال نہ کر دیا ہو۔"

چودھری پسینے میں ڈوبا ہوا آ کر بولا "مہتو چل کر بانس گن لو۔ کل ٹھیلا لا کر اٹھا لے جاؤں گا۔"

ہوری نے بانس گننے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی، "وہ چودھری ایسا آدمی نہیں ہے، پھر ایک آدھ بانس اور کاٹ ہی لے گا تو کیا؟ روز ہی تو منگنی میں بانس کٹتے رہتے ہیں۔ جیٹھوں میں تو ماڑو بنانے کے لئے لوگ، بیسیوں بانس کاٹ لے جاتے ہیں۔"

چودھری نے ساڑھے سات روپئے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے، ہوری نے گن کر کہا "اور نکالو، حساب سے ڈھائی اور ہوتے ہیں۔"

چودھری نے رکھائی سے کہا "پندرہ روپئے میں طے ہوئے ہیں کہ نہیں۔"

"پندرہ روپئے میں نہیں، بیس روپئے میں۔"

"ہیرا بھتو نے تمہارے سامنے پندرہ روپئے کہے تھے کہو تو بلا لاؤں۔"

"طے تو بیس ہی روپئے میں ہوئے تھے چودھری اب تمہاری جیت ہے جو چاہو کہو۔ ڈھائی روپئے ہوتے ہیں، تم دو ہی دے دو۔"

مگر چودھری کچی گولیاں نہ کھیلا تھا۔ اب اسے کس کا ڈر؟ ہوری کے منہ میں تو تالا پڑا ہوا تھا۔ کیا کہے، ماتھا ٹھونک کر رہ گیا۔ بس اتنا بولا "یہ اچھی بات نہیں ہے چودھری، دو روپئے دبا کر راجا نہ ہو جاؤ گے۔"

چودھری تند لہجے میں بولا "اور تم کیا بھائیوں کے تھوڑے سے پیسے دبا کر راجا ہو جاؤ گے؟ ڈھائی روپئے پر ایمان بگاڑ رہے تھے، اس پر مجھے اپدیش دینے چلے ہو۔ ابھی پردہ کھول دوں، تو سر نیچا ہو جائے۔"

ہوری پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ چودھری نے تو روپئے سامنے زمین پر رکھ چلتا بنا مگر وہ نیم کے نیچے بیٹھا بڑی دیر تک پچھتاتا رہا۔ وہ کتنا لالچی اور مطلبی ہے، اس کا اُسے آج پتہ چلا۔ چودھری نے ڈھائی روپئے دے دیئے ہوتے تو سے کتنی خوشی ہوتی۔ اپنی چالاکی کو سراہتا کہ بیٹھے بٹھائے ڈھائی روپئے مل

گئے۔ ٹھوکر کھا کر ہی تو ہم ہوشیاری کے ساتھ قدم اٹھانا سیکھتے ہیں۔

دھنیا اندر چلی گئی، باہر آئی تو روپئے زمین پر پڑے دیکھے۔ گن کر بولی "اور روپئے کیا ہوئے؟ دس نہ چاہیئے؟"

ہوری نے لمبا منہ بنا کر کہا "ہیرا نے پندرہ روپئے ہی دئے دیئے تو میں کیا کرتا؟"

"ہیرا پانچ روپئے میں دے دے، ہم نہیں دیتے ان داموں"

"وہاں مارپیٹ ہو رہی تھی، بیچ میں کیا بولتا؟"

ہوری نے اپنی ہار اپنے دل ہی میں رکھ لی، جیسے کوئی چوری سے آم توڑنے کے لئے پیڑ پر چڑھے اور گر پڑنے پر دھول جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہو کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ جیت کر آپ اپنی دغابازیوں کی ڈینگ مار سکتے ہیں، جیت میں سب کچھ معاف ہے، مگر ہار کی شرم تو پی جانے ہی کی چیز ہے۔

دھنیا شوہر کو طعنے دینے لگی۔ ایسے مبارک موقع اسے بہت کم ملتے تھے۔ ہوری اس سے چالاک تھا مگر آج بازی دھنیا کے ہاتھ تھی۔ ہاتھ مٹکا کر بولی۔ "کیوں نہ ہو، بھائی نے پندرہ روپئے کہہ دیئے تو تم کیسے ٹوکتے؟ ارے رام رام لاڈلے بھائی کا دل چھوٹا ہو جاتا کہ نہیں۔ پھر جب اتنا بڑا انرتھ ہو رہا تھا کہ لاڈلی بہو کے گلے پر چھری چل رہی تھی تو تم بھلا کیسے بولتے؟ اس وقت (وقت) کوئی تمہارا سب کچھ لوٹ لیتا تو بھی تمہیں سدھ نہ ہوتی۔"

ہوری چپ چاپ سنتا رہا۔ جھنجھلاہٹ ہوئی، غصہ آیا، خون کھولا، آنکھیں جلیں، دانت پیسے، مگر کچھ بولا نہیں چپکے سے کدال لی اور کھیت گوڑنے چلا۔

دھنیا نے کدال چھین کر کہا "کیا ابھی سبیرا ہے کیا جو اوکھ گوڑنے چلے؟ سورج دیوتا سر پہ آ گئے، نہانے دھونے جاؤ، روٹی تیار ہے" ہوری نے

بھنبھنا کر کہا، "مجھے بھوک نہیں ہے۔"

دھنیا نے جلے پر نمک چھڑکا، "وہاں کاہے کو بھوک لگے گی؟ بھائی نے بڑے بڑے لڈو دکھلا دیئے ہیں نا! بھگوان ایسے سپوت بھائی سب کو دیں۔"

ہوری بگڑا، "تو آج مار کھانے پر لگی ہوئی ہے۔"

دھنیا نے نقلی عاجزی دکھا کر کہا، "کیا کروں، تم دلا رہی اتنا کرتے ہو کہ میرا سر پھر گیا ہے۔"

"تو گھر میں رہنے دے گی کہ نہیں؟"

"گھر تمہارا، مالک تم، میں بھلا کون ہوتی ہوں تمہیں گھر سے نکالنے والی؟"

ہوری آج دھنیا سے کسی طرح پیش نہیں پا سکتا، اس کی عقل جیسے کُند ہو گئی ہے۔ ان طنز کے تیروں کو روکنے کے لئے اس کے پاس کوئی ڈھال نہیں ہے۔ آہستہ سے کدال رکھ دی اور انگوچھا لے کر نہانے چلا گیا۔ لوٹا کوئی آدھ گھنٹے میں، مگر گوبر ابھی تک نہ آیا تھا، اکیلے کیسے کھانا کھائے؟ لونڈا وہاں جا کر سو رہا۔ بھولا کی وہ چنچل چھوکری نہیں ہے جُھنیا، اسی کے ساتھ ہنسی دل لگی کر رہا ہوگا۔ کل بھی تو اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ نہیں گائے دی تو لوٹ کیوں نہ آیا؟ کیا وہاں دھرنا دے گا؟

دھنیا نے کہا، "اب کھڑے کیا ہو؟ گوبر سانجھ کو آوے گا۔"

ہوری نے اور کچھ نہ کہا کہ کہیں دھنیا پھر نہ کچھ کہہ بیٹھے۔ کھانا کھا کر نیم کے سایہ میں سو رہا۔

روپا روتی ہوئی آئی۔ ننگے بدن، ایک لنگوٹی لگائے، جھبرے بال ادھر ادھر بکھرے ہوئے، ہوری کے سینے پر لوٹ گئی۔ اس کی بڑی بہن سونا کہتی ہے۔

جائے آئے گی تو اس کا گوبر میں پاتھوں گی" روپا یہ نہیں برداشت کر سکتی۔ سونا ایسی کہاں کی بڑی رانی ہے کہ سارا گوبر آپ ہاتھ ڈالے؟ روپا اس سے کس بات میں کم ہے؟ سونا روٹی پکاتی ہے تو کیا روپا برتن نہیں مانجھتی؟ سونا پانی لاتی ہے، تو کیا روپا کنوئیں پر رسی نہیں لے جاتی؟ سونا تو کلسا بھر کر اٹھلاتی چلی آتی ہے، رسی سمیٹ کر روپا ہی لاتی ہے، گو یہ دونوں ساتھ پاتھتی ہیں۔ سونا کھیت گوڑنے جاتی ہے تو کیا روپا بکری چرانے نہیں جاتی؟ پھر سونا اکیلے گوبر کیوں پاتھے گی؟ یہ انیائے روپا کیسے سہے؟

ہوری نے اس کے بھولے پن پر ریجھ کر کہا "نہیں گائے کا گوبر تو پاتھنا سونا گائے کے پاس جائے تو بھگا دینا"

روپا نے باپ کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا "دودھ بھی میں ہی دوہوں گی"

"ہاں ہاں تو نہ دوہے گی تو کون دوہے گا؟"

"وہ میری گائے ہوگی"

"ہاں سولہوں آنے تیری"

روپا خوش ہو کر اپنی جیت کا مبارک ماجرا ہاری ہوئی سونا کو سنانے چلی گئی "یہ گائے میری ہوگی۔ اس کا دودھ میں دوہوں گی، اس کا گوبر میں پاتھوں گی، تجھے کچھ نہ ملے گا"

سونا سن میں نو عمر، جسم میں جوان اور عقل میں بچی تھی، گویا اس کا شباب اسے آگے کھینچتا تھا اور طفلی پیچھے لے جاتی تھی۔ کچھ باتوں میں اتنی ہوشیار کہ نوجوان گریجویٹ عورتوں کو پڑھائے۔ اور کچھ باتوں میں اتنی الھڑ کہ بچوں سے بھی پیچھے لمبا، روکھا، مگر خوش چہرہ، ٹھڈی نیچے کو کھنچی ہوئی، آنکھوں میں ایک قسم کی

آسودگی، نہ بالوں میں تیل، نہ آنکھوں میں کاجل، نہ بدن پر کوئی گہنا، جیسے گرستی کے بوجھ نے شباب کو دبا کر بونا بنا دیا ہو۔ سر کو ایک جھٹکا دے کر بولی "جا تو گوبر پاتھ، جب تو دودھ دھر کر رکھے گی تو میں پی جاؤں گی۔"

"میں دودھ کی ہانڈی تالے میں بند کر کے رکھوں گی۔"

"میں تالا توڑ کر دودھ نکال لوں گی۔"

یہ کہتی ہوئی وہ باغ کی طرف چل دی۔ آم گدرا گئے تھے۔ ہوا کے جھونکوں سے ایک آدھ زمین پر گر پڑے تھے۔ لو کے مارے ہوئے پچکے اور پیلے۔ لیکن بچے ٹپکا سمجھ کر باغ میں منڈلایا کرتے تھے۔ روپا بھی بہن کے پیچھے ہولی۔ جو کام سونا کرے وہ روپا ضرور کرے گی۔ سونا کے بیاہ کی بات چیت ہو رہی تھی۔ روپا کے بیاہ کا کوئی چرچا نہیں کرتا، اس لئے وہ خود اپنے بیاہ کے لئے ضد کرتی ہے اس کا دولہا کیسا ہوگا اور وہ کیا کیا لائے گا، اسے کیسے رکھے گا، اسے کیا کھلائے گا کیا پہنائے گا، اس کا وہ بڑا مفصل بیان کرتی جسے سن کر شاید کوئی لڑکا اس سے بیاہ کرنے پر راضی نہ ہوتا۔

شام ہو رہی تھی۔ ہوری ایسا الساپا کہ گوڑنے نہ جا سکا۔ بیلوں کو ناند میں لگایا بھوسہ کھلی دی، اور ایک چلم بھر کر پینے لگا۔ اس فصل میں سب کچھ کھلیان میں تول دینے پر بھی ابھی اس پر کوئی تین سو کا قرض تھا جس پر کوئی سو روپئے سود کے بڑھے جاتے تھے۔ منگرو شاہ سے آج پانچ برس ہوئے کہ بیل کے لئے ساٹھ روپئے لئے تھے۔ پورے ساٹھ دے چکا تھا مگر ساٹھ کے ساٹھ بنے ہوئے تھے دانا دین پنڈت سے تیس روپئے کر آلو بوئے تھے، آلو تو چور کھود لے گئے اور اس تیس کے ان تینوں برسوں میں سو ہو گئے تھے۔ دولاری بیوہ سہانی جو گاؤں میں نمک، تیل، تمباکو کی دوکان رکھے ہوئے تھی، بٹوارے کے وقت اُس سے

چالیس روپئے لے کر بھائیوں کو دینے پڑے تھے۔ اس کے بھی تقریباً سو روپے ہو گئے تھے کیونکہ ایک آنہ فی روپیہ سود تھا۔ لگان ہی کے ابھی پچیس روپے باقی پڑے ہوئے تھے۔ اور دسہرہ کے دن شگون کے روپیوں کا بھی کوئی بندوبست کرنا تھا۔ بانسوں کے روپئے بڑے موقع سے مل گئے شگون کا مسئلہ حل ہو جائے گا، لیکن کون جانے ؟ یہاں تو ایک دھیلا بھی ہاتھ میں آ جائے تو گاؤں میں شور مچ جاتا ہے اور لینے والے چاروں طرف سے نوچنے لگتے ہیں۔ یہ پانچ روپئے تو وہ شگون میں دے گا، چاہے کچھ ہو جائے۔ مگر ابھی زندگی کے بڑے بڑے کام تو سر پر سوار ہیں، گوبر اور سونا کا بیاہ، بہت ہاتھ روکنے پر بھی تین سو سے کم نہ اٹھیں گے۔ یہ تین سو کس کے گھر سے آئیں گے ؟ جتنا چاہتا ہے کہ کسی سے ایک پیسہ ادھار نہ لے اور جس کا آتا ہے اس کی پائی پائی چکا دے مگر ہر طرح کی تکلیف اٹھانے پر بھی گلا نہیں چھوٹتا۔ اسی طرح سود بڑھتا جائے گا اور ایک دن اس کا سب گھر بار نیلام ہو جائے گا تو اس کے بال بچے بے سہارا ہو کر بھیک مانگتے پھریں گے۔ ہوری جب کام دھندے سے چھٹی پا کر چلم پینے لگتا تھا تو یہ فکر ایک بیاہ دیوار کی طرح اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی تھی جس میں سے نکل جانے کی اسے کوئی راہ نہ سوجھتی تھی۔ اگر دھیرج تھا تو یہی کہ یہ بپتا تنہا اس کے سر نہ تھی۔ بلکہ عموماً سبھی کسانوں کا یہی حال تھا۔ بہتوں کی حالت تو اس سے بھی بدتر تھی۔ سوبھا اور ہیرا کو جدا ہوئے ابھی کل تین سال ہوئے تھے مگر دونوں پر چار چار سو کا بار ہو گیا تھا جھینگر دو بل کی کھیتی کرتا ہے، اس پر ایک ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ جیادن جھنگٹ کے گھر بھکاری بھیک بھی نہیں پاتا مگر قرضے کا کوئی ٹھکانا نہیں یہاں بچا کون ہے ؟

یکایک سونا اور روپا دونوں دوڑی ہوئی آئیں اور ایک ساتھ بولیں "بھیا گائے لا رہے ہیں آگے آگے گائے ہے پیچھے پیچھے بھیا ہیں"

پہلے روپا نے گوبر کو آتے ہوئے دیکھا تھا، یہ خبر سنانے کی سرخروئی اسے ملنی چاہیئے تھی۔ سونا برابر کی ساجھے دار ہوئی جاتی ہے، یہ اس سے کیسے سہا جاتا؟

اس نے آگے بڑھ کر کہا "پہلے میں نے دیکھا تھا تبھی دوڑی۔ بہن نے تو پیچھے سے دیکھا"

سونا اس دعوٰی کو تسلیم نہ کر سکی بولی "تو نے بھیا کو کہاں پہچانا؟ تو تو کہتی تھی کہ کوئی گائے بھاگی آ رہی ہے۔ میں نے ہی کہا تھا کہ بھیا ہیں"

دونوں پھر باغ کی طرف دوڑیں، گائے کا خیر مقدم کرنے کے لئے۔

دھنیا اور ہوری دونوں گائے باندھنے کی تدبیر کرنے لگے۔ ہوری بولا "چلو جلدی سے ناند گاڑ دیں"

دھنیا کے چہرے پر شباب چمک اٹھا تھا، بولی "نہیں، پہلے تھالی میں تھوڑا آٹا اور گڑ گھول کر رکھ دیں۔ بیچاری دھوپ میں چلی ہو گی، پیاسی ہو گی۔ تم جا کر ناند گاڑو، میں گھولتی ہوں"

"کہیں ایک گھنٹی پڑی تھی، اسے ڈھونڈ لے۔ گائے کے گلے میں باندھیں گے"

"سونا کہاں گئی؟ سٹھانی کی دکان سے تھوڑا کالا ڈورا منگوا لو، گائے کو ڈیٹھ بہت لگتی ہے"

آج میرے من کی بڑی بھاری سادھ پوری ہو گئی"

دھنیا اپنی دلی مسرت کو دل ہی میں رکھنا چاہتی تھی۔ اتنی بڑی نعمت اپنے

ساتھ کوئی زحمت نہ لائے، اس اندیشہ سے اس کا دل کانپ رہا تھا۔ آسمان کی طرف تاک کر بولی یہ گائے کے آنے کا آنند تو جب ہے کہ اس کا پورا قدم بھی اچھا ہو۔ بھگوان کے من کی بات ہے۔"

گویا وہ بھگوان کو بھی دھوکا دینا چاہتی تھی۔ بھگوان کو بھی دکھانا چاہتی تھی کہ اس گائے کے آنے سے اُسے اتنی خوشی نہیں ہوئی کہ حسدی بھگوان سکھ کا پلڑا اونچا کرنے کے لئے کوئی نئی بپتا بھیج دیں۔

وہ ابھی آٹا گھول رہی تھی کہ گوبر گائے کو لئے، بچوں کے ایک جلوس کے ساتھ دروازے پر آپہونچا۔ ہوری دوڑ کر گائے کے گلے میں لپٹ گیا۔ دھنیا نے آٹا چھوڑ دیا اور جلدی سے ایک پرانی ساڑھی کا کالا کنارا پھاڑ کر گائے کے گلے میں باندھ دیا۔

ہوری بھگتی بھری نگاہوں سے گائے کو دیکھ رہا تھا جیسے ساچھات (مجسم) دیوی جی نے گھر میں قدم رکھا ہو۔ آج بھگوان نے یہ دن دکھایا کہ اس کا گھر گئو ماتا کے چرنوں سے پوتر ہوگیا۔ ایسے اچھے بھاگ! نہ جانے کس کے پن کا پھل ہیں!

دھنیا نے گھبرا کر کہا "کھڑے کیا ہو آنگن میں ناند گاڑ دو۔"

"آنگن میں جگہ کہاں ہے؟"

"بہت جگہ ہے۔"

"میں تو باہر ہی گاڑتا ہوں۔"

"پاگل نہ بنو۔ گاؤں کا حال جان کر بھی انجان بنتے ہو۔"

"جو بات نہیں جانتے اس میں ٹانگ نہ اڑایا کرو۔ دنیا بھر کی بدیا تم ہی نہیں پڑھے ہو۔"

ہوری سچ مچ آپے میں نہ تھا۔ گائے اس کے لئے صرف بھگتی کی چیز نہ تھی بلکہ

زندہ دولت تھی۔ وہ اس سے اپنے دروازے کی رونق اور گھر کی عظمت بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ گائے کو دروازے پر بندھی دیکھ کر پوچھیں کہ یہ کس کا گھر ہے؟ لوگ کہیں، ہوری مہتو کا۔ تبھی لڑکی والوں پر بھی اس کا اثر پڑے گا؟ دھنیا اس کے خلاف خوف کھا رہی تھی۔ وہ گائے کو سات پردوں کے اندر چھپا کر رکھنا چاہتی تھی۔ اگر گائے آٹھوں پہر کوٹھڑی میں رہ سکتی تو وہ شاید اسے باہر نہ نکلنے دیتی یوں تو ہر بات میں ہوری کی جیت ہوتی تھی۔ وہ اپنی بات پر اڑ جاتا تھا اور دھنیا کو دب جانا پڑتا تھا مگر آج دھنیا کے سامنے ہوری کی ایک نہ چلی۔ دھنیا لڑنے پر تل گئی۔ گوبر، سونا اور روپا غرضکہ سارا گھر ہوری کی طرف تھا مگر دھنیا نے تنہا سب کو شکست دی۔ آج اس میں ایک عجیب خود اعتمادی اور ہوری میں ایک عجیب انکسار کا ظہور ہو گیا تھا۔

مگر تماشا کیسے رک سکتا تھا؟ گائے ڈولی میں بیٹھ کر تو آئی نہ تھی، یہ کیسے ممکن تھا کہ گاؤں میں اتنی بڑی بات ہو جائے اور میلا نہ لگے۔ جس نے سنا سب کام کاج چھوڑ کر دیکھنے دوڑا۔ وہ معمولی دیسی گائے نہیں ہے، بھولا کے گھر سے اسّی روپئے میں آئی ہے۔ ہوری اسّی روپئے تو کیا دیں گے؟ پچاس ساٹھ روپئے میں لائے ہوں گے۔ گاؤں کی تاریخ میں پچاس ساٹھ روپیوں کی گائے کا آنا بھی انہونی بات تھی۔ بیل تو پچاس کے بھی آئے، سو کے بھی آئے مگر گائے کے لئے اتنی بڑی رقم کسان کیا کھا کر خرچ کرے گا؟ یہ تو گوالوں ہی کا کلیجہ ہے کہ انچبیوں روپئے گن آتے ہیں۔ گائے کیا ہے مجسم دیوی کا روپ ہے۔ تماشائیوں اور نقادوں کا تانتا لگا ہوا تھا اور ہوری دوڑ دوڑ کر سب کی آؤ بھگت کر رہا تھا۔ اتنا منکسر مزاج اور خوش وہ کبھی نہ تھا۔

ستر سال کے بوڑھے پنڈت داتا دین لاٹھی ٹیکتے ہوئے آئے اور پوپلے

مزے سے بولے، کہاں ہو ہوری؟ تنک ہم بھی تمہاری گائے دیکھ لیں، سُنا بڑی سُندر ہے ۔"

ہوری نے دوڑ کر پالاگن کیا اور دل میں متکبرانہ مسرت کے مزے لیتا ہوا بڑی خاطر سے پنڈت جی کو صحن میں لے گیا۔ پنڈت نے گائے کو اپنی پرانی اور تجربہ کار نگاہوں سے دیکھا، سینگیں دیکھیں، تھن دیکھا، پٹھے دیکھے اور گھنی اُجلی بھوؤں کے نیچے چھپی ہوئی آنکھوں میں جوانی کی اُمنگ لے کر بولے "کوئی دودکھ نہیں ہے بیٹا، بال بھونری سب ٹھیک! بھگوان چاہیں گے تو تمہارے بھاگ کھل جائیں گے۔ ایسے اچھے لچھن ہیں کہ واہ! بس راتب نہ کم ہونے پاوے۔ ایک بچھڑا سو سو کا ہوگا۔"

ہوری نے خوشی کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے "سب آپ کا آسیر باد ہے دادا"

داتا دین نے سُرتی کے پیک تھوکتے ہوئے کہا "میرا آشیرباد نہیں ہے بیٹا، بھگوان کی یاد ہے۔ یہ سب بھگوان کی یاد ہے۔ روپئے نگد دیئے؟"

ہوری نے بے پر کی اڑائی۔ اپنے مہاجن کے روبرو بھی اپنی امیری دکھانے کا ایسا اچھا موقع وہ کیوں ہاتھ سے جانے دے؟ ٹکے کی نئی ٹوپی سر پر رکھ کر جب ہم اکڑنے لگتے ہیں۔ ذرا دیر کے لئے کسی سواری پر بیٹھ کر جب ہم آسمان پر اُڑنے لگتے ہیں تو اتنی بڑی نعمت پاکر اس کا دماغ کیوں نہ آسمان پر چڑھ جائے؟ بولا "بھلا ایسا بھلا مانس نہیں ہے مہراج، نگد گنائے، پورے چوکس۔"

اپنے مہاجن کے سامنے یہ ڈینگ مار کر ہوری نے نادانی تو کی تھی مگر داتا دین کے چہرے پر بے صبری کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ اس کہنے میں کتنی سچائی ہے یہ ان کی اندر بیٹھی ہوئی آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ان میں اداسی کی جگہ تجربہ چھپا ہوا بیٹھا

تھا۔ خوش ہو کر بولے ۔ کوئی ہرج نہیں بیٹا، کوئی ہرج نہیں۔ بھگوان سب اچھا کریں گے پانچ سیر دودھ ہے اس میں بچے کے لئے چھوڑ کر؟

دھنیا نے فوراً ٹوکا۔ ارے نہیں مہراج، اتنا دودھ کہاں؟ بڑھیا ہو گئی ہے، پھر یہاں راتب کہاں دھرا ہے؟

داتا دین نے بھید بھری نگاہوں سے دیکھ کر اس کی چوکسی کی داد دی، جیسے کہہ رہے ہوں گے "گرستن کا یہی دھرم ہے، دن کی لینا مردوں کا کام ہے، انہیں کرنے دو۔" پھر ویسے ہی لہجے میں بولے۔ "باہر نہ باندھنا اتنا کہے دیتے ہیں۔"

دھنیا نے شوہر کی طرف فتح مندانہ نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہی ہو "لو اب تو مانو گے۔"

پھر داتا دین سے بولی "نہیں مہراج، باہر کیا باندھیں گے؟ بھگوان دیں تو اسی آنگن میں تین گائیں اور بندھ سکتی ہیں۔"

سارا گاؤں گائے دیکھنے آیا، نہیں آئے تو سوبھا اور ہیرا جو سگے بھائی تھے۔ ہوری کے دل میں بھائیوں کے لئے اب بھی جگہ تھی۔ وہ دونوں اگر دیکھ لیتے اور خوش ہو جاتے تو اس کی دلی خواہش پوری ہو جاتی۔ شام ہو گئی؟ لوٹ آئے، اسی دروازے سے نکلے مگر پوچھا کچھ نہیں۔

ہوری نے ڈرتے ڈرتے دھنیا سے کہا۔ نہ سوبھا آیا، نہ ہیرا، سُنا نہ ہوگا؟

دھنیا بولی "تو یہاں کون انہیں بلانے جاتا ہے؟"

"تو بات تو سمجھتی نہیں، لڑنے کو تیار رہتی ہے۔ بھگوان نے جب یہ دن دکھایا ہے تو ہمیں سر جھکا کر چلنا چاہیئے۔ آدمی کو اپنے سگوں کے منہ سے اپنی بھلائی برائی سُننے کی جتنی اچھا ہوتی ہے اتنی باہر والوں کے منہ سے نہیں۔ پھر اپنے بھائی لاکھ بُرے ہوں تو اپنے بھائی ہی ہیں۔ اپنے حصے بخرے کے لئے سبھی لڑتے ہیں مگر اس سے

کھو ن کتھوڑے ہی بدل جاتا ہے۔ دونوں کو بلا کر دکھا دینا چاہئے نہیں تو کہیں گے کہ گائے لائے اور یہیں بتا تا تک نہیں۔"

دھنیا نے ناک سکیڑ کر کہا "میں نے تم سے سو بار، لاکھ بار کہہ دیا کہ میرے منہ پر اپنے بھائیوں کا بکھان نہ کیا کرو، اُن کا نام سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ سارے گاؤں نے سنا، کیا انہوں نے نہ سنا ہوگا؟ کچھ اتنی دور بھی تو نہیں رہتے۔ سارا گاؤں دیکھنے آیا، اُن ہی کے پاؤں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ مگر آویں کیسے؟ جلن ہو رہی ہوگی کہ اس کے گھر گائے آگئی۔ چھاتی پھٹی جاتی ہوگی۔"

چراغ جلانے کا وقت آگیا تھا۔ دھنیا نے جا کر دیکھا تو بوتل میں مٹی کا تیل نہ تھا۔ بوتل لے کر تیل لانے چلی گئی۔ پیسے ہوتے تو روپا کو بھیجتی۔ اُدھار لانا ہے، کچھ لٹو پتو کرے گی جبھی تیل اُدھار ملے گا۔

ہوری نے رُوپا کو بلا کر پیار سے گود میں بٹھایا اور کہا "ذرا جا کر دیکھ، ہیرا کا کا آگئے ہیں کہ نہیں۔ سوبھا کا کا کو بھی دیکھتی آنا۔ کہنا کہ دادا نے تمہیں بلایا ہے۔ نہ آویں تو ہاتھ پکڑ کر کھینچ لانا۔"

"رُوپا ٹھنک کر بولی "چھوٹی کاکی مجھے ڈانٹتی ہے۔"

"کاکی کے پاس کیا کرنے جائے گی؟ پھر سوبھا کی گھر والی تو تجھے پیار کرتی ہے۔"

"سوبھا کا کا مجھے چڑھاتے ہیں، کہتے ہیں میں نہ کہوں گی۔"

"کیا کہتے ہیں بتا؟"

"چڑھاتے ہیں۔"

"کیا کہہ کر چڑھاتے ہیں؟"

"کہتے ہیں کہ تیرے لئے موس پکڑ رکھا ہے، لے جا، بھون کر کھا لے"

ہوری کے دل میں گدگدی پیدا ہوئی۔

"تو کہتی نہیں کہ پہلے تم کھا لو، تب میں کھاؤں گی؟"

"اماں منع کرتی ہیں، کہتی ہیں کہ ان لوگوں کے گھر نہ جایا کرو"

"تو اماں کی بیٹی ہے کہ دادا کی؟"

"روپا نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا "اماں کی!" اور ہنسنے لگی۔

"تو پھر میری گودی سے اتر جا۔ آج میں تجھے اپنی تھالی میں نہ کھلاؤں گا"

گھر میں ایک ہی پھول کی تھالی تھی۔ ہوری اسی میں کھاتا تھا۔ تھالی میں کھانے کی عزت پانے کے لئے روپا ہوری کے ساتھ کھاتی تھی۔ اس عزت کو وہ کیسے چھوڑے؟ ہمک کر بولی "اچھا تمہاری!"

"تو پھر میرا کہنا مانے گی کہ اماں کا؟"

"تمہارا"

"تو جا کر ہیرا اور سوبھا کو پکڑ لا"

"اور جو اماں بگڑیں گی"

"اور جو اماں سے کہنے کون جائے گا؟"

روپا کودتی ہوئی ہیرا کے گھر چلی۔ عداوت کا جال بڑی بڑی مچھلیوں کو پھنساتا ہے۔ چھوٹی مچھلیاں یا تو اس میں پھنستی ہی نہیں یا فوراً نکل بھاگتی ہیں ان کے لئے وہ مار نے والا جال کھیل کی چیز ہے، ڈر کی نہیں۔ بھائیوں سے ہوری کی بول چال بند تھی مگر روپا دونوں گھروں میں آتی جاتی تھی۔ بچوں سے کیا بیر؟

مگر روپا گھر سے نکلی ہی تھی کہ دھنیا تیل لئے ہوئے مل گئی۔ پوچھا، سانجھ

کی بیرا کہاں جاتی ہے؟ چل گھر!" روپا ماں کو خوش کرنے کی لالچ کو نہ روک سکی۔

دھنیا نے ڈانٹا "چل گھر! کسی کو بلانے نہیں جانا!"

روپا کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہ گھر لائی اور ہوری سے بولی "میں نے تم سے لاکھ بار کہہ دیا کہ میری لڑکی کو کسی کے گھر نہ بھیجا کرو۔ کسی نے کچھ کر کرا دیا تو میں تمہیں لے کر جاؤں گی؟ ایسا ہی بڑا پریم ہے تو آپ کیوں نہیں جاتے؟ جان پڑتا ہے کہ ابھی پیٹ نہیں بھرا۔"

ہوری ناند جما رہا تھا، ہاتھوں میں مٹی لپیٹے ہوئے سُنی ان سُنی کر گئے بولا "کس بات پر بگڑتی ہے بھائی؟ یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ اندھے کتے کی طرح ہوا پہ بھونکا کرے۔"

دھنیا کو کُپّی میں تیل بھرنا تھا۔ اس وقت جھگڑا نہ بڑھانا چاہتی تھی۔ روپا بھی لڑکوں میں جا ملی۔

پہر رات سے زیادہ جا چکی تھی۔ ناند گڑ چکی تھی۔ بھوسہ کھلی ڈال دی گئی۔ گائے من مارے اداس بیٹھی تھی، جیسے کوئی بہو سسرال آئی ہو۔ ناند میں منہ تک نہ ڈالتی تھی۔ ہوری اور گوبر کھانا کھا کر آدھی آدھی روٹی اس کے لئے لائے مگر اس نے سونگھا تک نہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی، جانوروں کو بھی اکثر تھان چھوٹ جانے کا دُکھ ہوتا ہے۔

ہوری باہر کھاٹ پر بیٹھ کر چلم پینے لگا تو پھر بھائیوں کی یاد آئی۔ نہیں آج سب سے پر بھائیوں سے بے پرواہی نہیں برت سکتا۔ اس کا دل یہ گئو پاکر بڑا ہو گیا تھا۔ بھائیوں سے جدا ہو گیا ہے تو کیا ہوا؟ اُن کا بیری تو نہیں ہے۔ یہی گائے تین سال پہلے آئی ہوتی تو سبھی کا اس پر برابر کا حق ہوتا اور کل کو یہی گائے دودھ دینے لگے گی تو کیا وہ بھائیوں کے گھر دودھ نہ بھیجے گا۔ یا دہی نہ بھیجے گا؟ ایسا تو اُس کا

دھرم نہیں ہے۔ بھائی اس کا بُرا چیتیں، پر وہ کیوں ان کا بُرا چیتے؟ اپنی اپنی کرنی تو اپنے اپنے ساتھ ہے۔

اس نے ناریل کھاٹ کے پائے سے لگا کر رکھ دیا اور ہیرا کے گھر کی طرف چلا۔ سوبھا کا گھر بھی اُدھر ہی تھا۔ دونوں اپنے اپنے دروازے پر پڑے ہوئے تھے۔ کافی اندھیرا تھا۔ ہوری پر ان میں سے کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ دونوں میں کچھ باتیں ہو رہی تھیں۔ ہوری رک گیا اور باتیں سننے لگا۔ ایسا آدمی کہاں ہے جو اپنا چرچا سن کر ہٹ جائے؟

ہیرا نے کہا "جب ہم سا ایک میں تھے، ایک بکری بھی نہ لی۔ اب پچھائیں گائے لی جاتی ہے۔ بھائی کا حق مار کر کسی کو پھلتے پھولتے نہیں دیکھا"

سوبھا بولا "یہ تم انیائے کر رہے ہو، ہیرا! بھیا نے ایک ایک پیسے کا حساب دے دیا۔ یہ میں کبھی نہ مانوں گا کہ انہوں نے پہلے کی کمائی چھپا رکھی تھی"

"تم مانو چاہے نہ مانو، پر ہے یہ پہلے ہی کی کمائی"

"کسی پر جھوٹی تہمت نہ لگانا چاہیئے"

"اچھا تو یہ روپے کہاں سے آ گئے؟ کہاں سے ہُن برس پڑا؟ اتنے ہی کھیت تو ہمارے پاس بھی ہیں، اتنی ہی اپج ہماری بھی ہے، پھر کیوں ہمارے پاس کفن کو کوڑی نہیں ہے اور اُن کے گھر نئی گائے آتی ہے؟

"اُدھار لائے ہوں گے"

"بھولا ادھار دینے والا آدمی نہیں"

"کچھ بھی ہو، گائے ہے بڑی سُندر، گوبر لئے آتا تھا تو میں نے رستے میں دیکھا"

"بے ایمانی کا دھن جیسے آتا ہے ویسے ہی چلا جاتا ہے۔ بھگوان چاہیں گے

تو گائے گھر میں بہت دن نہ رہے گی۔"

ہوری سے اور نہ سنا گیا۔ وہ گئی گزری باتوں کو بھلا کر اپنے دل میں پریم اور اپناپا بھرے ہوئے بھائیوں کے پاس آیا تھا۔ اس صدمے نے جیسے اس کے دل میں سوراخ کر دیا اور وہ برادرانہ جذبہ اس میں کسی طرح نہ ٹھہر سکا۔ جی میں آیا کہ اسی وقت حملے کا جواب دے۔ مگر بات بڑھ جانے کے ڈر سے چپ رہ گیا۔ اگر اس کی نیت صاف ہے تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ بھگوان کے آگے وہ نردکھ ہے، دوسروں کی اسے پرواہ نہیں ہے۔ اُلٹے پاؤں لوٹ آیا اور وہی جلی ہوئی چلم پینے لگا۔ مگر جیسے وہ زہر ہر لحظ اس کی رگوں میں پھیلتا جاتا تھا۔ اس نے سو جانے کی کوشش کی مگر نیند نہ آئی۔ بیلوں کے پاس جا کر انہیں سہلانے لگا تو زہر مدھم پڑا۔ پھر چلم بھری مگر اس میں بھی کچھ مزا نہ تھا۔ زہر نے جیسے احساس کو دبا دیا ہو جیسے نشے میں احساس یک طرفہ ہو جاتا ہے، جیسے پھیلا ہوا پانی ایک سمت میں ہو کر تیزی سے بہنے لگتا ہے وہی حالت اس کی ہو رہی تھی اسی مجنونانہ حالت میں وہ اندر گیا۔ ابھی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صحن میں ایک طرف چٹائی پر پڑی ہوئی دھنیا سونا سے بدن دبوا رہی تھی اور روپا جو روز شام ہوتے ہی سو جاتی تھی، آج کھڑی ہوئی گائے کا منہ کھجلا رہی تھی۔ ہوری نے جا کر گائے کو کھونٹے سے کھول لیا اور دروازے کی طرف لے چلا۔ وہ اسی دم گائے کو بھولا کے گھر پہونچانے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ اتنا بڑا کلنک سر پر لے کر وہ اب گائے کو گھر میں نہیں رکھ سکتا، کسی طرح نہیں!

دھنیا نے پوچھا "ادھر کہاں لے جاتے ہو رات کو؟"

ہوری نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا "لئے جاتا ہوں بھولا کے گھر لوٹا دوں گا۔"

دھنیا کو تعجب ہوا، اُٹھ کر سامنے آ گئی اور بولی "لوٹا کیوں دو گے؟ لوٹانے ہی کے لئے لائے تھے؟"

"ہاں اس کے لوٹا ہی دینے میں کشل ہے۔"

"کیوں بات کیا ہے؟ اتنے ارمان سے لائے اور اب لوٹانے جا رہے ہو، کیا بھولا روپیہ مانگتے ہیں؟"

"نہیں، بھولا یہاں کب آئے۔"

"تو پھر کیا بات ہوئی؟"

"کیا کرے گی پوچھ کر؟"

دھنیا نے اُچک کر گائے کی رسّی ہاتھ سے چھین لی۔ اس کی تیز عقل نے گویا اڑتی ہوئی چڑیا پکڑ لی۔ بولی "تمہیں بھائیوں کا ڈر ہو تو جا کر ان کے پیروں پڑو، میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ اگر ہماری بڑھتی دیکھ کر کسی کی چھاتی پھٹتی ہے تو پھٹ جائے، مجھے پرواہ نہیں ہے۔"

ہوری نے منکسرانہ لہجہ میں کہا، "دھیرے دھیرے بولو جہلانی، کوئی سُنے تو کہے کہ یہ سب آدھی رات گئے لڑ رہے ہیں۔ میں اپنے کانوں سے کیا کیا سُن آیا ہوں۔ تو کیا جانے؟ یہاں چرچا ہو رہا ہے کہ میں نے الگ ہوتے سمے روپئے دبا لئے تھے اور بھائیوں سے کپٹ کیا تھا، وہی روپئے اب نکل رہے ہیں۔"

"ہیرا کہتا ہوگا؟"

"سارا گاؤں کہہ رہا ہے، اکیلے ہیرا کو کیوں بدنام کروں؟"

"سارا گاؤں نہیں کہہ رہا ہے۔ میں ابھی جا کر پوچھتی ہوں تاکہ تمہارے باپ کتنے روپئے چھوڑ کر مرے تھے؟ ڈاری جانوروں کے پیچھے تم بگڑ گئے، ساری جندگی مٹی میں ملا دی۔ پال پوس کر سنڈا کیا اور اب ہم بے ایمان ہیں! میں کہے دیتی ہوں اگر گائے گھر کے باہر نکلی تو انرتھ ہو جائے گا۔ رکھ لئے ہم نے روپئے، دبا لئے اور بیچ کھیت دبا لئے؟ ڈنکے کی چوٹ کہتی ہوں کہ میں نے ہنڈا بھر بھر یں چھپا لیں

ہیرا اور سوبھا اور سنسار کو جو کرنا ہو کر لے۔ کیوں نہ رنڈوے رکھ لیں؟ دو دو سنڈوں کا بیاہ نہیں کیا، گونا نہیں کیا؟

ہوری سٹپٹا گیا۔ دھنیا نے اُس کے ہاتھ سے پگہیا چھین لی اور گائے کو کھونٹے سے باندھ کر دروازے کی طرف چلی ہوری نے اُسے پکڑنا چاہا مگر وہ باہر جا چکی تھی، وہیں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ باہر اُسے پکڑنے کی کوشش کر کے وہ کوئی ناٹک نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ دھنیا کے غصے سے وہ خوب واقف تھا۔ بگڑتی ہے تو چنڈی ہی بن جاتی ہے۔ مارو، کاٹو سُنے گی نہیں۔ لیکن ہیرا بھی تو ایک ہی بگڑیل ہے، کہیں ہاتھ چلا بیٹھے تو پرلے (قیامت) ہی ہو جائے۔ نہیں نہیں ہیرا اتنا مورکھ نہیں ہے۔ میں نے کہاں سے کہاں یہ آگ لگا دی۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ بات دل میں ڈال لیتا تو کیوں یہ جھگڑا ہوتا؟ دفعتاً دھنیا کی کرخت آواز کان میں پڑی، ہیرا کی گرج بھی سُن پڑی، ہیرا ہی کا تیز لہجہ بھی دل میں چبھا۔ یکایک اُسے گوبر کی یاد آئی۔ باہر لپک کر اس کی کھاٹ دیکھی تو وہ وہاں نہ تھا۔ غضب ہو گیا۔ گوبر بھی وہیں پہنچ گیا۔ اب کُشل نہیں۔ اس کا نیا خون ہے نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ لیکن ہوری وہاں کیسے جائے؟ ہیرا کہے گا کہ آپ تو بولتے نہیں اور اس ڈائن کو لڑنے کے لیے بھیج دیا۔ شور و ہنگامہ بڑھتا جاتا تھا۔ سارا گاؤں جاگ پڑا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کہیں آگ لگ گئی ہے اور لوگ چارپائیوں سے اُٹھ اُٹھ کر بجھانے کے لئے دوڑے جا رہے ہیں۔ اتنی دیر تک تو وہ ضبط کئے بیٹھا رہا، پھر نہ رہا گیا۔ دھنیا پر غصہ آیا۔ وہ کیوں چڑھ کر لڑنے گئی؟ اپنے گھر میں آدمی نہ جانے کس کو کیا کہتا ہے۔ جب تک کوئی منہ پر بات نہ کہے یہی سمجھنا چاہیئے کہ اس نے کچھ نہیں کہا۔ ہوری کی کسانی فطرت جھگڑے سے بھاگتی تھی۔ چار باتیں سن کر غم کھا جانا اس سے کہیں اچھا کہ آپس میں جھگڑا ہو، کہیں

مار پیٹ ہو جائے تو تھانہ پولیس ہو، بندھے بندھے پھرو، سب کی چودھری بنتی کرو، عدالت کی دھول پھانکو، کھیتی باڑی جہنم میں جائے! اس کا ہیرا پر تو کوئی بس نہ تھا۔ مگر دھنیا کو تو بل سے کھینچ لا سکتا ہے۔ بہت ہو گا گالیاں دے لے گی، ایک دو دن روٹھی رہے گی، تھانہ پولیس کی تو نوبت نہ آوے گی۔ وہ جا کر ہیرا کے دروازے پر سب سے دور دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ ایک فوجی افسر کی طرح میدان میں آنے کے پہلے حالات کو بخوبی سمجھ لینا چاہتا تھا۔ اگر اپنی جیت ہو رہی ہے تو کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ ہار ہو رہی ہے تو فوراً کود پڑے گا۔ دیکھا تو وہاں پچاسوں آدمی جمع ہو گئے تھے۔ پنڈت داتا دین لالہ پٹیشری، دونوں ٹھاکر جو گاؤں کے کرتا دھرتا تھے، سبھی پہنچ گئے ہیں۔ دھنیا کا پلہ ہلکا ہو رہا تھا۔ اس کی تندی رائے عامہ کو اس کے خلاف کئے دیتی تھی۔ وہ لڑائی کے فن میں طاق نہ تھی، غصے میں ایسی جلی کٹی سنا رہی تھی کہ لوگوں کی ہمدردی اس سے دور ہوتی جاتی تھی۔

وہ گرج رہی تھی، ”تو ہمیں دیکھ کر کیوں جلتا ہے؟ ہمیں دیکھ کر کیوں تیری چھاتی پھٹتی ہے؟ پال پوس کر جوان کر دیا، یہ اس کا انعام ہے؟ ہم نے پالا ہوتا تو آج کہیں بھیک مانگتے ہوتے، روکھ کی چھانہہ بھی نہ ملتی۔“

ہوری کو یہ لفظ ضرورت سے زیادہ کڑے معلوم ہوئے۔ بھائیوں کو پالنا تو اس کا دھرم تھا، ان کے حصے کی جائداد بھی تو اس کے ہاتھ میں تھی، کیسے نہ پالتا پوستا؟ دنیا میں کہیں منہ دکھانے والا رہتا؟

ہیرا نے جواب دیا، ”ہم کسی کو کچھ نہیں جانتے، تیرے گھر میں کتوں کی طرح ٹکڑا کھاتے تھے اور دن بھر کام کرتے تھے۔ یہ جانا ہی نہیں کہ لڑکپن اور جوانی کیسی ہوتی ہے۔ دن دن بھر سوکھا گوبر اکٹھا کرتے تھے اس پر بھی تو بنا دس گالی دیئے روٹی نہ دیتی تھی۔ تجھ جیسی لپساہن کے پالے پڑ کر زندگی کڑوی ہو گئی۔“

دھنیا اور تیز پڑی ،، جبان سنبھال، نہیں تو منہ سے باہر کھینچ لوں گی، پساچن تیری عورت ہوگی، تو ہے کس پھیر میں مونڈی کاٹے، ٹکڑا کھور، نمک حرام!''

داتادین نے ڈانٹا ،، اتنا کڑا بچن کیوں کہتی ہے دھنیا؟ استری دھرم ہے کہ گم کھائے۔ وہ تو اجڈ ہے، کیوں اس کے منہ لگتی ہے؟''

لالہ پٹیشری پٹواری نے تاکید کی ،، بات کا جواب بات ہے، گالی نہیں۔ تو نے لڑکپن میں اُسے پالا پوسا، پر یہ کیوں بھول جاتی ہے کہ اس کی جائداد تیری ہاتھ میں تھی؟''

دھنیا نے سمجھا کہ سب مل کر مجھے نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ پس چوگھی لڑائی لڑنے کے لئے تیار ہو گئی ،، اچھا تم رہنے دو لالہ! میں سب کو پہچانتی ہوں۔ اس گاؤں میں رہتے بیس برس ہو گئے۔ ایک ایک کی نس نس پہچانتی ہوں۔ میں گالی دے رہی ہوں اور وہ پھول برسا رہا ہے، کیوں؟''

دلاری سیٹھانی نے آگ پر گھی ڈالا ،، سچ ہے بڑی گال دراج عورت ہے بھائی، مردوں کے منہ لگتی ہے۔ ہوری ہی جیسا مرد ہے کہ اس کا نباہ ہوتا ہے، دوسرا ہوتا تو ایک دن نہ پٹتی''

اگر ہیرا اس وقت ذرا نرم پڑ جاتا تو اس کی فتح ہو جاتی، لیکن وہ گالیاں سن کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اوروں کو اپنی طرف دیکھ کر وہ کچھ شیر ہو رہا تھا۔ گلا پھاڑ کر بولا ،، چلی جا میرے دوار سے، نہیں جوتوں سے بات کروں گا۔ جھونٹا پکڑ کر اکھاڑ لوں گا۔ گالی دیتی ہے ڈاین؟ بیٹے کا گھمنڈ ہو گیا، کھون......

پانسہ پلٹ گیا۔ ہوری کا خون جوش میں آگیا۔ جیسے بارود میں چنگاری پڑ گئی ہو۔ آگے آکر بولا ،، اچھا، بس، اب چپ ہو جاؤ ہیرا! اب نہیں سنا جاتا۔ میں اس عورت کو کیا کہوں؟ جب میری پیٹھ میں دھول لگتی ہے تو اسی کے کارن۔

نہ جانے کیوں اس سے چپ نہیں رہا جاتا۔"

چاروں طرف سے ہیرا پر بوچھاڑ پڑنے لگی۔ داتا دین نے بے غیرت کہا، پٹیشری نے غنڈا بنایا، جھنگری سنگھ نے شیطان کا لقب دیا، دولاری نے کپوت کہا۔ ایک کڑوے لفظ نے دھنیا کا پلہ ہلکا کر دیا تھا، دوسرے کڑوے لفظ نے ہیرا کو پستی میں ڈال دیا۔ اس پر ہوری کے سنجیدہ الفاظ نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

ہیرا سنبھل گیا۔ گل گاؤں اس کے خلاف ہو گیا ہے۔ اب چپ رہنے ہی میں خیریت ہے۔ غصے کے تیز نشے میں بھی اس میں اتنا ہوش باقی تھا۔

دھنیا کا کلیجہ دونا ہو گیا۔ ہوری سے بولی "سن لو کان کھول کے۔ بھائیوں کے لئے مرتے رہتے ہو۔ یہ بھائی ہیں؟ ایسے بھائی کا تو منہ نہ دیکھے۔ یہ مجھے جوتوں سے مارے گا۔ کھلا پلا ...."

ہوری نے ڈانٹا "پھر کیوں بک بک کرنے لگی تو؟ گھر کیوں نہیں جاتی؟"

دھنیا زمین پر بیٹھ گئی اور فریاد کے لہجے میں بولی "اب تو اس کے جوتے کھا کر گھر جاؤں گی۔ جرا اس کی مردمی دیکھ لوں۔ کہاں ہے گوبر؟ اب کس دن کام آوے گا؟ تو دیکھ رہا ہے بیٹا! تیری ماں کو جوتے مارے جا رہے ہیں!"

اس طرح فریاد کر کے اس نے اپنے غصے کے ساتھ ہوری کے غصے کو بھی عملی صورت دے دی۔ آگ کو پھونک پھونک کر اس میں لپیٹ پیدا کر دی۔ ہیرا ہارا ہوا سا پیچھے ہٹ گیا تھا۔ پنیا اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف کھینچ رہی تھی یکایک دھنیا نے شیرنی کی طرح جھپٹ کر ہیرا کو اس زور کا دھکا دیا کہ وہ دھم سے زمین پر گر پڑا اور بولی "کہاں جاتا ہے؟ جوتے مار! مار جوتے! دیکھوں تیری مردمی!"

ہوری نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گھسیٹتا ہوا گھر کی طرف چلا۔

۵

اُدھر گوبر کھانا کھا کر اہیرن ٹولہ جا پہنچا۔ آج جھُنیا سے اس کی بہت باتیں ہوئی تھیں۔ جب وہ گائے لے کر چلا تھا تو جھُنیا آدھے راستہ تک اس کے ساتھ آئی تھی گوبر تنہا گائے کو کیسے لے جاتا؟ اجنبی کے ساتھ جانے میں اس کا بھڑکنا قدرتی تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد جھنیا نے گوبر کو بھید بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا "اب تم کا ہے کو کبھی یہاں آؤ گے؟"

ایک روز پہلے تک گوبر کنوارا تھا۔ گاؤں میں جتنی نوجوان عورتیں تھیں وہ یا تو اس کی بہنیں تھیں یا بھاوجیں۔ بہنوں سے تو کوئی چھیڑ چھاڑ ہو ہی کیا سکتی تھی۔ بھاوجیں البتہ کبھی کبھی اُس سے ٹھٹھولی کیا کرتی تھیں مگر یہ محض تفریحاً ہوتا تھا۔ ان کی نگاہوں میں ابھی اس کے شباب میں صرف پھول لگتے تھے۔ جب تک پھل نہ لگ جائیں اس پر ڈھیلے پھینکنا بیکار تھا اور کسی طرف سے حوصلہ افزائی نہ پا کر اس کا کنوارا پن اُس کے گلے سے لپٹا ہوا تھا۔ جھنیا کا محروم دل جیسے بھاوجوں کے طنز و مذاق نے اور بھی خواہشمند بنا دیا تھا، اُس کے کنوارے پن ہی پر للچا اٹھا اُس کنوارے پن میں بھی پتے کے کھڑکتے ہی کسی سوتے ہوئے شکاری جانور کی طرح شباب جاگ اٹھا۔

گوبر نے کھلے منچلے پن کے ساتھ کہا "اگر بھکاری کو ملنے کا آسرا ہو تو وہ دن بھر اور رات بھر داتا کے دوارے پر کھڑا رہے۔"

جھنیا معترضانہ لہجے میں بولی "تو یہ کہو کہ تم بھی مطلب کے یار ہو۔"

گوبر کی رگوں کا خون متحرک ہوا تھا، بولا "بھوکا آدمی اگر ہاتھ پھیلائے تو اُسے

چھما کر دینا چاہیئے"

جھنیا اور گہرے اُتری "بھکاری جب تک دس دروازے نہ جائے اُس کا پیٹ کیسے بھرے گا؟ ایسے بھکاریوں کو منہ نہیں لگاتی، ایسے تو گلی گلی ملتے ہیں۔ پھر بھکاری دیتا کیا ہے؟ اسیس! اسیسوں سے تو کسی کا پیٹ نہیں بھرتا"

کم فہم گوبر جھنیا کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ جھنیا چھوٹی ہی سی تھی جبھی سے گاہکوں کے گھر دودھ لے جایا کرتی تھی۔ سسرال میں بھی اُسے گاہکوں کے گھر دودھ پہنچانا پڑتا تھا۔ آج کل بھی دَہی بیچنے کا بار اُسی پر ہے۔ اُسے طرح طرح کے انسانوں سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ دو چار روپئے اس کے ہاتھ لگ جاتے تھے، گھڑی بھر کے لئے دل بہلاؤ بھی ہو جاتا تھا مگر یہ خوشی جیسے مانگی کی چیز ہو۔ اس میں اُمید نہ تھی۔ ایثار نہ تھا۔ اختیار نہ تھا۔ وہ ایسی محبت چاہتی تھی جس کے لئے وہ جئے اور مرے، جس پر وہ خود کو قربان کر دے! وہ صرف جگنو کی چمک نہیں بلکہ چراغ کی مستقل روشنی چاہتی تھی۔ وہ ایک گرست کی لڑکی تھی اور اس کے گرست پن کو رنگین مزاجوں کی لگاوٹیں کچل نہ سکی تھیں۔

گوبر نے پرشوق بشرے سے کہا "بھکاری کو ایک ہی دوارے پر بھر پیٹ بھیک مل جائے تو کیوں در در گھومے؟"

جھنیا نے رحم سے اس کی طرف دیکھا۔ کتنا بھولا ہے، جیسے کچھ سمجھتا ہی نہیں، بولی "بھکاری کو ایک جگہ بھر پیٹ کہاں ملتا ہے؟ اُسے تو مٹھی ہی بھر ملے گا۔ سب کچھ تو جبھی پاؤ گے جب اپنا بھی سب کچھ دو گے"

"میرے پاس کیا ہے، جھنیا؟"

"تمہارے پاس کچھ نہیں ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ میرے لئے تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ بڑے بڑے لکھپتی لوگوں کے پاس بھی نہیں۔ مجھ سے بھیک نہ مانگ

کہ مجھے مول لے سکتے ہو!"

گوبر حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔

جُھنیا نے پھر کہا "اور جانتے ہو دام کیا دینا ہوں گے؟ میرا ہو کر رہنا پڑے گا۔ پھر کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے دیکھوں گی تو گھر سے نکال دوں گی۔"

گوبر کو جیسے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے چاہی ہوئی چیز مل گئی۔ ایک عجیب خوف بھری خوشی سے اُس کا عضو عضو بھڑک اٹھا۔ مگر یہ کیسے ہو گا؟ جھنیا کو رکھ لے تو رکھنی کو لے کر گھر میں رہے گا کیسے؟ برادری کا جھنجھٹ تو ہے۔ سارا گاؤں کاؤں کاؤں کرنے لگے گا۔ سبھی دشمن ہو جائیں گے۔ اماں تو اُسے گھر میں گھسنے ہی نہ دیں گی۔ مگر جب عورت ہو کر یہ نہیں ڈرتی تو مرد ہو کر وہ کیوں ڈرے؟ بہت ہو گا لوگ اُسے الگ کر دیں گے۔ وہ الگ ہی رہے گا۔ جھنیا جیسی عورت گاؤں میں دوسری کون ہے؟ کتنی سمجھ داری کی باتیں کرتی ہے۔ کیا جانتی نہیں کہ میں اُس کے لائق نہیں ہوں؟ پھر بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میری ہونے کو راضی ہے، گاؤں والے نکال دیں گے تو کیا دنیا میں دوسرا گاؤں ہی نہیں ہے؟ اور گاؤں کیوں چھوڑے؟ ماتا دین نے چمارن رکھ لی تو کسی نے کیا کر لیا؟ داتا دین دانت پیس کر رہ گئے۔ ماتا دین نے اتنا ضرور کیا کہ اپنا دھرم بچا لیا۔ اب بھی بنا اسنان پوجا کئے منہ میں پانی نہیں ڈالتے، دونوں جون اپنا کھانا آپ پکاتے ہیں۔ اور اب تو الگ کھانا بھی نہیں پکاتے، داتا دین اور وہ ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ جھنگری سنگھ نے بامھنی (برہمنی) رکھ لی، ان کا کسی نے کیا کر لیا؟ ان کا جتنا آدر تب تھا اتنا اب بھی ہے بلکہ اور ادھک پہلے نوکری کھوجتے پھرتے تھے، اب اس کے روپئے سے مہاجن بن بیٹھے۔ ٹھکرائی کا رعب تو تھا ہی، مہاجنی کا رعب جم گیا۔ مگر پھر خیال آیا کہ کہیں جُھنیا ہنسی نہ کر رہی ہو، پہلے اس کا اطمینان

ہو جانا ضروری تھا۔

اُس نے کہا "من سے کہتی ہو جھونا کہ خالی لالچ دے رہی ہو؟ میں تو تمہارا ہو چکا اب تم بھی میری ہو جاؤ گی؟"

"تم میرے ہو چکے؟ کیسے جانوں؟"

"تم جان بھی مانگو تو دے دوں"

"جان دینے کا مطلب بھی سمجھتے ہو؟"

"تم سمجھا دینا"

"جان دینے کا مطلب ہے ساتھ زندہ کر نباہ کرنا۔ ایک بار ہاتھ پکڑ کر عمر بھر نباہ کرتے رہنا، چاہے دنیا کچھ کہے، چاہے ماں باپ، بھائی بند گھر دوار سب کچھ چھوڑنا پڑے۔ منہ سے جان دینے والے بہتوں کو دیکھ چکی، بھونروں کی طرح پھول کا رس لے کر اُڑ جاتے ہیں۔ تم بھی تو اسی طرح نہ اُڑ جاؤ گے؟"

گوبر کے ایک ہاتھ میں گائے کی رسّی تھی، دوسرے ہاتھ سے اس نے جُھنیا کا ہاتھ پکڑ لیا، جیسے بجلی کے تار پر ہاتھ پڑ گیا ہو، سارا بدن شباب کے اولین ہمس سے کانپ اٹھا۔ کتنی نرم و نازک اور بھری ہوئی کلائی! جُھنیا نے اس کا ہاتھ ہٹایا نہیں، جیسے اس چھونے کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ پھر لمحہ بھر بعد سنجیدگی سے بولی "آج تم نے میرا ہاتھ پکڑا ہے، یاد رکھنا"

"خوب یاد رکھوں گا۔ جھونا اور مرتے دم تک نباہوں گا"

جھنیا بے اعتباری کی مسکراہٹ سے بولی "اسی طرح تو سب کہتے ہیں گوبر، بلکہ اس سے بھی میٹھے چکنے شبدوں میں، اگر من میں کپٹ ہو تو مجھے بتا دو۔ ہوشیار ہو جاؤں، ایسوں کو دل نہیں دیتی، ان سے تو ہنس بول لیتی ہی کا ناتا رکھتی ہوں برسوں سے دودھ لے کر ہاٹ جاتی ہوں۔ ایک سے ایک بابو، مہاجن ٹھاکر، وکیل،

عملے افسر اپنی چاہ دکھا کر مجھے پھنسا لینا چاہتے ہیں۔ کوئی چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر کہتا ہے، "جھنیا ترسامت" کوئی مجھے رسیلی چتون سے گھورتا ہے جیسے پریم کے مارے بے سدھ ہو گیا ہو۔ سب میری گلامی کرنے کو تیار رہتے ہیں، عمر بھر، بلکہ دوسرے جنم میں بھی، پر میں اُن سبھوں کی نس پہچانتی ہوں۔ سب کے سب بھونرے ہیں، رس لے کر اڑ جانے والے۔ میں بھی انہیں نچاتی ہوں، ترچھی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی، مسکاتی ہوں۔ وہ مجھے گدھی بناتے ہیں۔ میں انہیں اُلّو بناتی ہوں۔ میں مر جاؤں تو اُن کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے گا، وے مر جائیں تو میں کہوں گی کہ اچھا ہوا، مر گیا۔ میں تو جس کی ہو جاؤں گی اُس کی جنم بھر کے لئے ہو جاؤں گی، سُکھ میں، دُکھ میں، سمپت میں، بپت میں، اسی کے ساتھ رہوں گی۔ ہرجائی نہیں ہوں کہ سب سے ہنستی بولتی پھروں، نہ روپئے کی بھوکی ہوں، نہ گہنے کپڑے کی۔ بس بھلے آدمی کا ساتھ چاہتی ہوں جو مجھے اپنا سمجھے اور جسے میں بھی اپنا سمجھوں۔ ایک پنڈت جی بہت تلک چھاپا لگاتے ہیں۔ آدھ سیر دودھ لیتے ہیں۔ ایک دن اُن کی گھر والی کہیں نیوتے میں گئی تھی۔ مجھے کیا معلوم؟ اور دنوں کی طرح دودھ لئے بھیتر چلی گئی۔ وہاں پکارتی ہوں، بہو جی! بہو جی! کوئی بولتا ہی نہیں۔ اتنے میں دیکھتی ہوں تو پنڈت جی باہر کے کواڑ بند کئے چلے آ رہے ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ اس کی نیت بُری ہے، میں نے ڈانٹ کر پوچھا تم نے کواڑ کیوں بند کر لئے؟ بہو جی کہیں گئی ہیں کیا؟ گھر میں سناٹا کیوں ہے؟"

اُس نے کہا "وہ ایک نیوتے میں گئی ہیں۔" اور میری طرف دو ڈگ اور بڑھ آیا۔

میں نے کہا "تمہیں دودھ لینا ہو تو لو، نہیں میں جاتی ہوں۔" بولا "آج تو تم یہاں سے نہ جانے پاؤ گی جھونا رانی! روج روج کلیجے پر چھُری چلا کر بھاگ جاتی ہو۔

آج میرے ہاتھ سے نہ بچو گی۔"

تم سے سچ کہتی ہوں گوبر، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

گوبر جوش میں بولا "میں بچہ کو دیکھ پاؤں تو کھود کر گاڑ دوں، کھون پی لوں، تم مجھے دکھا تو دینا۔"

"سنو تو، ایسوں کا منہ توڑنے کے لئے میں ہی بہت ہوں۔ میری چھاتی دھک دھک کرنے لگی۔ یہ کچھ کر بیٹھے تو کیا کروں گی؟ کوئی چلاّنا بھی نہ سنے گا۔ پر من میں یہ پکا کر لیا تھا کہ میری دیہہ چھوٹی تو دودھ بھری ہانڈی اس کے منہ پر پٹک دوں گی۔ چار پانچ سیر دودھ جائے گا تو جائے، بچہ کو یاد تو ہو جائے گا، کلیجہ کڑا کر کے بولی اس پھیر میں نہ رہنا پنڈت جی! میں اہیر کی لڑکی ہوں، مونچھ کا ایک ایک بال چنوا لوں گی۔ یہی لکھا ہے تمہارے پوتھی پترے میں کہ دوسروں کی بہو بیٹی کو اپنے گھر میں بند کر کے اس کی آبرو لو؟ اسی لئے تلک چھاپے کا جال بچھائے بیٹھے ہو؟ لگا ہاتھ جوڑنے، پاؤں پڑنے، بولا، ایک چاہنے والے کا من رکھ لو گی تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا جھونا رانی؟ کبھی کبھی گریبوں پر دیا کیا کرو، نہیں بھگوان پوچھیں گے کہ میں نے تمہیں اتنا روپ کا دھن دیا تھا، تم نے اس سے ایک برہمن کا اُپکار بھی نہیں کیا، تو کیا جواب دو گی؟ بولو!" روپے پیسے کا دان تو سدا ہی پاتا ہوں، آج، روپ کا دان دو۔"

میں نے یونہی اس کا من پرکھنے کو کہہ دیا کہ میں پچاس روپئے لوں گی۔ سچ کہتی ہوں گوبر کہ وہ اُسی دم کوٹھری میں گیا اور دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر میرے ہاتھوں میں دینے لگا اور جب میں نے نوٹ وہیں گرا دئے اور دوارے کی طرف چلی تو اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا، میں نے تو پہلے ہی سے تیار تھی۔ ہانڈی اس کے منہ پر دے ماری، سر سے پیر تک سرابور ہو گیا، چوٹ بھی بہت لگی، سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور لگا ہائے ہائے

کرنے۔ میں نے دیکھا کہ اب یہ کچھ نہیں کر سکتا تو پیٹھ میں دو لاتیں جما دیں اور کواڑ کھول کر بھاگی۔"

گوبر قہقہہ لگا کر بولا "بہت اچھا کیا تم نے۔ دودھ سے نہا گیا ہوگا۔ تلک چھاپا بھی دُھل گیا ہوگا؟"

دوسرے دن پھر میں اس کے گھر گئی۔ گھر والی آگئی۔ وہ اپنے بیٹھکے میں سر پر پٹی باندھے پڑا تھا میں نے کہا، کہو تو کل کی تمہاری کرتوت کھول دوں پنڈت! لگا ہاتھ جوڑنے میں نے کہا، اچھا تھوک کر چاٹو تو چھوڑ دوں۔ دھرتی پر ماتھا ٹیک کر کہنے لگا، اب میری آبرو تمہارے ہاتھ ہے۔ جھونا! یہی سمجھ لو کہ پنڈتانی مجھے جیتا نہ چھوڑیں گی۔ مجھے بھی اس پر دیا آگئی۔"

گوبر کو یہ دیا بری لگی، بولا "یہ تم نے کیا کیا؟ اس کی عورت سے جا کر کہہ کیوں نہ دیا کہ جوتوں سے پیٹتی۔ ایسے پکھنڈیوں پر دیا نہ کرنی چاہیئے تم مجھے کل اس کی صورت دکھا دو۔ پھر دیکھنا کہ کیسی مرمت کرتا ہوں۔"

جھنیا نے اس کے ادھ کھلے شباب کو دیکھ کر کہا "تم اسے نہ پاؤ گے پورا دیو ہے، سینت میت کا مال اڑاتا ہے کہ نہیں۔"

گوبر اپنے شباب کی یہ تحقیر کیسے برداشت کرتا؟ ڈینگ مار کر بولا "موٹے ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ یہاں پھولاد کی ہڈیاں ہیں۔ تین سو ڈنڈ روز مارتا ہوں۔ دودھ گھی نہیں ملتا۔ نہیں تو اب تک سینہ یوں نکل آیا ہوتا"، یہ کہہ کر اس نے اپنا سینہ تان کر دکھلایا۔

جھنیا نے تقویت بھری آنکھوں سے دیکھا، بولی "اچھا کبھی دکھا دوں گی۔ پر یہاں تو سبھی ایک سے ایک ہیں، تم کس کس کی مرمت کروگے؟ نہ جانے مردوں کی کیا عادت ہے کہ جہاں کوئی جوان، سندر عورت دیکھی اور بس لگے گھورنے، چھاتی

پیٹنے اور یہ جو بڑے آدمی کہلاتے ہیں یہ تو نرے کچالی ہوتے ہیں ۔
"پھر میں تو کوئی سندری بھی نہیں ہوں ...... "
گوبر نے احتجاج کیا "ر تم! تمہیں دیکھ کر تو یہی جی چاہتا ہے کہ کلیجہ میں بٹھالیں "
جھنیا نے اس کی پیٹھ پر ایک ہلکا سا گھونسا جمایا " لگے اوروں کی طرح تم بھی چاپلوسی کرنے۔ میں جیسی کچھ ہوں، میں جانتی ہوں، پر ان لوگوں کو تو کوئی بھی جوان عورت مل جائے، گھڑی بھر من بہلانے کو اور کیا چاہیئے؟ گُن تو آدمی اُس میں دیکھتا ہے جس کے ساتھ جنم بھر نباہ کرنا ہو۔ سنتی بھی ہوں اور دیکھتی بھی ہوں کہ آج کل بڑے گھروں کا عجب حال ہے۔ جس محلّے میں میری سسرال ہے اُسی میں گپڈ گپڈو نام کے کاشمیری رہتے تھے۔ بڑے بھاری آدمی تھے۔ ان کے یہاں پانچ سیر دودھ لگتا تھا۔ ان کے تین لڑکیاں تھیں۔ کوئی بیس بیس، پچیس پچیس برس کی، ایک سے ایک سندر۔ تینوں بڑے کالج میں پڑھنے جاتی تھیں۔ ایک سایت کالج میں پڑھاتی تھی اور تین سو کا مہینہ پاتی تھی۔ ستار وے سب بجاویں، ہارمونیا وے سب بجاویں، ناچیں وے، گاویں وے، پر بیاہ کوئی نہ کرتی تھی، رام جانے وہ کسی مرد کو پسند نہیں کرتی تھیں کہ مرد ان ہی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار میں نے بڑی بی بی سے پوچھا تو ہنس کر بولیں کہ ہم لوگ یہ روگ نہیں پالتے۔ پھر بھیتر ہی بھیتر گلچھرے اُڑاتی تھیں۔ جب دیکھوں، دو چار لونڈے ان کو گھیرے ہوتے ہیں۔ جو سب سے بڑی تھی وہ تو کوٹ پتلون پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر مردوں کے ساتھ گھومنے جاتی۔ سارے شہر میں ان کی لیلا کا چرچا تھا۔ گپڈ بابو سر نیچا کئے جیسے منہ میں کالکھ سی لگائے رہتے تھے۔ لڑکیوں کو ڈانٹتے تھے، سمجھاتے تھے، وے سب کی سب کھلم کھلا کہتی تھیں کہ تمہیں ہمارے بیچ میں بولنے کا کچھ مجال نہیں ہے، ہم اپنے من کی رانی ہیں، جو ہمارا جی چاہے گا کریں گے۔ بیچارا باپ جوان

جوان لڑکیوں سے کیا ہوے؟ مارنے باندھنے سے رہا۔ ڈانٹنے ڈپٹنے سے رہا۔ پر بھائی بڑے آدمیوں کی باتیں کون چلاوے؟ وہ جو کچھ کریں سب ٹھیک ہے۔ انہیں تو برادری اور پنچایت کا بھی ڈر نہیں ہے۔ میری سمجھ میں تو یہی نہیں آتا کہ کسی کا روج روج من کیسے بدل جاتا ہے۔ کیا آدمی گائے بکری سے بھی گیا بیتا ہو گیا؟ پر کسی کو برا نہیں کہتی، بھائی، من کو جیسا بناؤ ویسا بنتا ہے۔ ایسوں کو بھی دیکھتی ہوں جنہیں سدا کی دال روٹی کے بعد کبھی کبھی منہ کا سواد بدلنے کے لئے حلوا پوری بھی چاہیئے اور ایسوں کو بھی دیکھتی ہوں جنہیں گھر کی روٹی دال دیکھ کر جوڑی آتی ہے۔ کچھ بیچاریاں ایسی بھی ہیں جو اپنی دال روٹی ہی میں مگن رہتی ہیں۔ حلوا پوری سے انہیں کوئی مطلب نہیں۔ میری دونوں بھاوجوں ہی کو دیکھو۔ ہمارے بھائی کانے کبڑے نہیں ہیں۔ دس جوانوں میں ایک جوان ہیں پر بھاوجوں کو نہیں بھاتے۔ انہیں تو وہ چاہیئے جو سونے کی بالیاں بنوائے، مہین ساڑیاں لاوے اور روج چاٹ کھلاوے۔ بالیاں اور ساڑیاں اور مٹھائیاں مجھے بھی کم اچھی نہیں لگتیں، مگر جو کچھ کر اس کے لئے اپنی لاج بیچتی پھروں تو بھگوان اس سے بچا دیں۔ ایک کے ساتھ روکھا سوکھا کھا کر عمر کاٹ دینا، بس اپنا تو یہی راگ ہے۔ بہت کرکے تو مرد ہی عورتوں کو بگاڑتے ہیں۔ جب مرد ادھر ادھر تانک جھانک کرے گا تو عورت بھی آنکھیں لڑائے گی۔ مرد دوسری عورت کے پیچھے دوڑے گا تو عورت بھی دوسرے مرد کے پیچھے دوڑے گی۔ مرد کا ہرجائی ہونا عورت کو بھی اتنا ہی برا لگتا ہے جتنا عورت کا مرد کو۔ یہی سمجھ لو۔ میں نے تو اپنے آدمی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر تم ادھر ادھر لپکے تو میرے بھی جو جی میں آئے گا کروں گی۔ جو یہ چاہو کہ تم تو اپنے من کی کرو اور عورت کو مار کے ڈر سے اپنے بس میں رکھو تو یہ نہ ہوگا۔ تم کھلے کھجانے کرتے ہو، وہ چھپ کر کرے گی۔ تم اسے جلا کر سکھی نہیں رکھ سکتے۔"

گوبر کے لئے یہ ایک نئی دنیا کی باتیں تھیں۔ محو ہو کر سن رہا تھا۔ کبھی کبھی تو آپ ہی آپ اس کے پاؤں ٹھٹک جاتے، پھر جیسے کمر چلنے لگتا۔ جھنیا نے پہلے اسے اپنے روپ پر موہ لیا تھا، آج اس نے اپنی تجربے سے بھری باتوں اور اپنی عظمت پروری کے ذکر سے اسے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ایسے روپ، گن اور گیان والی عورت اسے مل جائے تو دھنیا بھاگ! پھر وہ کیوں پنچایت اور برادری سے ڈرے؟

جھنیا نے جب دیکھ لیا کہ اس کا رنگ گہرا جم گیا تو سینے پر ہاتھ رکھ کر زبان کو دانت سے کاٹتی ہوئی بولی۔

"ارے یہ تو تمہارا گاؤں آگیا! تم بھی بڑے چالاک ہو مجھے کہا بھی نہیں کہ لوٹ جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ لوٹ پڑی۔

گوبر نے اصرار سے کہا "چھن بھر کے لئے میرے گھر کیوں نہیں چلتی؟ اماں بھی تو دیکھ لیں۔"

جھنیا نے شرم سے آنکھیں چرا کر کہا "تمہارے گھر یوں نہ جاؤں گی۔ مجھے تو یہی اچرج ہو تا ہے کہ میں اتنی دور کیسے آگئی۔ اچھا بتاؤ، اب کب آؤ گے؟ رات کو میرے دروازے پر اچھی سنگت ہوگی چلے آنا۔ میں اپنے پچھواڑے ملوں گی۔"

"اور جو نہ ملیں؟"

"تو لوٹ آنا۔"

"تو پھر میں نہ آؤں گا۔"

"آنا پڑے گا۔ نہیں تو کہے دیتی ہوں۔"

"تم بھی بچن دو کہ ملو گی۔"

"میں بچن نہیں دیتی۔"

"تو میں بھی نہیں آتا۔"

"میری بلا سے!"

"جھنیا انگوٹھا دکھا کر چل دی۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے پر اپنا اپنا اقتدار قائم کر چکے تھے۔ جھنیا جانتی تھی کہ وہ آئے گا۔ گوبر جانتا تھا کہ وہ ملے گی، کیسے نہ ملے گی؟ جب وہ تنہا گائے کو ہنکاتا ہوا چلا تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ بہشت سے گر پڑا ہو۔

۶

جیٹھ کی گرم شام شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں پانی کے چھڑکاؤ سے فضا سرد و شاداب ہو رہی تھی۔ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں اور پودوں کے گملے سجا دیئے گئے تھے اور بجلی کے پنکھے چل رہے تھے۔ رائے صاحب اپنے کارخانے میں بجلی بنوا لیتے تھے۔ ان کے سپاہی پیلی وردیاں پہنے اور نیلے صافے باندھے عوام پر رعب جماتے پھرتے نوکر سفید کرتے پہنے اور زعفرانی رنگ کی پگڑیاں باندھے مہمانوں اور رئیسوں کی خاطر و مدارات کر رہے تھے۔ اسی وقت ایک موٹر صدر دروازے کے سامنے آ کر رکا اور اس میں سے تین اصحاب اترے۔ وہ جو کھدر کا کرتا اور چپل پہنے ہوئے تھے، ان کا نام پنڈت اونکار ناتھ ہے۔ آپ بجلی نامی روزنامے کے مشہور و معروف ایڈیٹر ہیں، جنہیں دیش کی چنتا نے گھلا ڈالا ہے۔ دوسرے صاحب جو کوٹ پتلون میں ہیں۔ وہ ہیں تو وکیل، مگر وکالت نہ چلنے کے سبب ایک بیمہ کمپنی کی دلالی کرتے ہیں اور تعلق داروں کو مہاجنوں اور بینکوں سے قرض دلانے میں وکالت سے کہیں زیادہ کمائی کر لیتے ہیں۔ ان کا نام ہے شیام بہادری تنخا اور تیسرے صاحب جو ریشمی اچکن اور چست پاجامہ پہنے ہوئے ہیں، مسٹر بی مہتا یونیورسٹی میں فلسفے کے

پروفیسر ہیں۔ یہ تینوں صاحب رائے صاحب کے ہم سبقوں میں ہیں اور شگون کے چلنے میں مدعو ہوتے ہیں۔ آج سارے علاقے کے اسامی آئیں گے اور شگون کے روپے نذر کریں گے۔ رات کو دھنش یگیہ ہوگا اور مہمانوں کی دعوت ہوگی۔ ہوری نے پانچ روپے شگون کے دے دیئے ہیں اور ایک گلابی مرزئی پہنے، گلابی پگڑی باندھے، گھٹنے تک کاچھنی کاچھے، ہاتھ میں ایک کھرپی لئے اور چہرے پر باؤ ڈر ملے راجہ جنک کا مالی بن گیا ہے۔ اور گھمنڈ سے اتنا پھول اٹھا ہے گویا یہ جلسہ اسی کی بدولت ہو رہا ہے۔

رائے صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ دوہرے بدن کے اونچے آدمی تھے۔ گٹھا ہوا جسم، بارونق چہرہ، بلند پیشانی، گورا رنگ، اس پر شربتی ہدی چادر خوب پھب رہی تھی۔

پنڈت اونکار ناتھ نے پوچھا، اب کے کونسا ناٹک کھیلنے کا ارادہ ہے؟ میری دلچسپی کی تو یہاں یہی ایک چیز ہے۔

رائے صاحب نے تینوں اصحاب کو خیمے کے سامنے کرسیوں پر بٹھاتے ہوئے کہا، پہلے تو دھنش یگیہ ہوگا اور پھر اس کے بعد ایک مزاحیہ ڈرامہ۔ ناٹک تو کوئی اچھا نہ ملا۔ کوئی اتنا لمبا کہ شاید پانچ گھنٹوں میں نہ ختم ہو اور کوئی اتنا مشکل کہ شاید یہاں ایک آدمی بھی اس کا مطلب نہ سمجھے۔ آخر میں نے خود ایک مزاحیہ ناٹک لکھ ڈالا جو دو گھنٹوں میں پورا ہو جائے گا۔

اونکار ناتھ کو رائے صاحب کی ڈرامہ نگاری میں بہت شک تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ ذہانت تو غریبی ہی میں چمکتی ہے، چراغ کی طرح جو اندھیرے ہی میں اپنی روشنی ظاہر کرتا ہے۔ بے پروائی سے منہ پھیر لیا، جسے چھپانے کی بھی انہوں نے کوشش نہیں کی۔

مسٹر تنکھا بے کار باتوں میں نہ پڑنا چاہتے تھے مگر پھر بھی رائے صاحب کو دکھانا چاہتے تھے کہ اس کے متعلق انہیں کچھ کہنے کا حق ہے۔ بولے "ناٹک کوئی بھی اچھا ہو سکتا ہے اگر اس کے ایکٹر اچھے ہوں۔ عمدہ سے عمدہ ناٹک بُرے ایکٹروں کے ہاتھ میں پڑ کر بُرا ہو سکتا ہے۔ جب تک اسٹیج پر تعلیم یافتہ ایکٹریسیں نہیں آتیں ہمارے ناٹکی فن کا اُدھار نہیں ہو سکتا۔ اب کے تو آپ نے کونسل میں سوالوں کی دھوم مچا دی، میں تو دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی ممبر کا ریکارڈ اتنا شاندار نہیں ہے۔"

فلاسفر پروفیسر مسٹر مہتا اس تعریف کو سہہ نہ سکے۔ مخالفت تو کرنا چاہتے تھے مگر اصول کی آڑ لے کر۔ انہوں نے حال ہی میں ایک کتاب کئی سال کی محنت سے لکھی تھی۔ اس کی جتنی شہرت ہونی چاہئے تھی اس کا عشر عشیر بھی نہ ہوئی تھی جس سے وہ بہت مغموم تھے۔ بولے "میں تو بھئی سوالوں کا قائل نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری زندگی ہمارے اصولوں کے مطابق ہو۔ آپ کسانوں کے بہی خواہ ہیں، انہیں انواع و اقسام کی مراعات دینا چاہتے ہیں، زمینداروں کے اختیارات چھین لینا چاہتے ہیں، بلکہ انہیں تو آپ سماج کی نحوست کہتے ہیں مگر پھر بھی آپ زمیندار ہیں، ویسے ہی زمیندار جیسے ہزاروں اور ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ کسانوں کے ساتھ رعایت ہونی چاہئے تو پہلے آپ خود شروع کریں۔ کسانوں کو نذرانہ لئے بغیر پٹے لکھ دیں، بیگار بند کر دیں، اضافہ لگان سے درگزر کریں، چراگاہیں چھوڑ دیں۔ مجھے ان لوگوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے جو باتیں تو کرتے ہیں کمیونسٹوں کی سی، مگر زندگی ہے رئیسوں کی سی، اتنی ہی عیش پسندی اور خود غرضی سے معمور۔"

رائے صاحب کو صدمہ ہوا۔ وکیل صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ایڈیٹر

صاحب کے منہ پر کالکھ سی لگ گئی۔ وہ خود اشتراکیت کے پجاری تھے۔ مگر براہ راست گھر میں آگ نہ لگانا چاہتے تھے۔

تنخا نے رائے صاحب کی وکالت کی "میں سمجھتا ہوں کہ رائے صاحب کا اپنے آسامیوں کے ساتھ جتنا اچھا سلوک ہے ویسا ہی اگر سبھی زمیندار برتیں تو یہ سوال ہی باقی نہ رہے۔"

مہتا نے ہتھوڑے کی دوسری چوٹ جمائی "مانتا ہوں، آپ کا اپنے آسامیوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ اس میں خود غرضی ہے یا نہیں؟ اس کا ایک سبب کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ دھیمی آنچ میں کھانا ذائقہ دار پکتا ہے؟ گڑ سے مارنے والا زہر سے مارنے والے کی نسبت کہیں زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ہم سوشلسٹ ہیں یا نہیں ہیں۔ ہیں، تو ویسا برتیں بھی۔ ورنہ بکنا چھوڑ دیں۔ میں نقلی زندگی کے خلاف ہوں۔ اگر گوشت کھانا اچھا سمجھتے ہو تو علانیہ کھاؤ۔ بُرا سمجھتے ہو تو نہ کھاؤ۔ یہ تو میری سمجھ میں آتا ہے۔ مگر اچھا سمجھنا اور چھپ کر کھانا، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اُسے بزدلی بھی کہتا ہوں اور مکاری بھی جو دراصل ایک ہی ہیں۔"

رائے صاحب ایک صحبت یافتہ آدمی تھے، تو ہین اور صدمے کو صبر اور فراخ دلی سے سہنے کی انہیں مہارت تھی۔ کچھ پس و پیش میں پڑ کر بولے "آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے مہتا جی! آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کی صاف گوئی کی کتنی قدر کرتا ہوں، مگر آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسری مسافتوں کی طرح خیالوں کی مسافت میں بھی منزلیں ہوتی ہیں۔ اور آپ ایک منزل کو چھوڑ کر دوسری منزل میں نہیں جا سکتے۔ انسانی زندگی کی تاریخ اس کا ایک بین ثبوت ہے۔ میری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہے جہاں بادشاہ خدا ہے اور زمیندار خدا کا ہمشیر ہے۔ میرے

والد مرحوم آسامیوں پر اتنی دیا کرتے تھے کہ پالے سوکھے میں کبھی نصف اور کبھی پورا لگان معاف کر دیتے تھے۔ اپنے ذخیرے سے اناج نکال کر آسامیوں کو کھلا دیتے تھے۔ گھر کے زیور بیچ کر لڑکیوں کے بیاہ میں مدد دیتے تھے۔ مگر یہ سب اُسی وقت تک جب رعایا انہیں سرکار اور دھرماوتار کہتی رہی، انہیں اپنا دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا کرتی رہی۔ رعایا کو پالنا ان کا سناتن دھرم تھا۔ مگر اختیار کے نام پر وہ کوڑی کا دندانہ بھی چھوڑ دینا نہ جانتے تھے۔ میں اُسی ماحول میں پلا ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں عملاً خواہ کچھ کروں مگر ارادوں میں ان سے آگے بڑھ گیا ہوں اور یہ ماننے لگا ہوں کہ جب تک کسانوں کو یہ رعائتیں اختیاری شکل میں ملیں گی اس وقت تک صرف نیک خیالی کی بنیاد پر ان کی حالت میں سدھار نہیں ہو سکتا اپنی خوشی سے بے غرض بن جانا تو مستثنیات میں سے ہے۔ میں خود اچھا خیال رکھتے ہوئے بھی اپنا سوارتھ نہیں چھوڑ سکتا اور چاہتا ہوں کہ ہمارے طبقے کو حکومت کی طاقت اور طرز عمل کے ذریعے سے اپنا سوارتھ چھوڑ دینے کے لئے مجبور کر دیا جائے۔ اُسے آپ بزدلی کہیں گے، میں مجبوری کہتا ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ کسی کو بھی دوسروں کی محنت پر موٹے ہونے کا حق نہیں ہے۔ دوسروں کے بل پر جینا انتہائی بے غیرتی ہے۔ کام کرنا جملہ جانداروں کا دھرم ہے۔ سماج کی وہ تنظیم تدوین جس میں کچھ لوگ مفت مزے اڑائیں اور بیشتر آدمی مرا کھپا کریں، کبھی راحت بخش نہیں ہو سکتی۔ پونجی اور تعلیم جسے میں پونجی ہی کا ایک پہلو سمجھتا ہوں ان کا گڑھ جتنی جلد ٹوٹ جائے اتنا ہی اچھا۔ جنہیں پیٹ بھر روٹی میسر نہیں ان کے افسر دس دس پانچ پانچ ہزار پاتے ہیں۔ یہ ہنسنے کے قابل ہے اور شرم کے بھی! اس نظام نے ہم زمینداروں میں کتنی عیش پسندی، کتنی بد چلنی، کتنی غلامی اور کتنی بے شرمی بھر دی ہے، یہ میں خوب جانتا ہوں مگر میں

ان ہی وجوہ سے اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ میرا تو یہ کہنا ہے کہ اپنے سوارتھ کے خیال سے بھی اُس کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔ اس شان کو نبھانے کے لئے ہمیں اپنے ضمیر کا اتنا خون کرنا پڑتا ہے کہ ہم میں خودداری کا نام بھی نہیں رہ گیا ہے۔ ہم اپنے آسامیوں کو لوٹنے کے لئے مجبور ہیں۔ اگر افسروں کو قیمتی قیمتی ڈالیاں نہ دیں تو باغی سمجھے جائیں اور شان و شوکت سے نہ رہیں تو کنجوس کہلائیں۔ انقلابی تحریک کی ذراسی آہٹ پر ہم کانپ اٹھتے ہیں اور افسروں کے پاس فریاد لے کر دوڑتے ہیں کہ ہمیں بچائیے۔ ہمیں اپنے پر اعتبار نہیں رہا اور نہ ہم میں مردانگی ہی رہ گئی ہے۔ بس ہماری حالت ان بچوں کی سی ہے نہیں چمچ سے دودھ پلا کر پالا جاتا ہے دیکھنے میں موٹے مگر واقعی کمزور، بے بس اور محتاج!

مہتا نے تالی بجا کر کہا، "ہیرا! آپ کی زبان میں جتنی عقل ہے کاش اس کی نصف بھی دماغ میں ہوتی! افسوس یہی ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ اپنے خیالات پر عمل نہیں کر سکتے۔"

اونکار ناتھ بولے "اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا، مسٹر مہتا! ہمیں وقت کے ساتھ چلنا بھی ہے اور اسے اپنے ساتھ چلانا بھی۔ بڑے ہی کاموں میں مدد کی ضرورت نہیں ہوتی، اچھے کاموں کے لئے بھی مدد کی اتنی ہی ضرورت ہے آپ ہی کیوں آٹھ سو روپے مہینے ہڑپ کرتے ہیں۔ جب کہ آپ کے کروڑوں بھائی صرف اٹھ روپئے میں اپنا بناہ کر رہے ہیں۔"

رائے صاحب نے ظاہرا افسوس لیکن باطنی اطمینان سے ایڈیٹر صاحب کو دیکھا اور بولے "شخصی باتوں کی تنقید نہ کیجئے، ایڈیٹر صاحب! ہم یہاں سماج کے نظام پر غور کر رہے ہیں۔"

مسٹر مہتا ویسے ہی ٹھنڈے دل سے بولے۔ "نہیں، میں اُسے برا نہیں سمجھتا۔ سماج

شخصوں سے بنتا ہے اور شخص کو بھول کر ہم کسی نظام پر غور نہیں کر سکتے۔ اس لئے اتنی تنخواہ لیتا ہوں کہ میرا اس نظام پر اعتقاد نہیں ہے۔"

ایڈیٹر صاحب کو حیرت ہوئی۔ "اچھا تو آپ موجودہ نظام کے حامی ہیں؟"

"میں اس اصول کا حامی ہوں کہ دنیا میں چھوٹے بڑے ہمیشہ رہیں گے اور انہیں ہمیشہ رہنا چاہیئے۔ اسے مٹانے کی کوشش کرنا بنی نوع انسان کی تباہی کا موجب ہوگا۔"

کشتی کا جوڑ بدل گیا۔ رائے صاحب الگ کھڑے ہو گئے اور ایڈیٹر صاحب اکھاڑے میں اُترے۔ "آپ اس بیسویں صدی میں اعلیٰ ادنیٰ کا فرق مانتے ہیں؟"

"جی ہاں، مانتا ہوں، اور بڑے زوروں سے مانتا ہوں۔ جس مت کو آپ مانتے ہیں وہ بھی تو کوئی نیا مت نہیں ہے۔ جب سے انسان میں خودی کا ارتقاء ہوا جبھی سے اس مت کا جنم ہوا۔ بدھ اور افلاطون اور عیسیٰ سبھی سماج میں مساوات کے مبلغ تھے۔ یونان اور روم اور شام سبھی نے اس کی آزمائش کی مگر غیر قدرتی ہونے کے سبب کبھی وہ دیرپا نہ رہ سکی۔"

"آپ کی باتیں سن کر مجھے تعجب ہوتا ہے۔"

"تعجب نادانی کا دوسرا نام ہے۔"

"میں آپ کا شکرگزار ہوں گا اگر آپ اس پر مضامین کا کوئی سلسلہ شروع کر دیں۔"

"جی! میں اتنا احمق نہیں ہوں۔ اچھی رقم دلائیے تو البتہ۔"

"آپ نے اصول ہی ایسا لیا ہے کہ علانیہ عوام کو لوٹ سکتے ہیں۔"

"مجھ میں اور آپ میں فرق اتنا ہی ہے کہ میں جو کچھ مانتا ہوں اس پر عمل کرتا ہوں اور آپ لوگ مانتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔ دولت کو آپ کسی بے انصافی

کے ذریعہ برابر پھیلا سکتے ہیں مگر عقل، کردار، خوبصورتی، ذہانت اور طاقت کو برابر پھیلا دینا تو آپ کی سکت سے باہر ہے۔ چھوٹے بڑے کا فرق صرف دولت ہی سے نہیں ہوتا۔ میں نے بڑے بڑے دولت مندوں کو فقیروں کے سامنے گھٹنے ٹیکتے دیکھا ہے اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ حسن کے چوکھٹ پہ بڑے بڑے راجے ناک رگڑتے ہیں۔ کیا یہ تمدنی افتراق نہیں ہے؟ آپ روس کی مثال دیں گے۔ وہاں اس کے سوا اور کیا ہے کہ مِل کے مالک نے سرکاری نوکر کا روپ لے لیا ہے؟ عقل پہلے بھی حکومت کرتی تھی اور آگے بھی ہمیشہ کرے گی۔"

طشتری میں پان آ گئے تھے۔ رائے صاحب نے مہمانوں کو پان، الائچی دیتے ہوئے کہا "عقل اگر خود غرضی سے بری ہو تو ہمیں اس کا اقتدار ماننے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ سوشلزم کا یہی معیار ہے۔ ہم سادھو مہاتماؤں کے سامنے اسی لئے سر جھکاتے ہیں کہ ان میں تیاگ کا بل ہے۔ اسی طرح ہم عقل کے ہاتھ میں اختیار بھی دینا چاہتے ہیں، وقار بھی، اور لیڈری بھی، مگر دولت کبھی نہیں! عقل، اختیار اور وقار شخص کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے لیکن اس کی دولت بس بونے کے لئے اس کے بعد اور بھی طاقتور ہو جاتی ہے۔ عقل کے بغیر کوئی سماج نہیں چل سکتا۔ ہم تو صرف اس بچھو کا ڈنک توڑ دینا چاہتے ہیں۔"

دوسرا موٹر آ پہنچا اور مسٹر کھنا اُترے جو ایک بینک کے منیجر اور شکر مل کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ دو عورتیں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ رائے صاحب نے ان دونوں کو اُتارا۔ جو کھدر کی ساڑی پہنے ہوئے بہت متین، دور اندیش سی ہیں۔ مسٹر کھنا کی بیوی کامنی کھنا ہیں۔ دوسری جو اونچی ایڑی کا بوٹ پہنے ہوئے ہیں اور جن کے حسین چہرے سے ہنسی پھوٹی پڑتی ہے، مس مالتی ہیں جو انگلستان

سے ڈاکٹری پڑھ کر آئی ہیں اور اب پریکٹس کرتی ہیں۔ تعلق داروں کے محلوں میں اُن کی بڑی آمد و رفت ہے۔ آپ نئے جگ کی مجسم مورت ہیں۔ نازک اندام مگر شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی، جھجک کا کہیں نام بھی نہیں۔ وضع میں مکمل بلا کی حاضر جواب، مردانہ جذبات کی ماہر، کھیل کود کو زندگی کا ماحصل سمجھنے والی، لبھانے اور رجھانے کے فن میں طاق، جہاں روح کا مقام ہے وہاں ظاہر داری، جہاں دل کی جگہ ہے وہاں ناز و انداز، دلی جذبات پر اچھا قابو جس میں رغبت یا خواہش کا فقدان سا ہو گیا ہے!

آپ نے مسٹر مہتا سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا " سچ کہتی ہوں، آپ صورت سے فلسفی معلوم ہوتے ہیں۔ اس نئی کتاب میں آتما کے ماننے والوں کو اُدھیڑ کر رکھ دیا ہے، پڑھتے پڑھتے کئی بار دل میں آیا کہ آپ سے لڑ جاؤں۔ فلاسفروں میں ہمدردی کیوں نہیں ہوتی؟"

مہتا صاحب جھینپ گئے، کنوارے تھے اور نئے جگ کی عورتوں سے پناہ مانگتے تھے، مردوں کی جماعت میں خوب چہکتے تھے مگر جیوں ہی کوئی عورت آئی اور آپ کی زبان بند ہوئی، جیسے عقل پر قفل لگ جاتا تھا۔ عورتوں سے مہذبانہ سلوک تک کرنے کا ہوش نہ رہتا تھا۔

مسٹر کھنا نے پوچھا " فلاسفروں کی صورت میں کیا خاص بات ہوتی ہے، دیوی جی؟"

مالتی نے مہتا کی طرف رحم سے دیکھ کر کہا " مہتا جی بُرا نہ مانیں تو بتا دوں۔"

کھنا صاحب مس مالتی کے پرستاروں میں سے تھے، جہاں مس مالتی جائیں وہاں کھنا کا پہنچنا لازمی تھا۔ ان کے آس پاس بھونرے کی طرح منڈلاتے رہتے تھے۔ ہر وقت اُن کی یہی خواہش رہتی تھی کہ مالتی سے زیادہ سے زیادہ وہی بولیں اور

اس کی نگاہ زیادہ سے زیادہ ان ہی پر ہے۔

کھنّا نے آنکھ جھپکا کر کہا "فلسفی کسی کی بات کا جواب نہیں مانتے ان میں یہی تو وصف ہے"

"تو سنئے۔ فلسفی ہمیشہ مردہ دل ہوتے ہیں۔ جب دیکھئے اپنے خیالوں میں غرق بیٹھے ہیں! آپ کی طرف تاکیں گے مگر آپ کو دیکھیں گے نہیں، آپ ان سے باتیں کئے جایئے لیکن وہ کچھ سُنیں گے نہیں، جیسے خلا میں اُڑ رہے ہوں"

سب لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ مہتا صاحب گویا زمین میں گڑ گئے!

"آکسفورڈ میں میرے فلسفہ کے پروفیسر مسٹر ہسبینڈ تھے......"

کھنّا نے ٹوکا "نام تو نرالا ہے"

"جی ہاں، اور تھے کنوارے......"

"مسٹر مہتا بھی تو کنوارے......"

"یہ روگ سبھی فلاسفروں کو ہوتا ہے"

اب مہتا کو موقع ملا۔ بولے "آپ بھی تو اسی مرض میں مبتلا ہیں؟"

میں نے عہد کیا ہے کہ کسی فلاسفر ہی سے شادی کروں گی اور یہ طبقہ شادی کے نام سے گھبراتا ہے ہسبینڈ صاحب عورت کو دیکھ کر گھر میں چھپ جاتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں کئی لڑکیاں تھیں۔ اگر ان میں سے کوئی کبھی کچھ پوچھنے کے لئے ان کے دفتر میں چلی جاتی تو آپ ایسے گھبرا اُٹھتے جیسے کوئی شیر آگیا ہو۔ ہم لوگ انہیں خوب چھیڑتے تھے مگر تھے بیچارے بڑے ہی سادہ مزاج کئی ہزار کی آمدنی تھی مگر میں نے انہیں سدا ایک ہی سوٹ پہنے دیکھا۔ ان کی ایک بیوہ بہن تھی۔ وہی ان کے گھر کا سارا انتظام کرتی تھی۔ مسٹر ہسبینڈ کو تو کھانے پینے کی فکر ہی نہ رہتی تھی۔ ملنے والوں کے ڈر سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے لکھا

پڑھا کرتے تھے۔ کھانے کا وقت آجاتا تو ان کی بہن اندر کے دروازے سے ان کے پاس جا کر ان کی کتاب بند کر دیتی تھی، جبھی انہیں معلوم ہوتا تھا کہ کھانے کا وقت آگیا۔ رات کو بھی کھانے کا وقت مقرر تھا۔ ان کی بہن کمرے کی بتی بجھا دیا کرتی۔ ایک دن بہن نے کتاب بند کرنا چاہا تو آپ نے اُسے دونوں ہاتھ سے دبا لیا اور بہن بھائی میں زور آزمائی ہونے لگی۔ آخر بہن ان کی پہئے دار کرسی کو کھینچ کر کھانے کے کمرے میں لے گئی۔"

رائے صاحب بولے "مگر مہتا صاحب تو بڑے خلیق اور خوش مزاج ہیں۔ ورنہ اس ہنگامے میں کیوں آتے؟"

"تو آپ فلاسفر نہ ہوں گے۔ جب اپنے تفکرات سے ہمارے سر میں درد ہونے لگتا ہے تو پھر دنیا بھر کی فکر سر پر سوار کر کے کوئی کیسے خوش رہ سکتا ہے؟"

اُدھر ایڈیٹر صاحب مسز کھنا صاحب سے اپنی مالی پریشانیوں کی داستان کہہ رہے تھے "بس یوں سمجھئے شریمتی جی کہ ایڈیٹر کی زندگی ایک طویل فریاد ہے جسے سن کر لوگ رحم کے عوض کانوں پر ہاتھ دھر لیتے ہیں بیچارہ نہ اپنا بھلا کر سکتا ہے نہ دوسروں کا۔ پبلک اُس سے اُمید تو یہ رکھتی ہے کہ ہر تحریک میں وہ سب سے آگے رہے، جیل جائے، مار کھائے، گھر کا مال اسباب قرق کرائے، یہ اُس کا فرض سمجھا جاتا ہے، مگر اس کی مشکلات کی طرف کسی کو توجہ نہیں۔ ہو تو وہ سب کچھ اسے ہر علم و فن کا ماہر ہونا چاہیئے، مگر اُسے زندہ رہنے کا حق نہیں۔ آپ تو آج کل کچھ لکھتی ہی نہیں۔ خوش نصیبی سے آپ کی خدمت کرنے کا جو تھوڑا بہت موقع مجھے مل سکتا ہے، اُس سے آپ مجھے کیوں محروم رکھتی ہیں؟"

مسز کھنا کو شعر گوئی کا شوق تھا۔ اس ناتے سے ایڈیٹر صاحب کبھی کبھی اُن

سے مل آیا کرتے تھے۔ لیکن گھر کے کام دھندوں میں لگے رہنے کے سبب ادھر بہت دنوں سے وہ کچھ لکھ نہ سکی تھیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ایڈیٹر صاحب ہی نے انہیں حوصلہ دلا کر شاعر بنایا تھا۔ فطری ذکاوت ان میں بہت کم تھی۔

"کیا لکھوں؟ کچھ سوجھتا ہی نہیں! آپ نے کبھی مس مالتی سے کچھ لکھنے کو نہیں کہا؟"

ایڈیٹر صاحب نے بے رخی سے کہا۔ "ان کا وقت قیمتی ہے، کامنی دیوی! لکھنے تو وہ لوگ ہیں جن کے دل میں کچھ درد ہے، پریم ہے، لگن ہے اور گیان ہے جنہوں نے دولت اور عیش و عشرت کی زندگی کا مقصد بنا لیا وہ کیا لکھیں گے؟"

کامنی نے حسد آمیز تمسخر سے کہا "اگر آپ اُن سے لکھا سکیں تو آپ کے اخبار کی اشاعت دوگنی ہو جائے۔ لکھنؤ میں تو ایسا کوئی طبیعت دار نہیں ہے جو آپ کا گاہک نہ بن جائے۔"

"اگر دولت میری زندگی کا مقصد ہوتی تو آج میں اس حالت میں نہ ہوتا۔ مجھے بھی دھن کمانے کا ڈھنگ معلوم ہے۔ آج چاہوں تو لاکھوں کما سکتا ہوں۔ مگر یہاں تو دولت کو کبھی کچھ سمجھا ہی نہیں۔ ادبی خدمت میری زندگی کا مقصد ہے۔ اور رہے گا۔"

"کم سے کم میرا نام تو گاہکوں میں لکھا دیجئے"

"آپ کا نام گاہکوں نہیں، مربیوں میں لکھوں گا۔"

"مربیوں میں رانیوں مہارانیوں کو رکھئے۔ جن کی ذرا سی خوشامد کر کے آپ اپنے اخبار کو نفع کی چیز بنا سکتے ہیں۔"

"میری رانی مہارانی آپ ہیں۔ میں تو آپ کے سامنے کسی رانی مہارانی کی حقیقت نہیں سمجھتا۔ جس میں دیا اور گیان ہے وہ میری رانی مہارانی ہے، خوشامد

سے مجھے نفرت ہے۔"

کامنی نے چٹکی لی، "لیکن میری خوشامد تو آپ کر رہے ہیں ایڈیٹر صاحب!"

ایڈیٹر نے متانت سے عقیدت سے بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ خوشامد نہیں ہے، شریمتی جی! دل کے سچے جذبات ہیں۔"

منسٹر صاحب نے پکارا۔ "ایڈیٹر صاحب ذرا ادھر آیئے گا، مس مالتی آپ سے کچھ کہتی ہیں۔"

ایڈیٹر کی وہ سب اکڑ غائب ہو گئی، عجز و انکسار کی مورت بنے ہوئے جا کر کھڑے ہو گئے۔ مالتی نے انہیں ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "میں ابھی کہہ رہی تھی کہ دنیا میں مجھے سب سے زیادہ ڈر ایڈیٹروں سے لگتا ہے۔ آپ لوگ جسے چاہیں ایک منٹ میں بگاڑ دیں۔ مجھی سے چیف سکریٹری صاحب نے ایک دفعہ کہا۔ "اگر میں اس بلاڈی اونکار ناتھ کو جیل میں بند کر سکوں تو خود کو خوش نصیب سمجھوں۔"

اونکار ناتھ کی بڑی بڑی مونچھیں تن گئیں اور آنکھوں میں غرور کی چمک آ گئی یوں وہ بڑے متحمل مزاج آدمی تھے مگر چیلنج سن کر ان کی مردانگی متحرک ہو جاتی تھی۔ استقلال کے لہجے میں بولے۔ "اس مہربانی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اس بزم میں اپنا ذکر تو ہوتا ہے خواہ کسی طرح ہو۔ آپ سکریٹری صاحب سے کہہ دیجئے گا کہ اونکار ناتھ ان آدمیوں میں نہیں ہیں جو ان گیدڑ بھبکیوں سے ڈر جائیں۔ اس کا قلم اسی وقت رکے گا جب اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس نے بے انصافی اور ظلم کو جڑ سے کھود کر پھینک دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔"

مس مالتی نے اور اکسایا۔ "مگر آپ کا یہ وطیرہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب آپ معمولی خوش اطواری سے حکام کی مدد حاصل کر سکتے ہیں تو کیوں ان سے کنی کاٹتے

میں ؟ اگر آپ اپنی تنقیدوں میں آگ اور زہر ذرا کم کر دیں تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں آپ کو سرکار سے کافی مدد دلا سکتی ہوں۔ پبلک کو تو آپ نے دیکھ لیا، اُس سے اپیل کی، اس کی خوشامد کی، اپنی مشکلیں کہیں، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب ذرا حکام کو بھی آزما دیکھئے۔ تیسرے مہینے آپ موٹر پر نہ چلنے لگیں اور سرکاری دعوتوں میں مدعو نہ ہونے لگیں تو مجھے آپ جتنا چاہے کوسئے گا۔ تب یہی رئیس اور نیشنلسٹ جو آپ کی پرواہ نہیں کرتے آپ کے مکان کا طواف کریں گے۔"

اونکار ناتھ نے گھمنڈ سے کہا "یہی تو میں نہیں کر سکتا دیوی جی۔ میں نے اپنے اصولوں کو ہمیشہ بلند اور پاک رکھا ہے اور جیتے جی ان کی حفاظت کروں گا۔ دولت کے پجاری تو گلی گلی ملیں گے، میں اصول کے پجاریوں میں ہوں۔"

"میں اسے مکر کہتی ہوں۔"

"آپ کی خوشی!"

"دھن کی آپ کو پرواہ نہیں؟"

"اصولوں کا خون کر کے نہیں"

"تو آپ کے اخبار میں بدیسی چیزوں کے اشتہار کیوں ہوتے ہیں؟ میں نے کسی بھی اور اخبار میں اتنے بدیسی اشتہار نہیں دیکھے۔ آپ بنتے تو ہیں بڑے اصول پرست مگر اپنے نفع کے لئے دیس کا دھن بدیس بھیجتے ہوئے آپ کو ذرا بھی رنج نہیں ہوتا۔ آپ کسی دلیل سے اپنے اس طرز کو حق بجانب نہیں قرار دے سکتے۔"

اونکار ناتھ کے پاس سچ مچ کوئی جواب نہ تھا۔ انہیں بغلیں جھانکتے دیکھ کر رائے صاحب نے اُن کی مدد کی "تو آخر آپ کیا چاہتی ہیں؟ ادھر سے بھی مارے جائیں اور اُدھر سے بھی مارے جائیں تو اخبار کیسے چلے؟"

مس مالتی نے رحم کرنا نہ سیکھا تھا بولی "اخبار نہیں چلتا تو بند کر دیجئے۔ اپنا اخبار

چلانے کے لئے آپ کو بدیسی چیزوں کے پرچار کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر آپ مجبور ہیں۔ تو اصول کا ڈھونگ چھوڑ دیجئے۔ میں تو اصول پرست اخباروں کو دیکھ کر جل اٹھتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ دیا سلائی دکھا دوں۔ جو شخص قول فعل میں یکسانیت نہیں رکھتا وہ اور چاہے جو کچھ ہو اصول پرست نہیں ہے۔"

مہتا کھل اُٹھے، ذرا دیر قبل انہوں نے خود اسی خیال کو پیش کیا تھا۔ انہیں معلوم ہوا کہ اس عورت میں سوچنے کی سکت بھی ہے۔ یہ صرف تتلی نہیں ہے۔ تامل دور ہو گیا۔ بولے "یہی بات میں ابھی کہہ رہا تھا قول فعل میں یکسانیت کا نہ ہونا ہی دغا ہے، مکاری ہے۔"

مالتی خوش ہو کر بولی "تو اس بارے میں آپ اور ہم ایک ہیں، تو میں بھی فلاسفر ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہوں۔"

کھنا کی زبان کھجلا رہی تھی بولے "آپ کا ایک ایک عضو فلسفے میں ڈوبا ہوا ہے۔"

مالتی نے ان کی راس کھینچی "اچھا آپ کو بھی فلسفے میں دخل ہے؟ میں تو سمجھتی تھی کہ آپ بہت پہلے اپنے فلسفے کو گنگا جی کے حوالے کر بیٹھے ورنہ آپ اتنے بینکوں اور کمپنیوں کے ڈائرکٹر نہ ہوتے۔"

رائے صاحب نے کھنا کو سہارا دیا "تو کیا آپ سمجھتی ہیں کہ فلاسفروں کو ہمیشہ فاقہ مست رہنا چاہیئے؟"

"جی ہاں! فلاسفر اگر رغبت پہ فتح نہ پا سکے تو فلاسفر کیسا؟"

"اس لحاظ سے تو شاید مہتا صاحب بھی فلاسفر نہ ٹھہریں۔"

مہتا نے آستین سی چڑھا کر کہا "میں نے تو کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا، رائے صاحب میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ جن اوزاروں سے لوہار کام کرتا ہے اُن اوزاروں سے

سنار نہیں کرتا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آدم بھی اسی حالت میں پڑے رہے جیسے ببول یا تاڑ؟ میرے لئے دولت صرف اُن آسانیوں کا نام ہے جن میں میں اپنی زندگی کو بامعنی بنا سکوں۔ دولت میرے لئے بڑھنے اور پھولنے پھلنے والی چیز نہیں بلکہ صرف ذریعہ ہے۔ مجھے دولت کی بالکل خواہش نہیں، آپ صرف ویسے ذرائع مہیا کریں۔ جن سے اپنی زندگی کو کام کی چیز بنا سکوں۔"

اونکار ناتھ سوشلسٹ تھے شخصی فضیلت کو کیسے مان سکتے تھے؟ "اسی طرح ہر مزدور کہہ سکتا ہے کہ اُسے کام کرنے کی آسانیوں کی غرض سے ایک ہزار ماہوار کی ضرورت ہے۔"

"اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس مزدور کے بغیر آپ کا کام نہیں چل سکتا تو آپ کو وہ آسانیاں دینی پڑیں گی۔ اگر وہی کام دوسرا مزدور کم مزدوری میں کر دے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ پہلے مزدور کی خوشامد کریں۔"

"اگر مزدوروں کے ہاتھ میں اختیار ہوتا تو مزدوروں کے لئے عورت اور شراب بھی اتنی ہی ضروری ہو جاتیں جتنی فلاسفروں کے لئے؟"

"تو آپ یقین کیجئے میں ان سے حسد نہ کرتا۔"

"جب آپ کی زندگی بامعنی ہونے کے لئے عورت اس قدر ضروری ہے تو آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

مہتا نے بے تامل کہا "اسی لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ آزادانہ عیش کوشی روح کے ارتقا میں رکاوٹ نہیں ڈالتی۔ شادی تو روح اور زندگی کو پنجرے میں بند کر دیتی ہے۔"

کھنّا نے تائید کی "پابندی اور نفس کشی پرانی تھیوریاں ہیں، نئی تھیوری ہے آزادانہ عیش کوشی۔"

مالتی نے چوٹی پکڑی "تو اب مسز کھنا کو طلاق کے لئے تیار رہنا چاہیئے؟"

"طلاق کا بل پاس تو ہو"

"شاید اس کا اولین استعمال آپ ہی کریں گے؟"

"کامنی نے مالتی کی طرف زہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور منہ سکیڑ لیا گویا کہہ رہی ہوں "کھنا تمہیں مبارک رہیں مجھے پروا نہیں"

مالتی نے مہتا کی طرف دیکھ کر کہا "اس بارے میں آپ کا خیال ہے۔ مسٹر مہتا؟"

مہتا متین بن گئے۔ وہ کسی مسئلے پر اپنی رائے دیتے تھے تو گویا اپنی کل جان اسی میں ڈال دیتے تھے۔ بولے "بیاہ کو میں سماجی سمجھوتہ سمجھتا ہوں، جسے رد کرنے کا اختیار نہ مرد کو ہے، نہ عورت کو۔ سمجھوتہ کرنے سے پہلے آپ آزاد ہیں مگر اس کے بعد آپ کے ہاتھ کٹ جاتے ہیں"

"تو آپ طلاق کے خلاف ہیں۔ کیوں؟"

"بالکل"

"اور آزادانہ عیش پرستی والا اصول؟"

"وہ ان کے لئے ہے جو بیاہ نہیں کرنا چاہتے"

"اپنی روح کا کامل ارتقا بھی چاہتے ہیں۔ مگر ایسے بہت کم ہیں جو لالچ کو روک سکیں"

"آپ بہتر کسے سمجھتے ہیں ازدواج کو یا تجرد کو؟"

"سماجی اختیار سے ازدواج کو اور شخصی نقطۂ خیال سے تجرد کو"

دھنش یگیہ کا وقت قریب تھا دس سے ایک بجے تک دھنش یگیہ اور ایک سے تین بجے تک ناٹک یہ پروگرام تھا۔ کھانے کی تیاری شروع ہوئی مہمانوں

کے لئے بنگلے میں الگ الگ رہنے کا انتظام تھا۔

کھنّا صاحب اور ان کی پارٹی کے لئے دو کمرے تھے اور بھی کتنے ہی مہمان آ گئے تھے۔ سبھی اپنے اپنے کمرے میں گئے اور کپڑے بدل بدل کر دسترخوان پر جا بیٹھے۔ یہاں چھوت چھات کا کوئی ذکر نہ تھا۔ سبھی ذات کے لوگ ایک ساتھ کھانا کھانے بیٹھے صرف اونکار ناتھ ایڈیٹر سب سے الگ اپنے کمرے میں پھلاہار کرنے چلے گئے اور کامنی کے سر میں درد تھا۔ اس نے کھانے سے انکار کر دیا تھا کھانے کے وقت مہمانوں کی تعداد پچیس سے کم نہ تھی، گوشت بھی تھا۔ اس جلسے کے لئے رائے صاحب عمدہ قسم کی شراب خاص طور پر تیار کراتے تھے۔ گوشت بھی کئی طرح کا پکتا تھا، کوفتہ، کباب اور پلاؤ، مرغ، بکرا، ہرن، تیتر، بیٹر جیسے جو پسند ہو، کھائے۔

کھانا شروع ہو گیا تو مالتی نے پوچھا" ایڈیٹر صاحب کہاں گئے؟ کسی کو بھیجئے رائے صاحب، کہ انہیں پکڑ لائے" رائے صاحب نے کہا" وہ ویشنو ہیں، انہیں یہاں بلا کر کیوں بے چارے کا دھرم بگاڑو گی۔ بڑا ہی دھرم کرم والا آدمی ہے"

"آج اور کچھ نہ سہی، تماشہ تو رہے گا"

یکایک ایک صاحب کو انہوں نے دیکھ کر پکارا" آپ بھی تشریف رکھتے ہیں، مرزا خورشید! اچھا، یہ کام آپ کے سپرد۔ آپ کی لیاقت کا امتحان ہو جائے گا"

مرزا خورشید گورے چٹے آدمی تھے، بھوری مونچھیں، نیلی آنکھیں، دوہرا بدن، چاند پر کے بال صفاچٹ، چھ کلیا اچکن اور چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے۔ اوپر سے ہیٹ لگا لیتے تھے۔ کونسل کے ممبر تھے مگر وہاں بیشتر اوقات خراٹے ہی لیتے رہتے تھے۔ رائے دینے کے وقت چونک پڑتے تھے اور نیشنلسٹوں کی طرف

بے بول دیتے تھے۔ صوفی تھے، دو بار حج کر آئے تھے مگر شراب خوب پیتے تھے۔ کہتے تھے کہ جب ہم خدا کا ایک حکم بھی کبھی نہیں مانتے تو دین کے لیے کیوں جان دیں؟ بڑے پُر مذاق اور لا اُبالی انسان تھے۔ پہلے بصرے میں ٹھیکے کا کام کرتے تھے۔ لاکھوں کمائے مگر شامتِ اعمال کہ ایک میم سے آشنائی کر بیٹھے، مقدمہ بازی ہوئی، جیل جاتے جاتے بچے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر ملک سے نکل جانے کا حکم ہوا۔ جو کچھ جہاں تھا وہیں چھوڑا اور صرف پچاس ہزار لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بمبئی میں ان کے ایجنٹ تھے۔ سوچا تھا کہ ان سے حساب کتاب کر لیں گے اور جو کچھ نکلے گا اُسی میں زندگی کاٹ دیں گے۔ مگر ایجنٹوں نے جعل کر کے اُن سے وہ پچاس ہزار بھی اینٹھ لئے۔ نراس وہاں سے لکھنؤ چلے۔ گاڑی میں ایک مہاتما سے ملاقات ہوئی۔ مہاتما نے انہیں سبز باغ دکھا کر ان کی گھڑی، انگوٹھیاں اور روپے سب اڑا دئے۔ بیچارے لکھنؤ پہنچے تو جسم کے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ رائے صاحب سے دیرینہ مراسم تھے۔ کچھ ان کی مدد سے کچھ اور دوستوں کی مدد سے ایک جوتے کی دُکان کھول لی جو اَب لکھنؤ کی سب سے زیادہ چلتی ہوئی دکان تھی۔ چار پانچ سو روزانہ کی بکری تھی۔ عوام کو ان پر چند ہی روز میں اتنا اعتقاد ہو گیا تھا کہ ایک بڑے بھاری مسلم تعلقدار کو نیچا دکھا کر کونسل میں پہنچ گئے تھے۔ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بولے "جی نہیں، میں کسی کا دین نہیں لیتا پھرتا۔ یہ کام آپ کو خود کرنا چاہیئے۔ مزا تو جب ہے کہ آپ انہیں شراب پلا کر چھوڑیں۔ یہ آپ کے معجزۂ حسن کی آزمائش ہے۔"

چاروں طرف سے آوازیں آئیں "ہاں ہاں، مس مالتی! آج اپنا کمال دکھلایئے۔"

مالتی نے مرزا کو للکارا "کچھ انعام دو گے؟"

"سو روپئے کی تھیلی"

"ہش، سو روپئے، لاکھ روپئے کا دھرم بگاڑوں سو کے لئے؟"

"اچھا آپ خود اپنی فیس بتائیے؟"

"ایک ہزار کوڑی کم نہیں"

"اچھا منظور"

"جی نہیں لائیے مہتا صاحب کے ہاتھ میں رکھ دیجئے"

مرزا صاحب نے فوراً سو روپئے کا نوٹ جیب سے نکالا اور اُسے دکھاتے ہوئے کھڑے ہو کر بولے "بھائیو! یہ ہم سب مردوں کی عزت کا معاملہ ہے، اگر مس مالتی کی فرمائش نہ پوری ہوئی تو ہمارے لئے کہیں منہ دکھلانے کی جگہ نہ رہے گی اگر میرے پاس روپئے ہوتے تو میں مس مالتی کی ایک ایک ادا پر ایک ایک لاکھ روپئے قربان کر دیتا۔ ایک قدیم شاعر نے اپنے معشوق کے ایک ایک سیاہ خال پر سمرقند اور بخارا کے صوبے نچھاور کر دیئے تھے! آج آپ سبھی صاحبوں کی جوانمردی اور حسن پرستی کا امتحان ہے، جس کے پاس جو کچھ ہو سچے سورما کی طرح نکال کر رکھ دے۔ آپ کو علم کی قسم اور معشوق کی اداؤں کی قسم اور اپنی عزت کی قسم پیچھے قدم نہ ہٹائیے مردو! روپئے خرچ ہو جائیں گے مگر نام ہمیشہ کے لئے رہ جائے گا۔ ایسا تماشا لاکھوں میں بھی سستا ہے۔ دیکھئے لکھنؤ کے حسینوں کی ملکہ ایک زاہد پر اپنے حسن کا جادو کیسے چلاتی ہے!"

تقریر ختم کرتے ہی مرزا صاحب نے ہر ایک پاکٹ کی تلاشی شروع کر دی۔ پہلے مسٹر کھنّا کی تلاشی ہوئی ان کی جیب سے پانچ روپئے نکلے۔

مرزا صاحب نے اداس ہو کر کہا "واہ کھنّا صاحب واہ، نام بڑے درشن چھوٹے! اتنی کمپنیوں کے ڈائرکٹر، لاکھوں کی آمدنی اور آپ کی جیب میں پانچ روپئے!

لاحول ولاقوۃ! کہاں ہیں مہتا، آپ ذرا جا کر مسٹر کھنا سے کم سے کم سو دو سو روپے وصول کر لائیے۔"
کھنا کھسیا کر بولے "اجی اُن کے پاس ایک پیسہ بھی نہ ہوگا۔ کون جانتا تھا کہ آپ یہاں تلاشی لینا شروع کر دیں گے۔"
"خیر اب خاموش رہیے، ہم اپنی قسمت تو آزما لیں۔"
"اچھا تو میں جا کر ان سے پوچھتا ہوں۔"
"جی نہیں، آپ یہاں سے ہل نہیں سکتے۔ مسٹر مہتا آپ فلاسفر ہیں، ماہر علم النفس، دیکھئے اپنی بھد نہ کرائیے گا۔"
مہتا شراب پی کر مست ہو جاتے تھے تو اُس مستی میں اُن کا فلسفہ اُڑ جاتا تھا اور زندہ دلی جاگ اٹھتی تھی۔ لپک کر مسٹر کھنا کے پاس گئے اور پانچ ہی منٹ میں منہ لٹکائے لوٹ آئے۔
مرزا نے پوچھا "ارے کیا خالی ہاتھ؟"
رائے صاحب ہنسے "قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے!"
مرزا نے کہا "ہو بڑے خوش نصیب کھنا، خدا کی قسم!"
مہتا نے قہقہہ لگایا اور جیب سے سو سو روپے کے پانچ نوٹ نکالے۔
مرزا نے دوڑ کر انہیں گلے لگا لیا۔
چاروں طرف سے آوازیں اٹھیں "کمال ہے! مانتا ہوں استاد! کیوں نہ ہو فلاسفر ہی تو ٹھہرے!"
مرزا نے نوٹوں کو آنکھوں سے لگا کر کہا "بھئی مہتا! آج سے میں تمہارا مرید ہو گیا۔ بتاؤ کیا جادو مارا؟"
مہتا اکڑ کر سرخ سرخ آنکھوں سے تاکتے ہوئے بولے "اجی کچھ نہیں۔ ایسا کون سا بڑا کام تھا؟ جا کر پوچھا، اندر آؤں؟ بولے آپ ہیں مہتا! آئیے۔ میں نے اندر جا کر کہا، وہاں لوگ برج کھیل رہے ہیں۔ مانگی پانچ سو

روپئے ہار گئی ہیں اور اپنی انگوٹھی بیچ رہی ہیں جو ہزار سے کم نہیں ہے۔ آپ نے تو دیکھا ہے بس وہی۔ آپ کے پاس روپئے ہوں تو پانچ سو دے کر ایک ہزار کی چیز لے لیجئے۔ ایسا موقع پھر نہ ملے گا۔ مس مالتی نے اس وقت روپئے نہ دیئے تو بے داغ نکل جائیں گی بعد کو کون دیتا ہے؟ شاید اس لئے انہوں نے انگوٹھی نکالی ہو کہ پانچ سو روپئے کس کے پاس دھرے ہوں گے۔ یہ سن کر وہ مسکرائیں اور جھٹ پٹ اپنی تھیلی سے پانچ نوٹ نکال کر دے دیئے اور بولیں میں کچھ لئے بغیر گھر سے نہیں نکلتی، نہ جانے کب کیا ضرورت پڑ جائے۔"

کھنّا کھسیا کر بولے "جب ہمارے پروفیسروں کا یہ حال ہے تو یونیورسٹی کا ایشور ہی مالک ہے۔"

خورشید نے زخم پر نمک چھڑکا۔ "ارے تو ایسی کون سی بڑی رقم ہے جس کے لئے آپ کا دل بیٹھا جاتا ہے؟ ذرا جھوٹ نہ کہلائیے تو یہ آپ کی ایک دن کی آمدنی ہے۔ بس سمجھ لیجئے گا ایک دن بیمار پڑ گئے۔ اور پھر روپیہ جائے گا بھی تو مس مالتی ہی کے ہاتھ میں اور آپ کے دردِ جگر کی دوا مس مالتی ہی کے پاس تو ہے۔" مالتی نے ٹھوکر دی۔ "دیکھئے مرزا جی، طویلے میں بتھاوج اچھی نہیں۔"

مرزا نے دم ہلائی۔ "کان پکڑتا ہوں، مس صاحبہ۔"

مسٹر ٹنخا کی تلاش ہوئی۔ مشکل سے دس روپئے نکلے۔ مہتا کی جیب سے صرف اٹھنی نکلی۔ کئی اصحاب نے ایک ایک دو دو روپئے اپنے آپ دے دیئے۔ حساب جوڑا گیا تو تین سو کی کمی تھی۔ یہ کمی رائے صاحب نے فراخ دلی کے ساتھ پوری کر دی۔

ایڈیٹر صاحب نے میوے اور پھل کھائے تھے اور ذرا کمر سیدھی کر رہے تھے کہ رائے صاحب نے جا کر کہا "آپ کو مس مالتی یاد کر رہی ہیں۔"

وہ خوش ہو کر بولے "زہے نصیب کہ مس مالتی مجھے یاد کر رہی ہیں"۔
رائے صاحب کے ساتھ ہال میں پہنچ گئے۔
ادھر نوکروں نے میزیں صاف کر دی تھیں۔ مالتی نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔
ایڈیٹر نے انکسار دکھایا، بولے "بیٹھئے، تکلف نہ کیجئے۔ میں اتنا بڑا آدمی نہیں ہوں"۔

مالتی نے عقیدت کے لہجہ میں کہا "آپ تکلف سمجھتے ہوں گے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ میں اپنی توقیر بڑھا رہی ہوں۔ یوں آپ اپنے کو کچھ نہ سمجھیں اور آپ کے لئے زیبا بھی یہی ہے، مگر یہاں جتنے لوگ جمع ہیں وہ سبھی آپ کی قومی اور ادبی خدمت سے خوب واقف ہیں۔ آپ نے اس دائرے میں جو اہم کام کیا ہے خواہ ابھی لوگ اُس کی قدر نہ کریں لیکن وہ وقت بہت دور نہیں ہے بلکہ میرے خیال سے بہت قریب آگیا ہے۔ جب ہر شہر میں آپ کے نام پر سڑکیں بنیں گی۔ کلب کھلیں گے اور ٹاؤن ہال میں آپ کی تصویر لٹکائی جائے گی۔ اس وقت جو کچھ دیش بیداری ہے وہ آپ ہی کی عظیم کوشش کا نتیجہ ہے۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ملک میں اب آپ کے ایسے مقلد پیدا ہو گئے ہیں جو "گرام سدھار" کے کام میں آپ کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہیں اور ان سب کی بڑی خواہش ہے کہ یہ کام سنگٹھن کے ساتھ کیا جائے اور اس کے لئے ایک گاؤں سدھار سبھا بنائی جائے جس کے آپ صدر ہوں"۔

اونکار ناتھ کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ انہیں چوٹی کے آدمیوں میں اتنی عزت ملے۔ یوں وہ عام جلسوں میں کبھی کبھی بولتے اور کئی سبھاؤں کے سکریٹری اور اسسٹنٹ سکریٹری بھی تھے مگر تعلیم یافتہ جماعت نے اب تک ان کی جانب سے بے اعتنائی برتی تھی ان لوگوں میں کسی طرح وہ مل جل نہ پاتے تھے اور اسی لئے

جلسوں میں اُن کی کاہلی اور خود غرضی کی شکایت کیا کرتے تھے اور اپنے اخبار میں ایک ایک کو دھر گھسیٹتے تھے۔ قلم تیز تھا، لکھے سخت تھے، صاف گوئی کے بجائے ہرزہ گوئی کر بیٹھتے تھے۔ اس لئے لوگ انہیں خالی ڈھول سمجھتے تھے اسی جماعت میں آج اُن کی اتنی عزت! کہاں ہیں آج "سوراج" اور "آزاد ہندوستان" اور "ہنٹر" کے ایڈیٹر؟ آکر دیکھیں اور اپنا کلیجہ ٹھنڈا کریں! آج یقیناً اُن پر دیوتاؤں کی مہربانی ہے۔ نیک کوشش کبھی بیکار نہیں جاتی! یہ رشیوں کا قول ہے وہ خود اپنی نظروں میں اٹھ گئے تھے، ممنونیت سے خوش ہو کر بولے "دیوی جی! آپ تو مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہی ہیں۔ میں نے تو عوام کی جو کچھ خدمت کی وہ اپنا فرض سمجھ کر کی، میں اس عزت کو ذاتی نہیں بلکہ اس مقصد کی عزت سمجھ رہا ہوں جس کے لئے میں نے اپنی زندگی قربان کر دی ہے۔ لیکن میری التجا ہے کہ صدر کا عہدہ کسی باعزت شخص کو دیا جائے۔ عہدہ پر میرا اعتقاد نہیں ہے، میں تو خادم ہوں اور خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

مس مالتی اسے کسی طرح قبول نہیں کر سکتیں — صدر پنڈت جی کو بننا پڑے گا۔ شہر میں ایسا با اثر آدمی دوسرا نہیں دکھائی دیتا جس کے قلم میں جادو ہے، جس کی زبان میں جادو ہے اور جس کی شخصیت میں جادو ہے وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ با اثر نہیں؟ وہ زمانہ گیا جب دولت اور اثر میں میل تھا۔ اب ذہانت اور اثر کے میل کا زمانہ ہے۔ ایڈیٹر صاحب کو وہ صدارت ضرور قبول کرنی ہوگی۔ سکریٹری مس مالتی ہوں گی۔ اس سبھا کے لئے ایک ہزار کا چندہ بھی ہو گیا ہے اور ابھی تو کل شہر اور صوبہ پڑا ہوا ہے۔ چار پانچ لاکھ مل جانا تو معمولی بات ہے!

اونکار ناتھ پر کچھ نشہ سا چڑھنے لگا۔ ان کے دل میں جو ایک طرح کی سنسنی اٹھ رہی تھی۔ اسی نے سنجیدہ ذمہ داری کی صورت کر لی۔ بولے "مگر آپ یہ سمجھ لیں مس مالتی کہ یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے اور آپ کو اپنا بہت وقت دینا پڑے گا۔

میں اپنی جانب سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سبھا کے مقام پر مجھے سب سے پہلے موجود پائیں گی۔"

مرزا صاحب نے پچھاڑ دیا۔" آپ کا بڑے سے بڑا دشمن بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ اپنا فرض ادا کرنے میں کبھی کسی سے پیچھے رہے ہے۔"

مس مالتی نے دیکھا کہ شراب کا اثر کچھ کچھ ہو رہا ہے تو اور بھی سنجیدہ ہو کر بولیں۔" اگر ہم لوگ اس کام کی اہمیت نہ سمجھتے تو نہ یہ سبھا قائم ہوتی اور نہ آپ اس کے پریسیڈنٹ ہوتے۔ ہم کسی رئیس یا تعلقدار کو پریسیڈنٹ بنا کر روپیہ خوب بٹور سکتے اور خدمت کی آڑ میں اپنا مطلب پورا سکتے ہیں۔ مگر ہمارا یہ مقصد نہیں ہے۔ ہمارا واحد مقصد عوام کی خدمت کرنا ہے اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ آپ کا اخبار ہے۔ ہم نے طے کر لیا ہے کہ شہر اور گاؤں میں اس کا پرچار کیا جائے اور جلد سے جلد اس کے گاہکوں کی تعداد بیس ہزار تک پہنچا دی جائے۔ صوبے کی کل میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے چیئرمین صاحب ہمارے دوست ہیں کئی چیئرمین یہیں موجود ہیں اگر ہر ایک نے پانچ سو کاپیاں لے لیں تو پچیس ہزار تو آپ یقینی سمجھیں۔ پھر راجا صاحب اور مرزا جی کی یہ صلاح ہے کہ اس کے متعلق کونسل میں یہ تجویز پیش کی جائے کہ ہر گاؤں کے لئے "بجلی" کی ایک کاپی سرکاری طور پر منگائی جائے یا کچھ سالانہ امداد منظور کی جائے۔ یقین کامل ہے کہ یہ تجویز پاس ہو جائے گی۔"

اونکار ناتھ نے جیسے نشہ میں جھومتے ہوئے کہا۔" ہمیں گورنر کے پاس ڈیپوٹیشن لے جانا ہوگا۔"

مسٹر خورشید بولے۔" ضرور ضرور۔"

"ان سے کہنا ہو گا کہ کسی مہذب حکومت کے لئے یہ کتنی شرم اور بار ناجی

کی بات ہے کہ گرام سدھار کا واحد اخبار ہونے پر بھی "بجلی" کی ہستی تک نہیں تسلیم کی جاتی۔"

خورشید نے کہا "ضرور، ضرور!"

"میں گھمنڈ نہیں کرتا۔ ابھی گھمنڈ کرنے کا وقت نہیں آیا پر مجھے اس کا دعویٰ ہے کہ دیہاتی سنگٹھن کے لئے "بجلی" نے جتنا کام کیا ہے ......"

مسٹر مہتا نے اصلاح کی "نہیں جناب تپسیا کہئے!"

میں مسٹر مہتا کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہاں اسے تپسیا ہی کہنا چاہیئے۔ بڑی کٹھن تپسیا! "بجلی" نے جو تپسیا کی ہے وہ اس صوبے ہی کی نہیں بلکہ ملک کی تاریخ میں لاجواب ہے۔"

خورشید بولے "ضرور، ضرور!"

مس مالتی نے ایک پیگ اور دیا، ہماری سبھا نے یہ بھی طے کیا ہے کہ کونسل میں اب کے جو جگہ خالی ہو اس کے لئے آپ کو کھڑا کیا جائے۔ آپ کو صرف اپنی منظوری دینی ہوگی، باقی یہ کام ہم لوگ کر لیں گے، آپ کو نہ خرچ سے مطلب نہ پرچار سے، نہ دوڑ دھوپ سے۔"

اونکار ناتھ کی آنکھوں کی روشنی دونی ہوگئی، فخریہ انکسار سے بولے "میں آپ لوگوں کا خادم ہوں، جو کام چاہیئے لے لیجئے۔"

"ہم لوگوں کو آپ سے ایسی ہی اُمید ہے۔ ہم اب تک فرضی دیوتاؤں کے سامنے ماتھا رگڑتے رگڑتے ہار گئے اور کچھ ہاتھ نہ لگا۔ اب ہم نے آپ کی ذات میں اپنا سچا رہنما، سچا مرشد پایا ہے اور اس مبارک دن کی خوشی میں آج ہمیں یک دل اور یک زبان ہو کر اپنے غرور اور اپنی مکاری کو ترک کر دینا چاہیئے۔ ہم میں آج سے کوئی برہمن نہیں، کوئی شودر نہیں، کوئی ہندو نہیں، کوئی مسلمان نہیں، کوئی

اونچا نہیں، کوئی نیچا نہیں، ہم سب لوگ ایک ہی ماں کے بچے، ایک ہی گود کے کھیلنے والے اور ایک ہی تھالی کے کھانے والے بھائی ہیں جو لوگ تفریق پر اعتقاد رکھتے ہیں، جو لوگ علیحدگی اور کٹرپن کے قائل ہیں ان کے لئے ہماری سبھا میں گنجائش نہیں۔ جس سبھا کے پریسیڈنٹ شری اونکار ناتھ جی جیسے بڑے دل والے مہاشے ہوں اُس سبھا میں بڑے چھوٹے کا، کھانے پینے کا اور ذات پات کا امتیاز نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اتحاد اور قومیت میں اعتقاد نہ رکھتے ہوں وہ براہ کرم یہاں سے اٹھ جائیں۔"

رائے صاحب نے شبہہ ظاہر کیا، "میرے خیال میں اتحاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب لوگ کھانے پینے کا بچار چھوڑ دیں۔ میں شراب نہیں پیتا تو کیا مجھے اس سبھا سے الگ ہو جانا پڑے گا؟"

مالتی نے بے مروتی سے کہا، "بے شک الگ ہو جانا پڑے گا! آپ اس سبھا میں رہ کسی طرح کا امتیاز نہیں رکھ سکتے۔"

مہتا نے گھڑے کو ٹھونکا، "مجھے شک ہے کہ ہمارے پریسیڈنٹ صاحب خود ہی کھانے پینے کے اتحاد پر یقین نہیں رکھتے۔"

اونکار ناتھ کا چہرہ زرد پڑ گیا اس بدمعاش نے یہ کہا نے وقت کی شہنائی بجادی؟ کمبخت کہیں گڑے مردے نہ اُکھاڑنے لگے ورنہ یہ ساری خوش نصیبی سپنے کی طرح خلا میں غائب ہو جائے گی۔"

مس مالتی نے اُن کے چہرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور استقلال سے کہا، "آپ کا یہ شک بے بنیاد ہے مہتا جی! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قومی اتحاد کا ایک بے نظیر حامی، ایسا فراخ دل شخص، ایسا طبیعت دار شاعرانہ بیہودہ اور شرمناک تفریقوں کا قائل ہوگا؟ ایسا شک کرنا اس کی قوم پرستی کو ذلیل کرنا

ہے۔

اونکار ناتھ کا چہرہ چمک اُٹھا، خوشی اور اطمینان کی جھلک دوڑ گئی۔

مالتی نے اسی لہجہ میں کہا "اور اس سے بھی زیادہ اُن کے مردانہ جذبات کی توہین کرنا ہے، ایک عورت کے ہاتھوں سے شراب کا پیالہ پاکر وہ کون مہذب شخص ہے جو انکار کر دے؟ یہ تو نسوانی طبقہ کی توہین ہو گی، اس طبقے کی جس کی نگاہ کے تیروں سے اپنے دل کو چھلنی بنانے کی خواہش بھی مردوں میں پائی جاتی ہے اور جس کی اداؤں پر مر مٹنے کی ہوس بڑے بڑے راجے مہاراجے تک رکھتے ہیں۔ لائیے بوتل اور گلاس اور دور چلنے دیجئے۔ اس مبارک موقع پر کسی طرح کا شبہہ یا کسی طرح کا عذر، غداری سے کم نہیں ہے۔ پہلے ہم اپنے پریسیڈنٹ صاحب کی صحت کا جام پئیں گے۔"

شراب سوڈا اور برف پہلے ہی سے تیار تھا۔ مالتی نے اونکار ناتھ کو اپنے ہاتھوں سُرخ زہر سے بھرا ہوا گلاس دیا اور انہیں کچھ ایسی جادو بھری چتونوں سے دیکھا کہ ان کا سارا اعتقاد اور بھی برتری کا سارا خیال کافور ہو گیا۔ دل نے کہا "چال چلن ماحول کے تابع ہے۔ آج تم مفلس ہو، کسی موٹر کو گرد اڑاتے دیکھتے تو ایسا بگڑتے ہو کہ اُسے پتھروں سے چور چور کر ڈالو گے لیکن کیا تمہارے دل میں موٹر کی تمنا نہیں ہے؟ ماحول ہی سب کچھ ہے بقیہ کچھ نہیں! باپ دادوں نے نہیں پی تھی تو نہ پی ہو، انہیں ایسا موقع ہی کب ملا تھا؟ ان کا رزق تو پوتھی پتھروں پر تھا شراب لاتے کہاں سے؟ اور پیتے بھی تو جاتے کہاں؟ پھر وہ تو ریل گاڑی پر نہ چڑھتے تھے، نل کا پانی نہ پیتے تھے۔ انگریزی پڑھنا گناہ سمجھتے تھے۔ زمانہ کتنا بدل گیا ہے، وقت کے ساتھ اگر نہیں چل سکتے تو وہ تمہیں پیچھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ ایسی حسینہ کے نازک ہاتھوں سے اگر زہر بھی ملے تو اُسے قبول کرنا چاہیئے۔

کرنا چاہیے۔ جس خوش نصیبی کے لیے بڑے بڑے راجے مہاراجے ترستے ہیں وہ آج اُن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ کیا وہ اسے ٹھکرا سکتے ہیں؟

انہوں نے گلاس لیا اور سر جھکا کر اپنی ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے ایک ہی سانس میں پی گئے اور تب لوگوں کو متکبرانہ انداز سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں "اب تو آپ کو مجھ پر یقین آیا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں بالکل پونگا پنڈت ہوں؟ اب تو آپ مجھے مکار اور فریبی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے"؟

ہال میں ایسا شور و غل مچا کہ کچھ نہ پوچھو جیسے پٹاری میں بند قہقہے نکل پڑے ہوں۔ "واہ دیوی جی کیا کہنا! کمال ہے مس مالتی کمال ہے! توڑ دیا نمک کا قانون توڑ دیا دھرم کا قلعہ توڑ دیا پارسائی کا گھڑا!

اونکار ناتھ کے حلق کے نیچے شراب کا اترنا تھا کہ اُن کے منچلے پن میں گویائی آ گئی۔ بہک کر بولے "میں نے اپنے دھرم کی امانت مس مالتی کے نازک ہاتھوں میں سونپ دی اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس کی واجبی حفاظت کریں گی۔ ان کے کنول سے قدموں پر میں ایسے ایک ہزار دھرموں کو نچھاور کر سکتا ہوں"۔

قہقہوں سے ہال گونج اٹھا۔

ایڈیٹر صاحب کا چہرہ پھولا ہوا تھا، آنکھیں جھکی پڑتی تھیں، دوسرا گلاس بھر کر بولے "یہ مس مالتی کا جام صحت ہے، آپ لوگ نوش کریں اور انہیں دعائیں دیں"۔

لوگوں نے پھر اپنے اپنے گلاس خالی کر دیئے۔

اسی وقت مرزا خورشید نے ایک مالا لا کر ایڈیٹر صاحب کے گلے میں ڈال دی اور کہا "دوستو حبیب افادی نے ابھی اپنے معزز صدر صاحب کی شان میں ایک قصیدہ کہا ہے، اجازت ہو تو سنا دوں"۔

چاروں طرف سے آوازیں آئیں "ہاں، ہاں، ضرور، ضرور سنائیے!"

اونکار ناتھ بھنگ تو آئے دن پیا کرتے تھے اور ان کا دماغ اُس نشے کا عادی ہو گیا تھا مگر شراب پینے کا یہ پہلا ہی موقع تھا۔ بھنگ کا نشہ رفتہ رفتہ نیند کی طرح آتا تھا اور دماغ پر بادل کی چھا جاتا تھا۔ احساس قائم رہتا تھا۔ انہیں خود معلوم ہوتا رہتا تھا کہ اس وقت اُن کی تقریر بڑے لچھے دار ہے۔ اور ان کا تخیل بہت بلند ہے۔ شراب کا نشہ اُن پر شیر کی طرح جھپٹا اور دبوچ بیٹھا۔ کہتے کچھ ہیں اور منہ سے کچھ نکلتا ہے۔ پھر یہ بات بھی جاتی رہی۔ وہ کیا کہتے ہیں اور کیا کہتے ہیں، اس کا خیال ہی نہ رہ گیا۔ یہ خواب کے رومان والے عجائبات نہ تھے۔ بلکہ بیداری کا وہ چکر تھا جس میں مجسم نامجسم ہو جاتا ہے۔ خدا جانے یہ بات ان کے دماغ میں کیسے آگئی کہ قصیدہ پڑھنا کوئی بہت بُرا کام ہے۔ میز پر ہاتھ مار کر بولے "نہیں ہرگز نہیں۔ یہاں کوئی قصیدہ نہیں ہوگا۔ ہم پریسیڈنٹ ہیں۔ ہمارا حکم ہے۔ ہم ابی اس سبا کو توڑ سکتے ہیں۔ ابی توڑ سکتے ہیں۔ سبی کو نکال سکتے ہیں۔ کوئی ہمارا کچھ نہیں کر سکتا۔ ہم پریسیڈنٹ ہیں کوئی اور پریسیڈنٹ نہیں ہے"

مرزا نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور اس قصیدے میں تو آپ کی تعریف کی گئی ہے!"

ایڈیٹر صاحب نے سُرخ مگر بے نور آنکھوں سے دیکھا "تم نے ہماری تعریف کیوں کی؟ کیوں کی؟ بولو کیوں ہماری تعریف کی؟ ہم کسی کا نوکر نہیں۔ ہم کسی سالے کا دیا نہیں کھاتے۔ ہم خود ایڈیٹر ہیں۔ ہم بجلی کا ایڈیٹر ہے۔ اس میں سب کا تعریف کرے گا۔ دیوی جی! ہم تمہارا تعریف نہیں کرے گا۔ ہم کوئی بڑا آدمی نہیں ہے ہم سب کا گلام ہے۔ ہم آپ کے پاؤں کا دھول ہے۔ مالتی دیوی بھی ہے، ہماری لکشمی ہماری رادھا!"

یہ کہتے ہوئے وہ مالتی کے پیروں کی طرف جھکے اور منہ کے بل فرش پر گر پڑے مسٹر مرزا نے دوڑ کر انہیں سنبھالا اور کرسیاں ہٹا کر وہیں زمین پر لٹا دیا۔ پھر ان کے کانوں کے پاس منہ لے جا کر بولے "رام رام ست ہے! کہئے تو آپ کا جنازہ نکالوں؟"

رائے صاحب نے کہا کل دیکھنا کتنا بگڑتا ہے۔ ایک ایک کو اپنے اخبار میں کوسے گا اور اس طرح کہ آپ بھی یاد کریں گے۔ ایک ہی پاجی ہے، کسی پر رحم نہیں کرتا۔ لکھنے میں تو اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ ایسا گدھا آدمی کیسے اتنا اچھا لکھتا ہے، یہ ایک راز ہے۔"

کئی آدمیوں نے ایڈیٹر صاحب اٹھایا اور لے جا کر ان کے کمرے میں لٹا دیا۔ مگر پنڈال میں دھنش یگیہ شروع ہو گیا تھا۔ کئی بار ان لوگوں کو بلانے کے لئے آدمی آ چکے تھے۔ حاکم بھی پنڈال میں آ پہنچے تھے، لوگ ادھر جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے کہ دفعتاً ایک افغان آ کر کھڑا ہو گیا گورا رنگ، بڑی بڑی مونچھیں، اونچا قد، چوڑا سینہ، آنکھوں میں بے خوفی کا جنون بھرا ہوا، ڈھیلا لمبا کرتا، پیروں میں شلوار، زردوزی کے کام کی صدری، سر پر پگڑی اور کُلاہ، کندھے سے چمڑے کا بیگ لٹکائے، کندھے پر بندوق رکھے اور کمر میں تلوار باندھے نہ جانے کدھر سے آ کھڑا ہوا اور گرج کر بولا خبردار کوئی یہاں سے مت جاؤ۔ ہمارے صاحب کے آدمی پر ڈاکہ پڑا ہے۔ یہاں کا جو سردار ہے وہ ہمارا آدمی کو لوٹ لیا ہے اس کا مال تم کو دینا ہوگا۔ ایک ایک کوڑی دینا ہوگا۔ کہاں ہے سردار اس کو بلاؤ!"

رائے صاحب نے سامنے آ کر غصہ بھری آواز میں کہا "کیسی لوٹ؟ کیسا ڈاکہ؟ یہ تم لوگوں کا کام ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں لوٹتا۔ صاف صاف کہو کیا

سوا کیا ہے؟"

افغان نے آنکھیں نکالیں اور بندوق کا کُندہ زمین پر پٹک کر بولا "ام سے پوچھتا ہے کیسا لوٹ، کیسا ڈاکہ؟ تم لوٹتا ہے، تمہارا آدمی لوٹتا ہے۔ ام یہاں کی کوٹھی کا مالک ہے۔ اماری کوٹھی میں پچیس جوان ہے۔ تمہارا آدمی روپیہ تحصیل کر لاتا تھا۔ ایک ہزار، وہ تم لوٹ لیا۔ اور پوچھتا ہے کیسی لوٹ کیسا ڈاکہ! ام بتائے گا کیسا ڈاکہ ہوتا ہے۔ امارا پچیسوں آدمی ابھی آتا ہے۔ ام تمہارا گاؤں لوٹ دے گا۔ کوئی سالا کچھ نہیں کر سکتا، کچھ نہیں کر سکتا"

کھتا نے افغان کے تیور دیکھے تو چپکے سے اٹھ کر نکل جائیں۔ اُس نے زور سے ڈانٹا "کہاں جاتا ہے تم؟ کوئی کہیں نہیں جا سکتا۔ نہیں ام سب کو قتل کر دے گا۔ ابی فیر کر دے گا۔ امارا تم کچھ نہیں کر سکتا۔ ام تمہاری پولیس سے نہیں ڈرتا۔ پولیس کا آدمی ہمارا شکل دیکھ کر بھاگتا ہے۔ امارا اپنا کونسل ہے۔ ام اس کو خط لکھ کر لاٹ صاحب کے پاس جا سکتا ہے۔ ام یہاں سے کسی کو نہیں جانے دے گا۔ تم ہمارا ایک ہزار روپیہ لوٹ لیا۔ امارا روپیہ نہیں دے گا تو ہم کسی کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ تم سب آدمی دوسروں کے مال لوٹ کر تا ہے اور یہاں معشوق کے ساتھ شراب پیتا ہے"

مس مالتی اُس کی آنکھ بچا کر کمرے سے نکلنے لگیں کہ وہ باز کی طرح ٹوٹ کر اُن کے سامنے کھڑا ہوا اور بولا "تم ان بدمعاشوں سے ہمارا مال دلوا کے تئیں ام تم کو اٹھا لے جائے گا۔ اور اپنی کوٹھی میں جشن منائے گا۔ تمہارا حسن پر ہم عاشق ہو گیا یا تو ام کو ایک ہزار ابی دے دے یا تم کو امارے ساتھ چلنا پڑے گا۔ تم کو ہم نہیں چھوڑے گا۔ ام تمہارا عاشق ہو گیا ہے۔ ہمارا دل اور جگر پھٹا جاتا ہے۔ امارا اس جگہ پچیس جوان ہے۔ اس ضلع میں امارا پانچ سو جوان

کام کرتا ہے۔ ام اپنے قبیلے کا خان ہے ہمارے قبیلہ میں دس ہزار سپاہی ہے۔ ہم کابل کے امیر سے لڑ سکتا ہے۔ انگریز سرکار ام کو بیس ہزار سالانہ خراج دیتا ہے اگر تم اما مار روپیہ نہیں دے گا تو ام گاؤں لوٹ لے گا اور تمہارا معشوق کو اٹھا لے جائے گا۔ خون کرنے میں ہم کو مزہ آتا ہے۔"

مجلس پر خوف چھا گیا۔ مس مالتی اپنا چہکنا بھول گئیں، کمنا کی پنڈلیاں کانپ رہی تھیں سب بے چارے چوٹ چپیٹ کے ڈر سے یک منزل بنگلے میں رہتے تھے۔ زینہ پر چڑھنا ان کے لئے سولی پر چڑھنے سے کم نہ تھا۔ گرمی میں بھی دہشت کے مارے کمرے میں سوتے تھے۔ رائے صاحب کو بہتری پن کا گھمنڈ تھا۔ وہ اپنے ہی گاؤں میں ایک پٹھان سے ڈر جانا مضحکہ انگیز سمجھتے تھے۔ مگر اس کی بندوق کو کیا کرتے؟ انہوں نے ذرا بھی چھیڑ چھاڑ کی اور اس نے بندوق داغ دی۔ ہوش تو ہوتے ہی ہیں یہ سب اور نشانہ بھی ان سب کا کتنا بے خطا ہوتا ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں بندوق نہ ہوتی تو رائے صاحب اس سے سنگین ملانے کو تیار ہو جاتے مشکل یہی تھی کہ کمبخت کسی کو باہر نہیں جانے دیتا ورنہ دم کے دم میں سارا گاؤں جمع ہو جاتا اور اس کے پورے جتھے کو مار پیٹ کر رکھ دیتا۔

آخر انہوں نے دل مضبوط کیا اور جان پر کھیل کر بولے۔ "ہم نے آپ سے کہہ دیا کہ ہم چور ڈاکو نہیں ہیں۔ میں یہاں کے کونسل کا ممبر ہوں۔ اور یہ دیوی جی لکھنؤ کی مشہور ڈاکٹر ہیں۔ یہاں سبھی شریف اور معزز لوگ جمع ہیں۔ ہمیں بالکل خبر نہیں کہ آپ کے آدمیوں کو کس نے لوٹا۔ آپ جا کر تھانے میں رپٹ کیجئے۔"

خان نے زمین پر پیر پٹکے، پینترے بدلے اور بندوق کو کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لیتا ہوا دھاڑا۔ "مت بک بک کرو۔ کونسل کے ممبر کو ہم اسی طرح پیر دل سے مسل دیتا ہے (زمین پر پاؤں رگڑتا ہے) ہمارا ہاتھ مضبوط ہے ہمارا دل

مضبوط ہے۔ ہم خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتا، تم ہمارا روپیہ نہیں دے گا تو ہم (رائے صاحب کی طرف اشارہ کرکے) ابی تم کو قتل کر دے گا۔"

اپنی طرف بندوق کا سرا دیکھ کر رائے صاحب جھک کر میز کے برابر آ گئے۔ عجیب مصیبت تھی۔ شیطان خواہ مخواہ کہتا جاتا ہے کہ تم نے ہمارے روپئے لوٹ لئے۔ نہ کچھ سنتا ہے نہ کچھ سمجھتا ہے اور نہ کسی کو باہر جانے آنے دیتا ہے۔ نوکر چاکر سپاہی پیادے سب دھنش یگیہ دیکھنے میں مصروف تھے۔ زمینداروں کے نوکر یوں بھی کاہل اور کام چور ہوتے ہی ہیں جب تک دس دفعہ نہ پکارا جائے بولتے ہی نہیں اور اس وقت تو وہ ایک اچھے کام میں لگے ہوئے تھے۔ دھنش یگیہ ان کے لئے صرف تماشا نہیں بلکہ بھگوان کی لیلا تھی۔ اگر ایک آدمی بھی ادھر آ جاتا تو سپاہیوں کو خبر ہو جاتی اور دم بھر میں خان کی ساری خانی نکل جاتی۔ داڑھی کا ایک ایک بال نُچ جاتا۔ کتنا غصّہ ور ہے۔ ہوتے بھی تو جلا دیں۔ نہ مرنے کا غم نہ جینے کی خوشی۔

مرزا سے انگریزی میں بولے "اب کیا کرنا چاہیے؟"

مرزا صاحب نے حیرت سے دیکھا، "کیا بتاؤں، کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ میں آج اپنا پستول گھر ہی میں چھوڑ آیا ورنہ مزا چکھا دیتا۔"

گھناونی صورت بنا کر بولے "کچھ روپئے دے کر کسی طرح اس بلا کو ٹالئے۔"

رائے صاحب نے مالتی کی طرف دیکھا، "دیوی جی، اب آپ کی کیا صلاح ہے؟"

مالتی کا چہرہ تمتما رہا تھا بولی "ہو گا کیا؟ میری اتنی بے عزتی ہو رہی ہے اور آپ لوگ بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔ بیس مردوں کے ہوتے ایک اُجڈ پٹھان میری اتنی دُرگت کر رہا ہے اور آپ لوگوں کے خون میں ذرا بھی گرمی نہیں آتی۔ آپ کو جان پیاری ہے؟

کیوں ایک آدمی باہر جا کر شور نہیں مچاتا؟ کیوں آپ لوگ اس پر جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے بندوق نہیں چھین لیتے؟ بندوق ہی تو چلائے گا؟ چلانے دو۔ ایک یا دو کی جان ہی تو جائے گی؟ جانے دو۔"

مگر دیوی جی مرجانا جتنا آسان سمجھتی تھیں اور لوگ نہ سمجھتے تھے۔ کوئی آدمی باہر نکلنے کی پھر ہمت کرے اور پٹھان غصے میں آکر دس پانچ فیر کر دے تو یہاں صفایا ہو جائے گا۔ بہت ہوگا تو اسے پھانسی کی سزا ہو گی، وہ بھی کیا ٹھیک؟ ایک مست قبیلے کا سردار ہے، اسے پھانسی دیتے ہوئے سرکار بھی سوچ بچار کرے گی۔ اوپر سے دباؤ پڑے گا۔ سیاست کے مقابلے میں انصاف کو کون پوچھتا ہے؟ ہمارے اوپر ایسے مقدمے دائر ہو جاتے ہیں اور زائد پڑیں تو پنڈت کہہ دو بات تو تعجب نہیں۔ کتنے مزے سے ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ اب تک ڈرامہ کا لطف اٹھاتے ہوتے۔ اس شیطان نے آکر ایک نئی بلا کھڑی کر دی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلا وہ ایک خون کئے مانے گا بھی نہیں۔

کھنہ نے مالتی کو دھتکارا۔ "دیوی جی، آپ تو ہمیں لتاڑ رہی ہیں جیسے اپنی جان بچانا کوئی پاپ ہے۔ جان بھی جانداروں کو پیاری ہوتی ہے۔ اور ہمیں بھی ہو تو کوئی شرم کی بات نہیں۔ آپ ہماری جان اتنی سستی سمجھتی ہیں، یہ دیکھ کر مجھے رنج ہوتا ہے۔ ایک ہزار ہی کا تو معاملہ ہے۔ آپ ہی کے پاس مفت کے ایک ہزار ہیں، وہ دے کر کیوں نہیں رخصت کر دیتیں؟ آپ خود اپنی بے عزتی کرا رہی ہیں۔ اس میں ہمارا کیا قصور؟"

رائے صاحب نے گرم ہو کر کہا۔ "اگر اس نے دیوی جی کو ہاتھ لگایا تو چاہے میری لاش یہیں تڑپنے لگے، میں اس سے بھڑ جاؤں گا۔ آخر وہ بھی آدمی ہی تو ہے۔"

مرزا نے شبہ سے سر ہلا کر کہا "رائے صاحب، آپ ابھی ان سب کے مزاج سے واقف نہیں ہیں۔ یہ فائر کرنا شروع کرے گا تو پھر کسی کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ اس کا نشانہ بے خطا ہوتا ہے۔"

مسٹر تنخا آنے والے چناؤ کا مسئلہ حل کرنے آئے تھے اور دس پانچ ہزار کا پنٹا لا کر کے گھر جانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ یہاں جان ہی عذاب میں پڑ گئی۔ بولے "یہ سب سے سہل طریقہ وہی ہے جو ابھی کھنا جی نے بتایا۔ ایک ہزار ہی کی بات ہے اور روپئے موجود ہیں تو پھر آپ لوگ کیوں پس و پیش کر رہے ہیں؟"

مس مالتی نے تنخا کو حقارت بھری نگاہوں سے دیکھا، بولیں "آپ لوگ اتنے بزدل ہیں، یہ میں نہ سمجھتی تھی۔"

"میں بھی یہ نہ سمجھتا تھا کہ آپ کو روپئے اتنے پیارے ہیں اور وہ بھی مفت کے روپئے۔"

"جب آپ لوگ میری بے عزتی دیکھ سکتے ہیں تو اپنے گھر کی عورتوں کی بھی بے عزتی دیکھ سکتے ہوں گے؟"

"تو آپ بھی پیسے کے لئے اپنے گھر کے مردوں کو قربان کر دینے میں تامل نہ کریں گی؟"

خان اتنی دیر تک جھلایا ہوا سا ان لوگوں کی گٹ پٹ سن رہا تھا۔ اب یکایک گرج کر بولا "ام اب نہیں مانے گا۔ ام اتنی دیر سے یہاں کھڑا ہے۔ تم لوگ کوئی جواب نہیں دیتا (جیب سے سیٹی نکال کر) ام تم کو ایک لمحہ اور دیتا ہے اگر تم روپیہ نہیں دیتا تو ہم سیٹی بجائے گا اور ہمارا پچیس جوان یہاں آجائے گا۔" پھر آنکھوں سے عشق کا اظہار کرتے ہوئے مس مالتی سے بولا "تم امارے ساتھ

چلے گا۔ دلدار! ام تمارے اوپر خدا ہو جائے گا۔ اپنا جان تمارے قدموں میں رکھ دے گا۔ اتنا آدمی تمارا عاشق ہے مگر کوئی سچا عاشق نہیں ہے۔ سچا عاشق کیسا ہوتا ہے، ہم دکھا دے گا۔ تمارا اشارہ پاتے ہی ام اپنے سینے میں خنجر چبھا سکتا ہے۔"

مرزا نے گھگھیا کر کہا، "دیوی جی! خدا کے لئے اس موذی کو روپے دلوا دیجئے۔"

کھنا نے دست بستہ التجا کی "رحم! ہم پر رحم کرو مس مالتی!"

رائے صاحب تن کر بولے "ہرگز نہیں۔ آج جو کچھ ہونا ہے ہو جانے دیجئے۔ یا تو ہم خود مر جائیں گے یا ان ظالموں کو سدا کے لئے سبق دے دیں گے۔"

تنکھا نے رائے صاحب کو ڈانٹ بتائی، "شیر کی ماند میں گھسنا کوئی بہادری نہیں ہے۔ میں اسے حماقت سمجھتا ہوں۔"

مگر مس مالتی کے دلی خیالات کچھ اور ہی تھے۔ خان کی محبت بھری نگاہوں نے انہیں مطمئن کر دیا تھا اور اب اس تماشے میں انہیں کچھ منچلے پن کا سرور آ رہا تھا۔ ان کا جی کچھ دیر ان جوانمردوں کے بیچ میں رہ کر ان کے وحشیانہ عشق کا لطف اٹھانے کے لئے للچا رہا تھا۔ مہذبانہ عشق کی کمزوری اور مردہ دلی کا انہیں تجربہ ہو چکا تھا۔ آج وحشی اور نامہذب پٹھانوں کے جنونانہ عشق کے لئے ان کا دل بے قرار تھا۔ جیسے موسیقی کا لطف اٹھانے کے بعد کوئی مست ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے کو دوڑے۔

انہوں نے خان کے سامنے آ کر بے خوفی سے کہا، "تمہیں روپئے نہیں ملیں گے۔"

خان نے ہاتھ بڑھا کر کہا، "تو ام تم کو لوٹ لے جائے گا۔"

"تم اتنے آدمیوں کے درمیان سے ہمیں نہیں لے جا سکتے۔"

"ہم تم کو ایک ہزار آدمیوں کے درمیان سے لے جا سکتا ہے۔"

"تم کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

"ہم اپنے معشوق کے لئے اپنے بدن کا ایک ایک بوٹی کٹوا سکتا ہے۔"

اس نے مالتی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اسی وقت ہوری نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ راجہ جنک کا مالی بنا ہوا تھا اور اس کے کھیلوں نے دیہاتیوں کو ہنسا ہنسا کے لوٹ پوٹ کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ مالک ابھی تک کیوں نہیں آئے۔ ذرا وہ بھی آکر دیکھیں کہ دیہاتی اس کام میں کتنے ہوشیار ہوتے ہیں۔ ان کے یار دوست بھی دیکھیں۔ کیسے مالک کو بلائے؟ وہ موقع کھوج رہا تھا اور جیوں ہی فرصت ملی دوڑا ہوا یہاں آیا مگر یہاں کا منظر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ سب لوگ بالکل چپ تھے اور کانپتے ہوئے خوف بھری نگاہوں سے خان کو دیکھ کر سب کچھ بھانپ گیا۔ اسی وقت رائے صاحب نے پکارا "ہوری دوڑ کر باہر سپاہیوں کو بلا لا! جلد دوڑ!"

ہوری پیچھے مڑا ہی تھا کہ خان نے اس کے آگے بندوق تان کر ڈانٹا "کہاں جاتا ہے سؤر؟ ہم گولی مار دے گا۔"

ہوری گنوار تھا۔ سرخ پگڑی دیکھ کر اس کی جان نکل جاتی تھی مگر مست سانڈ پر لاٹھی لے کر ٹوٹ پڑتا تھا۔ وہ بزدل نہ تھا۔ مرنا اور مارنا دونوں ہی جانتا تھا۔ مگر پولیس کے ہتھکنڈوں کے سامنے اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ بندھا بندھا کون پھرے؟ گھوس کے روپے کہاں سے لائے؟ بال بچے کس پر چھوڑے؟ پر جب مالک للکارتے ہوں تو پھر کس کا ڈر؟ تب وہ موت کے منہ میں بھی کود سکتا ہے۔

اس نے جھپٹ کر خان کی کمر پکڑی اور ایسا اڑنگا مارا کہ خان چاروں شانے چت زمین پر آ رہے اور لگے پشتو میں گالیاں دینے۔ ہوری اُن کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور زور سے داڑھی پکڑ کر کھینچی۔ داڑھی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ خان نے فوراً اپنی کلاہ اُتار کر پھینک دیا اور زور لگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ارے! یہ تو مسٹر مہتا ہیں! وہی!

لوگوں چاروں طرف سے مہتا کو گھیر لیا۔ کوئی ان کے گلے لگتا تھا اور کوئی پیٹھ پر تھپکیاں دیتا تھا۔ مسٹر مہتا کے چہرے پر نہ تبسم تھا نہ غرور، خاموش کھڑے تھے گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

مالتی نے نقلی غصہ سے کہا، "آپ نے یہ بہروپیا پن کہاں سیکھا؟ میرا دل ابھی تک دھڑک رہا ہے"۔

مہتا نے مسکراتے ہوئے کہا، "ذرا ان بھلے مانسوں کی جوانمردی کا امتحان لے رہا تھا۔ جو گستاخی ہوئی ہو اُسے معاف کیجئے گا"۔

۷

یہ کھیل جب ختم ہوا تو اُدھر پنڈال میں دھنش یگیہ بھی ختم ہو چکا تھا اور سوشل مزاحیہ ڈرامے کی تیاری ہو رہی تھی۔ مگر ان لوگوں کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ صرف مہتا صاحب دیکھنے گئے اور شروع سے آخر تک جمے رہے۔ انہیں بہت مزا آ رہا تھا۔ بیچ بیچ میں تالیاں بجاتے رہے تھے اور "پھر کہو، پھر کہو" کا اصرار کر کے ایکٹروں کا حوصلہ بھی بڑھاتے تھے۔ رائے صاحب نے اس کھیل میں ایک مقدمے باز دیہاتی زمیندار کا خاکہ اُڑایا تھا۔ کہنے کو تو مزاحیہ تھا مگر درد و الم سے بھرا ہوا۔ ہیرو کا بات بات میں قانونی دفعات کا حوالہ دینا، بیوی پر صرف اس لئے مقدمہ چلانا کہ

اس نے کھانا تیار کرنے میں ذرا سی دیر کی تھی، پھر وکیلوں کے نخرے اور دیہاتی گواہوں کی چالاکیاں اور چانسے بازیاں، گواہی کے لئے فوراً تیار ہو جانا مگر اجلاس پر جاتے وقت خوب مناون کملانا اور طرح طرح کی فرمائش کر کے اُلّو بنانا، یہ سبھی مناظر دیکھ کر لوگ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔ سب سے بہترین منظر وہ، جس میں وکیل گواہوں کو ان کے بیانات کا سبق پڑھا رہا تھا۔ گواہوں کا بار بار بھول جانا۔ وکیل کا بگڑنا، پھر ہیرو کا دہقانی لہجے میں گواہوں کو سمجھانا اور بالآخر اجلاس پر گواہوں کا بدل جانا، ایسا پُر لطف اور صحیح خاکہ تھا کہ مہتا صاحب اچھل پڑے۔ اور تماشا ختم ہونے پر ہیرو کے گلے سے لگا لیا اور سبھی ایکٹروں کو ایک ایک تمغہ دینے کا اعلان کر دیا۔ رائے صاحب کے متعلق ان کے دل میں عقیدت کے جذبات جاگ اٹھے۔ رائے صاحب اسٹیج کے پیچھے ڈرامے کی نگرانی کر رہے تھے۔ مہتا صاحب دوڑ کر اُن کے گلے سے لپٹ گئے اور بے خود ہو کر بولے

"آپ کی نگاہ اتنی تیز ہے، اس کا مجھے شان گمان بھی نہ تھا۔"

دوسرے روز ناشتہ کے بعد شکار کا پروگرام تھا۔ وہیں کسی ندی کے کنارے پر کھانا پکے، خوب جی بھر کر نہائیں، غوطے لگائیں، اور شام کو لوگ واپس آئیں اس طرح دیہاتی زندگی کا لطف حاصل کیا جائے۔ مہمانوں میں صرف وہی لوگ رہ گئے جن کا رائے صاحب سے گہرا تعلق تھا۔ مسز کھنّا کے سر میں درد تھا۔ بس وہ نہ جا سکیں۔ ایڈیٹر صاحب تو اس جماعت سے جلے ہوئے تھے اور ان لوگوں کے خلاف ایک سلسلہ مضامین نکالنے اور اچھی طرح لینے کے خیال میں محو تھے۔ سب کے سب چھٹے ہوئے غنڈے ہیں۔ حرام کے پیسے اڑاتے ہیں اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، اس کی انہیں کیا خبر؟ ان کے پڑوس میں کون مر رہا ہے، انہیں اس کی کیا پروا؟ انہیں تو اپنے عیش

و عشرت سے کام ہے۔ یہ مہتا جو فلسفی بنا پھرتا ہے اُسے یہی دُھن ہے کہ زندگی کو ہر طرح مکمل بناؤ۔ جینے میں ایک ہزار مار لاتے ہو، تمہیں اختیار ہے کہ زندگی کو مکمل بناؤ یا اس سے بھی زیادہ۔ جیسے یہ فکر مارے ڈالتی ہے کہ لڑکوں کا بیاہ کیسے ہو۔ یا بیمار بیوی کے لئے ڈاکٹر کیسے آئیں، یا اگلے گھر کا کرایہ کہاں سے آئے گا وہ اپنی زندگی کیسے مکمل بنائے؟ کھلے سانڈ بنے ہوئے دوسروں کے کھیت میں منہ مارتے پھرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ دنیا میں سب سکھی ہیں۔ تمہاری آنکھیں جب کھلیں گی جب انقلاب ہو گا اور تم سے کہا جائے گا کہ بچہ کھیت میں چل کر ہل چلاؤ۔ تب دیکھیں گے کہ تمہاری زندگی کیسے مکمل ہوتی ہے اور وہ جو ہے مالتی، جو بہتر گھاٹوں کا پانی پی کر بھی مس بنی پھرتی ہے، شادی نہیں کرے گی کیونکہ اس سے زندگی بندش میں پڑ جاتی ہے اور بندش میں زندگی کا کامل ارتقاء نہیں ہو پاتا۔ ارتقاء تو اُسی میں ہے کہ دنیا کو لوٹے جاؤ اور آزادانہ عیش کئے جاؤ۔ ساری بندشیں توڑ دو، دھرم اور سماج کو گولی مار دو، فرائض کو پاس نہ پھٹکنے دو، بس تمہاری زندگی مکمل ہو گئی! اس سے زیادہ آسان اور کیا ہو گا؟ ماں باپ سے نہیں پٹتی تو انہیں دھتا بتاؤ، بیاہ مت کرو، یہ بندھن ہے اور بچے ہوں گے تو یہ موہ کا جال ہے! مگر ٹیکس کیوں دیتے ہو؟ قانون بھی تو بندھن ہے، اُسے کیوں نہیں توڑتے؟ اُس سے کیوں کنی کاٹتے ہو؟ جانتے ہو نا کہ قانون کی ذرا بھی خلاف ورزی کی اور بیڑیاں پڑ جائیں گی۔ بس وہی بندھن توڑ دو جو اپنی ہوس رانیوں میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ رسّی کو سانپ بنا کر پیٹو اور تیس مار خاں بنو۔ زندہ سانپ کے پاس جاؤ ہی کیوں؟ وہ پھنکار بھی مارے گا تو لہر آنے لگے گی۔ اُسے آتا دیکھو تو دُم دبا کر بھاگ کھڑے ہو۔ یہ تمہاری مکمل زندگی ہے۔"

شکاری جماعت آٹھ بجے روانہ ہوئی۔ کھنّا نے کبھی شکار نہ کھیلا تھا، بندوق

کی آواز سے کانپ اٹھتے تھے، مگر مس مالتی جارہی تھیں تو وہ کیسے رُک سکتے۔ مسٹر ٹنخا کو ابھی تک چناؤ کے بارے میں بات چیت کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ شاید وہاں مل جائے۔ رائے صاحب اپنے اس علاقے میں عرصے سے نہ گئے تھے۔ وہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھنا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی علاقے میں جانے آنے سے آسامیوں کے ساتھ کچھ تعلق بھی قائم رہتا ہے اور اپنا رعب بھی۔ کارندے اور پیادے بھی چوکس رہتے ہیں۔ مرزا خورشید کو زندگی کے نئے تجربات حاصل کرنے کا شوق تھا، خصوصاً ایسے، جن میں ہمت دکھانی پڑے۔ مس مالتی تنہا کیسے رہتیں؟ انہیں تو شائقین کا جمگھٹا چاہیئے۔ صرف مہتا صاحب شکار کھیلنے کے لئے سچے حوصلے سے جارہے تھے۔ رائے صاحب کی خواہش تو تھی کہ خوراک کا سامان، باورچی، کہار، خدمتگار، سب ساتھ چلیں لیکن مہتا نے مخالفت کی۔

کھنا نے کہا "آخر وہاں کھائیں گے یا بھوکوں مریں گے؟"

مہتا نے جواب دیا "کھائیں گے کیوں نہیں؟ لیکن آج ہم سب لوگ خود اپنا سارا کام کریں گے۔ دیکھنا تو چاہیئے کہ بلا نوکر کے بھی ہم زندہ رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ مس مالتی پکائیں گی اور ہم لوگ کھائیں گے۔ دیہاتوں میں ہنڈیاں اور پتیل مل ہی جاتے ہیں۔ اور ایندھن کی کوئی کمی ہی نہیں، شکار ہم کریں گے ہی۔"

مالتی نے گلہ کیا "معاف کیجیئے، آپ نے رات میں میری کلائی اتنے زور سے پکڑی کہ ابھی تک دُکھ رہی ہے۔"

"کام تو ہم لوگ کریں گے، آپ صرف بتلاتی جائیں گی۔"

مرزا خورشید بولے "اجی آپ لوگ تماشا دیکھتے رہیئے گا، میں سارا انتظام کر دوں گا۔ بات ہی کون سی ہے؟ جنگل میں ہانڈی اور برتن ڈھونڈنا حماقت ہے۔ ہرن کا شکار کیجیئے، بھونئے، کھائیے اور وہیں درختوں کے سائے میں

خراٹے بجئے!"

یہی تجویز منظور ہوئی۔ دو موٹر روانہ ہوئے۔ ایک مس مالتی چلا رہی تھیں۔ اور دوسرا خود رائے صاحب۔ کوئی بیس پچیس میل کے بعد پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ دونوں طرف اونچی پہاڑیوں کا سلسلہ دوڑا چلا جا رہا تھا۔ سڑک بھی پیچدار ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ دور کی چڑھائی کے بعد یکایک ڈھال آگیا اور موٹر تیزی سے نیچے کی طرف چلے۔ دور سے دریا نظر آرہا تھا۔ کسی مریض کی طرح کمزور اور بے حس کنارے پر برگد کے گھنے سایہ میں موٹر روک دیئے گئے اور لوگ اترے۔ یہ مشورہ ہوا کہ دو دو کی ٹولی بنے اور شکار کھیل کر بارہ بجے تک یہاں آجائیں۔ مس مالتی مہتا کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں۔ کھنّا دل مسوس کر رہ گئے۔ جس خیال سے آئے تھے اس میں جیسے پنچر ہو گیا۔ اگر جانتے کہ مالتی دھوکا دے گی تو گھر واپس لوٹ جاتے۔ گو رائے صاحب کا ساتھ بھی اتنا دلچسپ نہ سہی تاہم بُرا نہ تھا۔ اُن سے بہت سی معاملے کی باتیں کرنا تھیں۔ خورشید اور تنکھا بچ رہے۔ ان کی ٹولی بنی بنائی تھی۔ تینوں ٹولیاں ایک ایک سمت کو چل دیں۔

کچھ دُور تک پتھریلی پگڈنڈی پہ مہتا کے ساتھ چلنے کے بعد مالتی نے کہا "تم تو چلے ہی جاتے ہو، ذرا دم تو لے لینے دو۔"

مہتا مُسکرائے "ابھی تو ہم میل بھر بھی نہیں آئے، ابھی سے تھک گئیں؟"

"تھکی نہیں، پر کیوں نہ ذرا دم لے لو؟"

"جب تک کوئی شکار ہاتھ نہ آجائے، ہمیں آرام کرنے کا حق نہیں۔"

"میں شکار کھیلنے نہیں آئی تھی!"

مہتا نے انجان بن کر کہا "اچھا، یہ میں نہ جانتا تھا۔ تو پھر کیا کرنے آئی تھیں؟

"اب تم سے کیا بتاؤں؟"

ہرنوں کا ایک جھنڈ جرتا ہوا نظر آیا۔ دونوں ایک چٹان کی آڑ میں چھپ گئے۔ نشانا لگا کر گولی چلائی گئی۔ نشانہ خالی گیا اور جھنڈ بھاگ نکلا۔

مالتی نے پوچھا، "اب؟"

"کچھ نہیں، چلو، پھر کوئی شکار ملے گا۔"

دونوں کچھ دُور تک چپ چاپ چلتے رہے، پھر مالتی نے ذرا رُک کر کہا "گرمی سے بُرا حال ہو رہا ہے۔ آؤ اس پیڑ کے نیچے بیٹھ جائیں۔"

"ابھی نہیں۔ تم بیٹھنا چاہتی ہو تو بیٹھو، میں تو نہیں بیٹھتا۔"

"بڑے بے رحم ہو تم! سچ کہتی ہوں۔"

"جب تک کوئی شکار نہ مل جائے بیٹھ نہیں سکتا۔"

"تب تو تم مجھے مار ہی ڈالو گے! اچھا بتاؤ کہ رات تم نے مجھے اتنا کیوں ستایا؟ مجھے تم پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ یاد ہے کہ تم نے مجھے کیا کہا تھا؟ تم ہمارے ساتھ چلیے گا، دلدار؟ میں نہ جانتی تھی کہ تم اتنے شریر ہو۔

اچھا، سچ کہنا کہ کیا تم اُس وقت مجھے اپنے ساتھ لے جاتے؟"

مہتا نے کوئی جواب نہ دیا جیسے سنا ہی نہیں۔

دونوں کچھ دور چلتے رہے۔ ایک تو جیٹھ کی دھوپ دوسرے پتھریلا راستہ مالتی تھک کر بیٹھ گئی، مہتا کھڑے کھڑے بولے "اچھی بات ہے تم آرام کر لو، میں یہیں آ جاؤں گا۔"

"مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟"

"میں جانتا ہوں کہ تم اپنی حفاظت کر سکتی ہو۔"

"کیسے جانتے ہو؟"

"نئے جگ کی دیویوں میں یہی تو صفت ہے۔ وہ مرد کا سہارا نہیں چاہتیں بلکہ اُس کے دوش بدوش چلنا چاہتی ہیں۔"

مالتی نے جھینپتے ہوئے کہا "تم کورے فلسفی ہو، مہتا! سچ!"

سامنے درخت پر ایک مور بیٹھا ہوا تھا۔ مہتا نے نشانہ لگایا اور بندوق سر کی۔ مور اُڑ گیا۔

مالتی خوش ہو کر بولی "اچھا ہوا، بہت ہوا۔ میری بددُعا لگی۔"

مہتا نے بندوق کندھے پر رکھ کر کہا "تم نے مجھے نہیں بلکہ اپنے آپ کو بددُعا دی۔ شکار مل جاتا تو میں تمہیں دس منٹ کی مہلت دیتا۔ اب تو تم کو فوراً چلنا پڑے گا۔"

مالتی اٹھ کر مہتا کا ہاتھ پکڑتی ہوئی بولی "فلاسفروں کے شاید دل نہیں ہوتا تم نے اچھا کیا کہ شادی نہیں کی۔ اس غریب کو مار ہی ڈالتے۔ مگر میں یوں نہ چھوڑوں گی۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔"

مہتا نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور آگے بڑھے۔

مالتی آبدیدہ ہو کر بولی "میں کہتی ہوں، نہ جاؤ، ورنہ میں اسی چٹان پر سر پٹک دوں گی۔"

مہتا نے تیزی سے قدم بڑھائے۔ مالتی انہیں دیکھتی رہی۔ جب وہ بیس قدم نکل گئے تو جھنجھلا کر اُٹھی اور ان کے پیچھے دوڑی۔ تنہا آرام کرنے میں تو کوئی لطف نہ تھا۔

قریب جا کر بولی "میں تمہیں اتنا حیوان نہ سمجھتی تھی۔"

"میں جو ہرن ماروں گا اس کی کھال تمہیں بھینٹ کر دوں گا۔"

"کھال جائے بھاڑ میں! میں تم سے بات نہ کروں گی۔"

"کہیں ہم لوگوں کے ہاتھ کچھ نہ لگا اور دوسروں نے اچھے شکار مارے تو مجھے بڑی جھینپ ہوگی۔"

ایک چوڑا نالا مُنہ پھیلائے آگے پڑا تھا جس کے بیچ کی چٹانیں دانتوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ دھار میں اتنا زور تھا کہ لہریں اُچھلی پڑتی تھیں سورج سر پر آپہنچا اور اس کی پیاسی کرنیں پانی میں گھس رہی تھیں۔

مالتی نے خوش ہو کر کہا "اب لوٹنا پڑا۔"

"کیوں؟ اس پار چلیں گے وہیں تو شکار ملے گا۔"

"دھار کس زور کی ہے، میں تو بہہ جاؤں گی۔"

"اچھی بات ہے، تم یہیں بیٹھو، میں جاتا ہوں۔"

"آپ جایئے، مجھے اپنی جان سے بیر نہیں ہے۔"

مہتا نے پانی میں قدم رکھا اور پیروں کو سادھتے ہوئے چلے جیوں جیوں آگے جاتے تھے پانی گہرا ہوتا جاتا تھا حتّٰی کہ سینے تک آگیا۔

مالتی گھبرا اُٹھی، اندیشے سے دل بیقرار ہو گیا۔ ایسی بیچینی تو اُسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ بلند لہجے میں بولی "پانی گہرا ہے، ٹھہر جاؤ! میں بھی آتی ہوں۔"

"نہیں تم پھسل جاؤ گی، دھار تیز ہے۔"

مالتی ساڑھی اُوپر چڑھا کر نالے میں گھس پڑی مگر دس ہاتھ جاتے جاتے پانی اس کی کمر تک آگیا۔

مہتا گھبرائے۔ دونوں ہاتھوں سے اُسے لوٹ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے "تم یہاں نہ آؤ مالتی! یہاں تمہارے گلے تک پانی ہے۔"

مالتی نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر کہا "ہونے دو۔ تمہاری یہی مرضی ہے کہ میں مر جاؤں، تو تمہارے پاس ہی مروں گی۔"

مالتی پیٹ تک پانی میں تھی۔ دھارا اتنی تیز تھی کہ معلوم ہوتا تھا، اب قدم اُکھڑا۔ مہتا لوٹ پڑے اور مالتی کو ایک ہاتھ سے پکڑ لیا۔

مالتی نے نشیلی آنکھوں میں غصہ بھر کر کہا "میں نے تم جیسا بید رد آدمی کبھی نہ دیکھا تھا۔ بالکل پتھر ہو! خیر، آج ستالو جتنا ستاتے بنے، میں بھی کبھی سمجھوں گی۔"

مالتی کے پیر اُکھڑتے ہوئے معلوم ہوئے، وہ بندوق سنبھالتی ہوئی ان سے لپٹ گئی۔

مہتا نے دلاسا دیتے ہوئے کہا، "تم یہاں کھڑی نہیں رہ سکتیں، میں تمہیں اپنے کندھے پر بٹھائے لیتا ہوں۔"

مالتی نے چیں بجبیں ہو کر کہا "تو اُس پار جانا اتنا ضروری ہے؟"

مہتا نے کچھ جواب نہ دیا۔

بندوق کو کنپٹی سے کندھے پر دبا لیا اور مالتی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر کندھے پر بٹھایا۔

مالتی اپنی خوشی کو چھپاتی ہوئی بولی "اگر کوئی دیکھ لے؟"

"تو دیکھ لے۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے؟"

"بھدّا تو لگتا ہے۔"

دو قدم کے بعد اُس نے درد بھری آواز میں کہا "اچھا بتاؤ کہ اگر میں یہیں ڈوب جاؤں تو تمہیں رنج ہوگا یا نہیں؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ تمہیں بالکل رنج نہ ہوگا۔"

مہتا بولے "تو تم سمجھتی ہو کہ میں انسان نہیں ہوں۔"

"میں تو یہی سمجھتی ہوں، کیوں چھپاؤں؟"

"سچ کہتی ہو مالتی؟"

"تم کیا سمجھتے ہو؟"

"میں پھر کبھی بتاؤں گا"

پانی مہتا کے گلے تک آگیا، کہیں اگلا قدم اٹھاتے ہی سر تک نہ آجائے۔ مالتی کا دل دھڑکنے لگا بولی۔ "مہتا! ایشور کے لئے اب آگے مت جاؤ۔ ورنہ میں پانی میں کود پڑوں گی"

اس سنکٹ میں مالتی کو ایشور یاد آیا جس کا وہ مذاق اڑایا کرتی تھی۔ جانتی تھی کہ ایشور کہیں بیٹھا نہیں ہے جو آکر انہیں بچا لے۔ مگر دل کو جس سہارے اور طاقت کی ضرورت تھی وہ اور کہاں تھا؟ پانی کم ہونے لگا۔ مالتی نے خوش ہو کر کہا۔ "اب تم مجھے اُتار دو"

"نہیں نہیں، چپ چاپ بیٹھی رہو۔ کہیں آگے کوئی گڑھا نہ ہو"

"تم سمجھتے ہو گے کہ کتنی خود غرض ہے"

"مجھے اس کی اُجرت دے دینا"

مالتی کے دل میں گدگدی ہوئی۔ بولی "کیا اُجرت لوگے؟"

"یہی کہ جب تمہاری زندگی میں کوئی ایسا ہی موقع آئے تو مجھے بلا لینا"

دونوں کنارے پر آگئے۔ مالتی نے ریت پر اپنی ساڑی نچوڑی، جوتے کا پانی نکالا، مُنہ ہاتھ دھویا، مگر یہ الفاظ اپنے بھید بھرے مطلب کے ساتھ اس کے سامنے ناچتے رہے۔

اس نے تجربے کا لُطف اٹھاتے ہوئے کہا "یہ دن یاد رہے گا"

مہتا نے پوچھا "تم بہت ڈر رہی تھیں؟"

"پہلے تو ڈری مگر پھر مجھے یقین ہو گیا کہ تم ہم دونوں کی حفاظت کر سکتے ہو"

مہتا نے فخر سے مالتی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر تکان کی سرخی کے ساتھ چمک بھی تھی۔ بولے "مجھے یہ سن کر اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ تم نہ سمجھ سکو گی مالتی؟
تم نے سمجھا یا کب؟ الٹا اور جنگلوں میں گھسیٹتے پھرتے ہو۔ ابھی پھر لوٹتے وقت یہی نالا پار کرنا ہوگا تم نے کیسی آفت میں جان ڈال دی ہے مجھے تمہارے ساتھ رہنا پڑے تو ایک دن نہ پٹے"
مہتا مسکرائے۔ ان الفاظ کا اشارہ خوب سمجھ رہے تھے۔
"مہتا مجھے اتنا دشٹ سمجھتی ہو! اور جو میں کہوں کہ تم سے محبت کرتا ہوں، مجھ سے بیاہ کرو گی؟"
ایسے سنگدل سے کون بیاہ کرے گا؟ رات دن جلا کر مار ڈالو گے،، اور محبت بھری آنکھوں سے دیکھا گویا کہہ رہی ہو "اس کا مطلب تم خوب سمجھتے ہو۔ اتنے نادان نہیں"
مہتا نے جیسے ہوش میں آکر کہا "تم سچ کہتی ہو مالتی! میں کسی عورت کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ مجھ سے کوئی عورت پریم کا سوانگ نہیں کر سکتی۔ میں اس کے دل کی گہرائی تک پہنچ جاؤں گا۔ پھر مجھے اس سے منافرت ہو جائے گی"
مالتی کانپ اٹھی۔ ان باتوں میں کتنی سچائی تھی، پوچھا "اچھا بتاؤ تم کسی محبت سے مطمئن ہو گے؟"
"بس یہی کہ جو دل میں ہو، وہی زبان پر ہو۔ میرے نزدیک رنگ روپ اور ناز و انداز کی قیمت اتنی نہیں ہے جتنی ہونی چاہیئے۔ میں وہ خوراک چاہتا ہوں جس سے روح کی آسودگی ہو۔ متحرک اور جاذب اشیاء کی ضرورت نہیں"
مالتی نے ہونٹ سکیڑ کر گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا "تو تم سے کوئی پیش نہ پائیگا۔ ایک ہی گھاگھر ہو! اچھا بتاؤ میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔

مہتا نے شرارت سے مسکرا کر کہا "تم سب کچھ کر سکتی ہو۔ دانا ہو، ہوشیار ہو، طباع ہو، رحمدل ہو، شوخ ہو، خوددار ہو، تیاگ کر سکتی ہو۔ مگر محبت نہیں کر سکتیں۔"

مالتی نے تیز نگاہ سے تاک کر کہا "جھوٹے ہو تم، بالکل جھوٹے! مجھے تمہارا یہ دعویٰ بے دلیل معلوم ہوتا ہے کہ تم عورت کے دل تک پہنچ جاتے ہو۔"

دونوں نالے کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے بارہ بج چکے تھے مگر اب مالتی کو نہ آرام کی خواہش تھی نہ واپسی کی۔ آج کی گفتگو میں اُسے ایسا مزا آ رہا تھا جو اس کے لئے بالکل نیا تھا۔ اُس نے کتنے ہی عالموں اور لیڈروں کو ایک مسکراہٹ میں، ایک چتون میں، ایک بات میں احمق بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ ایسی ریت کی دیوار پر وہ زندگی کی بُنیاد نہیں قائم کر سکتی تھی۔ آج اُسے وہ سخت اور ٹھوس پتھر سی زمین مل گئی جو پھاوڑوں سے چنگاریاں نکال رہی تھی اور یہ سختی اُسے زیادہ سے زیادہ فریفتہ کئے دیتی تھی۔

دھائیں کی آواز ہوئی۔ ایک "لال سر" نالے پر اُڑا جا رہا تھا۔ مہتا نے نشانہ مارا، چڑیا چوٹ کھا کر کچھ دُور اُڑی۔ پھر بیچ دھار میں گر پڑی، اور لہروں کے ساتھ بہنے لگی۔

"اب؟"

"ابھی جا کر لاتا ہوں، جاتا کہاں ہے؟"

یہ کہتے ہی وہ ریت میں دوڑے اور بندوق کنارے پر رکھ کر پانی میں کود پڑے اور بہاؤ کی طرف تیرنے لگے مگر نصف میل تک پورا زور لگانے پر بھی وہ چڑیا کو نہ پا سکے۔ چڑیا مر کر بھی گویا اُڑی جا رہی تھی! دفعتاً انہوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی کنارے کی ایک جھونپڑی سے نکلی۔ چڑیا کو بہتا دیکھ کر ساڑی کو رانوں تک چڑھایا اور پانی میں کود پڑی۔ ایک لمحے میں اس نے چڑیا پکڑ لی اور مہتا کو دکھاتی

ہوئی بولی "پانی سے نکل آؤ بابوجی! تمہاری چڑیا یہ ہے۔"

مہتا صاحب لڑکی کی چستی اور ہمت دیکھ کر دنگ ہو گئے، فوراً کنارے کی طرف بڑھے اور دو منٹ میں اس کے پاس جا پہنچے۔

لڑکی کا رنگ تھا تو سیاہ اور گہرا سیاہ، کپڑے بہت ہی میلے اور گھنونے۔ زیور کے نام پر صرف ہاتھوں میں دو دو موٹی چوڑیاں۔ سر کے بال اُلجھے اور بکھرے ہوئے، چہرہ کا کوئی حصّہ ایسا نہیں جسے سُندر یا سڈول کہا جا سکے، مگر وہاں کی صاف آب و ہوا نے اس کی سیاہی میں ایسی ملاحت بھر دی تھی اور قدرت کی گود میں پل کر اس کے اعضا اتنے سڈول اور کسے ہوئے اور پھرتیلے ہو گئے تھے کہ شباب کی تصویر کے لیے اُس سے بہتر نمونہ ملنا مشکل تھا۔ اس کی عمدہ صحت گویا مہتا کے دل میں سکت اور چمک لا رہی تھی۔

مہتا نے اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "تم بڑے موقع سے پہنچ گئیں ورنہ مجھے نہ جانے کتنی دُور تیرنا پڑتا۔"

لڑکی نے خوش ہو کر کہا "میں نے تمہیں تیرتے دیکھا تو دوڑی۔ شکار کھیلنے آئے ہو گے؟"

"ہاں آئے تو تھے شکار ہی کھیلنے مگر دوپہر ہو گئی اور یہی ایک چڑیا ملی ہے۔"

"تیندوا مارنا چاہو تو میں اس کی جگہ دکھا دوں۔ رات کو یہاں روز وہ پانی پینے آتا ہے۔ کبھی کبھی دوپہر میں بھی آ جاتا ہے۔"

پھر ذرا شرما کر سر جھکاتے ہوئے بولی "اس کی کھال ہمیں دینی پڑے گی۔ چلو میرے دُوارے پر، وہاں پیپل کی چھایا ہے، یہاں دھوپ میں کب تک کھڑے رہو گے؟ کپڑے بھی تو بھیگے ہوئے ہیں۔"

مہتا نے اُس کے بدن سے لپٹی ہوئی بھیگی ساڑی کی طرف دیکھ کر کہا "تمہارے

کپڑے بھی تو بھیگے ہوئے ہیں"

اس نے بے پرواہی سے کہا "اُنہہ ہمارا کیا، ہم تو جنگل کے جیو ہیں۔ دن دن بھر دھوپ اور پانی میں کھڑے رہتے ہیں۔ تم تھوڑے ہی رہ سکتے ہو"

لڑکی کتنی سمجھدار ہے اور بالکل گنوار۔

"تم کھال بیچ کر کیا کرو گی؟"

"ہمارے دادا ہاٹ میں بیچتے ہیں۔ یہی تو ہمارا کام ہے"

"لیکن دوپہر یہاں کاٹیں تو تم کھلاؤ گی کیا؟"

لڑکی نے شرماتے ہوئے کہا "تمہارے کھانے لایک ہمارے گھر میں کیا ہے؟ مکئے کی روٹیاں کھاؤ تو دھری ہیں چیڑے کا سالن پکا دوں گی۔ تم بتاتے جانا جیسے بنانا ہو۔ تھوڑا دودھ بھی ہے ہماری گائے کو ایک بار تیندوے نے گھیر لیا تھا۔ وہ اُس کو سینگوں سے بھگا کر چلی آئی تھی۔ تب سے تیندوا اس سے ڈرتا ہے"

"لیکن میں اکیلا نہیں ہوں، میرے ساتھ ایک عورت بھی ہے"

"تمہاری گھر والی ہوگی؟"

"نہیں، گھر والی تو ابھی نہیں ہے، جان پہچان کی ہے"

"تو میں دوڑ کر اُن کو بلائے لاتی ہوں، تم اپنی چل کر چھاہنہ میں بیٹھو"

"نہیں، نہیں، میں بلائے لاتا ہوں"

"تم تھک گئے ہوگے۔ شہر کے باسی جنگل میں کاہے کو آتے ہوگے؟ ہم تو جنگلی آدمی ہیں۔ کنارے ہی پر تو کھڑی ہوں گی؟"

جب تک مہتا کچھ بولیں وہ ہوا ہو گئی۔ مہتا اوپر چڑھ کر پیپل کے سائے میں بیٹھے تو اس آزادانہ زندگی سے انہیں رغبت پیدا ہو گئی؟ سامنے کا پہاڑی سلسلہ فلسفے کے اصولوں کی طرح ناقابل عبور اور لامتناہی دور تک پھیلا ہوا گویا فہم و فراست

کو وسعت دے رہا تھا گویا دل اُس عقل کو، اُس نور کو، اُس عشق کو اس کے مجسم اور عظیم صورت میں دیکھ رہا ہو دور کی ایک بہت بلند چوٹی پر ایک چھوٹا سا مندر تھا جو اُس نا قابل فہم مقام میں گیان کی طرح اونچا مگر کھویا ہوا سا کھڑا تھا۔ گویا پرندہ وہاں تک پر مار کر آرام و آسائش حاصل کرنا چاہتا ہے مگر کہیں جگہ نہیں پاتا۔

مہتا انہیں خیالات میں غرق تھے کہ وہ لڑکی مس مالتی کو ساتھ لئے آ پہنچی۔ ایک جنگلی پھول کی طرح دھوپ میں کھلی ہوئی اور دوسری گملے کے پھول کی طرح دھوپ سے زرد اور مرجھائی ہوئی۔

مالتی نے بے دلی سے کہا "پیپل کی چھاؤں بہت اچھی لگ رہی ہے، کیوں؟ اور یہاں بھوک کے مارے جان نکلی جاتی ہے!"

لڑکی دو بڑے بڑے مٹکے اٹھا لائی اور بولی "تم جب تک یہیں بیٹھو، میں دوڑ کر پانی لاتی ہوں۔ پھر چولہا جلاؤں گی اور میرے ہاتھ کا کھاؤ تو میں چھن بھر میں باٹیاں بنا دوں گی، نہیں تو اپنے آپ سینک لینا۔ ہاں گیہوں کا آٹا میرے گھر میں نہیں ہے اور یہاں کہیں کوئی دکان بھی نہیں ہے کہ لا دوں۔"

مالتی کو مہتا پر غصہ آ رہا تھا۔ بولی "تم یہاں کیا آ کر پڑ رہے ہے؟"

مہتا نے چڑھاتے ہوئے کہا "ایک روز ذرا اس صحرائی زندگی کا لطف بھی تو اٹھاؤ۔ دیکھو مکا کی روٹیوں میں کتنی لذت ہے۔"

"مجھ سے وہ روٹیاں کھائی ہی نہ جائیں گی اور کسی طرح نگل بھی جاؤں تو ہضم نہ ہوں گی۔ تمہارے ساتھ آ کر میں بہت پچھتا رہی ہوں۔ راستہ بھر دوڑا کے مار ڈالا اور اب یہاں لا کر پٹک دیا۔"

مہتا نے کپڑے اُتار دیئے تھے اور صرف ایک گیلا جانگھیا پہنے ہوئے بیٹھے تھے۔ لڑکی کو مٹکے لے جاتے دیکھا تو اس کے ہاتھ سے چھین لئے اور کنوئیں

پر پانی بھرنے چلے۔ فلسفے کے عمیق مطالعے میں بھی انہوں نے اپنی صحت کی حفاظت کی تھی اور۔ دونوں مٹکے لے کر چلتے ہوئے ان کے بھرے ہوئے بازوؤں چوڑے سینے اور پٹھے دار رانوں سے کسی یونانی مجسمے کے متناسب اعضاء کی طرح ان کی قوت کا پتہ مل رہا تھا۔ لڑکی انہیں پانی کھینچتے ہوئے شوق کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی وہ اب اس کے رحم کے نہیں بلکہ اس کی عقیدت کے مستحق ہو گئے تھے۔

کنواں بہت گہرا تھا، کوئی ساٹھ ہاتھ۔ مٹکے بھاری تھے اور مہتا صاحب ورزش کے عادی ہوتے ہوئے بھی ایک مٹکا کھینچتے کھینچتے سُست پڑ گئے۔ لڑکی دوڑ کر ان کے ہاتھوں سے رسی چھین لی اور بولی "تم سے نہ کھینچے گا، تم جا کر کھاٹ پر بیٹھو۔ میں بھرے لاتی ہوں"

مہتا اپنی مردانیت کی یہ توہین نہ سہہ سکے۔ رسی اس کے ہاتھ سے پھر لے لی اور زور لگا کر ایک لمحہ میں دوسرا مٹکا بھی کھینچ لیا۔ پھر دونوں ہاتھوں میں دونوں مٹکے لئے ہوئے اگر جھونپڑی کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ لڑکی نے آناً فاناً آگ جلائی اور مرغے کے پر جھلس دئے۔ پھر چھرے سے اُس کی بوٹیاں بنائی اور چولہے میں آگ جلا کر گوشت چڑھا دیا اور چولہے کے پچھلے حصے پر کڑھائی میں دودھ اُبالنے لگی۔

اور مالتی بھویں چڑھائے چارپائی پر اُداس پڑی ہوئی اس منظر کو اس طرح دیکھ رہی تھی گویا اس کے آپریشن کی تیاری ہو رہی ہو۔

مہتا جھونپڑی کے دروازے پر کھڑے ہو کر لڑکی کی خانہ داریوں کو شوق و رغبت سے دیکھتے ہوئے بولے "مجھے بھی تو کوئی کام بتا دو، میں کیا کروں؟"

لڑکی نے ملائم جھڑکی کے ساتھ کہا "تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ جا کر بائی کے پاس بیٹھو، بیچاری بہت بھوکی ہیں۔ دودھ گرم ہوا جاتا ہے، اُسے پلا دینا۔"

اُس نے ایک گھڑے سے آٹا نکالا اور گوندھنے لگی۔ مہتا اُس کے اعضاء کی خوشگوار حرکت دیکھتے رہے۔ لڑکی بھی رہ رہ کر انہیں کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے اپنا کام کرنے لگتی تھی۔

مالتی نے پکارا۔ "تم وہاں کیا کھڑے ہو؟ میرے سر میں شدت کا درد ہو رہا ہے آدھا سر ایسا پھٹا پڑتا ہے جیسے گر جائے گا۔"

مہتا نے آکر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے، دھوپ لگ گئی ہے۔"

"میں کیا جانتی تھی کہ تم مجھے مار ڈالنے کے لئے یہاں لا رہے ہو؟"

"تمہارے ساتھ کوئی دوا بھی تو نہیں ہے؟"

"کیا میں کسی مریض کو دیکھنے آرہی تھی جو دوا لے کر چلتی؟ میرا ایک دواؤں کا بکس ہے وہ سمری میں ہے۔ اُف! سر پھٹا جاتا ہے۔"

مہتا اس کے سرہانے زمین پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ اُس کا سر سہلانے لگے۔ مالتی نے آنکھیں بند کر لیں۔

لڑکی ہاتھوں میں آٹا بھرے ہوئے، سر کے بال بکھیرے، آنکھیں دھوئیں سے سُرخ اور اشک آلود، کل بدن پسینہ سے تر جس سے اُس کا اُبھرا ہوا سینہ صاف جھلک رہا تھا، آکر کھڑی ہو گئی۔ اور مالتی کو آنکھیں بند کئے پڑا دیکھ کر بولی۔ "بائی کو کیا ہو گیا ہے؟"

"مہتا بولے" سر میں بڑا درد ہے۔"

"پورے سر میں ہے کہ آدھے میں؟"

"آدھے میں بتاتی ہیں۔"

"دہنی طرف ہے کہ بائیں طرف؟"

"بائیں طرف۔"

"میں ابھی دَوڑ کر ایک دوا لاتی ہوں جسے گھِس کر لگاتے ہی اچھا ہو جائے گا۔"

"تم اس دھوپ میں کہاں جاؤ گی؟"

لڑکی نے سُنا ہی نہیں۔ تیزی سے ایک طرف جا کر پہاڑیوں میں غائب ہو گئی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد مہتا نے اُسے اُونچی پہاڑی پر چڑھتے دیکھا۔ دور سے بالکل گڑیا سی لگ رہی تھی۔ دل میں سوچا کہ اس جنگلی چھوکری میں خدمت کا کتنا جذبہ اور کتنا عملی علم ہے۔ لو اور دھوپ میں آسمان پر چڑھی چلی جا رہی ہے۔

مالتی نے آنکھیں کھول کر دیکھا بولی "کہاں گئی وہ کلوٹی؟ غضب کی کالی ہے جیسے آبنوس کا کندہ۔ اسے بھیج دو۔ رائے صاحب سے کہہ آئے کہ موٹر یہاں بھیج دیں۔ اس دھوپ میں میرا دَم نکل جائے گا۔"

"کوئی دوا لانے گئی ہے۔ کہتی ہے کہ اس سے آدھا سیسی کا درد بہت جلد دُور ہو جاتا ہے۔"

"ان کی دوائیں ان ہی کو نفع کرتی ہیں، مجھے نہ کریں گی۔ تم تو اس چھوکری پر لٹو ہو گئے۔ کتنے چھچھورے ہو! جیسی روح ویسے فرشتے۔"

مہتا کو تلخ سچائی کہنے میں تامل نہ ہوتا تھا، بولے "کچھ باتیں تو اُس میں ایسی ہیں کہ اگر تم میں ہوتیں تو تم سچ مچ دیوی ہو جاتیں۔"

"اُس کی خوبیاں اُسے مبارک ہوں! مجھے دیوی بننے کی ہوس نہیں ہے۔"

"تم کہو تو میں جا کر موٹر لاؤں، اگرچہ میں نہیں کہہ سکتا کہ موٹر یہاں آ بھی سکے گا یا نہیں۔"

"اس کلوٹی کو کیوں نہیں بھیج دیتے؟"

"وہ تو دوا لینے گئی ہے، پھر کھانا پکائے گی۔"

"تو آج آپ اُس کے مہمان ہیں۔"

مہتا نے اس جملے سے چڑھ کر کہا "اس لڑکی کی جانب میرے دل میں جو محبت و عقیدت ہے وہ ایسی ہے کہ اگر میں اس کی طرف بد نگاہی سے دیکھوں تو آنکھیں پھوٹ جائیں۔ میں اپنے کسی دلی دوست کی خاطر بھی اس دھوپ اور لو میں اس اونچی پہاڑی پر نہ جاتا اور ہم صرف گھڑی بھر کے مہمان ہیں، اسے وہ جانتی ہے۔ وہ کسی غریب عورت کے لئے بھی اسی مستعدی سے دوڑ جائے گی۔ میں اس امر کو صرف تحریر یا تقریر کے ذریعہ ادا کر سکتا ہوں کہ دنیا میں سب لوگ بھائی ہیں اور سبھی میں برادرانہ محبت ہونی چاہیئے مگر وہ ان جذبات پر عمل کر کے دکھلا سکتی ہے۔ کہنے سے کرنا مشکل ہے، یہ تو تم بھی جانتی ہو"

مالتی نے طنز سے کہا "بس بس، وہ دیوی ہے میں مان گئی، اس کے سینہ میں ابھار، کمر میں لچک، جسم میں وزن ہے۔ دیوی ہونے کے لئے اور کیا چاہیئے؟"

مہتا تلملا اٹھے۔ فوراً اٹھے، کپڑے پہنے جو سوکھ گئے تھے۔ بندوق اٹھائی اور چلنے کو تیار ہو گئے۔ مالتی نے پھنکار چھوڑی "تم نہیں جا سکتے مجھے تنہا چھوڑ کر!"

"پھر کون جائے گا؟"

"وہی تمہاری دیوی"

مہتا بدحواس سے کھڑے تھے۔ عورت مرد پر کتنی آسانی سے فتح پا سکتی ہے اس کا آج انہیں زندگی میں پہلا تجربہ ہوا۔

وہ دوڑی ہانپتی چلی آرہی تھی، وہی کالی کلوٹی لڑکی، ہاتھ میں ایک جھاڑ لئے پاس آکر مہتا کو کہیں جانے کے لئے تیار دیکھ کر بولی "میں وہ جڑی کھوج لائی۔ ابھی گھس کر لگاتی ہوں۔ مگر تم کہاں جا رہے ہو؟ ماس (گوشت) تو پک گیا ہوگا۔

میں باٹیاں سینکے دیتی ہوں، دو ایک کھا لینا۔ باقی دودھ پی لیں گی۔ ٹھنڈے میں چلے جانا۔"

اس نے بلا تامل مہتا کی اچکن کے بٹن کھول دیئے۔ مہتا بہت ضبط کئے ہوئے تھے، جی چاہتا تھا کہ اس دہقانی لڑکی کے قدم چوم لیں۔

مالتی نے کہا "اپنی دوا رہنے دے۔ ندی کے کنارے برگد کے نیچے ہمارا موٹر کھڑا ہے۔ وہاں اور لوگ ہوں گے ان سے جا کر کہنا، موٹر یہاں لائیں۔ دوڑی ہوئی جا!"

لڑکی نے مایوسانہ نگاہوں سے مہتا کو دیکھا۔ اتنی محبت سے جڑی لائی، اس کی یہ بے قدری! اس گنوارن کی دوا انہیں نہیں جنچی تو نہ سہی، اس کا من رکھنے ہی کو ذرا سی لگو لیتیں تو کیا ہوتا؟۔

اس نے جڑی کو زمین پر رکھ کر پوچھا "تب تک تو چولہا ٹھنڈا ہو جائے گا باؤ جی۔ کہو تو روٹیاں سینک کر رکھ لوں۔ بابو جی کھانا کھالیں، تم دودھ پی لو اور دونوں جنے آرام کرو۔ تب تک میں موٹر والے کو بلا لوں۔"

وہ جھونپڑی میں گئی، بجھی ہوئی آگ پھر جلائی، دیکھا تو گوشت ابل گیا تھا، کچھ جل بھی گیا تھا، جلد جلد روٹیاں سینکیں، دودھ گرم تھا اسے ٹھنڈا کیا اور ایک کٹورے میں مالتی کے پاس لائی۔ مالتی نے کٹورے کے بھدے پن پر منہ بنایا لیکن دودھ نہ چھوڑ سکی۔ مہتا جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھ کر ایک تھالی میں گوشت اور روٹیاں کھانے لگے۔ لڑکی کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی۔ مالتی نے لڑکی سے کہا "انہیں کھانے دے، کہیں بھاگے نہیں جاتے۔ تو جا کر موٹر لا۔"

لڑکی نے مالتی کی طرف ایک مرتبہ سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ یہ کیا چاہتی ہیں؟ ان کا مطلب کیا ہے؟ اسے مالتی کے چہرے پر مریضوں کی سی عاجزی اور

احسانمندی اور التجا کی جھلک نہ دکھائی دی، اس کی جگہ غرور اور رعونت کی جھلک تھی دہقانی لڑکی دل کی پرکھ میں ہوشیار تھی بولی "کسی کی لونڈی نہیں ہوں، بائی جی تم بڑی ہوگی تو اپنے گھر کی۔ میں تم سے مانگنے نہیں جاتی۔ میں موٹر بیلنے نہ جاؤں گی۔"

مالتی نے ڈانٹا "اچھا تو نے گستاخی پر کمر باندھی ہے، بتا تو کس کے علاقے میں رہتی ہے؟"

"رائے صاحب کا علاقہ ہے۔"

"تو تجھے انہیں رائے صاحب کے ہاتھوں ہنٹروں سے پٹواؤں گی۔"

"مجھے پٹوانے سے تمہیں سکھ ملے تو پٹوا لینا بائی جی، کوئی رانی مہارانی تھوڑے ہی ہوں کہ لشکر بھیجنا پڑے۔"

مہتا نے دو چار نوالے کھائے تھے کہ مالتی کی یہ باتیں سنیں۔ نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ جلدی سے ہاتھ دھویا اور بولے "وہ نہیں جائے گی، میں جا رہا ہوں۔"

مالتی بھی کھڑی ہو گئی "اسے جانا پڑے گا۔"

مہتا نے انگریزی میں کہا "اس کی توہین کر کے تم اپنی توقیر بڑھا نہیں رہی ہو، مالتی!"

مالتی نے پھٹکار بتائی "ایسی ہی لونڈیاں تو مردوں کو پسند آتی ہیں، جن میں کوئی اور گن ہو یا نہ ہو مگر جوان کی خدمت دوڑ دوڑ کر خوشی سے کریں اور اپنے بھاگ کو سراہیں کہ اس مرد نے مجھ سے کچھ کام کرنے کو تو کہا۔ بس وہی تو دیویاں ہیں! میں سمجھتی تھی کہ ویسی مردی کم سے کم تم میں نہیں ہے، لیکن تم بھی دل کے ویسے ہی نکلے۔"

مہتا علم النفس کے ماہر تھے۔ مالتی کے دلی خیالات کو بخوبی سمجھ رہے تھے حسد کی ایسی انوکھی مثال انہیں کبھی نہ ملی تھی۔ اس عورت میں جو اتنی نرم مزاج،

اتنی فراخدل اور اتنی ہنس مکھ تھی، حسد کی ایسی تیز آگ!

بولے "کچھ بھی کہو مگر میں اُسے نہ جانے دوں گا۔ اس کی خدمتوں اور مہربانیوں کا یہ صلہ دے کر میں اپنی نظروں میں ذلیل نہیں بن سکتا" مہتا کی آواز میں کچھ ایسی سختی تھی کہ مالتی آہستہ سے اُٹھی اور جانے کو تیار ہو گئی۔ اس نے جل کر کہا "اچھا تو میں ہی جاتی ہوں۔ تم اس کے چرنوں کی پوجا کر کے بعد کو آنا"

دو تین قدم چلی گئی تو مہتا نے اُس لڑکی سے کہا "اب مجھے اجازت دو بہن! تمہاری یہ محبت، تمہاری یہ بے غرضانہ خدمت ہمیشہ یاد رہے گی"

لڑکی نے آبدیدہ ہو کر دونوں ہاتھوں سے انہیں پرنام کیا اور جھونپڑی میں چلی گئی"

دوسری ٹولی رائے صاحب اور کھنا کی تھی۔ رائے صاحب تو اپنے اُسی ریشمی کرتے اور ریشمی چادرے میں تھے مگر کھنا نے شکاری پوشاک پہن رکھی تھی جو شاید اُسی دن کے لئے تیار کرائی گئی تھی کیونکہ کھنا کو آسامیوں کے شکار سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ جانوروں کا شکار کھیلتے؟ کھنا پستہ قد اور اکہرے بدن کے شکیل آدمی تھے۔ گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، منہ پر چیچک کے داغ، بات چیت میں بڑے ہوشیار!

کچھ دور چلنے کے بعد کھنا نے مہتا صاحب کا ذکر چھیڑ دیا جو کل ہی سے اُن کے سر پہ کسی نحوست کی طرح سوار تھے، بولے "یہ مہتا بھی کچھ عجیب آدمی ہے۔ مجھے تو کچھ بنا ہوا معلوم ہوتا ہے!"

رائے صاحب مہتا کی عزت کرتے تھے اور انہیں سچا، بے ریا آدمی سمجھتے تھے مگر کھنا سے کچھ لین دین بھی تھا اور کچھ مزاج میں بھی امن پسندی تھی۔ بس مخالفت

نہ کر سکے۔ بولے "میں تو انہیں صرف تفریح کی چیز سمجھتا ہوں کبھی ان سے بحث نہیں کرتا اور کرنا بھی چاہوں تو اتنا علم کہاں سے لاؤں؟ جس نے زندگی کے دائرے میں کبھی پیر ہی نہیں رکھا وہ اگر زندگی کے بارے میں کسی نئے اصول کا راگ الاپتا ہے تو مجھے اس پر ہنسی آتی ہے۔ مزے سے ایک ہزار ماہوار وصول کرتے ہیں، نہ جورو نہ جاتا، نہ کوئی فکر نہ تکلیف، وہ فلسفہ نہ بگھاریں تو کون بگھارے؟ آپ آزاد رہ کر زندگی کو مکمل بنانے کا خواب دیکھتے ہیں، ایسے آدمی سے کیا بحث کی جائے؟"

"میں نے سنا کہ چال چلن ٹھیک نہیں ہے؟"

"بیفکرے پن میں چال چلن ٹھیک رہ کیسے سکتا ہے؟ سوسائٹی میں رہو اور اس کے فرائض انجام دو جب پتہ چلے۔"

"مس مالتی نہ جانے کیا دیکھ کر اُن پر فریفتہ ہوئی جاتی ہیں؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ وہ صرف تمہیں جلا رہی ہے۔"

"مجھے وہ کیا کھا کر جلائیں گی؟ میں اُنہیں کھلونے سے زیادہ نہیں سمجھتا۔"

"یہ تو نہ کہو مسٹر کھنّا، مس مالتی پر جان تو دیتے ہو تم!"

"یوں تو میں بھی آپ پر وہی الزام لگا سکتا ہوں۔"

"میں انہیں واقعی کھلونا سمجھتا ہوں۔ آپ البتہ انہیں مورت بنائے ہوئے ہیں۔"

کھنّا نے زور سے قہقہہ لگایا حالانکہ ہنسی کی کوئی بات نہ تھی "اگر ایک لوٹا جل چڑھا دینے سے بردان مل جائے تو کیا بُرا ہے؟"

اب کے رائے صاحب نے زور کا قہقہہ مارا جس کا کوئی مطلب نہ تھا "تب آپ نے اس دیوی کو سمجھا ہی نہیں۔ آپ جتنا ہی اس کی پوجا کریں گے اتنا ہی آپ سے دور بھاگیں گی اور جتنا ہی دور بھاگئے گا اتنا ہی آپ کی طرف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دوڑیں گی۔"

"میری طرف! میں اُس شوقین جماعت سے بالکل باہر ہوں، مسٹر کھنا! سچ کہتا ہوں۔ مجھ میں جتنی عقل، اور طاقت ہے وہ اس علاقے کے انتظام ہی میں خرچ ہو جاتی ہے۔ گھر کے جتنے لوگ ہیں، سبھی اپنی اپنی دھن میں مست ہیں۔ کوئی پرستش میں اور کوئی عیش وعشرت میں! اور ان سب اجگروں کو خوراک دینا میرے ذمے ہے میرا فرض ہے! میرے بہت سے تعلق دار بھائی عیش کر رہے ہیں، یہ میں جانتا ہوں مگر وہ لوگ گھر پھونک کر تماشا دیکھتے ہیں! قرض کا بار سر پر بڑھتا جا رہا ہے، روزانہ ڈگریاں ہو رہی ہیں، جس سے لیتے ہیں اُسے دینا نہیں جانتے چاروں طرف بدنامی ہی بدنامی ہے۔ میں تو ایسی زندگی سے مر جانا بہتر سمجھتا ہوں۔ معلوم نہیں کن کرموں کے پھل سے میرے آتما میں ذرا سی جان باقی رہ گئی ہے۔ جو مجھے دیس اور سماج کے بندھن میں باندھے ہوئے ہے۔ ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہوئی۔ جیل گیا اور لاکھوں روپئے کی زیر باری اٹھائی اور ابھی تک اس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں مجھے اُس کا پچھتاوا نہیں ہے، بالکل نہیں! مجھے فخر ہے۔ میں اس آدمی کو آدمی نہیں سمجھتا جو قوم اور ملک کے بہبود کی کوشش نہ کرے اور قربانی نہ کرے مجھے کیا اچھا لگتا ہے کہ بے جان کسانوں کا خون چوسوں اور اپنے کنبے والوں کی نفس پرستیوں کے ذرائع مہیا کروں مگر کروں کیا؟ جس انتظامی فضا میں میری پرورش اور بالیدگی ہوتی اُس سے نفرت ہونے پر بھی اس کا موہ چھوڑ نہیں سکتا اور اُسی چکر میں رات دن پڑا رہتا ہوں کہ کسی طرح عزت آبرو بچی رہے اور ضمیر کا خون نہ ہونے پائے ایسا آدمی مس مالتی ہی کیا کسی مس کے پیچھے نہیں پڑ سکتا اور پڑے تو اس کا ستیاناس سمجھئے، ہاں ذرا سی تفریح کر لینا دوسری بات ہے۔"

کتنا بھی جری شخص تھے، میدان میں آگے بڑھنے والے۔ دو بار جیل ہو آئے تھے۔ کسی سے دبانا جانتے تھے۔ کھدر پہنتے تھے اور فرانسیسی شراب پیتے تھے۔ موقع پر بڑی بڑی تکلیفیں جھیل سکتے تھے۔ جیل میں شراب چھوئی تک نہیں تھی، اور دوا سے، کلاس میں رہ کر سی، کلاس کی روٹیاں کھاتے رہے، اگرچہ انہیں ہر طرح کا آرام مل سکتا تھا۔ مگر میدانِ جنگ میں چلنے والا رتھ بھی تو تیل کے بغیر نہیں چل سکتا۔ ان کے لئے زندگی ذراسی شوقینی ذراسی رنگینی لازمی تھی۔ بولے "آپ سنیاسی بن سکتے ہیں۔ مگر میں تو نہیں بن سکتا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جو دنیا دار نہیں وہ لڑائی میں پورے حوصلے سے شریک نہیں ہو سکتا جو عورت سے محبت نہیں کر سکتا اس کی حب الوطنی پر میرا یقین نہیں۔"

رائے صاحب مسکرائے "آپ مجھی پر آوازے کسنے لگے۔"

"آوازے نہیں ٹھیک بات ہے۔"

"شاید ہو۔"

"آپ اپنے دل میں اتر کر دیکھئے تو پتہ چلے۔"

"میں تو دیکھ لیا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہاں خواہ کتنی ہی برائیاں ہوں مگر زہر کی ہوس نہیں ہے۔"

"تب تو مجھے آپ پر رحم آتا ہے۔ آپ جو اتنے مغموم اور متفکر ہیں اس کا واحد سبب آپ کی نفس کشی ہے میں تو یہ ناٹک کھیل کر ہی رہوں گا خواہ اس کا انجام رنج ہی کیوں نہ ہو۔ وہ مجھ سے مذاق کرتی ہے اور دکھاتی ہے کہ مجھے تیری پروا نہیں۔ مگر میں ہمت ہارنے والا انسان نہیں ہوں میں اب تک اس کا مزاج نہیں سمجھ سکا۔ نشانہ کہاں ٹھیک بیٹھے گا اس کا تصفیہ نہیں کر سکا جس دن یہ کنجی ہاتھ آ گئی بس فتح ہے۔"

"لیکن وہ کُنجی آپ کو شاید ہی ملے۔ شاید مہتا آپ سے بازی مار لے جائیں۔"

ایک ہرن کئی ہرنیوں کے ساتھ چر رہا تھا، بڑی سینگوں والا اور بالکل سیاہ رائے صاحب نے نشانہ لگایا۔ کھنّا نے روکا "کیوں ہتیھا کرتے ہو یار! بیچارا چر رہا ہے، چرنے دو۔ دھوپ تیز ہو گئی ہے۔ آیئے کہیں بیٹھ جائیں۔ آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

رائے صاحب نے بندوق چلائی مگر ہرن بھاگ گیا۔ بولے "ایک شکار ملا بھی تو نشانہ خالی گیا۔"

"ایک ہتیا سے بچے۔"

"ہاں کہیئے کیا بات کرنے کو کہہ رہے تھے؟"

"آپ کے علاقے میں ایکھ ہوتی ہے؟"

"بڑی کثرت سے۔"

"تو پھر کیوں نہ ہمارے شکر مل میں شریک ہو جایئے حصّے دھڑا دھڑ بک رہے ہیں۔ آپ زیادہ نہیں تو ایک ہزار حصّے خرید لیں۔"

"غضب کیا، میں اتنے روپئے کہاں سے لاؤں گا؟"

"اتنے نامی گرامی تعلقدار اور آپ کو روپئوں کی کمی! کل پچاس ہزار ہی تو ہوتے ہیں اور اس میں بھی تو ابھی پچیس ہی فی صدی دینا ہے۔"

"نہیں بھائی صاحب، میرے پاس اس وقت بالکل روپئے نہیں ہیں۔"

"روپئے جتنے چاہیں مجھ سے لیں۔ بنیک آپ کا ہے۔ ہاں ابھی آپ نے اپنی زندگی کا بیمہ نہ کرایا ہوگا۔ میری کمپنی کی ایک بڑھیا پالیسی لے لیجیئے سو دو سو ماہوار بڑی آسانی سے دے سکتے ہیں اور بعد کو ایک یکبارگی رقم مل جائے گی۔

چار پانچ ہزار لڑکوں کے لئے اس سے بہتر بندوبست آپ نہیں کر سکتے۔ ہمارے قواعد دیکھئے۔ ہم باہمی امداد کے اصول پر پورا عمل کرتے ہیں۔ دفتر اور عملے کے خرچ کے سوا نفع کی ایک پائی بھی کسی کی جیب میں نہیں جاتی۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ اس طریقے پر کمپنی کیسے چل رہی ہے اور میری صلاح سے تھوڑا سا سٹے کا کام شروع کر دیجئے۔ یہ جو آج صدہا کروڑپتی بنے ہوئے ہیں سب اسی کی بدولت بنے ہوئے ہیں۔ روئی، شکر، گیہوں، ربر کسی جنس کا سٹا کیجئے، منٹوں میں لاکھوں کا پنٹارا ہوتا ہے۔ کام ذرا بے ٹنکا ہے۔ بہت سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں مگر وہی جو اناڑی ہیں۔ آپ جیسے تجربہ کار تعلیم یافتہ اور دور اندیش لوگوں کے لئے تو اس سے بہتر نفع کا کام ہی نہیں ہے۔ بازار کا چڑھاؤ اُتار کوئی ناگہانی واقعہ نہیں۔ یہ بھی ایک سائنس ہے۔ ایک بار اُسے غور سے دیکھ لیجئے تو کیا مجال کہ دھوکہ ہو جائے۔"

رائے صاحب کو کمپنیوں پر اعتبار نہ تھا۔ دو ایک بار اس کا انہیں تلخ تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ لیکن مسٹر کھنا کو اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے ترقی کرتے ہوئے دیکھا تھا اور ان کے کمالِ فن کے قائل ہو گئے تھے۔ ابھی دس سال پہلے جو شخص بینک میں کلرک تھا وہ صرف اپنی محنت اور ذہانت سے شہر میں پوجا جاتا ہے۔ اس کی صلاح کو یوں ہی ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ اس بارے میں اگر کھنا اُن کے رہنما بن جائیں تو انہیں بہت کچھ کامیابی ہو سکتی ہے۔ ایسا موقع کیوں ہاتھ سے جانے دیا جائے۔ طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ دفعتاً ایک دیہاتی ایک بڑی ٹوکری میں کچھ جڑیں، پتیاں اور پھول لئے جاتا ہوا دکھائی دیا۔

کھنا نے پوچھا "ارے کیا بیچتا ہے؟"

دیہاتی ڈر گیا کہ کہیں بیگار میں نہ پکڑ جائے۔ بولا "کچھ تو نہیں مالک، یہی

گھاس پات ہے۔"

"کیا کرے گا اُن کا؟"

"بیچوں گا مالک۔ جڑی بوٹی ہے۔"

"کون کون سی جڑی بوٹی ہے؟"

دیہاتی نے اپنا دواخانہ کھول کر دکھایا۔ معمولی چیزیں تھیں جو جنگل کے آدمی اُکھاڑ لے جاتے ہیں اور شہری عطاروں کے ہاتھ دو چار آنے میں بیچ آتے ہیں۔ جیسے مکو، کنگھی، شہد یی، ککروندہ، تخم دھتورہ، مدار کے پھول اکر بنجے گھونگچی وغیرہ ہر چیز دکھاتا تھا اور رٹے ہوئے لفظوں میں اس کے اوصاف بھی بتاتا جاتا تھا۔ "یہ مکوے ہے سرکار! تاپ ہو، مندا گنی ہو، تلی ہو، دھڑکن ہو، ہول ہو، کھانسی ہو ایک خوراک میں آرام ہو جاتا ہے۔ یہ دھتورے کے بیج ہیں۔ مالک! گٹھیا ہو، بائی ہو......" کھنّا نے دام پوچھے، اُس نے آٹھ آنے کہے۔ کھنّا نے ایک روپیہ پھینک دیا اور اُسے پڑاؤ پر رکھ آنے کو کہا۔ غریب نے منہ مانگے دام ہی نہیں پائے بلکہ دگنے پائے، دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

رائے صاحب نے پوچھا "آپ یہ گھاس پات لے کر کیا کریں گے؟"

کھنّا نے مسکرا کر کہا "ایران کی اشرفیاں بناؤں گا۔ میں کیمیا گر ہوں۔ یہ آپ کو شاید نہیں معلوم؟"

"تو یار وہ منتر ہمیں بھی سکھا دو۔"

"ہاں ہاں! شوق سے میری شاگردی کیجئے۔ پہلے سوا سیر لڈو لا کر چڑھایئے، تب بتا دوں گا۔ بات یہ ہے کہ مجھے طرح طرح کے آدمیوں سے سابقہ پڑتا ہے کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو جڑی بوٹیوں پر جان دیتے ہیں، بس انہیں اتنا معلوم ہو جائے کہ یہ کسی فقیر کی دی ہوئی جڑی بوٹی ہے پھر آپ کی خوشامد کریں گے،

ناک رگڑیں گے اور آپ وہ چیز انہیں دے دیں تو سدا کے لئے آپ کے احسانمند بن جائیں گے ایک رو۔ پڑیں اگر دس بیس احمقوں پر احسان کا نمدہ کسا جا سکے تو کیا بُرا ہے؟ ذرا سے احسان سے بڑے بڑے کام نکل جاتے ہیں۔"

رائے صاحب نے شوق بھرے تعجب سے پوچھا، "مگر ان بوٹیوں کے گن آپ کو یاد کیسے رہتے ہیں؟"

کھنّا نے قہقہہ لگایا۔ آپ بھی رائے صاحب بڑے مزے کی بات کرتے ہیں۔ جس بوٹی میں جو گن چاہیے بتا دیجئے، یہ آپ کی لیاقت پر منحصر ہے۔ صحت تو روپئے میں آٹھ آنے اعتقاد سے ہوتی ہے۔ آج جو ان بڑے بڑے افسروں کو دیکھتے ہیں اور ان لمبی دم والے عالموں کو اور ان رئیسوں کو، یہ سب کورانہ اعتقاد والے ہوتے ہیں۔ میں تو علم نباتات کے پروفیسروں کو جانتا ہوں جو لگروندے کے نام سے بھی واقف نہیں۔ ان عالموں کا مذاق تو ہمارے سوامی جی خوب اڑاتے ہیں۔ آپ کو تو کبھی ان کے درشن نہ ہوئے ہوں گے۔ اب کے آئیں گے تو ان سے ملاؤں گا۔ جب سے میرے باغیچے میں ٹھیرے ہیں رات دن لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ ہوس تو انہیں چھو بھی نہیں گئی۔ صرف ایک بار دودھ پیتے ہیں۔ ایسا عالم مہاتما میں نے نہیں دیکھا۔ نہ جانے کتنے برسوں تک ہمالیہ پر تپسیا کرتے رہے۔ پورے پہنچے ہوئے سادھو ہیں۔ آپ اُن کے مرید ضرور ہو جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی ساری پریشانیاں ہوا ہو جائیں گی۔ آپ کو دیکھتے ہی وہ آپ کا ماضی، حال، مستقبل سب کہہ سنائیں گے ایسے ہنس مکھ ہیں کہ دیکھتے ہی دل شگفتہ ہو جاتا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ خود اتنے بڑے مہاتما ہیں، مگر سنیاس تیاگ، مندر اور مٹھ اور پنتھ ان سب کو ڈھونگ کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ رواجی بندشوں کو توڑو اور انسان بنو۔ دیوتا بننے کا خیال

چھوڑ دو، دیوتا بن کر تم انسان نہ رہ جاؤ گے۔"

رائے صاحب کے دل میں شبہ ہوا۔ مہاتماؤں پر انہیں بھی پورا اعتقاد تھا۔ جو ذی اقتدار لوگوں میں عموماً ہوتا ہے۔ دُکھی دل کو دھیان میں جو تسکین ملتی ہے اُس کے لئے وہ بھی للچاتے رہتے ہیں۔ جب مالی مشکلات کے سبب مایوس ہو جاتے تو دل میں آتا کہ دنیا سے منہ موڑ کر گوشہ تنہائی میں جا بیٹھیں اور نجات کی سبیل کریں۔ دنیاوی بندشوں کو بھی عوام کی طرح روحانی ترقی کی راہ کا روڑا سمجھتے تھے اور اُن سے دور ہو جانا ہی اُن کی زندگی کا بھی معیار تھا۔ مگر سنیاس اور تیاگ کے علاوہ بندشوں کے توڑنے کی اور کیا تدبیر ہے؟

بولے "مگر جب وہ سنیاس کو ڈھونگ کہتے ہیں تو خود کیوں سنیاس لیا ہے؟"

انہوں نے سنیاس کب لیا ہے صاحب؟ وہ تو کہتے ہیں کہ انسان کو اخیر اخیر تک کام کرتے رہنا چاہیئے۔ آزاد خیالی اُن کی نصائح کی جان ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ آزاد خیالی کا مطلب کیا ہے؟"

"سمجھ میں تو میری بھی کچھ نہیں آیا۔ اب کے آپ آیئے تو اُن سے گفتگو ہو۔ وہ پریم کو، زندگی کو سچائی کہتے ہیں۔ اور اس کی ایسی عمدہ صراحت کرتے ہیں کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔"

مس مالتی کو اُن سے ملایا نہیں؟"

"آپ بھی مذاق کرتے ہیں۔ مالتی کو بھلا اُن سے کیا ملتا؟ . . . ."

بات ختم نہ ہوئی تھی کہ سامنے کی جھاڑی میں سرسراہٹ سن کر وہ چونک پڑے اور جان بچانے کی غرض سے رائے صاحب کے پیچھے آگئے۔ جھاڑی سے ایک تیندوا نکلا اور آہستہ آہستہ سامنے کی طرف چلا۔

رائے صاحب نے بندوق اٹھائی اور نشانہ لگانا چاہتے تھے کہ کھنّا نے کہا۔

"یہ کیا کرتے ہیں آپ؟ خواہ مخواہ اُسے چھیڑ رہے ہیں۔ کہیں لوٹ پڑتے تو؟"

"لوٹ کیا پڑے گا؟ وہیں ڈھیر ہو جائے گا۔"

"تو مجھے اُس ٹیلے پر چڑھ جانے دیجئے۔ میں شکار کا ایسا شائق نہیں۔"

"تب کیا شکار کھیلنے چلے تھے؟"

"شامت اور کیا؟"

رائے صاحب نے بندوق نیچی کر لی۔

"بڑا بڑھیا شکار نکل گیا۔ ایسے موقعے کب ملتے ہیں؟"

"میں تو اب یہاں نہیں ٹھہر سکتا، خطرناک مقام ہے۔"

"ایک آدھ شکار تو مار لینے دیجئے۔ خالی ہاتھ لوٹتے شرم آتی ہے۔"

"آپ مجھے مہربانی کر کے موٹر تک پہنچا دیجئے، پھر چاہے آپ تیندوے کا شکار کریں یا چیتے کا۔"

"سچ آپ بڑے ڈرپوک ہیں مسٹر کھنّا!"

معفت اپنی جان خطرے میں ڈالنا بہادری نہیں۔"

"اچھا تو آپ خوشی سے واپس جا سکتے ہیں۔"

"تنہا؟"

"راستہ بالکل صاف ہے۔"

"جی نہیں، آپ کو میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

رائے صاحب نے بہت سمجھایا مگر کھنّا نے ایک نہ مانی۔ ڈر کے مارے اُن کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس وقت اگر جھاڑی سے ایک گلہری بھی نکل آتی تو وہ چیخ مار کر گر پڑتے۔ بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ پسینہ سے تر بتر ہو گئے تھے۔ رائے صاحب

کو مجبور ہو کر ان کے ساتھ لوٹنا پڑا۔ جب دونوں بڑی دور نکل آئے تو کھنّا کے ہوش ٹھکانے ہوئے بولے "خطرہ سے نہیں ڈرتا لیکن خطرہ مول لینا حماقت ہے۔"

"اجی جاؤ بھی، ذرا سا ٹینڈوا دیکھ لیا تو جان نکل گئی۔"

"میں شکار کھیلنا اُس وقت کا رواج سمجھتا ہوں جب انسان حیوان تھا۔ اب اُس وقت سے تہذیب بہت آگے بڑھ گئی ہے۔"

"میں مس مالتی سے آپ کی قلعی کھولوں گا۔"

"میں اہنسا کا ماننا شرم کی بات نہیں سمجھتا۔"

"اچھا تو یہ آپ کا اہنسا والا مسئلہ تھا؟ شاباش!"

کھنّا نے غرور سے کہا "جی ہاں، یہ میرا دھی مسئلہ تھا۔ آپ بُدھ اور شنکر کے نام پر فخر کرتے ہیں اور بے زبان جانوروں کا خون کرتے ہیں۔ شرم آپ کو آنی چاہیئے نہ کہ مجھے۔"

کچھ دور تک دونوں پھر چپ چاپ چلتے رہے، کھنّا بولے "تو آپ کب تک آئیں گے؟ میں چاہتا ہوں کہ آپ پالیسی کا فارم آج ہی بھر دیں اور شکر مل کے حصوں کا بھی میرے پاس دونوں فارم موجود ہیں۔"

رائے صاحب نے متفکرانہ لہجے میں کہا "ذرا سوچ لینے دیجئے۔"

"اس میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

تیسری ٹولی خورشید اور ٹنخا کی تھی۔ خورشید کے لئے ماضی اور مستقبل سادہ کاغذ جیسا تھا۔ وہ حال میں رہتے تھے۔ نہ ماضی کا پچھتاوا تھا نہ مستقبل کی فکر۔ جو کچھ آگے آجاتا تھا اسی میں دل و جان سے لگ جاتے تھے۔ دوستوں کی جماعت میں وہ مذاق کے پتلے تھے۔ کونسل میں اُن سے زیادہ حوصلہ مند ممبر کوئی نہ تھا۔ جس سوال

کے پیچھے پڑ جاتے منسٹروں کو رُلا دیتے۔ کسی کے ساتھ رو رعایت کرنا نہ جانتے تھے بیچ بیچ میں ہنسی بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کے لئے آج زندگی کا دن تھا، کل کا پتہ نہیں۔ غصہ ور بھی ایسے کہ خم ٹھونک کر سامنے آجاتے تھے۔ انکسار کے آگے سجدہ کرتے تھے، مگر جہاں کسی نے شان دکھائی اور یہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑے۔ نہ اپنا لینا یاد رکھتے تھے نہ دوسروں کا دینا۔ شراب و شاعری کا شوق تھا۔ عورت صرف تفریح کی چیز تھی۔ بہت دن ہوئے دل کا دیوالہ نکال چکے تھے۔

ٹھاکر صاحب بڑے کاٹ پیچ کے آدمی تھے۔ سودا پٹانے میں، معاملہ سلجھانے میں، اڑنگا لگانے میں، بالو سے تیل نکالنے میں، گلا دبانے میں اور دُم جھاڑ کر نکل جانے میں بڑے ہوشیار تھے۔ کہئے تو ریت میں ناؤ چلا دیں، پتھر پر دوب اُگا دیں، تعلقداروں کو مہاجنوں سے قرض دلانا۔ نئی کمپنیاں کھولنا، چناؤ کے وقت اُمیدوار کھڑا کرنا، یہی سب ان کا کام تھا۔ خاص کر چناؤ کے وقت اُن کی قسمت چمک اُٹھتی تھی۔ کسی مالدار اُمیدوار کو کھڑا کرتے، دل و جان سے اُس کا کام کرتے اور دس بیس ہزار بنا لیتے۔ جب کانگریس کا زور تھا تو کانگریسی اُمیدوار کے مددگار تھے جب فرقہ وارانہ جماعت کا زور ہوا تو ہندو سبھا کی طرف سے کام کرنے لگے، مگر اس اُلٹ پھیر کو ٹھیک ثابت کرنے کے لئے اُن پاس ایسے دلائل تھے جن کی تردید نہ ہو سکتی تھی۔ شہر کے سبھی رؤسا، سبھی اُمرا اور سبھی حکام سے ان کا یارانہ تھا۔ دل میں چاہے لوگ ان کے طریقے پسند نہ کریں مگر وہ ایسے منکر مزاج تھے کہ کوئی ان کے منہ پر نہ کہہ سکتا تھا۔

مرزا خورشید نے رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر کہا "آج تو شکار کھیلنے لائق دن نہیں ہے۔ آج تو کوئی مشاعرہ ہونا چاہیئے تھا۔"

وکیل صاحب نے تائید کی "جی ہاں، وہیں باغ میں۔ بڑی بہار رہتی۔"

ذرا دیر بعد ٹنخا نے معاملہ کی بات شروع کی "اب کے چناؤ میں بڑے بڑے گل کھلیں گے۔ آپ کے لئے بھی مشکل ہے۔"

مرزا بے پرواہی سے بولے "اب کے میں کھڑا ہی نہ ہوں گا۔"

ٹنخا نے پوچھا "کیوں؟"

"مفت کی ہائے ہائے میں کون پڑے؟ فائدہ ہی کیا؟ مجھے اب اس ڈموکریسی پر اعتقاد نہیں رہا۔ ذرا سا کام اور مہینوں کی بحث! ہاں عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے اچھی بحث ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ ایک گورنر رہے۔ خواہ وہ ہندوستانی ہو یا انگریز، اس سے بحث نہیں۔ ایک انجن جس گاڑی کو بڑے مزے سے ہزاروں میل کھینچ لے جا سکتا ہے اُسے دس ہزار آدمی بھی مل کر اتنی تیزی سے نہیں کھینچ سکتے۔ میں تو سارا تماشا دیکھ کر کونسل سے بیزار ہو گیا ہوں۔ میرا بس چلے تو کونسلوں میں آگ لگا دوں جسے ہم ڈموکریسی کہتے ہیں۔ وہ اصل میں بڑے بڑے تاجروں اور زمینداروں کا راج ہے، اور کچھ نہیں۔ چناؤ میں وہی بازی لے جاتا ہے جس کے پاس روپیہ ہے۔ روپئے کے زور سے اُسے سبھی آسانیاں مل جاتی ہیں۔ بڑے بڑے پنڈت، بڑے بڑے مولوی بڑے بڑے لکھنے اور بولنے والے، جو قلم اور زبان سے پبلک کو جدھر چاہیں موڑ دیں، سبھی سونے کے دیوتا کے پیروں پر ناک رگڑتے ہیں۔ میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اب چناؤ کے پاس نہ جاؤں گا۔ میرا پروپیگنڈا اب ڈموکریسی کے خلاف ہو گا۔"

مرزا صاحب نے قرآن کی آیتوں سے ثابت کیا کہ قدیم زمانہ کے بادشاہوں کا معیار کتنا بلند تھا۔ آج تو ہم اُن کی طرف تاک بھی نہیں سکتے ہماری آنکھوں میں چکا چوند آ جائے گی۔ بادشاہ کو خزانے کی ایک کوڑی بھی نجی خرچ میں لانے

کا اختیار نہ تھا۔ وہ کتابیں نقل کر کے، کپڑے سی کر، لڑکوں کو پڑھا کر اپنا گذر کرتا تھا۔ مرزا نے ایسے بادشاہوں کی ایک طویل فہرست گنا دی۔ کہاں تو وہ رعا پرور بادشاہ اور کہاں آج کل کے منسٹر لوگ جنہیں پانچ، چھ، سات، آٹھ ہزار ماہوار ملنا چاہیئے۔ یہ لوٹ ہے یا ڈمو کریسی؟

ہرنوں کا جھنڈ چرتا ہوا نظر آیا۔ مرزا کے چہرے پر شکار کا جوش چمک اُٹھا بندوق اٹھائی اور نشانہ مارا۔ ایک کالا ہرن گر پڑا۔ "وہ مارا!" اس مجنونانہ آواز کے ساتھ مرزا بھی بے تحاشا دوڑ پڑے۔ بالکل بچوں کی طرح اچھلتے کودتے اور تالیاں بجاتے ہوئے۔

پاس ہی ایک درخت پر ایک شخص لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ وہ بھی فوراً درخت سے اُتر کر مرزا کے ساتھ دوڑا۔ ہرن کی گردن میں گولی لگی تھی۔ اُس کے پیر کانپ رہے تھے اور اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ لکڑہارے نے ہرن کو مغموم نگاہوں سے دیکھ کر کہا "اچھا پٹھا تھا، من بھر سے کم نہ ہوگا۔ حکم ہو تو میں اٹھا کر پہنچا دوں۔"

مرزا کچھ بولے نہیں۔ وہ ہرن کی درد بھری آنکھوں کو دیکھ رہے تھے۔ ابھی ایک منٹ قبل اُس میں زندگی تھی۔ ذرا سا پتا بھی کھڑکتا تو کان کھڑے کر کے چوکڑیاں بھرتا ہوا نکل بھاگتا۔ اپنے ساتھیوں اور بال بچوں کے ساتھ خدا کی اگائی ہوئی گھاس چر رہا تھا مگر اب بے بس پڑا ہے۔ اُس کی کھال ادھیڑ لو، اُس کی بوٹیاں کر ڈالو، اسے خبر بھی نہ ہوگی۔ اس کی تفریحی زندگی میں جو کشش تھی، جو لطف تھا، وہ کیا اس بے جان لاش میں ہے؟ کتنا سڈول جسم تھا، کتنی پیاری آنکھیں، کتنا دلکش جلوہ! اس کی قلانچیں دل میں خوشی کی لہریں پیدا کر دیتی تھیں، اُس کی چوکڑیوں کے ساتھ ہمارا دل بھی چوکڑیاں بھرنے لگتا تھا، اس کی جانداری

اپنے ساتھ ہر جگہ زندگی سی بکھراتی چلی جاتی تھی... جس طرح پھول اپنی خوشبو پھیلاتا ہے۔ لیکن اب اُسے دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔

لکڑہارے نے پوچھا "کہاں پہنچانا ہوگا مالک؟ مجھے دو چار پیسے دے دینا۔"

مرزا صاحب جیسے دھیان سے چونک پڑے۔ بولے "اچھا اٹھا لے۔ کہاں چلے گا؟"

"جہاں حکم ہو مالک۔"

"نہیں جہاں تیری مرضی ہو وہاں لے جا۔ میں تجھے دیتا ہوں۔"

لکڑہارے نے مرزا کی طرف تعجب سے دیکھا۔ کانوں پر یقین نہ آیا بولا۔

"ارے نہیں مالک، ہجور نے سکار کیا ہے سو ہم کیسے کھالیں؟"

"نہیں نہیں، میں خوشی سے کہتا ہوں کہ تم اسے لے جاؤ۔ تمہارا گھر یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"کوئی آدھا کوس ہوگا مالک۔"

"تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ دیکھوں گا کہ تمہارے بال بچے کیسے خوش ہوتے ہیں؟"

"اسے تو میں نہ لے جاؤں گا سرکار! آپ اتنی دور سے آئے، اس کڑی دھوپ میں شکار کیا، میں کیسے اٹھا لے جاؤں؟"

"اُٹھا، اُٹھا، دیر نہ کر مجھے معلوم ہوگیا کہ تو بھلا آدمی ہے۔"

لکڑہارے نے ڈرتے ڈرتے اور رہ رہ کر مرزا کے چہرے کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہ کہیں بگڑ نہ جائیں ہرن کو اٹھایا۔ یکا یک اس نے ہرن کو چھوڑ دیا اور کھڑا ہو کر بولا "میں سمجھ گیا مالک، ہجور نے اس کی حلالی نہیں

کی۔"

مرزا جی نے ہنس کر کہا "بس، بس، تو نے خوب سمجھا۔ اب اٹھا لے اور گھر چل۔"
مرزا صاحب مذہب کے اتنے پابند نہ تھے۔ انہوں نے دس سال سے نماز نہ پڑھی تھی۔ دو مہینے میں ایک دن پورا روزہ رکھ ڈالتے تھے، بالکل بلا کچھ کھائے پئے۔ مگر لکڑہارے کو اس خیال سے جو تسلی ہوئی تھی کہ ہرن اب لوگوں کے کھانے کی چیز نہیں رہ گیا۔ اسے پھیکا نہ کرنا چاہتے تھے۔ لکڑہارے نے ہلکے دل سے ہرن کو گردن پر رکھ لیا اور گھر کی طرف چلا۔ ٹھٹھا ابھی تک بے پرواہی سے وہیں درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دھوپ میں ہرن کے پاس جانے کی تکلیف کیوں گوارا کرتے؟ کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ لیکن جب لکڑہارے کو دوسری طرف جاتے دیکھا تو آ کر مرزا سے بولے "آپ اُدھر کہاں جا رہے ہیں حضرت؟ کیا راستہ بھول گئے۔"

مرزا نے خطاوار کی طرح مسکرا کر کہا "میں نے شکار اس غریب آدمی کو دے دیا۔ اب ذرا اس کے گھر جا رہا ہوں۔ آپ بھی آیئے نا۔"

ٹھٹھا نے مرزا کو تعجب سے دیکھا اور بولے "آپ اپنے ہوش میں ہیں یا نہیں؟"

"کہہ نہیں سکتا، مجھے خود نہیں معلوم۔"

"شکار اسے کیوں دے دیا؟"

"اس لئے کہ اُسے پا کر اس کو جتنی خوشی ہوگی اتنی مجھے یا آپ کو نہ ہوگی۔"

ٹھٹھا کھسیا کر بولے "جایئے! سوچا تھا کہ خوب کباب اڑائیں گے سو آپ نے سارا مزا کرکرا کر دیا۔ خیر۔ رائے صاحب اور مہتا کچھ نہ کچھ لائیں ہی گے کوئی غم نہیں میں اس جناؤ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نہیں کھڑے ہونا چاہتے تو نہ سہی۔ آپ کی جیسی مرضی۔ مگر آپ کو اس میں کیا تامل ہے کہ جو لوگ کھڑے ہوتے

ہیں اُن سے اس کی اچھی قیمت وصول کی جائے۔ میں آپ سے صرف اتنا چاہتا ہوں
کہ آپ کسی پر بھید نہ کھلنے دیں کہ آپ کھڑے نہیں ہو رہے ہیں۔ رؤسا کے ووٹ
تو سولہوں آنے اُن کی طرف ہیں۔ حکام بھی ان کے مددگار ہیں پھر بھی پبلک پر آپ کا
جو اثر ہے اس سے وہ گھبرا رہے ہیں۔ آپ چاہیں تو آپ کو اُن سے دس بیس ہزار
روپئے محض یہ ظاہر کر دینے کے لئے مل سکتے ہیں کہ آپ اُن کی خاطر بیٹھے جاتے ہیں۔۔
۔۔۔۔ نہیں مجھے عرض کر لینے دیجئے! اس معاملہ میں آپ کو کچھ نہیں کرنا ہے۔ آپ بفکر
بیٹھے رہئے۔ میں آپ کی طرف سے ایک مینی فسٹو نکال دوں گا، اور اُسی شام کو آپ
مجھ سے دس ہزار نقد وصول کر لیجئے۔"

مرزا صاحب نے اُن کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا "میں روپئے پر اور آپ
پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

مسٹر ٹنخا نے کچھ بھی بُرا نہیں مانا، ماتھے پر شکن تک نہ آنے دی۔

"مجھ پر آپ جتنی لعنتیں چاہیں بھیجیں مگر روپئے پر لعنت بھیج کر آپ اپنا
ہی نقصان کر رہے ہیں۔"

"میں ایسے روپئے کو حرام سمجھتا ہوں۔"

"آپ شریعت کے اتنے پابند تو نہیں ہیں؟"

"لوٹ کی کمائی کو حرام سمجھنے کے لئے شرع کے پابند ہونے کی ضرورت
نہیں ہے۔"

"تو اس معاملے میں آپ اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کر سکتے؟"

"جی نہیں۔"

"اچھی بات ہے، اسے جانے دیجئے۔ کسی بیمہ کمپنی کے ڈائرکٹر ہو جانے میں تو
آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟ آپ کو کمپنی کا ایک حصہ بھی نہ خریدنا پڑے گا۔

آپ صرف اپنا نام دے دیجئے گا۔"

"جی نہیں! مجھے یہ بھی منظور نہیں ہے۔ میں کمپنیوں کا ڈائرکٹر کئی کا مینجنگ ایجنٹ کئی کا چیئرمین تھا۔ دولت میرے پاؤں چومتی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ دولت سے آرام و تکلیف کے کتنے سامان جمع کئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ دولت انسان کو کتنا خود غرض بنا دیتی ہے، کتنا عیش پسند، کتنا مکار اور کتنا بے غیرت!"

وکیل صاحب کو پھر کوئی تجویز پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مرزا صاحب کے دانشمند اور باا ثر ہونے میں انہیں جو یقین تھا وہ بہت کم ہو گیا، اُن کے لئے دولت ہی سب کچھ تھی اور ایسے شخص سے جو دولت کو ٹھکراتا ہو اُن کا کوئی میل نہ ہو سکتا تھا۔

لکڑہارا ہرن کو کندھے پر رکھے لپکا چلا جا رہا تھا۔ مرزا نے بھی قدم بڑھایا۔ مگر موٹے جسم والے ننھا صاحب پیچھے رہ گئے۔ انہوں نے پکارا "ذرا سنئے مرزا جی۔ آپ تو بھاگے جا رہے ہیں۔"

مرزا نے بلا رُکے جواب دیا۔ "وہ غریب بوجھ لئے کتنی تیزی سے چلا جا رہا ہے، ہم کیا اپنا بدن لے کر اُس کے برابر نہیں چل سکتے؟"

لکڑہارے نے ہرن کو ایک ٹھنڈ پر اُتار کر رکھ دیا اور دم لینے لگا۔

مرزا صاحب نے آ کر پوچھا "تھک گئے کیوں؟"

لکڑہارے نے شرماتے ہوئے کہا "بہت بھاری ہے سرکار۔"

"تو لاؤ کچھ دور میں لے چلوں۔"

لکڑہارا ہنسا۔ مرزا ڈیل ڈول میں اس سے کہیں زیادہ اُونچے اور موٹے تازے تھے، پھر بھی وہ دُبلا پتلا آدمی اُن کی اس بات پر ہنسا۔ مرزا پر جیسے چابک پڑ گیا۔

"تم ہنسے کیوں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اسے نہیں اُٹھا سکتا؟"

لکڑہارے نے گویا معافی مانگی "سرکار، آپ لوگ بڑے آدمی ہو بوجھ اُٹھانا تو ہم جیسے مجوروں کا کام ہے"

"میں تمہارا دُگنا جو ہوں"

"اس سے کیا ہوتا ہے مالک؟"

مرزا کی مردانگی اپنی زیادہ توہین نہ سہہ سکی۔ انہوں نے بڑھ کر ہیرن کر گردن پر اٹھا لیا اور چل پڑے مگر مشکل سے پچاس قدم چلے ہوں گے کہ گردن پھٹنے لگی، پیر کانپنے لگے اور آنکھوں میں تتلیاں اُڑنے لگیں۔ کلیجہ مضبوط کیا اور کوئی بیس قدم پھر چلے کمبخت کہاں رہ گیا؟ جیسے اس لاش میں سیسہ بھر دیا گیا ہو۔ ذرا مسٹر ٹنخا کی گردن پر رکھ دوں تو مزا آجائے۔ لیکن بوجھ اُتاریں کیسے؟ دونوں اپنے دل میں کہیں گے کہ بڑی جوانمردی دکھانے چلے تھے، پچاس ہی قدم میں چیں بول گئے۔

لکڑہارے نے چٹکی لی "کہو مالک کیسے رنگ ڈھنگ ہیں؟ بہت ہلکا ہے نا؟"

مرزا کو بوجھ کچھ ہلکا معلوم ہونے لگا، بولے "اتنی دور تو لے ہی جاؤں گا جتنی دور تم لائے ہو"

"کئی دن گردن دکھے گی مالک"

"تم کیا سمجھتے ہو کہ میں یوں پھولا ہوا ہوں؟"

"نہیں مالک، اب تو ایسا نہیں سمجھتا مگر آپ حیران نہ ہوں۔ وہ چٹان ہے اس پر اُتار دیجئے"

"میں ابھی اسے اتنی ہی دور اور لے جا سکتا ہوں"

"مگر یہ اچھا نہیں لگتا، کہ میں یوں ہی چلوں اور آپ لدے رہیں"

مرزا صاحب نے چٹان پہ ہرن کو اتار کر رکھ دیا۔ وکیل صاحب بھی آ پہنچے۔ مرزا نے دانہ پھینکا۔ "اب تو آپ کو بھی کچھ دور لے چلنا پڑے گا جناب"۔

وکیل صاحب کی نگاہوں میں مرزا صاحب کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ بولے "معاف کیجئے۔ مجھے اپنی پہلوانی کا دعویٰ نہیں ہے۔"

"بہت بھاری ہے، سچ"

"اجی رہنے بھی دیجئے"

"آپ اگر اسے سو قدم لے چلیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ میرے سامنے جو تجویز رکھیں گے اُسے منظور کر لوں گا"

"میں ان چکموں میں نہیں آتا"

"میں چکمہ نہیں دیتا ہوں واللہ! آپ جس حلقے سے کہیں گے کھڑا ہو جاؤں گا اور جب حکم دیں گے بیٹھ جاؤں گا جس کمپنی کا ڈائرکٹر، ممبر، گماشتہ، کنویسر جو کچھ کہئے گا بن جاؤں گا۔ بس سو قدم لے چلئے۔ میری تو ایسے ہی دوستوں سے بنتی ہے جو موقع پڑنے پر سب کچھ کر سکتے ہوں"

تنخا کا جی چلبلا اٹھا۔ مرزا اپنے قول کے پکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہ تھا۔ ہرن کیا ایسا بہت بھاری ہوگا۔ آخر مرزا اتنی دور لے ہی تو آئے۔ بہت زیادہ تھکے تو نہیں معلوم ہوتے۔ اگر انکار کرتے ہیں تو سنہرا موقع ہاتھ سے جاتا ہے۔ آخر ایسا کون پہاڑ ہے؟ بہت ہوگا چار پانچ پنسیری ہوگا۔ دو چار دن کمر ہی تو دکھے گی۔ جیب میں روپئے ہوں تو تھوڑی سی بیماری مزہ کی چیز ہے۔

"سو قدم کی رہی"

"ہاں سو قدم میں گنتا ہوں گا"

"دیکھئے نکل

"نکل جانے والے پر لعنت بھیجتا ہوں"

ٹمٹا نے جوتے کا فیتہ پھر سے باندھا، کوٹ اُتار کر لکڑہارے کو دیا، پتلون اوپر چڑھایا، رومال سے منہ پونچھا اور اس طرح ہرن کو دیکھا جیسے اوکھلی میں سر ڈالنے جا رہے ہوں۔ پھر ہرن کو اٹھا کر گردن پر رکھنے کی کوشش کی، دو تین بار زور لگانے پر لاش گردن پر تو آ گئی مگر گردن نہ اٹھ سکی۔ کمر جھک گئی، ہانپ اُٹھے اور لاش زمین پر پٹکنے ہی والے تھے کہ مرزا نے انہیں سہارا دے کر آگے بڑھایا۔

ٹمٹا نے ایک قدم اس طرح اٹھایا جیسے دلدل میں چل رہے ہوں۔ مرزا نے بڑھاوا دیا "شاباش میرے شیر! واہ، واہ"

ٹمٹا نے ایک قدم اور رکھا۔ معلوم ہوا، گردن ٹوٹی جاتی ہے۔

"او مار لیا میدان! شاباش! جیتا رہ پٹھے!"

ٹمٹا دو قدم اور بڑھے۔ آنکھیں نکل پڑتی تھیں۔

"بس ایک بار اور زور مار دوست! سو قدم کی شرط غلط، پچاس ہی قدم رہی!!"

وکیل صاحب کا بُرا حال تھا، وہ بے جان ہرن شیر کی طرح انہیں دبوچے ہوئے اُن کے دل کا خون پی رہا تھا، ساری طاقت جواب دے چکی تھی، صرف لالچ کسی آہنی شہتیر کی طرح چھت کو سنبھالے ہوئے تھا۔ ایک سے پچیس ہزار تک گوٹی تھی۔ مگر بالآخر وہ شہتیر بھی جواب دے گیا، لالچ کی کمر ٹوٹ گئی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، سر چکرایا اور وہ شکار گردن پر لئے ہوئے پتھریلی زمین پر گر پڑے۔

مرزا نے فوراً اُٹھایا اور اپنے رومال سے ہوا کرتے ہوئے ان کی پیٹھ ٹھونکی۔

"زور تو یار تم نے خوب مارا مگر قسمت ہی کھوٹی ہے۔"

ٹنگا نے ہانپتے ہوئے ایک لمبا سانس کھینچ کر کہا، "آپ نے آج میری جان ہی لے لی تھی۔ دو من سے کم نہ ہوگا سسرا!"

مرزا نے ہنستے ہوئے کہا، "لیکن بھائی جان! میں بھی تو اتنی دور اٹھا کر لایا ہی تھا۔"

وکیل صاحب نے خوشامد کرنی شروع کی۔ "مجھے تو آپ کی فرمائش پوری کرنی تھی آپ کو تماشا دیکھنا تھا، وہ آپ نے دیکھ لیا۔ اب آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔"

"آپ نے معاہدہ کب پورا کیا؟"

"کوشش تو جان توڑ کر کی۔"

"اس کی سند نہیں۔"

لکڑ ہارے نے پھر اس کو اٹھا لیا تھا اور بھاگا چلا جا رہا تھا۔ وہ دکھا دینا چاہتا تھا کہ تم لوگوں نے کانکھ کانکھ کر آگے سے دس قدم اٹھا لیا تو یہ سمجھو کر پاس ہو گئے اس میدان میں میں تم سے کمزور ہونے پر بھی آگے ہی رہوں گا۔ ہاں کاغذ تم چاہے جتنا کالا کر دو اور جھوٹے مقدمے تم چاہے جتنے بناؤ۔

ایک نالا تھا جس میں بہت تھوڑا پانی تھا۔ نالے کے اُس پار ٹیلے پر ایک چھوٹا سا پانچ چھ گھروں کا پُروہ تھا اور کئی لڑکے املی کے درخت کے نیچے کھیل رہے تھے۔ لکڑ ہارے کو دیکھ کر سب نے دوڑتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا اور لگے پوچھنے "کس نے مارا؟ بالو! کیسے مارا؟ کہاں مارا؟ کیسے گولی لگی؟ اُس کے کیوں لگی اور ہرنوں کے کیوں نہ لگی؟" لکڑ ہارا "ہوں ہوں" کرتا املی کے نیچے پہنچا اور ہرن کو اتار کر قریب کی جھونپڑی سے دونوں اصحاب کے لئے چار پائی بچھا دی۔ اس کے چاروں لڑکوں اور دو بیویوں نے شکار کو اپنے چارج میں لے لیا۔ اور دوسرے

لڑکوں کو بھگا دینے کی کوشش کرنے لگے۔ سب سے چھوٹے لڑکے نے کہا ہمارا ہے۔"

اُس کی بڑی بہن نے جو چودہ پندرہ برس کی تھی، مہمانوں کی طرف دیکھ کر چھوٹے بھائی کو ڈانٹا۔ "چپ! نہیں سپاہی پکڑ لے جائے گا۔"

مرزا نے لڑکے کو چھیڑا۔ "یہ تمہارا نہیں ہے، ہمارا ہے۔"

لڑکے نے ہرن پر سوار ہو کر اپنا قبضہ ثابت کر دیا اور بولا۔ "باپو تو لائے ہیں!"

بہن نے سکھایا: "کہہ دے بھیا کہ تمہارا ہے۔"

ان بچوں کی ماں بکریوں کے لئے پتے توڑ رہی تھی۔ وہ نئے بھلے مانسوں کو دیکھ کر اُس نے ذرا سا گھونگھٹ نکال لیا اور شرمائی کہ اس کی ساڑی کتنی میلی، کتنی پھٹی اور اٹنگی ہے وہ اس بھیس میں مہمانوں کے سامنے کیسے جائے؟ اور گئے بغیر کام نہیں چلنے کا۔ پانی دانی دینا ہوگا۔

ابھی دوپہر ہونے میں کچھ کسر تھی۔ مگر مرزا نے اسی گاؤں میں دوپہر کاٹنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ گاؤں کے آدمیوں کو جمع کیا، شراب آئی، شکار پکا، قریب کے بازار سے گھی اور میدہ منگایا اور گاؤں بھر کو دعوت دی۔ چھوٹے، بڑے، عورت، مرد سبھی نے دعوت اڑائی۔ مردوں نے خوب شراب پی اور مست ہو کر شام تک گاتے رہے۔ اور مرزا صاحب بچوں کے ساتھ بچے، شرابیوں کے ساتھ شرابی، بوڑھوں کے ساتھ بوڑھے اور جوانوں کے ساتھ جوان بنے ہوئے تھے۔ اتنی ہی دیر میں گاؤں بھر سے ان کا اتنا گہرا میل جول ہو گیا تھا، گویا وہیں کے باشندے ہوں۔ لڑکے تو ان پر لوٹے پڑتے تھے، کوئی ان کی بندوق لئے دار ٹوپی سر پر رکھے لیتا تھا۔ کوئی ان کی رائفل کندھے پر رکھ کر اکڑتا ہوا چلتا تھا۔ اور کوئی ان کی رسٹ واچ

کھل کر اپنی کلائی پر باندھ لیتا تھا۔ مرزا نے خود دیسی شراب پی اور جھوم جھوم کر جنگلی آدمیوں کی طرح گاتے رہے۔

جب یہ لوگ شام کے وقت یہاں سے رخصت ہوئے تو گاؤں بھر کے عورت مرد انہیں بڑی دور تک پہنچانے گئے۔ کئی تو رو رہے تھے! ایسی خوش قسمتی کا موقع ان غریبوں کی زندگی میں شاید اول ہی مرتبہ آیا ہو کہ کسی شکاری نے ان سب کی ضیافت کی ہو۔ ضرور یہ کوئی راجہ نواب ہے، نہیں تو اتنا دریا دل اور کس کا ہوتا ہے؟ اُن کے درشن کا ہے کو ہوں گے۔

کچھ دور چلنے کے بعد مرزا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولے "بے چارے کتنے خوش تھے! کاش میری زندگی میں ایسے موقع روز آتے! آج کا دن بڑا مبارک تھا۔"

منگلا نے بے رخی سے کہا "آپ کے لئے مبارک ہوگا، میرے لئے تو منحوس ہی نکلا۔ مطلب کی کوئی بات نہ ہوئی۔ تمام دن جنگلوں اور پہاڑوں کی خاک چھاننے کے بعد اپنا سا منہ لئے لوٹے جاتے ہیں۔"

مرزا نے رکھائی سے کہا "مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے۔"

دونوں جب برگد کے نیچے پہنچے تو دونوں ٹولیاں لوٹ چکی تھیں۔ مہتا منہ لٹکائے ہوئے تھے۔ مالتی اداس سی الگ بیٹھی تھی جو نئی بات تھی۔ رائے صاحب اور کھنا دونوں بھوکے ہی رہ گئے تھے اور کسی کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ وکیل صاحب اس لئے غمگین تھے کہ مرزا نے ان کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ تنہا مرزا صاحب خوش تھے اور وہ خوشی روحانی تھی۔

۸

جب سے ہوری کے گھر میں گائے آ گئی ہے، گھر کی رونق ہی کچھ اور ہو گئی ہے

دھنیا کا گھمنڈ تو اُس کی بساط سے باہر ہو رہا تھا، جب دیکھو وہی گائے کا چرچا ہے۔

بھوسہ ختم ہو گیا تھا۔ ایکھ میں کچھ چری بو گئی تھی۔ اُسی کو کاٹ کتر کر مویشیوں کو کھلانا پڑتا تھا۔ آنکھیں آسمان کی طرف لگی رہتی تھیں کہ کب پانی برسے اور گھاس اُگے۔ آدھا اساڑھ گزر گیا اور بارش نہیں ہوئی۔

یکایک ایک روز بادل اُٹھے اور اساڑھ کا پہلا جھلا پڑا۔ کسان خریف کی فصل بونے کے لئے ہل لے کر نکلے ہی تھے کہ رائے صاحب کے کارندے نے کہلا بھیجا کہ جب تک لگان نہ بیباق ہو جائے گا کسی کو کھیت میں ہل نہ لے جانے دیا جائے گا۔ کسانوں پر جیسے بجلی گری۔ اور کبھی تو اتنی سختی نہ ہوتی تھی، اب کے یہ کیسا حکم؟ کوئی گاؤں چھوڑ کر بھاگا تھوڑا ہی جاتا ہے۔ اگر کھیتوں میں ہل نہ چلے تو روپیہ کہاں سے آئے گا؟ نکلیں گے تو کھیت ہی سے۔ سب مل کر کارندے کے پاس جا کر رو دیئے۔ کارندے کا نام تھا پنڈت نوکھے رام۔ آدمی بُرے نہ تھے مگر مالک کا حکم تھا۔ اُسے کیسے ٹالیں؟ ابھی اُس دن رائے صاحب نے کیسی دیا اور دھرم کی باتیں کی تھیں اور آج اسامیوں پر یہ ظلم! ہوری مالک کے پاس جانے کو تیار ہوا مگر پھر سوچا کہ انہوں نے کارندے کو ایک بار جو حکم دے دیا اُسے کیوں ٹالنے لگے وہ سب کا سرغنہ ہو کر کیوں بُرا بنے؟ جب اور کوئی کچھ نہیں بولتا تو وہی کیوں آگ میں کودے، جو سب کے سر پڑے گی اُسے وہ بھی جھیل لے گا!

کسانوں میں ہل چل مچی ہوئی تھی، سبھی گاؤں کے مہاجنوں کے پاس روپئے لینے کے لئے دوڑے۔ گاؤں میں آج کل منگرو شاہ کی خوب چل رہی تھی۔ اب کے برس اُسے سن میں اچھا نفع ہوا تھا۔ گیہوں اور السی میں بھی اس نے کچھ کم نہیں کمایا تھا۔ پنڈت داتادین اور دلاری سیٹھانی کے یہاں بھی لین دین کا کام ہوتا تھا سب سے بڑے مہاجن تھے جھنگری سنگھ جو شہر کے ایک بڑے مہاجن کے ایجنٹ تھے۔

ان کی ماتحتی میں کئی آدمی اور تھے جو آس پاس کے دیہاتوں میں گھوم گھوم کر لین دین کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے موٹے مہاجن تھے جو دو آنے روپیہ سود پر بغیر لکھا پڑھی کے روپئے دیتے تھے۔ گاؤں والوں کو بھی لین دین کا کچھ ایسا خبط تھا کہ جس کے پاس دس بیس روپئے جمع ہو جاتے وہی مہاجن بن بیٹھتا۔ ایک وقت میں تو ہوری نے بھی مہاجنی کی تھی۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ لوگ ابھی تک یہی سمجھتے تھے کہ ہوری کے پاس گڑے ہوئے روپئے ہیں۔ آخر وہ روپیہ گیا کہاں؟ بٹوارے میں نکلا نہیں۔ ہوری نے کوئی تیرتھ برت یا بھوج کیا نہیں، روپیہ گیا تو کہاں گیا؟ جوتے پھٹ جانے پر بھی اس کے گھٹے بنے رہتے ہیں؟

کسی نے کسی دیوتا کو سیدھا کیا، کسی نے کسی کو۔ کسی نے آنہ روپیہ سود دینا منظور کیا، کسی نے دو آنے۔ ہوری کی خودداری بالکل جاتی نہ رہی تھی جن لوگوں کے روپئے اس پر باقی تھے ان کے پاس کون سا منہ لے کر جائے۔ جھنگری سنگھ کے سوا اسے اور کوئی نہ سوجھا۔ وہ پکا کاغذ لکھاتے تھے، نذرانہ الگ لیتے تھے، دستوری الگ اور اسٹامپ کی تحریر الگ۔ اس پر ایک سال کا سود پیشگی کاٹ کر دیتے تھے۔ پچیس روپئے کا تمسک لکھو تو مشکل سے سترہ روپئے ملتے تھے۔ مگر اس آڑے وقت میں اور کیا کیا جائے؟ رائے صاحب کی زبردستی ہے ورنہ اس وقت کسی کے سامنے کیوں ہاتھ پھیلانا پڑتا۔

جھنگری سنگھ بیٹھے ہوئے داتون کر رہے تھے۔ ٹھنگنے، موٹے، چندوے کالے لمبی ناک اور بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی تھے، بالکل ناٹک کے مسخرے کی طرح! اور وہ تھے بھی بڑے منسوڑ۔ اسی گاؤں میں اپنی سسرال بنا کر مردوں سے سالے یا سسر اور عورتوں سے سالی یا سرہج کا ناتا جوڑ لیا کرتے تھے۔ راستے میں لڑکے انہیں چھیڑتے "پنڈت جی پالاگی" اور جھنگری سنگھ انہیں جھٹ پٹ

اشیرباد دیتے "تمہاری آنکھیں پھوٹیں، تمہارا گھٹنا ٹوٹے، تمہیں مرگی آدبے، تمہارے گھر میں آگ لگ جائے" وغیرہ لڑکے اس اشیرباد سے کبھی آسودہ نہ ہوتے تھے مگر ہیوں دین کے معاملے میں وہ بڑے سخت تھے، سود کی ایک پائی نہ چھوڑتے تھے، اور وعدے پر روپیہ لئے بغیر دروازے سے نہ ٹلتے تھے۔

ہوری نے جاکر سلام کیا اور اپنا دُکھڑا رو سُنایا۔

جھنگری سنگھ نے مسکرا کر کہا، "وہ سب پُرانا روپیہ کیا کر ڈالا؟"

"پرانے روپے ہوتے ٹھاکر، تو مہاجنوں سے اپنا پنڈ نہ چھڑا لیتا۔ بیاج بھرتے کسی کو اچھا لگتا ہے؟"

"گڑے روپے نہ نکلیں چاہے سود کتنا ہی دینا پڑے، تم لوگوں کا یہی ڈھنگ ہے۔"

"کہاں کے گڑے روپے ٹھاکر صاحب؟ کھانے کو تو ہوتا نہیں لڑکا جوان ہو گیا بیاہ کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ بڑی لڑکی بھی بیاہنے لایق ہو گئی۔ روپیہ ہوتا تو کس دن کے لئے گاڑ رکھتے؟"

جھنگری سنگھ نے جب سے اس کے دروازے پر گائے دیکھی تھی اس پر دانت لگائے ہوئے تھے۔ گائے کا ڈیل ڈول اور سڈول پن کہہ رہا تھا کہ اس میں پانچ سیر سے کم دودھ نہیں ہے۔ دل میں سوچ لیا تھا کہ ہوری کو کسی اردب میں ڈال کر گائے اڑا لینی چاہیئے۔ آج وہ موقع آگیا تھا۔

بولے "اچھا بھائی تمہارے پاس کچھ نہیں ہے! اب راجی ہوئے؟ جتنے روپے چاہو لے جاؤ لیکن تمہارے بھلے کے لئے کہتے ہیں کہ کچھ گہنے ہوں تو گرو رکھ کر روپے لے لو۔ اسٹام لکھوگے تو سود بڑھے گا۔ اور جھمیلے میں جاؤ گے۔"

ہوری نے قسم کھائی کہ گھر میں گہنے کے نام کچا تاگا بھی نہیں ہے دھنیا کے

ہاتھوں میں کرڑے ہیں تو وہ بھی گلٹ کے جھنگڑی سنگھ نے چہرے سے ہمدردی دکھاتے ہوئے کہا، تو ایک بات کرو۔ یہ نئی گائے جو لائے ہو اُسے ہمارے ہاتھ بیچ ڈالو۔ سود اسشام، سب بکھیڑوں سے بچ جاؤ۔ چار آدمی جو دام کہیں وہ ہم سے لے لو ہم جانتے ہیں کہ تم اسے اپنے سوکھ، کے لئے لائے ہو اور بیچنا نہیں چاہتے، لیکن یہ سنکٹ تو ٹالنا ہی پڑے گا۔"

ہوری پہلے تو اس بات پر ہنسا۔ وہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ٹھاکر نے ایسی اونچ نیچ سمجھائی، مہاجنی، ہتھکنڈوں کا ایسا بھیانک روپ دکھایا کہ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ ٹھاکر ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ جب ہاتھ میں روپیہ آجائے تو گائے لوٹا لینا۔ تیس روپے کا کاغذ لکھنے پر کہیں پچیس روپئے ملیں گے اور اگر تین چار برس نہ دئے گئے تو پورے سَو ہو جائیں گے۔ پہلے کا تجربہ یہی بتا رہا تھا کہ قرض وہ مہمان ہے جو ایک بار آکر جانے کا نام نہیں لیتا۔ بولا "میں گھر جاکر سب سے صلاح کر لوں تو بتاؤں۔"

"صلاح نہیں کرنا ہے، اُن سے کہہ دینا کہ روپیہ ادھار لینے میں اپنی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں ٹھاکر، ابھی آکر جواب دیتا ہوں۔"

لیکن گھر آکر اُس نے جیوں ہی یہ بات کہی کہ کہرام مچ گیا۔ دھنیا تو کم چلائی مگر دونوں لڑکیوں نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا۔ نہیں دیتے اپنی گائے، روپیہ جہاں سے چاہو لاؤ۔ سونا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس سے تو کہیں اچھا یہ ہے کہ مجھے بیچ ڈالو تو گائے سے کچھ جیسی ہی مل جائے گا۔ ہوری بیچارا شش و پنج میں پڑ گیا۔ دونوں لڑکیاں سچ مچ گائے پر جان دیتی تھیں۔ روپا تو اُس کے گلے سے لپٹ جاتی تھی اور اُسے کھلائے بغیر منہ میں لقمہ نہ ڈالتی تھی۔ گائے کتنے پیار سے

اُس کا ہاتھ چاٹتی تھی، کتنی محبت بھری آنکھوں سے اُسے دیکھتی تھی۔ اس کا بچھڑا کتنا سندر ہوگا۔ ابھی سے اس کا نام بھی رکھ دیا گیا تھا، مٹرو، وہ اسے اپنے ساتھ لے کر سوئے گی۔ اس گائے کے پیچھے دونوں بہنوں میں کئی بار لڑائی ہو چکی تھی، سونا کہتی کہ مجھے چاہتی ہے اور روپا کہتی کہ مجھے۔ اس کا فیصلہ ابھی تک نہ ہوا تھا اور دونوں کے دعوے برابر قائم تھے۔

مگر ہوری نے آگا پیچھا سمجھا کر آخر دھنیا کو کسی طرح راضی کر لیا۔ ایک دوست سے گائے ادھار لے کر بیچ ڈالنا ہے تو بہت ہی واہیات بات، مگر مصیبت میں تو آدمی کا دھرم تک چلا جاتا ہے۔ پھر یہ کون سی بڑی چیز ہے؟ ایسا نہ ہو تو پھر مصیبت سے لوگ اتنا ڈریں کیوں؟ گوبر نے بھی کوئی خاص اعتراض نہ کیا۔ وہ آج کل اور ہی دھن میں مست تھا۔ یہ طے کیا گیا کہ جب دونوں لڑکیاں رات کو سو جائیں تو گائے جھنگری سنگھ کے یہاں پہنچا دی جائے۔ گوبر اس دردناک منظر سے بھاگ کر کہیں چلا گیا تھا۔ وہ گائے کو جاتے کیسے دیکھ سکے گا؟ اپنے آنسوؤں کو کیسے روکے گا؟ ہوری بھی اوپر ہی سخت بنا ہوا تھا، اندر سے وہ بھی بے چین تھا۔ ایسا کوئی مائی کا لال نہیں جو اس وقت اس کو پچیس روپئے ادھار دے دے چاہے پھر پچیس کے پچاس ہی لے لے۔ وہ گائے کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تو ایسا معلوم ہوا کہ اس کی سیاہ سیاہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں گویا کہہ رہی ہے "کیا چار ہی دن میں تمہارا دل مجھ سے بھر گیا؟ تم نے بچن دیا تھا کہ جیتے جی اسے نہ بیچوں گا، یہی بچن تھا تمہارا؟ میں نے تم سے کبھی کسی بات کا گلہ بھی نہیں کیا، جو کچھ روکھا سوکھا تم نے دے دیا وہی کھا کر آسودہ ہو گئی۔ بولو!"

دھنیا نے کہا کہ لڑکیاں تو سو گئیں۔ اب اُسے لے کیوں نہیں جاتے؟

جب بیچنا ہی ہے تو ابھی سہی۔"

ہوری نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میرا تو ہاتھ نہیں اٹھتا دھنیا! اُس کا منہ نہیں دیکھتی۔ رہنے دے! روپئے سود پر لے لوں گا۔ بھگوان نے چاہا تو سب ادا ہو جائیں گے۔ تین چار سو ہوتے ہی کیا ہیں۔ ایک بار ادکھ جگ جاتے" دھنیا نے نخریہ محبت سے اُس کی طرف دیکھا۔ بولی "اور کیا۔ اتنی تپسیا کے بعد تو گھر میں گئو آئی تو اُسے بھی بیچ دو۔ لے لو کل روپئے۔ جیسے سب چکا دیئے جائیں گے ویسے ہی یہ بھی چکا دیں گے۔"

اندر بڑی اُمس ہو رہی تھی۔ ہوا بند تھی۔ ایک پتی بھی نہ ہلتی تھی، بادل چھائے ہوئے تھے مگر بارش کے آثار نہ تھے، ہوری نے گائے کو لے جا کر باہر باندھ دیا۔ دھنیا نے ٹوکا بھی کہ کہاں لئے جاتے ہو، مگر ہوری نے سنا نہیں، بولا "باہر ہوا میں باندھے دیتا ہوں۔ آرام سے رہے گی اس میں بھی تو جان ہے۔"

گائے باندھ کر وہ اپنے منجھلے بھائی سوبھا کو دیکھنے گیا جسے اِدھر کئی مہینہ سے دمہ کا مرض ہو گیا تھا۔ دوا دارو نام کو نہیں، کھانے پینے کا بندوبست نہیں، اور کام کرنا پڑتا تھا جان توڑ کر۔ اس لئے اس کی حالت دن بدن بگڑتی جاتی تھی۔ سوبھا غمخوار آدمی تھا، لڑائی جھگڑوں سے کوسوں دور بھاگنے والا۔ کسی سے مطلب نہیں اپنے کام سے کام۔ ہوری اسے چاہتا تھا اور وہ بھی ہوری کا ادب کرتا تھا۔ دونوں میں روپئے پیسے کی باتیں ہونے لگیں۔ رائے صاحب کے اس نئے فرمان کی تنقید ہو رہی تھی۔

کوئی گیارہ بجتے بجتے ہوری لوٹا تو اُسے معلوم ہوا کہ جیسے گائے کے پاس کوئی آدمی کھڑا ہے۔ پوچھا "کون ہے وہاں کھڑا؟" ہیرا بولا "میں ہوں دادا، تمہارے الاؤ میں آگ لینے آیا تھا۔"

ہیرا اُس کے الاؤ میں آگ لینے آیا ہے۔ اس ذرا سی بات سے ہوری کو بھائی کی لگاوٹ کا پتہ چلا۔ گاؤں میں اور بھی الاؤ ہیں، کہیں سے بھی آگ مل سکتی ہے۔ ہیرا اس کے الاؤ میں آگ لے رہا ہے تو اپنا ہی سمجھ کے تو۔ سارا گاؤں اس الاؤ میں آگ لینے آتا تھا۔ جو گاؤں میں سب سے بڑا تھا، مگر ہیرا کا آنا دوسری بات تھی اور اس دن کی لڑائی۔؟ لڑائی کے بعد ہیرا کے من میں میل نہیں رہتا۔ گُسّہ ور ہے پر دل کا ساپھ ہے۔"

اُس نے محبت کے لہجے میں پوچھا "تماکھو ہے کہ لاؤں؟"

"نہیں تماکھو ہے۔ دادا۔"

"سوبھا تو آج بہت بے حال ہے۔"

"کوئی دوا نہیں کھاتا تو کیا کیا جائے؟ اس کے حساب میں تو سارے بید، ڈاکٹر، حکیم اناڑی ہیں۔ بھگوان کے پاس جتنی بدھی تھی وہ اس کے اور اس کے گھر والی کے حصہ میں پڑ گئی ہے۔"

ہوری نے تشویش سے کہا "یہی تو برائی ہے اُس میں، اپنے سامنے کسی کو گنتا ہی نہیں اور چڑچڑے تو بیماری میں سبھی ہو جاتے ہیں، تمہیں یاد ہے کہ نہیں، جب تمہیں نفنزا (انفلوئنزا) ہو گیا تھا تو دوائی اٹھا کر پھینک دیتے تھے، تمہارے دونوں ہاتھ پکڑتا تھا تب تمہاری بھابھی منہ میں دوائی ڈالتی تھی، اُس پر تم اُسے تمام گالیاں دیتے تھے۔"

"ہاں دادا، بھلا وہ بات بھول سکتا ہوں تم نے اتنا نہ کیا ہوتا تو تم سے لڑنے کے لئے کیسے بچا رہتا؟"

ہوری کو ایسا معلوم ہوا کہ ہیرا کی آواز بھاری ہو گئی ہے۔ اُس کا گلا بھی بھر آیا، بولا "بیٹا! لڑائی جھگڑا تو زندگی کا دھرم ہے۔ اس سے جو اپنے ہیں وہ پرائے

تھوڑے ہی ہو جاتے ہیں۔ جب گھر میں چار آدمی رہتے ہیں۔ تبھی لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں جس کے کوئی ہے ہی نہیں اُس کے یہاں کون لڑے گا؟"

دونوں نے ساتھ چلم پی۔ پھر ہیرا اپنے گھر گیا اور ہوری اندر کھانا کھانے۔

دھنیا غصّہ سے بولی "دیکھو اپنے سپوت کی لیلا، اتنی رات ہوگئی اور اسے ابھی سیر سپاٹے سے چھٹی نہیں ملی۔ میں سب جانتی ہوں مجھ کو سارا پتہ مل گیا ہے، بھولا کی وہ رانڈ لڑکی نہیں ہے جھنیا وہ اسی کے پھیر میں پڑا رہتا ہے، ہوری کے کانوں میں بھی یہ بھنک پڑی تھی مگر اُسے یقین نہ ہوا تھا۔ گوبر نے چارا ان باتوں کو کیا جانے بولا "کسی نے کہا تم سے کچھ؟"

دھنیا تیز پڑی "تم سے چھپی ہوگی اور سبھی جگہ چرچا ہے۔ یہ ہے بھگا اور وہ بہتر گھاٹ کا پانی پئے ہوئے، اُسے انگلیوں پر نچا رہی ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس پر جان دیتی ہے، تم اُسے سمجھا دو نہیں تو کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو کہیں کے نہ رہو گے۔"

ہوری کا دل اُمنگ پر تھا، چھیڑ کی سوجھی "جھنیا دیکھنے سننے میں تو بری نہیں ہے اُسی سے کر لے سگائی۔ ایسی سستی مہریا اور کہاں ملی جاتی ہے؟"

دھنیا کو یہ چھیڑ تیر سی لگی "جھنیا اس گھر میں آئے تو منہ جھلس دوں رانڈ کا۔ گوبر کی چہیتی ہے تو اُسے لے کر جہاں چاہے رہے۔"

"اور جو گوبر اسی گھر میں لا دے۔"

"یہ تو دونوں لڑکیاں کس کے گلے باندھو گے؟ پھر برادری میں تمہیں کون پوچھے گا؟ کوئی دوارے پر کھڑا تک تو ہوگا نہیں۔"

"اسے اس کی کیا پرواہ۔"

"اس طرح نہیں چھوڑ دوں گی لالا کو! مر مر کے میں نے پالا ہے اور جھنیا آکر راج لے گی! منہ میں آگ لگا دوں گی رانڈ کے۔"

یکایک گوبر آکر گھبرائی ہوئی آواز میں بولا "دادا سندریا کو کیا ہو گیا؟ کیا کالے نے کاٹ لیا؟ وہ تو پڑی تڑپ رہی ہے۔"

ہوری چوکے میں جا چکا تھا۔ تھالی سامنے چھوڑ کر باہر نکل آیا اور بولا "کیا اسگن منہ سے نکالتے ہو۔ ابھی تو میں دیکھے آ رہا ہوں۔ بیٹھی ہوئی تھی۔"

تینوں باہر گئے۔ چراغ لے کر دیکھا۔ سندریا کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا، آنکھیں پتھرا گئی تھیں، پیٹ پھول گیا تھا اور چاروں پاؤں پھیل گئے تھے۔ دھنیا سر پیٹنے لگی۔ ہوری پنڈت داتا دین کے پاس دوڑا، گاؤں میں وہی مویشی ڈاکٹر تھے۔ پنڈت جی سونے جا رہے تھے۔ دوڑے ہوئے آئے۔ دم کے دم میں سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ گائے کو کسی نے کچھ کھلا دیا۔ علامت صاف تھی۔ صاف زہر دیا گیا ہے لیکن گاؤں میں ایسا کون دشمن ہے جس نے زہر دیا ہو؟ ایسی واردات تو اس گاؤں میں کبھی ہوئی ہی نہیں۔ مگر باہر کا کون آدمی گاؤں میں آیا؟ ہوری کی کسی سے عداوت بھی نہ تھی کہ اس پر شبہہ کیا جائے۔ ہیرا سے کچھ کہا سنی ہوتی تھی مگر وہ بھائی بھائی کا جھگڑا تھا۔ سب سے زیادہ دکھی تو ہیرا ہی تھا۔ دھمکی دے رہا تھا کہ جس نے یہ ہتیاروں کا کام کیا ہے اسے پائے تو پی جائے۔ وہ لاکھ غصہ ور ہو مگر اتنی کمینہ حرکت نہیں کر سکتا۔

آدھی رات تک جمگھٹا رہا۔ سبھی ہوری کے دکھ میں دکھی تھے اور ہتیارے کو گالیاں دیتے تھے۔ وہ اس وقت پکڑا جا سکتا تو اس کی جان کی خیر نہ تھی۔ جب یہ حال ہے تو کوئی جانوروں کو باہر کیسے باندھے گا؟ ابھی تک رات میں سبھی جانور باہر پڑے رہتے تھے۔ کسی طرح کی چنتا نہ تھی لیکن اب تو ایک نئی مصیبت آ کھڑی ہوئی تھی۔ کیا گائے تھی کہ بس دیکھتا رہے! پوجنے لائق۔ پانچ سیر سے کم دودھ نہ تھا۔ سو سو کا ایک ایک بچھڑا ہوتا۔ آتے دیر نہ ہوئی کہ یہ پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

جب سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے تو دھنیا ہوری کو کوسنے لگی "تمہیں کوئی لاکھ سمجھائے پر کرو گے اپنے ہی من کی۔ تم گائے کھول کر آنگن سے چلے تب تک میں چیختی رہی کہ باہر نہ لے جاؤ۔ ہمارے دن پتلے ہیں، نہ جانے کب کیسا ہو جائے۔ پر نہیں، اُسے گرمی لگ رہی ہے۔ اب خوب ٹھنڈی ہو گئی اور تمہارا کلیجہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ ٹھاکر یا مانگتے تھے دے دیا ہوتا تو ایک بوجھ سر سے اُتر جاتا اور احسان کا احسان ہوتا۔ مگر پھر یہ کھڑپٹر کیسے پڑتا؟ کوئی بُری بات ہونے والی ہوتی ہے تو مت پہلے ہی ماری جاتی ہے۔ اتنے دن آرام سے گھر میں بندھی رہی، نہ گرمی لگی نہ جوڑی آئی۔ اتنی جلدی سب کو پہچان گئی تھی کہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ باہر سے آئی ہے۔ بچے اس کے سینگوں سے کھیلتے رہتے تھے، سر تک نہ ہلاتی تھی۔ جو کچھ ناند میں ڈال دو چاٹ پونچھ کر صاف کر دیتی تھی۔ لچھمی تھی، ابھاگوں کے گھر کیا رہتی؟"

سونا اور روپا بھی اس ہلچل سے جاگ اُٹھی تھیں اور زار و قطار رو رہی تھیں۔ اُس کی خدمت کا بار زیادہ تر اُن ہی دونوں پر تھا۔ ان کی ساتھی ہو گئی تھی۔ دونوں کھا کر اُٹھتیں تو ایک ایک ٹکڑا روٹی اُسے اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھیں۔ کیسا جیبھ نکال کر کھا لیتی تھی اور جب تک ان کے ہاتھ کو منہ نہ پا لیتی کھڑی تاکتی رہتی۔ بھاگ پھوٹ گئے!

گوبر اور دونوں لڑکیاں رو رو کر سو گئے تھے۔ ہوری بھی لیٹا۔ دھنیا بھی اس کے سرہانے پانی کا لوٹا رکھنے آئی تو ہوری نے آہستہ سے کہا "تیرے پیٹ میں بات پچتی نہیں، کچھ سن پائے گی تو گاؤں بھر میں ڈھنڈھورا پیٹتی پھرے گی!"
دھنیا نے احتجاج کیا "بھلا سنوں تو۔ میں نے کون سی بات پیٹ دی کہ یوں ہی نام بدنام کر دیا!"

"اچھا تیرا سک کسی پر ہوتا ہے؟"

"میرا سک تو کسی پر نہیں ہے۔ کوئی باہری آدمی تھا۔"

"کسی سے کہے گی تو نہیں؟"

"کہوں گی نہیں تو گاؤں والے مجھے گہنے کیسے گڑھوا دیں گے۔"

"اگر کسی سے کہا تو مار ہی ڈالوں گا۔"

"مجھے مار کر سکھی نہ رہو گے۔ اب دوسری جہریا نہیں ملی جاتی۔ جب تک ہوں تمہارا گھر سنبھالے ہوئے ہوں۔ جس دن مر جاؤں گی سر پہ ہاتھ رکھ کر روؤ گے۔ ابھی مجھ میں ساری برائیاں ہی برائیاں ہیں تب آنکھوں سے آنسو بہیں گے۔"

"میرا سک تو ہیرا پر ہوتا ہے۔"

"جھوٹ، بالکل جھوٹ! ہیرا اتنا نیچ نہیں ہے، وہ منہ کا ہی برا ہے۔"

"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، سچ تیرے سر کی سوگند۔"

"تم نے اپنی آنکھوں دیکھا! کب؟"

"وہی میں سوبھا کو دیکھ کر آیا تو وہ سندریا کی ناند کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا کون ہے، تو بولا میں ہوں ہیرا! الاؤ سے آگ لینے آیا تھا۔ تھوڑی دیر مجھ سے بات کرتا رہا مجھے چلم پلائی۔ وہ ادھر گیا، میں گھر میں آیا اور وہیں گوبر نے پکار مچائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں گائے باندھ کر سوبھا کے گھر گیا ہوں اور اس نے ادھر آ کر کچھ کھلا دیا۔ سایت پھر یہ دیکھنے آیا تھا کہ مری یا نہیں۔"

دھنیا نے سرد آہ کھینچ کر کہا "اس طرح کے ہوتے ہیں بھائی جنھیں بھائی کا گلا کاٹتے میں بھی ہچک نہیں ہوتی۔ اف وہ! ہیرا من کا اتنا کالا ہے! اور داری جار کو میں نے ہی پال پوس کر بڑا کیا۔"

"اچھا جا، سو رہ! مگر کسی سے بھول کر بھی چرچا نہ چلانا۔"

"کون، ترڑ کا ہوتے ہی لالا کو تھانے نہ پہنچاؤں تو اپنے اصل باپ کی نہیں! یہ ہتھیارا بھائی کہنے لائق ہے۔ یہی بھائی کا کام ہے۔ وہ بیری ہے پکا بیری! اور بیری کو مارنے میں پاپ نہیں، چھوڑنے میں پاپ ہے۔"

ہوری نے دھمکایا "میں کہے دیتا ہوں دھنیا! انرتھ ہو جائے گا۔"

دھنیا جوش میں بولی "انرتھ نہیں انرتھ کا باپ ہو جائے۔ میں بنا لالا کو بڑے گھر بھجائے مانوں گی نہیں۔ تین سال چکّی پسواؤں گی، تین سال! وہاں سے چھوٹیں گے تو ہتیا لگے گی۔ تیرتھ کرنا پڑے گا۔ بھوج دینا پڑے گا۔ اس دھوکے میں نہ رہیے لالا! اور گواہی دلاؤں گی تم سے، لڑکے کے سر پہ ہاتھ رکھا کر۔"

اُس نے اندر جا کر کواڑ بند کر لئے اور ہوری خود کو کوستا ہوا پڑا رہا "جب میرے ہی پیٹ میں بات نہ پچی تو دھنیا کے پیٹ میں کیا پچے گی؟ اب یہ چڑیل ماننے والی نہیں۔ ہٹ پہ آجاتی ہے تو کسی کی سُنتی ہی نہیں۔ آج میں نے اپنی زندگی میں سب سے بڑی بھول کی۔"

چاروں طرف سنسان تاریکی چھائی تھی۔ دونوں بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں کبھی کبھی بج اُٹھتی تھیں۔ دس قدم پہ مردہ گائے پڑی ہوئی تھی۔ اور ہوری بڑے ہی پچھتاوے میں پڑا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا۔ اندھیرے میں اُجالے کی لکیر کہیں دکھائی نہ دیتی تھی۔

۹

علی الصباح ہوری کے مکان میں ایک پورا ہنگامہ تھا۔ ہوری دھنیا کو مار رہا تھا اور دھنیا اُسے گالیاں دے رہی تھی، دونوں لڑکیاں باپ کے پاؤں سے لپٹی ہوئی چلا رہی تھیں اور گوبر ماں کو بچا رہا تھا۔ بار بار ہوری کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے

ڈھکیل دیتا مگر جیوں ہی دھنیا کے منہ سے کوئی گالی نکل جاتی، ہوری اپنے ہاتھ چھڑا کر اسے دو چار گھونسے لات جما دیتا۔ اس کا بوڑھا غصہ جیسے کسی چھپی اور جمع کی ہوئی طاقت کو باہر نکال لایا ہو۔ سارے گاؤں میں تہلکہ مچ گیا۔ لوگ سمجھانے بجھانے کے بہانے تماشہ دیکھنے آ پہنچے۔ سوبھا لاٹھی ٹیکتا آ کھڑا ہوا۔ داتا دین نے ڈانٹا "ابے یہ کیا ہے ہوری؟ تم باؤلے ہو گئے ہو کیا؟ کوئی اس طرح گھر کی لچھمی پر ہاتھ چھوڑتا ہے؟ تمہیں تو یہ روگ نہ تھا، کیا ہیرا کی چھوت تمہیں بھی لگ گئی ہے؟"

ہوری نے پالاگن کر کے کہا "مہراج! تم اس بکھت نہ بولو۔ میں آج اس کی بان چھڑا کر تب دم لوں گا۔ میں جتنا ہی طرح دیتا ہوں اتنا ہی یہ سر چڑھتی جاتی ہے۔"

دھنیا غصے میں روتی ہوئی بولی "مہراج! تم گواہ رہنا۔ میں اس کے ہتیارے بھائی کو جیل بھجوا کر تب پانی پیوں گی۔ اس کے بھائی نے گائے کو بس کھلا کر مار ڈالا ہے۔ اب جو میں تھانے میں رپٹ لکھانے جاتی ہوں تو یہ ہتیارا مجھے مارتا ہے۔ میں نے اس کے پیچھے اپنی جندگانی ملیا میٹ کر دی، اس کا یہ انعام دے رہا ہے۔"

ہوری نے دانت پیس کر اور آنکھیں نکال کر کہا "پھر وہی بات منہ سے نکالی! تو نے دیکھا تھا ہیرا کو بس دیتے؟"

"تو کسم کھا جا کہ تو نے ہیرا کو گائے کے پاس کھڑا نہیں دیکھا؟"

"ہاں میں نے نہیں دیکھا، کسم کھاتا ہوں۔"

"بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کر کسم کھا۔"

ہوری نے گوبر کے سر پر کانپتا ہوا ہاتھ رکھ کر، کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میں بیٹے کی کسم کھاتا ہوں کہ میں نے ہیرا کو ناند کے پاس نہیں دیکھا۔"

دھنیا نے زمین پر تھوک کر کہا "تھڑی ہے تیری جھٹائی پہ۔ تو نے آپ مجھ سے

کہا کہ ہیرا چور کی طرح ناند کے پاس کھڑا تھا اور اب بھائی کے لئے جھوٹ بولتا ہے، تھوڑی ہے! اگر میرے بیٹے کا بال بھی بیکا ہوا تو گھر میں آگ لگا دوں گی، ساری گرہستی میں آگ لگا دوں گی۔ بھگوان! آدمی منہ سے بات کہہ کر اتنی بے شرمی سے پلٹ جاتا ہے!"

ہوری پاؤں پٹک کر بولا "دھنیا! رِس مت دلا نہیں تو بُرا ہوگا!"

"مار تو رہا ہے اور مار لے، جو تو اپنے باپ کا بیٹا ہوگا تو آج مجھے مار کر تب پانی پیئے گا! پاپی نے مارتے مارتے مجھے بھُرکس کر دیا، پھر بھی اس کا جی نہیں بھرا۔ مجھے مار کر سمجھتا ہے کہ بڑا ہیرو ہوں۔ بھائیوں کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا ہے، پاپی کہیں کا ہتیارا!"

پھر وہ فریاد کر کے رونے لگی۔ اس گھر میں آ کر اس نے کیا کیا دکھ درد نہیں جھیلا، کس کس طرح اپنا پیٹ تن نہیں کاٹا، کس طرح ایک ایک تنکے کو ترسی، کس طرح ایک ایک پیسہ جان کی طرح بچا کر رکھا، کس طرح گھر بھر کو کھلا کر آپ پانی پی کر سو رہی اور آج ان سارے بلدانوں کا یہ بدلا! بھگوان بیٹھے یہ انیائے دیکھ رہے ہیں اور اسے بچانے نہیں دوڑتے!

رفتہ رفتہ رائے عامہ اب دھنیا کے موافق ہونے لگی۔ اس میں اب کسی کو شک نہ رہا کہ ہیرا ہی نے گائے کو زہر دیا۔

ہوری نے بالکل جھوٹی قسم کھائی ہے، اس کا بھی لوگوں کو یقین ہو گیا۔ گوبر کو باپ کی اس جھوٹی قسم اور اس کی وجہ سے آنے والی مصیبت کے اندیشے نے ہوری کا مخالف بنا دیا۔ اس پر جو داتا دین نے ڈانٹ بتائی تو ہوری ہار دکھا گیا اور چپکے سے چلا گیا۔ راستی کی فتح ہوئی۔

داتا دین نے سوبھا سے پوچھا "تم کچھ جانتے ہو سوبھا! کیا بات ہوئی؟"

سوبھا زمین پہ لیٹا ہوا بولا "میں تو مہراج! آٹھ دن سے باہر نہیں نکلا۔ ہوری دادا کبھی کبھی جا کر کچھ دے آتے ہیں، اسی سے کام چلتا ہے۔ کل رات میں بھی وہ میرے پاس گئے تھے۔ کس نے کیا کیا، میں کچھ نہیں جانتا۔ ہاں کل سانجھ کو ہیرا میرے گھر کھرپی مانگنے گیا تھا۔ کہتا تھا کہ ایک جڑی کھودنا ہے۔ پھر تب سے اُس سے میری بھینٹ نہیں ہوئی۔"

دھنیا شہر کو پا کر بولی "پنڈت دادا، یہ اُسی کا کام ہے۔ سوبھا کے گھر سے کھرپی مانگ کر لایا اور کوئی جڑی کھود کر گائے کو کھلا دی۔ اُس رات کو جو جھگڑا ہوا تھا اُسی دن سے وہ رنج مانے بیٹھا ہے۔"

داتا دین بولے "یہ بات ثابت ہو گئی تو اُسے ہتیا لگے گی۔ پولیس کچھ کرے یا نہ کرے، دھرم تو بنا ڈنڈ دیئے نہ رہے گا۔ چلی تو جا روپیا! ہیرا کو بلا لا۔ کہنا کہ پنڈت دادا بلا رہے ہیں۔ اگر اُس نے ہتیا نہیں کی ہے تو گنگا جلی اُٹھالے اور چورے پر چل کر سوگند کھالے۔"

دھنیا بولی "مہراج! اس کی سوگند کا بھروسہ نہیں، جھٹ پٹ کھالے گا۔ جب اس نے جھوٹی سوگند کھائی جب بڑا دھرماتما بنتا ہے تو ہیرا کا کیا بسواس؟"

اب گوبر بولا "کھالے جھوٹی سوگند، بنس کا انت ہو جائے۔ بوڑھے جیتے رہیں، جوان جی کر کیا کریں گے؟"

روپا ایک چھن میں آ کر بولی "کاکا گھر میں نہیں پنڈت دادا! کاکی کہتی ہے کہیں چلے گئے ہیں۔"

داتا دین نے لمبی داڑھی پھٹکار کر کہا "تو نے پوچھا نہیں کہ کہاں چلے گئے ہیں؟ گھر میں چھپا بیٹھا نہ ہو۔ دیکھ تو سونا! اندر تو نہیں بیٹھا ہے؟"

دھنیا نے ٹوکا "اسے نہ بھیجو دادا! ہیرا کے سر ہتیا سوار ہے، نہ جانے کیا

کہہ بیٹھے۔"

داتادین نے خود ٹکڑی سنبھالی اور خبر لائے کہ ہیرا کہیں سچ مچ چلا گیا ہے۔ پنیا کہتی ہے، گیٹیا ڈھور، اور ڈھرا سب لے کر گئے ہیں۔ پنیا نے پوچھا بھی کہ کہاں جاتے ہو، پر بتایا نہیں۔ اُس نے پانچ روپئے آرے میں رکھے تھے۔ روپئے وہاں نہیں ہیں۔ شاید روپئے بھی لیتا گیا۔

دھنیا ٹھنڈے دل سے بولی "منہ میں کالکھ لگا کر کہیں بھاگ گیا ہوگا۔"

سوبھا بولا "بھاگ کے کہاں جائے گا؟ گنگا نہانے نہ چلا گیا ہو۔"

دھنیا نے شک ظاہر کیا "گنگا جاتا تو روپئے کیوں لے جاتا؟ اور آج کل کوئی پرب نہان بھی تو نہیں ہے۔"

اس شک کو کوئی دور نہ کر سکا، خیال مضبوط ہو گیا۔ آج ہوری کے گھر کھانا نہیں پکا، نہ کسی نے بیلوں کو پانی دیا۔ سارے گاؤں میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ دو دو چار چار آدمی جگہ جگہ جمع ہو کر اسی واقعہ پر رائے زنی کر رہے تھے۔ ہیرا ضرور کہیں بھاگ گیا۔ دیکھا ہوگا کہ بھید کھل گیا اب جیل الگ جانا پڑے گا اور بسنیا الگ ٹھکے گی۔ بس کہیں بھاگ گیا۔ پنیا بھی لعد سی کھنچ کر کچھ کہا نہ سُنا، نہ جانے کہاں چل دیئے۔

جو کچھ کسر رہ گئی تھی وہ شام کیوقت حلقے کے تھانیدار نے آ کر پوری کر دی۔ گاؤں کے چوکیدار نے اس واقعے کی رپٹ کی جو اس کا فرض تھا۔ پھر تھانیدار صاحب اپنے فرض سے کب چوکنے والے تھے؟ اب گاؤں والوں کو بھی ان کی خاطر مدارات کرکے اپنا فرض پورا کرنا چاہئے۔ داتادین، جھینگری سنگھ، نوکھے رام، ان کے چاروں پیادے، منگرو شاہ اور لالہ پٹیشوری سبھی آ پہنچے اور داروغہ جی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ ہوری کی طلبی ہوئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ

سوبھا دین پہ لیٹا ہوا بولا "میں تو مہراج! آٹھ دن سے باہر نہیں نکلا۔ ہیرا دی دادا کبھی کبھی جا کر کچھ دے آتے ہیں، اسی سے کام چلتا ہے۔ کل رات میں بھی وہ میرے پاس گئے تھے۔ کس نے کیا کیا، میں کچھ نہیں جانتا۔ ہاں کل سانجھ کو ہیرا میرے گھر کھرپی مانگنے گیا تھا۔ کہتا تھا کہ ایک جڑی کھودنا ہے۔ پھر تب سے اس سے میری بھینٹ نہیں ہوئی۔"

دھنیا شوہر کو پا کر بولی "پنڈت دادا، یہ اسی کا کام ہے۔ سوبھا کے گھر سے کھرپی مانگ کر لایا اور کوئی جڑی کھود کر گائے کو کھلا دی۔ اس رات کو جو جھگڑا ہوا تھا اسی دن سے وہ رنج مانے بیٹھا ہے۔"

داتا دین بولے "یہ بات ثابت ہو گئی تو اسے ہتیا لگے گی۔ پولیس کچھ کرے یا نہ کرے، دھرم تو بنا ڈنڈ دیئے نہ رہے گا۔ چلی تو جا روپا! ہیرا کو بلا لا۔ کہنا کہ پنڈت دادا بلا رہے ہیں۔ اگر اس نے ہتیا نہیں کی ہے تو گنگا جلی اٹھا لے اور چورے پر چل کر سوگند کھائے۔"

دھنیا بولی "مہراج! اس کی سوگند کا بھروسہ نہیں۔ جھٹ پٹ کھا لے گا۔ جب اس نے جھوٹی سوگند کھا لی جو بڑا دھرماتما بنتا ہے تو ہیرا کا کیا بسواس؟"

اب گوبر بولا "کھائے جھوٹی سوگند۔ بس کا انت ہو جائے۔ بوڑھے جیتے رہیں، جوان جی کر کیا کریں گے؟"

روپا ایک چھن میں آکر بولی "کاکا گھر میں نہیں پنڈت دادا! کاکی کہتی ہے کہ کہیں چلے گئے ہیں۔"

داتا دین نے لمبی داڑھی پھٹکار کر کہا "تو نے پوچھا نہیں کہ کہاں چلے گئے ہیں؟ گھر میں چھپا بیٹھا نہ ہو، دیکھ تو سونا! اندر تو نہیں بیٹھا ہے؟"

دھنیا نے ٹوکا "اسے نہ بھیجو دادا! ہیرا کے سر ہتیا سوار ہے نہ جانے کیا

کر بیٹھے؟"

داتادین نے خود لکڑی سنبھالی اور خبر لائے کہ ہیرا کہیں سچ مچ چلا گیا ہے۔ پنیا کہتی ہے، لُٹیا ڈور، اور ڈنڈا سب لے کر گئے ہیں۔ پنیا نے پوچھا بھی کہ کہاں جاتے ہو، پر بتایا نہیں۔ اُس نے پانچ روپے آٹے میں رکھے تھے۔ روپے وہاں نہیں ہیں۔ شاید روپے بھی لیتا گیا۔

دھنیا ٹھنڈے دل سے بولی "سویرے کا نکلا لگا کہیں بھاگ گیا ہوگا۔"

سوبھا بولا "بھاگ کے کہاں جائے گا؟ گنگا نہانے نہ چلا گیا ہو۔"

دھنیا نے شک ظاہر کیا "گنگا جاتا تو روپے کیوں لے جاتا؟ اور آج کل کوئی پرب نہان بھی تو نہیں ہے۔"

اِس شک کو کوئی دور نہ کر سکا، خیال مضبوط ہو گیا۔ آج ہوری کے گھر کھانا نہیں پکا، نہ کسی نے بیلوں کو پانی دیا۔ سارے گاؤں میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ دو دو چار چار آدمی جگہ جگہ جمع ہو کر اسی واقعہ پر رائے زنی کر رہے تھے۔ ہیرا ضرور کہیں بھاگ گیا۔ دیکھا ہوگا کہ بھید کھل گیا اب جیل جانا پڑے گا اور ہتیا الگ لگے گی۔ بس کہیں بھاگ گیا۔ پنیا بھی رو رہی تھی کہ کچھ کہا نہ سُنا، نہ جانے کہاں چل دیے۔

جو کچھ کسر رہ گئی تھی وہ شام کے وقت حلقے کے تھانیدار نے آکر پوری کر دی۔ گاؤں کے چوکیدار نے اس واقعے کی رپٹ کی جو اس کا فرض تھا۔ پھر تھانیدار صاحب اپنے فرض سے کب چوکنے والے تھے؟ اب گاؤں والوں کو بھی اُن کی خاطر مدارات کر کے اپنا فرض پورا کرنا چاہئے۔ داتادین، جھنگری سنگھ، نوکھے رام، ان کے چاروں پیادے، منگرو شاہ اور لالہ پٹیشوری سبھی آ پہنچے اور داروغہ جی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ ہوری کی طلبی ہوئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ

تھانیدار کے سامنے آیا۔ ایسا ڈر رہا تھا جیسے پھانسی ہو جائے گی۔ دھنیا کو پیٹتے وقت اس کا ایک ایک عضو پھڑک رہا تھا۔ داروغہ جی کے آگے کچھوے کی طرح اندر ہی اندر سمٹا جاتا تھا۔ داروغہ نے اسے محققانہ نگاہوں سے دیکھا اور اس کے دل تک پہنچ گئے قیافہ شناسی میں انہیں اچھی مہارت تھی۔ کتابی علم النفس میں کورے ہوں مگر عملاً اس کے ماہر تھے۔ یقین ہو گیا کہ آج کسی اچھے کا منہ دیکھ کر اٹھے ہیں۔

ہوری کا چہرہ کہے دیتا تھا کہ اس کے لئے صرف ایک دھمکی کافی ہے۔

داروغہ نے پوچھا "تجھے کس پر شبہ ہے؟"

ہوری نے زمین چھوئی اور ہاتھ جوڑ کر بولا "میرا شبہ کسی پر نہیں ہے سرکار! گائے اپنی موت مری ہے۔ بوڑھی ہو گئی تھی۔"

دھنیا بھی آکر پیچھے کھڑی ہو گئی تھی۔ فوراً بولی "گائے ماری ہے تمہارے بھائی ہیرا نے۔ سرکار ایسے بودے نہیں ہیں کہ جو کچھ تم کہہ دو گے مان لیں گے۔ یہاں جانچ کرنے آئے ہیں۔"

داروغہ جی نے پوچھا "یہ کون عورت ہے؟"

کئی آدمیوں نے داروغہ جی سے گفتگو کرنے کی خوش نصیبی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ ایک ساتھ بولے اور ہر ایک نے اپنے دل کو اس خیال سے تسکین دی کہ پہلے میں بولا "ہوری کی گھر والی ہے سرکار!"

"تو اسے بلاؤ۔ میں پہلے اسی کا بیان لکھوں گا۔ وہ کہاں ہے ہیرا؟"

"خاص لوگوں نے ایک آواز سے کہا "وہ تو آج تڑکے سے کہیں چلا گیا ہے سرکار!"

"میں اس کے گھر کی تلاشی لوں گا!"

تلاشی! ہوری کا سانس نیچے اوپر ہونے لگا۔ اس کے بھائی ہیرا کے گھر کی تلاشی ہوگی اور ہیرا گھر میں نہیں ہے! تو پھر ہوری کے جیتے جی اور اس کے دیکھتے یہ تلاشی نہ ہونے پاوے گی اور دھنیا سے اب اس کا کوئی ناتا نہیں ہے جہاں چاہے جائے۔ جب وہ اس کی آبرو بگاڑنے پر آگئی ہے تو اس کے گھر میں کیسے رہ سکتی ہے؟ جب گلی گلی ٹھوکر کھائے گی تب پتہ چلے گا۔

گاؤں کے خاص لوگوں نے اس سنکٹ کو ٹالنے کے لئے کانا پھوسی شروع کی۔

داتا دین نے اپنا گنجا سر ہلا کر کہا "یہ سب کمانے کے ڈھنگ ہیں۔ پوچھو ہیرا کے گھر میں کیا رکھا ہے؟"

پٹیشوری لالا بہت لمبے تھے مگر لمبے ہو کر بھی بے وقوف نہ تھے۔ اپنا لمبا، کالا منہ اور لمبا کر کے بولے "اور یہاں آیا ہے کس لئے؟ اور جب آیا ہے تو بنا کچھ لئے دیئے گیا کب ہے؟"

جھنگری سنگھ نے ہوری کو بلا کر کان میں کہا "نکالو جو کچھ دینا ہو، یوں گلا نہ چھوٹے گا۔"

داروغہ جی نے اب گرج کر کہا "میں ہیرا کے گھر کی تلاشی لوں گا۔"

ہوری کا چہرہ ایسا فق ہو گیا گویا جسم کا سارا خون خشک ہو گیا ہو۔ تلاشی اُس کے گھر ہوئی تو اُس کے بھائی کے گھر ہوئی تو، ایک ہی بات ہے۔ ہیرا الگ سہی پر دُنیا تو جانتی ہے کہ اُس کا بھائی ہے۔ مگر اس سمے اس کا کچھ بس نہیں۔ اُس کے پاس روپے ہوتے تو پچاس لا کر داروغہ جی کے پاؤں پر رکھ دیتا اور کہتا "سرکار، میری آبرو اب آپ کے ہاتھ ہے۔" مگر اُس کے پاس تو زہر کھانے کو ایک پیسہ نہیں ہے۔ دھنیا کے پاس دو چار روپے پڑے ہوں پر وہ چڑیل بھلا کب

دینے لگی؟ پھانسی کی سزا پائے ہوئے آدمی کی طرح سر جھکائے اپنی بے عزتی کو سختی سے محسوس کرتا ہوا خاموش کھڑا رہا۔

داتا دین نے ہوری کو آگاہ کیا" اب اس طرح کھڑے رہنے سے کام نہ چلے گا ہوری! روپئے کی کوئی تدبیر کرو۔"

ہوری عاجزانہ بولا" اب میں کیا کہوں مہراج؟ ابھی تو پہلے ہی کی گٹھری سر پر لدی ہے اور کس منہ سے مانگوں؟ پر اس سنکٹ سے اُبارلو۔ جیتا رہا تو کوڑی کوڑی چکا دوں گا۔ میں مر جاؤں تو گوبر تو ہے ہی۔"

لیڈروں میں مشورہ ہونے لگا" تھانیدار کو کیا بھینٹ کیا جائے" داتا دین نے پچاس تجویز کئے۔ جھنگری سنگھ کی رائے میں سو سے کم پر سودا نہ ہوگا۔ نوکھے رام بھی سَو کے حق میں تھے اور ہوری کے لئے سَو اور پچاس میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس تلاشی کا سنکٹ اس کے سر سے ٹل جائے، چاہے پوجا کتنی ہی چڑھانی پڑے، مُردے کو ایک من لکڑی سے جلاؤ یا دس من سے، اسے کیا پروا؟

مگر پٹیشوری سے یہ بے انصافی نہ دیکھی گئی۔ کوئی ڈاکہ یا قتل تو ہوا نہیں، صرف تلاشی ہو رہی ہے، بس بیس روپئے بہت ہیں۔

لیڈروں نے لعنت ملامت کی" تو پھر تمہیں تھانیدار سے بات چیت کرنا، ہم لوگ پاس نہ جائیں گے۔ کون گھڑکیاں کھائے؟"

ہوری نے پٹیشوری کے قدم پر سر رکھ دیا" بھیّا، میرا اُدھار کرو، جب تک جیوں گا تمہاری تابعداری کروں گا۔"

داروغہ جی نے پھر اپنے چوڑے سینہ اور بڑے پیٹ کا پورا زور لگا کر کہا "کہاں ہے ہیرا کا گھر؟ میں اس کے گھر کی تلاشی لوں گا۔"

پٹیشوری نے آگے بڑھ کر داروغہ جی کے کان میں کہا" تلاشی لے کر کیا کرو گے

سرکار، اُس کا بھائی آپ کی تابعداری کے لیئے حاضر ہے۔"

دونوں آدمی ذرا الگ جاکر باتیں کرنے لگے۔

"کیسا آدمی ہے؟"

"بہت ہی غریب، حضور کھانے کا ٹھکانا بھی نہیں۔"

"سچ!"

"ہاں حضور ایمان سے کہتا ہوں۔

ارے تو کیا ایک پچاسے کا بھی ڈول نہیں ہے۔"

"کہاں کی بات سرکار! دس مل جائیں تو ہزار سمجھئے۔ پچاس تو پچاس جنم میں بھی ممکن نہیں اور وہ بھی جب کوئی مہاجن کھڑا ہو جائے۔"

داروغہ جی نے ایک منٹ تک غور کرکے کہا "تو پھر اُسے ستانے سے کیا فائدہ؟ میں ایسوں کو نہیں ستاتا جو آپ ہی مر رہے ہوں۔"

پٹیشوری نے دیکھا کہ نشانہ اور آگے جا پڑا۔ بولے "نہیں سرکار ایسا نہ کریں، نہیں تو پھر ہم کہاں جائیں گے۔ ہمارے پاس دوسری کونسی کھیتی ہے؟"

"تم علاقہ کے پٹواری ہو جی، کیسی باتیں کرتے ہو؟"

"جب ایسا ہی کوئی موقع آجاتا ہے، آپ کی بدولت ہم بھی پا جاتے ہیں، نہیں تو پٹواری کو کون پوچھتا ہے؟"

"اچھا جاؤ تیس روپئے دلوا دو، بیس روپے ہمارے اور دس تمہارے۔"

"چار مکھیاں ہیں، اس کا تو خیال کیجئے؟"

"اچھا نصف نصف پر رکھو اور جلدی کرو، مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

پٹیشوری نے جھنگری سے کہا۔ جھنگری نے ہوری کو اشارے سے بلایا، اپنے گھر لے گئے تیس روپئے گن کر اُسے دیئے اور احسان رکھتے ہوئے بولے "آج

ہی کاگذ لکھ دینا۔ تمہارا منہ دیکھ کر روپئے دے رہا ہوں، تمہاری بھلمنسی پہ۔"

ہوری نے روپئے لئے اور انگوچھے کے چھور میں باندھے ہوئے خوش خوش داروغہ جی کی طرف چلا۔

یکایک دھنیا جھپٹ کر آگے آئی اور انگوچھا ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ گانٹھ مضبوط نہ تھی۔ جھٹکے کے زور سے کھل گئی اور سارے روپئے زمین پہ بکھر گئے۔ ناگن کی طرح پھنکار کر بولی "یہ روپئے کہاں لئے جا رہا ہے؟ بتا! بھلا چاہتا ہے تو سب روپئے لوٹا دے، نہیں کہے دیتی ہوں! گھر کے آدمی رات دن مریں، دانے دانے کو ترسیں، چیتھڑا پہننے کو نہ ملے اور انجلی بھر روپے لے کر چلا ہے اجت بچانے! ایسی بڑی ہے تیری اجت جس کے گھر میں چوہے لوٹیں وہ بھی اجت والا ہے! درگا تلاسی ہی تو لے گا، لے لے جہاں چاہے تلاسی۔ ایک تو سو روپے کی گائے گئی، اس پہ یہ پلیتھن! واہ رے تیری اجت!"

ہوری لہو کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ کل مجمع جیسے تھرا اٹھا۔ ایڈروں کے سر جھک گئے اور تھانیدار کا منہ ذرا سا نکل آیا۔ اپنی زندگی میں ان کی ایسی توہین نہ ہوئی تھی۔

ہوری متحیر سا کھڑا رہا۔ زندگی میں آج پہلی بار دھنیا نے اسے بھرے اکھاڑے میں ٹپک دیا، آسمان تکا دیا۔ اب وہ کیسے سر اٹھائے؟

مگر داروغہ جی اتنی جلد ہارنے والے نہ تھے، کھسیا کر بولے "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شیطان کی خالہ نے ہیرا کو پھنسانے کے لئے گائے کو خود زہر دے دیا ہے۔"

دھنیا ہاتھ مٹکا کر بولی "ہاں دے دیا۔ اپنی گائے تھی، مار ڈالی پھر؟ کسی دوسرے کا جانور تو نہیں مارا؟ تمہاری جانچ میں یہی نکلتا ہے تو یہی لکھو۔ پہنا دو میرے ہاتھ میں ہتھکڑی۔ دیکھ لیا تمہارا نیاؤ اور تمہاری بدھی کی پہنچ۔ گریبوں کا گلا کاٹنا دوسری بات

ہے اور دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کر نا دوسری بات ہے۔"

ہوری کی آنکھوں سے انگارے برسا، دھنیا پر جھپٹا مگر گوبر آگے کھڑا ہو گیا اور تیزی سے بولا "اچھا دادا، اب بہت ہو ا پیچھے ہٹ جاؤ نہیں تو کہے دیتا ہوں کہ میرا منہ دیکھو گے۔ تمہارے اوپر ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ ایسا کپوت نہیں ہوں، مگر یہیں گلے میں پھانسی لگا لوں گا۔"

ہوری پیچھے ہٹ گیا اور دھنیا شیر ہو کر بولی "تو ہٹ جا گوبر! دیکھوں تو وہ کیا کرتا ہے میرا اور دگا جی بیٹھے ہیں، اس کی ہمت دیکھوں۔ گھر میں تلاشی ہونے سے اس کی اجت جاتی ہے اور اپنی عورت کو سارے گاؤں کے سامنے لتیانے سے اس کی اجت نہیں جاتی! یہی تو بیروں کا دھرم ہے! بڑا بیر ہے تو کسی مرد سے لڑ! جس کی بانہہ پکڑ کر لایا اسے مار کر بیرتا دکھاوے گا۔ تو سمجھتا ہو گا کہ میں اسے روٹی کپڑا دیتا ہوں تو لے آج سے اپنا گھر سنبھال۔ دیکھو تو کہ اسی گاؤں میں تیری کا چھاتی پر مونگ دَل کر رہتی ہوں کہ نہیں اور تیرے گھر سے اچھا کھاؤں گی، اچھا پہنوں گی۔ جی میں آوے تو دیکھ لے!"

ہوری مغلوب ہو گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ عورت سے مرد کتنا کمزور ہے، کتنا بے بس۔

لیڈروں نے روپے چن کر اٹھائے تھے اور داروغہ جی کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کر رہے تھے کہ دھنیا نے ایک ٹھوکر اور جمائی "جس کے روپے ہوں اسے لے جا کر دے دو، ہمیں کسی سے ادھار نہیں لینا ہے اور جو دینا ہے تو اسی سے لینا۔ میں دمڑی بھی نہ دوں گی چاہے مجھے حاکم کی کچہری تک جانا پڑے۔ ہم باقی چکانے کو پچیس روپے مانگتے تھے تو کسی نے نہ دیا آج انجلی بھر روپے ٹھنا ٹھن نکال کر دے دیئے۔ میں سب جانتی ہوں۔ یہاں تو حصہ بانٹ ہونے والا تھا۔ سبھی کے

مُنہ میٹھے ہوتے۔ یہ ہتّیارے گاؤں کے مُکھیا ہیں۔ گریبوں کا کھُون چوسنے والے۔ سُود بیاج، ڈیڑھی سوائی، نجر بھینٹ، گھوس رسوت، جیسے ہو گریبوں کو لُوٹو۔ اس پر سوراج چاہیئے۔ جیل سے سوراج نہ ملے گا۔ سوراج ملے گا دھرم سے، نیاؤ سے۔"

لیڈروں کے مُنہ میں کالکھ سی لگ گئی تھی اور داروغہ جی کے منہ پر جھاڑو سی پھر گئی تھی۔ اپنی اپنی عزّت رکھنے کے لئے ہیرا کے گھر کی طرف چلے۔

راستے میں تھانیدار نے تسلیم کیا "عورت ہے بڑی دلیر!"

پٹیشوری لالا بولے "دلیر کیا ہے سرکار، کرکسا ہے۔ ایسی عورت کو تو گولی مار دے۔"

"تم لوگوں کا قافیہ تنگ کر دیا اُس نے۔ چار چار تو ملتے ہی۔"

"سرکار کے بھی تو پندرہ گئے۔"

"میرے کہاں جا سکتے ہیں نہ دے گا تو گاؤں کے مُکھیا دیں گے اور پندرہ کی جگہ پورے پچاس روپئے! آپ لوگ فوراً انتظام کیجئے۔"

پٹیشوری نے ہنس کر کہا "سرکار بڑے دل لگی باز ہیں۔"

داتا دین۔ بولے "بڑے آدمیوں کے یہی لچھن ہیں۔ ایسے بھاگوانوں کے درشن کہاں ہوتے ہیں۔"

داروغہ نے سخت لہجے میں کہا "یہ چاپلوسی پھر کیجئے گا۔ اس وقت تو مجھے پچاس روپئے دلائیے نقد، اور یہ سمجھ لو کہ آنا کانی کی تو میں چاروں کے گھر کی تلاشی لوں گا۔ بہت ممکن ہے کہ تم نے ہیرا اور ہوری کو پھنسا کر اُن سے سو پچاس اینٹھ لینے کے لئے یہ حرکت کی ہو۔"

لیڈر لوگ ابھی تک یہ سمجھ رہے تھے کہ داروغہ جی مذاق کر رہے ہیں۔

جھنگری سنگھ نے آنکھ مار کر کہا "نکالو پچاس روپئے، پٹواری صاحب!"

نوکھے رام نے تائید کی "پٹواری صاحب کا لالا کہا ہے انہیں آپ کی کھاطر کرنی ہی چاہیئے۔"

پنڈت نوکھے رام کی چوپال آگئی۔ داروغہ جی ایک پلنگ پر بیٹھ گئے اور بولے۔

"تم لوگوں نے کیا طے کیا؟ روپیئے نکال لیتے ہو یا تلاشی کراتے ہو؟"

داتا دین نے عذر کیا "مگر سرکار . . . . . . "

"میں اگر مگر کچھ نہیں سُننا چاہتا۔"

جھنگری سنگھ نے جرأت کی "سرکار یہ تو سراسر . . . . . "

میں پندرہ منٹ کی مہلت دیتا ہوں اگر اتنی دیر میں پورے پچاس نہ آگئے تو تم سب کے گھروں کی تلاشی ہوگی اور گنڈا سنگھ کو جانتے ہو۔ اس کا مارا پانی نہیں مانگتا۔"

پٹیشوری نے تیز ہوکر کہا "آپ کو اختیار ہے تلاشی لے لیں۔ یہ اچھی دل لگی ہے کہ کام کون کرے اور پکڑا کون جائے۔"

"میں نے پچیس سال تھانہ داری کی ہے۔ جانتے ہو؟"

"لیکن ایسا اندھیر تو کبھی نہیں ہُوا۔"

"تم نے ابھی اندھیر دیکھا کہاں ہے؟ کہو تو وہ بھی دکھا دوں۔ ایک ایک کو پانچ پانچ سال کے لئے بھجوا دوں۔ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ایک ڈاکے میں گل گانوں کو کالا پانی دلا سکتا ہوں۔ اس دھوکے میں نہ رہنا۔"

چاروں آدمی چوپال کے اندر جاکر صلاح کرنے لگے۔

پھر کیا ہُوا کسی کو معلوم نہیں۔ ہاں داروغہ جی خوش و خرم نظر آرہے تھے۔ اور چاروں آدمیوں کے منہ پر لعنت برس رہی تھی۔

داروغہ جی گھوڑے پر سوار ہوکر چلے تو چاروں لیڈر لوگ پیچھے دوڑ رہے تھے۔ گھوڑا دور نکل گیا تو لوٹے اس طرح جیسے کسی عزیز کی لاش جلاکر مرگھٹ سے لوٹ رہے ہوں۔

یکایک داتادین بولے "میرا شراپ نہ پڑے تو مُنہ نہ دکھاؤں۔"

نوکھے رام نے تائید کی "ایسا دھن کبھی پھلتے نہیں دیکھا۔"

پٹیشوری نے پیشین گوئی کی "حرام کی کمائی حرام ہی میں جائے گی۔"

جھنگری سنگھ کو آج خدائی انصاف میں شبہ پڑ گیا تھا۔ بھگوان نہ جانے کہاں ہے کہ یہ اندھیر دیکھ کر بھی پاپیوں کو ڈنڈ نہیں دیتا۔

اس وقت ان لوگوں کی تصویر دیکھنے لائق تھی۔

۱۰

ہیرا کا کہیں پتہ نہ چلا اور دن گزرتے جاتے تھے۔ ہوری سے جہاں تک بن پڑا دوڑ دھوپ کی، پھر ہار کر بیٹھ رہا۔ کھیتی باڑی کی فکر کرنی تھی۔ اکیلا آدمی کیا کیا کرتا؟ اور اب اپنی کھیتی سے زیادہ فکر تھی پُنیا کی کھیتی کی۔ پُنیا اب تنہا ہو کر اور بھی تیز پڑ گئی تھی۔ ہوری کو اب اُسکی خوشامد کرتے گزرتی تھی۔ ہیرا تھا وہ پُنیا کو دبائے رہتا تھا۔ اُس کے چلے جانے سے اب پُنیا پر کوئی انکس نہ رہ گیا تھا۔ ہوری کی مخالفت ہیرا سے تھی۔ پُنیا عورت تھی۔ اُس سے وہ کیا تناتنی کرتا۔ اور پُنیا اُس کے مزاج سے واقف تھی۔ اور اُس کی شرافت کا اُسے خوب مزا چکھاتی تھی۔ خیریت یہی ہوئی کہ کارندہ صاحب نے پُنیا سے بقایا لگان وصول کرنے کے لئے کوئی سختی نہیں کی، صرف تھوڑی سی نذر پا کر راضی ہو گئے ورنہ ہوری اپنے بقایا کے ساتھ اس کا بقایا ادا کرنے کے لئے بھی قرض لینے کو تیار تھا۔ ساون میں دھان لگانے کی ایسی کثرت رہی کہ مزدور نہ ملے اور ہوری اپنے کھیتوں میں دھان نہ لگا سکا۔ لیکن پُنیا کے کھیتوں میں کیسے نہ لگائے جاتے؟؟ ہوری نے پہر پہر رات گئے تک کام کر کے اُس کے دھان لگائے۔ اب ہوری ہی تو اُس کا محافظ ہے اگر پُنیا کو کوئی تکلیف ہوئی تو دُنیا اُسی پر تو ہنسے گی۔ نتیجہ یہ ہوا

کہ ہوری کو خریف کی فصل میں بہت تھوڑا اناج ملا اور پُنیا کے یہاں دھان رکھنے کی جگہ نہ تھی!

ہوری اور دھنیا میں اُس دن سے برابر کشیدگی چلی آتی تھی۔ گوبر سے بھی ہوری کی بول چال بند تھی۔ ماں بیٹے نے مل کر گویا اُس کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اپنے گھر میں پردیسی بنا ہُوا تھا۔ دو کشتیوں میں سوار ہونے والے کی جو دُرگت ہوتی ہے وہی اُس کی ہو رہی تھی۔ گاؤں میں بھی اب اُس کی اتنی عزت نہ تھی۔ دھنیا اپنی ہمت سے صرف عورتوں کی نہیں بلکہ مردوں کی بھی لیڈر بن بیٹھی تھی۔ مہینوں تک قرب و جوار کے علاقوں میں اس واقعے کا خوب چرچا رہا۔ حتیٰ کہ وہ ایک آسمانی صورت اختیار کرتا جاتا تھا "دھنیا پر دیوی جی کا اشٹ ہے۔ داروغہ جی نے جیوں ہی اُس کے آدمی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالی کہ دھنیا نے دیوی کو یاد کیا۔ دیوی اُس کے سر آ گئی پھر تو اُس میں اتنی سکت آ گئی کہ اُس نے ایک ہی جھٹکے میں اپنے مرد کی ہتھکڑی توڑ ڈالی اور داروغہ کی مونچھیں پکڑ کر اُکھاڑ لیں، پھر اُس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ داروغہ نے جب بہت منت کی تب جا کر اُسے چھوڑا۔" کچھ دن تو لوگ دھنیا کے درشن کو آتے رہے۔ وہ بات تو پرانی پڑ گئی مگر گاؤں میں دھنیا کی عزت بہت بڑھ گئی تھی۔ اُس میں عجیب ہمت ہے جو وقت پر مردوں کے بھی کان کاٹ سکتی ہے۔

مگر رفتہ رفتہ دھنیا میں ایک تبدیلی ہو رہی تھی۔ ہوری کو پُنیا کی کھیتی میں لگا ہُوا دیکھ کر بھی وہ کچھ نہ بولتی تھی۔ اور یہ اس لئے نہیں کہ وہ ہوری کی طرف سے بالکل بے پروا ہو گئی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ پُنیا پر اب اُسے رحم آتا تھا۔ ہیرا کا گھر سے بھاگ جانا اُس کا بدلا پورا کرنے کے لئے کافی تھا۔

اُسی اثنا میں ہوری کو بخار آنے لگا۔ فصلی بخار پھیلا ہی تھا! ہوری بھی اسی کی زد میں آ گیا۔ اور کئی سال کے بعد جو بخار آیا تو اُس نے سارا بقایا وصول کر لیا۔ ایک

مہینے تک ہوری بستر پر پڑا رہا۔ اس بیماری نے ہوری کو تو کچل ہی ڈالا، مگر دھنیا پر بھی فتح حاصل کر لی۔ شوہر جب مر رہا ہے تو اُس سے کیسا بیر؟ ایسی حالت میں تو بیریوں سے بھی بیر نہیں رہتا پھر وہ تو اپنا ہی کا مرد ہے۔ لاکھ برا ہو مگر اُس کے ساتھ زندگی کے پچیس سال کٹے ہیں۔ آرام ملا ہے تو اُسی کے ساتھ اور تکلیف جھیلی ہے تو اُسی کے ساتھ۔ اب چاہے وہ اچھا ہے یا برا، اپنا ہے۔ حالانکہ جار نے مجھے سب کے سامنے مارا۔ سارے گاؤں کے سامنے میرا پانی اُتار لیا۔ لیکن تب سے کتنا لجاتا ہے کہ سیدھے تاکتا بھی نہیں۔ کھانے آتا ہے تو سر جھکائے کھا کر اُٹھ جاتا ہے، ڈرتا رہتا ہے کہ میں کچھ کہہ نہ بیٹھوں۔"

ہوری جب اچھا ہوا تو شوہر و زن میں میل ہو گیا تھا۔

ایک دن دھنیا نے کہا "تمہیں اتنا غصہ کیسے آگیا؟ مجھے تو تمہارے اوپر کتنا ہی غصہ آوے پر ہاتھ نہ اُٹھاؤں گی۔"

ہوری نادم ہو کر بولا "اب اُس کا چرچا نہ کر دھنیا۔ میرے اوپر کوئی بھوت سوار تھا۔ اس کا مجھے کتنا دکھ ہوا ہے یہ میں جانتا ہوں۔"

"اور جو میں بھی اُسی رَس میں ڈوب مری ہوتی؟"

"تو کیا میں رونے کے لئے بیٹھا رہتا؟ میری لاش بھی تیرے ساتھ چتا پر جاتی۔"

"اچھا چپ رہو، بے بات کی بات مت بکو۔"

"گائے گئی سو گئی، میرے سر ایک بپتا ڈال گئی۔ پنیا کی چنتا مجھے مارے ڈالتی ہے۔"

اسی لئے تو کہتے ہیں کہ بھگوان گھر کا بڑا نہ بناوے۔ چھوٹوں کو کوئی نہیں ہنستا، نیکی بدی سب بڑوں کے سر جاتی ہے۔"

ماگھ کے دن تھے۔ مہاوٹ لگ رہی تھی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا ایک تو جاڑوں کی رات دوسرے ماگھ کی برکھا، موت کا سناٹا تھا۔ ہوری کھانا کھا کر ٹیا کے مٹر کے کھیت کی مینڈ پر اپنی جھونپڑی میں لیٹا ہوا تھا۔ چاہتا تھا کہ ٹھنڈ کو بھول جائے اور سو رہے مگر تار تار کمبل اور پھٹی ہوئی مرزئی اور ٹھنڈے گیلا پوال، اتنے بیریوں کے سامنے آنے کی ہمت نیند میں نہ تھی آج تمباکو بھی نہ ملا۔ کہ اس سے دل بہلتا۔ اُپلا سلگا لایا تھا، پر وہ بھی ٹھنڈ سے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ بوائی پھٹے پیروں کو پیٹ میں ڈال کر اور ہاتھوں کو رانوں کے بیچ میں دبا کر اور کمبل میں منہ چھپا کر اپنے ہی گرم سانسوں سے اپنے کو گرمی پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پانچ سال ہوئے یہ مرزئی بنوائی تھی۔ دھنیا نے ایک طرح سے جبراً بنوا دی تھی۔ وہی جب ایک بار ایک کابلی سے کپڑے لئے تھے جس کے پیچھے کتنی آفت ہوئی ور کتنی گالیاں کھانا پڑیں۔ اور یہ کمبل تو اس کے جنم سے بھی پہلے کا ہے۔ بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ وہ اس میں سوتا تھا، جوانی میں گوبر کو لے کر اس کمبل میں اُس کے جاڑے کٹتے تھے، اور بڑھاپے میں آج وہی بوڑھا کمبل اُس کا ساتھی ہے۔ مگر اب وہ کھانے کو چبانے والا دانت نہیں بلکہ دُکھنے والا دانت ہے۔ زندگی میں ایسا تو کوئی دن ہی نہیں آیا کہ زمیندار اور مہاجن کو دے کر کبھی کچھ بچا ہوا اور بیٹھے بٹھائے یہ ایک جنجال پڑ گیا۔ نہ کرو تو دنیا ہنسے اور کرو تو یہ کھٹکا لگا رہے کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ سب یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جھنیا کو لوٹے لیتا ہے۔ احسان تو کیا ہو گا الٹا کلنک لگتا ہے۔ اور اُدھر بھولا کئی بار یاد دلا چکے ہیں کہ کہیں سگائی کا ڈول کرو۔ اب کام نہیں چلتا۔ سوبھا اُس سے کئی بار کہہ چکا ہے کہ جھنیا کا خیال اُس کی طرف سے اچھا نہیں ہے۔ نہ ہو، جھنیا کی گرستی تو اُسے سنبھالنی ہی پڑے گی، چاہے ہنس کر سنبھالے یا رو کر۔ دھنیا کا دل بھی ابھی تک صاف نہیں ہوا۔ ابھی تک اُس کے دل میں

ملال بھرا ہوا ہے۔ مجھے سب آدمیوں کے سامنے اُسے مارنا نہ چاہئے تھا جس کے ساتھ پچیس سال بیت گئے اُسے مارنا اور گل گاؤں کے سامنے مارنا میرا کمینہ پن تھا۔ مگر دھنیا نے بھی تو میری آبرو اُتارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میرے سامنے سے کیسا کترا کر نکل جاتی جیسے کبھی کی جان پہچان ہی نہیں۔ کوئی بات کہنی ہوتی تو سونا یا روپا سے کہلاتی۔ دیکھتا ہوں کہ اُس کی ساڑی پھٹ گئی ہے۔ مگر کل مجھ سے کہا بھی تو سونا کی ساڑی کے لئے اپنی ساڑی کا نام تک نہ لیا۔ سونا کی ساڑی دو ایک مہینے جوڑ گانٹھ کر چل سکتی ہے اُس کی ساڑی تو تھیگڑوں سے بالکل گدڑی ہو گئی ہے۔ اور پھر میں ہی کون اُس کا من رکھ رہا ہوں؟ اگر میں ہی اس کے من کی دو چار باتیں کرتا رہتا تو کون چھوٹا ہو جاتا۔ یہی تو ہوتا کہ وہ تھوڑا سا مناؤنی کراتی، دو چار لگنے والی باتیں سُناتی، تو کیا مجھے چوٹ لگ جاتی؟ پھر میں بوڑھا ہو کر بھی اُلّو بنا رہا۔ وہ تو کہو اس بیماری نے آکر اُسے نرم کر دیا، نہیں تو نہ جانے کب تک مُنہ پھیلائے رہتی۔

اور آج ان دونوں میں جو باتیں ہوئی تھیں وہ گویا بھوکے کے لئے غذا تھیں۔ وہ دل سے بولی تھی اور ہوری مگن ہو گیا تھا۔ جی میں آیا کہ اُس کے پیروں پر سر رکھ دے اور کہے "میں نے تجھے مارا ہے تو لے بھی سر جھکائے دیتا ہوں جتنا چاہے مار لے، جتنی گالیاں دینا چاہے دے لے!"

یکایک اُسے جھونپڑی کے سامنے چوڑیوں کی جھنکار سُنائی دی۔ اُس نے کان لگا کر سُنا، ہاں کوئی ہے۔ پٹواری کی لڑکی ہوگی یا چاہے پنڈت کی گھروالی ہو۔ مٹر اُکھاڑنے آئی ہوگی۔ نہ جانے کیوں ان لوگوں کی نیت اتنی کھوٹی ہے۔ سارے گاؤں سے اچھا پہنتے ہیں۔ گھر میں ہزاروں روپے گڑے ہوئے ہیں، لین دین کرتے ہیں۔ ڈیوڑھی سوائی چلاتے ہیں، گھوس لیتے ہیں۔ دستوری لیتے ہیں، ایک نہ ایک

معاملہ کھڑا کر کے ایسے اُسے ملیتے ہی رہتے ہیں۔ پھر بھی نیت کا یہ حال! باپ جیسا ہوگا ویسی ہی سنتان بھی تو ہوگی اور آپ نہیں آتے عورتوں کو بھیجتے ہیں۔ ابھی اُٹھ کر ہاتھ پکڑ لوں تو کیا پانی رہ جائے؟ چھوٹا کہنے کو چھوٹا ہے پھر جو بڑا ہے اُس کا جھوٹا اور بھی چھوٹا ہے۔ عورت جات کا تو ہاتھ بھی نہیں پکڑنے بنتا۔ آنکھوں دیکھ کر بھی مکھی نگلنی پڑتی ہے۔ اُکھاڑ لے بھائی جتنا تیرا جی چاہے۔ سمجھ لے کہ میں نہیں ہوں۔ بڑے لوگ اپنی لاج نہ رکھیں، چھوٹوں کو تو ان کی لاج رکھنی ہی پڑتی ہے۔"

مگر نہیں، یہ تو دھنیا ہے، پکار رہی ہے۔

دھنیا نے پکارا، "سو گئے کہ جاگتے ہو؟"

ہوری جھپٹ کر اُٹھا اور جھونپڑی کے باہر آیا۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ دیوی مگن ہو کر اُسے بردان دینے آئی ہے، اس کے ساتھ ہی اس بادل بوندی اور جاڑے پالے میں اتنی رات گئے اُس کا آنا اندیشے کی بات تھی۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات ہوئی ہے۔

بولا ٹھنڈ کے مارے نیند بھی آتی ہے۔ تم اس جاڑے پالے میں کیسے آئیں؟ سب کسل تو ہے؟"

"ہاں سب کسل ہے!"

"گوبر کو بھیج کر مجھے کیوں نہیں بلوا لیا!"

دھنیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ جھونپڑی میں آکر پوال پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"گوبر نے تو منھ پر کالکھ لگا دی، اس کی کرنی کا کیا پوچھتے ہو؟ جس بات کو میں ڈرتی تھی وہی ہو کر رہی!"

کیا ہوا کیا؟ کسی سے مار پیٹ کر بیٹھا؟"

"اب میں کیا جانوں، کیا کر بیٹھا؟ چل کر پوچھو اسی رانڈ سے!"

"کس رانڈ سے؟ کیا کہتی ہے تو؟ بَورا تو نہیں گئی ہے؟"

"ہاں بَورا کیوں نہ جاؤں گی، بات ہی ایسی ہوئی ہے کہ چھاتی دونی ہو جائے۔"

ہوری کے دل میں روشنی کا ایک طویل خط کھنچ گیا۔

"صاف صاف کیوں نہیں کہتی؟ کس رانڈ کو کہہ رہی ہے؟"

"اُسی جھنیا کو اور کس کو!"

"تو جھنیا کیا یہاں آئی ہے؟"

"اور کہاں جاتی؟ پوچھتا کون؟"

"گوبر کیا گھر میں نہیں ہے؟"

"گوبر کا کہیں پتہ نہیں، جانے کہاں بھاگ گیا۔ اسے پانچ مہینے کا پیٹ ہے۔"

ہوری سب کچھ سمجھ گیا۔ گوبر کو بار بار اہیرن ٹولے جاتے دیکھ کر وہ کھٹک گیا۔ مگر اُسے کھلاڑی ہی نہ سمجھتا تھا۔ نوجوانوں میں کچھ لگاوٹ ہوتی ہی ہے، اُس میں کچھ نئی بات نہیں مگر جس روئی کے گالے کو نیلے آسمان میں ہوا کے جھونکوں سے اُڑتا دیکھ کر وہ صرف مسکرا دیا تھا وہی سارے آسمان میں پھیل کر اُس کے راستے کو اتنا تاریک بنا دے گا، یہ تو کوئی دیوتا بھی نہ جان سکتا تھا گوبر ایسا بدعلن! وہ سیدھا سادا اور گنوار جسے وہ ابھی بچہ سمجھتا تھا! مگر اُسے بھوج پڑ جانے کی فکر نہ تھی، پنچایت کا خوف نہ تھا، جھنیا کیسے گھر میں رہے گی، اس کی فکر اسے نہ تھی، اُسے فکر تھی تو گوبر کی۔ لڑکا شرمیلا ہے، اناڑی ہے، پانی دار ہے، کہیں کوئی نادانی نہ کر بیٹھے۔

گھبرا کر بولا "جھنیا نے کچھ کہا نہیں کہ گوبر کہاں گیا؟ اُس سے تو کہہ کر ہی

گیا ہو گا۔"

دھنیا جھنجلا کر بولی "تمہاری اکل تو گھاس کھا گئی ہے۔ اُس کی چہیتی تو یہاں بیٹھی ہے وہ بھاگ کے جائے کہاں؟ یہیں کہیں چھپا بیٹھا ہو گا۔ وہ تھوڑے ہی بچا ہے کہ کھو جائے گا۔ مجھے تو اس کلمُنہی جھنیا کی چنتا ہے کہ اسے کیا کروں۔ اپنے گھر میں تو چھن بھر نہ رہنے دوں گی۔ جس دن گائے لانے گیا ہے اُسی دن سے دونوں میں تاک جھانک ہونے لگی ہے۔ پیٹ نہ رہتا تو ابھی بات نہ کھلتی۔ مگر پیٹ رہ گیا تو جھنیا لگی گھبرانے۔ کہنے لگی کہ کہیں بھاگ چلو۔ گوبر ٹالتا رہا۔ ایک عورت کو ساتھ لے کے کہاں جائے، کچھ نہ سوجھا۔ پر جب آج وہ سر ہو گئی کہ مجھے یہاں سے لے چلو نہیں تو میں جان دے دوں گی، تو بولا دو تو چل کر میرے گھر میں رہ کوئی کچھ نہ بولے گا۔ میں اماں کو منا لوں گا۔ تب یہ کلمُنہی اُس کے ساتھ چل پڑی کچھ دور تو وہ آگے آگے آتا رہا پھر نہ جانے کدھر سرک گیا۔ یہ کھڑی اُسے پکارتی رہی جب رات بھیگ گئی اور وہ نہ لوٹا تو یہ بھاگی ہوئی یہاں چلی آئی۔ میں نے تو کہہ دیا ہے کہ جو کیا ہے اُس کا پھل بھوگ۔ اُبھاگنی نے میرے لڑکے کو چوپٹ کر دیا۔ تب اُسے بیٹھی رو رہی ہے، اُٹھتی ہی نہیں۔ کہتی ہے کہ اپنے گھر کون منہ سے جاؤں؟ بھگوان ایسی سنتان سے تو بانجھ ہی رکھے تو اچھا۔ سبیرے ہوتے ہوتے سارے گاؤں میں کاؤں کاؤں مچ جائے گی۔ ایسا جی ہوتا ہے کہ بس کھا لوں، میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ میں اپنے گھر نہ رکھوں گی۔ گوبر کو رکھنا ہے تو اپنے سر پہ رکھے۔ میرے گھر میں ایسوں کے لئے جگہ نہیں ہے اور اگر تم بیچ میں بولے تو پھر یا تو تم رہو گے یا میں رہوں گی۔"

ہوری بولا "تجھ سے بنا نہیں۔ اُسے گھر میں آنے ہی نہ دینا چاہئے تھا۔"

"سب کچھ کہہ کے ہار گئی۔ ٹلتی ہی نہیں، دھرنا دیئے بیٹھی ہے۔"

"اچھا چل! دیکھوں کیسے نہیں اُٹھتی۔ گھسیٹ کر باہر نکال دوں گا۔"

"داری جار بھولا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پر چپ ہی سادھے بیٹھا رہا۔ باپ بھی ایسے بے حیا ہوتے ہیں۔"

"وہ کیا جانتا تھا کہ ان میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔"

"جانتا کیوں نہیں تھا؟ گوبر رات دن گھیرے رہتا تھا تو کیا اس کی آنکھیں پھوٹ گئی تھیں؟ سوچنا چاہئے تھا کہ یہاں کیوں دوڑ دوڑ آتا ہے۔"

"چل میں جھنیا سے پوچھتا ہوں نا۔"

دونوں جھونپڑی سے نکل کر گاؤں کی طرف چلے۔ ہوری نے کہا "پانچ گھڑی رات سے اوپر ہو گئی ہوگی۔"

دھنیا بولی "ہاں اور کیا۔ مگر کیسا سناٹا پڑ گیا ہے کہ کوئی چور آئے تو گاؤں بھر کو لوٹ لے جائے۔"

"چور ایسے گاؤں میں نہیں آتے۔ امیروں کے گھر آتے ہیں۔"

دھنیا نے ذرا رُک کر ہوری کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "دیکھو شور نہ مچانا نہیں سارا گاؤں جاگ اُٹھے گا اور بات پھیل جائے گی۔"

"ہوری نے سخت لہجے میں کہا "میں یہ کچھ نہیں جانتا۔ ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لاؤں گا۔ اور گاؤں کے باہر کر دوں گا۔ بات تو ایک دن کھلنی ہے پھر آج ہی کیوں نہ کھل جائے؟ وہ میرے گھر آئی کیوں؟ جائے جہاں گوبر ہو۔ اس کے ساتھ کُکرم کیا تو کیا ہم سے پوچھ کر کیا تھا۔"

"دھنیا نے پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور آہستہ سے کہا "تم اس کا ہاتھ پکڑو گے تو چلائے گی۔"

"تو چلایا کرے۔"

"مگر اتنی رات گئے اس اندھیرے سناٹے میں جائے گی کہاں ۔ یہ تو سوچو۔"

"جائے جہاں اُس کے سگے ہوں۔ ہمارے گھر میں اُس کا کیا رکھا ہے۔"

"ہاں۔ پر اتنی رات گئے گھر سے نکالنا ٹھیک نہیں۔ پاؤں بھاری ہے کہیں ڈر ڈرا جائے تو اور آپھت ہو۔ ایسی دَسا میں کچھ کرتے دھرتے بھی تو نہیں بنتا۔"

"ہمیں کیا کرنا ہے، مرے یا جئے۔ جہاں چاہے جائے۔ کیوں اپنے منھ میں کالکھ لگاؤں؟ میں تو گوبر کو بھی نکال باہر کر دوں گا۔"

دھنیا نے بہت متفکر ہو کر کہا "کالکھ جو لگنی تھی وہ تو لگ گئی۔ وہ تو اب جیتے جی نہیں چھوٹ سکتی۔ گوبر نے ناؤ ڈبا دی۔"

"گوبر نے نہیں ڈبائی، ڈبائی اِسی نے۔ وہ تو بچہ تھا اس کے پنجے میں آ گیا۔"

"کسی نے ڈبائی ہو، اب تو ڈوب ہی گئی۔"

"دونوں دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ دفعتاً دھنیا نے ہوری کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا "دیکھو تمہیں میری سوگند، اُس پہ ہاتھ نہ اٹھانا۔ وہ تو آپ ہی رو رہی ہے۔ بھاگ کی کھوٹی نہ ہوتی تو یہ دن ہی کیوں آتا۔"

ہوری کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ دھنیا کی یہ نسوانی محبت اُس تاریکی میں بھی گویا چراغ کی طرح اُس کی فکر مند صورت کو منور کر رہی تھی۔ دونوں کے دل میں گویا گزرا ہوا شباب جاگ اُٹھا تھا۔ ہوری کو اس ڈھلی ہوئی عورت میں بھی وہی نرم و نازک دل والی لڑکی نظر آئی جو پچیس سال پہلے اُس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ اُس گلے لگنے میں کتنا اتحاد، پریم تھا جو سارے کلنک، ساری تکلیفوں اور سب ہی

رواجی بندشوں کو اپنے اندر سمیٹے لیٹا تھا۔

دونوں نے دروازے پہ آکر کواڑ کی درازوں سے اندر جھانکا۔ ڈیوٹ پر تیل کی ڈبی جل رہی تھی اور اُس کی دُھندلی روشنی میں جھنیا گھٹنے پہ سر رکھے دروازے کی طرف منہ کئے، اندھیرے میں اُس خوشی کو تلاش کر رہی تھی جو ابھی ایک لمحہ قبل اپنا دل فریب جلوہ دکھا کر غائب ہو گئی تھی۔ وہ آفت کی ماری طعنوں کے تیروں سے زخمی اور زندگی کے صدموں سے پریشان کسی پیڑ کی چھاؤں کھوجتی پھرتی تھی اور اُسے ایک مکان بھی مل گیا تھا جس کی پناہ میں وہ خود کو محفوظ و مسرور سمجھ رہی ہے مگر آج وہ مکان اپنے سارے سکھ کا ساز و سامان لئے ہوئے الہ دین کے شاہی محل کی طرح غائب ہو گیا تھا اور مستقبل ایک خوفناک دیو کی طرح اُسے نگل جانے کو کھڑا تھا۔

دفعتاً دروازہ کھلتے اور ہوری کو آتے دیکھ کر وہ خوف سے کانپتی ہوئی اُٹھی اور ہوری کے قدموں پر گر کر روتی ہوئی بولی "دادا! اب تمہارے سوائے مجھے دوسرا ٹھور نہیں ہے۔ چاہے مارو چاہے کاٹو پر اپنے دُوارے سے دُر دُراؤ مت!"

ہوری نے جھک کر پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا "ڈر مت بیٹی، ڈر مت، تیرا گھر ہے، تیرا دوار ہے، تیرے ہم ہیں۔ آرام سے رہ۔ جیسی تو بھولا کی بیٹی ہے ویسی ہی میری بیٹی ہے۔ جب تک ہم جیتے ہیں کسی بات کا کھٹکا مت کر۔ ہمارے رہتے کوئی تجھے ٹیڑھی آنکھوں نہ دیکھ سکے گا۔ برادری کو بھوج جو لگے گا وہ سب ہم دے دیں گے۔ تیرے لئے کوئی چنتا کی بات نہیں۔"

جھنیا یہ دلاسا پاکر اور بھی ہوری کے قدموں سے لپٹ گئی اور بولی "دادا!

اب تم ہی میرے باپ ہو، اور اماں! تم ہی میری ماں ہو۔ میں اناتھ ہوں۔ مجھے شرن دو۔ نہیں تو میرے کاکا اور بھائی مجھے کچا کھا جائیں گے!"

دھنیا رقت کے جوش کو اب نہ روک سکی۔ بولی "تو چل گھر میں بیٹھ، میں دیکھ لوں گی کاکا اور بھیا کو۔ سنسار میں ان ہی کا راج نہیں ہے۔ بہت کریں گے اپنے گہنے لے لیں گے۔ پھینک دینا اتار کر!"

ابھی ذرا دیر پہلے دھنیا نے غصے کے جوش میں جھنیا کو ابھاگنی، کلنکن اور کلمنہی، نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا تھا۔ جھاڑو مار کر گھر سے نکالنے جا رہی تھی، اب جو جھنیا نے محبت، عفو اور تسکین سے بھرے ہوئے یہ کلمے سنے تو ہوری کے پاؤں چھوڑ کر دھنیا کے پاؤں سے لپٹ گئی اور وہی پاکباز عورت جس نے ہوری کے سوا کسی مرد کو آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہ تھا، اس پاپی جھنیا کو گلے لگائے اس کے آنسو پونچھ رہی تھی اور اس کے دبے ہوئے دل کو اپنی ملائم باتوں سے تسلی دے رہی تھی، جیسے کوئی چڑیا اپنے بچوں کو پروں میں چھپائے بیٹھی ہو!

ہوری نے دھنیا کو اشارہ کیا کہ اسے کچھ کھلا پلا دے اور جھنیا سے پوچھا۔ "کیوں بیٹی، تجھے کچھ معلوم ہے کہ گوبر کدھر گیا ہے؟"

جھنیا نے سسکتے ہوئے کہا "مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ میرے کارن تمہارے اوپر ...." یہ کہتے کہتے اس کی آواز آنسوؤں سے رک گئی۔

ہوری اپنی بے چینی نہ چھپا سکا۔

"جب تو نے آج اسے دیکھا وہ کچھ دکھی تھا؟"

"باتیں تو ہنس ہنس کے کر رہے تھے۔ من کا حال رام جانے!"

"تیرا من کیا کہتا ہے؟ ہے گاؤں ہی میں کہ کہیں باہر چلا گیا؟"

"مجھے تو شک ہوتا ہے کہ کہیں باہر چلے گئے ہیں۔"

"یہی میرا من بھی کہتا ہے۔ کیسی نادانی کی۔ ہم اُس کے بیری تھوڑے ہی تھے۔ جب بھلی یا بری ایک بات ہو گئی تو اُسے نباہنا پڑتا ہے۔ اس طرح بھاگ کر تو اُس نے ہماری جان سنکٹ میں ڈال دی۔"

دھنیا نے جھنیا کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے جاتے ہوئے کہا۔ "مُنہ چور کہیں کا! جس کی بانہہ پکڑی اُس کا نباہ کرنا چاہیئے کہ مُنہ میں کالکھ پوت کر بھاگ جانا چاہیئے؟ اب تو آوے تو گھر میں گھسنے نہ دوں۔"

ہوری وہیں پوال پر لیٹا۔ گوبر کہاں گیا؟ یہ سوال اُس کے دل کے آسمان میں کسی پرند کی طرح منڈلانے لگا۔

(۱۱)

ایسے غیر معمولی واقعہ پر گاؤں میں جو کچھ ہل چل مچنا چاہیئے تھی وہ مچی اور مہینوں تک مچتی رہی۔ جھنیا کے دونوں بھائی لاٹھیاں لئے گوبر کو کھوجتے پھرتے تھے۔ بھولا نے قسم کھائی کہ اب نہ جھنیا کا مُنہ دیکھیں گے اور نہ اس گاؤں کا۔ ہوری سے انھوں نے اپنے بیاہ کی جو بات چیت کی تھی وہ اب بند ہو گئی تھی۔ اب وہ اپنی گائے کے روپئے لیں گے اور نقد، اور اس میں دیر ہوئی تو ہوری پر دعویٰ کر کے اُس کا گھر بار نیلام کرا لیں گے۔ گاؤں والوں نے ہوری کو برادری سے خارج کر دیا۔ کوئی اُس کا حقہ نہیں پیتا، نہ اُس کے گھر پانی پیتا ہے۔ کنوئیں سے پانی بند کر دینے کی کچھ بات چیت تھی مگر دھنیا کا غصہ سب دیکھ چکے تھے۔ بس کسی کو آگے آنے کی ہمت نہ پڑی۔ دھنیا نے سب کو سُنا سُنا کر کہہ دیا کہ کسی نے اُسے پانی بھرنے سے روکا تو اُس کا اور اپنا خون ایک کر دوں گی۔

اس للکار نے سبھی کے چھکے پانی کر دیئے۔ سب سے دُکھی ہے جھنیا جس کے

مطلب یہ سارا ہنگامہ ہو رہا ہے۔ اور گوبر کی کوئی کھوج خبر نہ ملنا اُس کو اور بھی بڑھائے دیتا ہے، تمام دن منھ چھپائے گھر میں پڑی رہتی ہے۔ باہر نکلے تو چاروں طرف سے طنز کے تیروں کی بارش ہوتی ہے کہ جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ دن بھر گھر کا کام دھندا کرتی رہتی ہے اور جب فراغت پاتی ہے تو رو لیتی ہے۔ ہر وقت تھر تھر کانپتی رہتی ہے کہ دھنیا کہیں کچھ کہہ نہ بیٹھے۔ صرف کھانا تو نہیں پکا سکتی کیونکہ اُس کے ہاتھ کا پکایا کوئی کھائے گا نہیں، باقی سارا کام اُس نے اپنے اوپر لے لیا ہے۔ گاؤں میں جہاں عورت مرد جمع ہو جاتے ہوتے ہیں۔ یہی تذکرہ ہونے لگتا ہے۔"

ایک دن دھنیا بازار سے چلی آ رہی تھی کہ راستے میں پنڈت داتا دین مل گئے۔ دھنیا نے سر نیچا کر لیا اور چاہتی تھی کہ کترا کر نکل جائے مگر پنڈت جی چھیڑ کا موقع پا کر کب چوکنے والے تھے، چھیڑ ہی تو بیٹھے۔ "گوبر کا کچھ پتہ سندیسہ ملا کہ نہیں؟ ایسا کپوت نکلا کہ گھر کی ساری مرجاد بگاڑ دی۔"

دھنیا کے دل میں خود یہی خیال آتا رہتا تھا۔ اداس من سے بولی "برے دن آتے ہیں بابا، تو آدمی کی مت ماری جاتی ہے، اور کیا کہوں۔"

داتا دین بولے "تمہیں اُس پاپن کو گھر میں نہ رکھنا چاہئے تھا۔ دودھ میں مکھی پڑ جاتی ہے تو آدمی اُسے نکال کر پھینک دیتا ہے اور دودھ پی جاتا ہے سوچو، کتنی بدنامی اور جگ ہنسائی ہو رہی ہے۔ کلچھنی گھر میں نہ رہتی تو کچھ نہ ہوتا۔ لڑکوں سے اس طرح کی بھول چوک ہوتی ہی رہتی ہے۔ جب تک برادری کو بھوج نہ دو گی اور برہمنوں کو نہ کھلاؤ گی تب تک کیسے اُدھار ہو گا اُسے گھر میں نہ رکھتے تو کچھ نہ ہوتا۔ ہوری تو پاگل ہے ہی، پر تو کیسے دھوکا کھا گئی؟"

داتا دین کا لونڈا ماتا دین ایک چماری سے آشنائی کئے ہوئے تھا۔ اُسے

سارا گاؤں جانتا تھا۔ مگر وہ تلک لگاتا تھا، پوتھی پتر اپڑھتا تھا، کتھا، بھاگوت کہتا تھا اور پرو ہتی کہتا تھا۔ اُس کے وقار میں ذرا بھی کمی نہ تھی۔ وہ روزانہ اشنان پوجا کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ کر دیتا تھا۔ دھنیا جانتی تھی کہ جھنیا کو گھر میں رکھ لینے ہی سے یہ بلا آئی ہے۔ اُسے نہ جانے کیسے دیا آگئی ورنہ اُسی رات کو جھنیا کو نکال دیتی تو کیوں اتنی بدنامی ہوتی۔ مگر یہ خوف بھی تو تھا کہ تب اُس کے لئے کنواں تالاب کے سوا اور ٹھکانا کہاں تھا؟ ایک نہیں بلکہ دو جانوں کی قیمت دے کر وہ اپنے مرجاد کو کیسے بچاتی؟ پھر جھنیا کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ دھنیا ہی کے کلیجہ کا ٹکڑا ہے۔ ہنسی کے ڈر سے اُس کی جان کیسے لے لیتی؟ اور پھر جھنیا کی بے کسی اور عاجزی بھی تو اُسے متاثر کرتی رہتی تھی۔ وہ باہر سے جلی بھنی آتی مگر جیوں ہی جھنیا لوٹے میں پانی لا کر رکھ دیتی اور اسکے پیر دھلانے لگتی، اُس کا غصہ پانی ہو جاتا۔ بے چاری لاج اور دکھ سے آپ ہی دبی ہوئی ہے اُسے اور کیا دبائے؟ مرے کو اور کیا مارے؟

اُس نے تند لہجے میں کہا "ہم کو گھرانے کی مرجاد اتنی پیاری نہیں ہے مہاراج! کہ اُس کے پیچھے ایک جیو کی ہتیا کر ڈالتے۔ بیاہتا نہ سہی، پر اُس کی بانہہ تو پکڑی ہے میرے ہی بیٹے نے۔ کس منہ سے نکال دیتی؟ وہی کام بڑے بڑے کرتے ہیں تو اُن کی مرجاد دھو جاتی ہے، ناک کٹ جاتی ہے۔ بڑے آدمیوں کو اپنی ناک دوسروں کی جان سے پیاری ہو گی، ہمیں تو اپنی ناک اتنی پیاری نہیں!"

داتا دین ہار ماننے والے جیو نہ تھے۔ وہ دس گاؤں کے نارد تھے۔ یہاں، وہاں اور وہاں کی یہاں لگانا اُن کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ وہ چوری تو نہ کرتے تھے اُس میں جان جوکھم کا معاملہ تھا۔ مگر چوری کے مال میں حصہ لینے کیوقت ضرور پہنچ جاتے تھے کہیں پیٹھ میں دھول نہ لگنے دیتے تھے۔ زمیندار کو آج تک لگان کی ایک پائی

نہ دی تھی۔ قرقی آتی تو کنوئیں میں گرنے چلتے، تو کھے رام کے لئے دھرے کچھ نہ بنتا۔ مگر اسامیوں کو سود پر روپیہ قرض دیتے تھے۔ کسی عورت کو کوئی زیور بنوانا ہے تو داتا دین اُس کی خدمت کیلئے حاضر ہیں۔

شادی بیاہ طے کرنے میں انہیں بڑا لطف آتا ہے۔ نیکنامی بھی ملتی ہے اور دکشنا بھی۔ بیماری میں علاج معالجے بھی کرتے ہیں اور جھاڑ پھونک بھی۔ جیسی مریض کی مرضی ہو اور صحبت یافتہ ایسے ہیں کہ جوانوں میں جوان بن جاتے ہیں اور بچوں میں بچے اور بوڑھوں میں بوڑھے۔ چور کے بھی ساتھی ہیں اور شاہ کے بھی۔ گاؤں میں کسی کو ان پر اعتبار نہیں ہے۔ مگر ان کی باتوں میں کچھ ایسی کشش ہے کہ لوگ بار بار دھوکا کھا کر بھی ان ہی کی پناہ لیتے ہیں۔

سر اور ڈاڑھی ہلا کر بولے: "یہ تو ٹھیک کہتی ہے دھنیا! دھرماتما لوگوں کا یہی دھرم ہے پر سماجی ریت رواج کا نباہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

اسی طرح ٹھیشوری لال نے ہوری کو چھیڑا۔ وہ گاؤں میں دھرماتما مشہور تھے۔ پورنماشی کو ہمیشہ ستیہ نارائن کی کتھا سنتے تھے۔ مگر پٹواری ہونے کی وجہ سے اپنے کھیت بیگار میں جتواتے تھے، بیگار میں سینچواتے تھے اور اسامیوں کو آپس میں لڑا کر رقمیں مارتے تھے۔ سارا گاؤں اُن سے کانپتا تھا۔ غریبوں کو دس دس پانچ پانچ روپئے قرض دے کر اُنہوں نے کئی ہزار بنا لئے تھے۔ فصل کی چیزیں اسامیوں سے لے کر کچہری اور تھانہ کے عملوں کی بھینٹ کرتے رہتے تھے۔ اس سے کل علاقے میں ان کی اچھی دھاگ تھی۔ اگر کوئی ان کے ہتھے نہ چڑھا تو وہ دار وغہ گھنڈا سنگھ تھے جو حال ہی میں اس علاقے میں تعینات ہو کر آئے تھے۔ پر اُپکاری بھی تھے۔ بخار کے دنوں میں سرکاری کونین تقسیم کرتے تھے، کوئی بیمار ہو تو اُس کی خیر و عافیت پوچھنے ضرور جاتے تھے۔ چھوٹے موٹے جھگڑے آپس ہی میں طے

کرا دیتے تھے۔ شادیوں میں پالکی، قالین اور محفل کا سامان منگنی دیکر لوگوں کا کام نکال دیتے تھے۔ یہ سب کرتے ہوئے بھی موقع پر نہ چوکتے تھے مگر جس کا کھاتے تھے اُسی کا گاتے بھی تھے۔ بولے "یہ تم نے کیا روگ پال لیا ہوری ؟"

ہوری نے پیچھے پھر کر پوچھا "تم نے کیا کہا لالا ؟ میں نے سُنا نہیں۔"

پٹیشوری پیچھے سے قدم بڑھاتے ہوئے آگے آکر بولے "کہہ رہا تھا کہ دھنیا کے ساتھ کیا تمہاری عقل بھی گھاس کھا گئی ہے ؟ جھنیا کو کیوں نہیں اُس کے باپ کے بھیج دیتے ؟ ناحق اپنی ہنسی کرا رہے ہو۔ نہ جانے کس کا بچہ لے کر آئی ہے۔ اور تم نے گھر میں رکھ لیا ہے۔ ابھی تمہاری دو دو لڑکیاں بیاہنے کو بیٹھی ہوئی ہیں۔ سوچو، کیسے بیڑا پار ہوگا۔

ہوری اس طرح کی نکتہ چینی اور خیر خواہی کی باتیں سُنتے سنتے پک گیا تھا۔ بولا "یہ میں سب سمجھتا ہوں لالا پر تمہیں بتاؤ کہ کروں کیا ؟ میں جھنیا کو نکال دوں تو بھولا اُسے رکھ لیں گے ؟ اگر وہ راجی ہوں تو آج میں اُسے اُن کے گھر پہنچا دوں۔ اگر تم انہیں منا لو تو جنم بھر تمہارا اُپکار مانوں۔ مگر وہاں تو اُنکے دونوں لڑکے ہتیا پر اُتارو ہیں، پھر میں اُسے کیسے نکال دوں۔ ایک تو نالائق آدمی ملا کہ اُس کی بانہہ پکڑ کر دگا دے گیا اب میں بھی نکال دوں گا تو وہ کہیں محنت مجوری بھی تو نہ کر سکے گی۔ کہیں جا کر ڈوب مری تو کیسے پاپ لگے گا ؟ رہے لڑکیوں کے بیاہ سو بھگوان مالک ہیں۔ جب اُس کا سمے آوے گا تب کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آوے گی۔ لڑکی تو ہماری برادری میں آج تک کبھی کنواری نہیں رہی۔ برادری کے ڈر سے میں ہتیا رے کا کام نہیں کر سکتا۔"

ہوری منکسر مزاج شخص تھا۔ ہمیشہ سر جھکائے چلتا اور چار باتیں برداشت کر لیتا تھا۔ ہیرا کے علاوہ گاؤں میں کوئی اور اُس کا بدخواہ نہ تھا۔ مگر سماج اتنا بڑا

اندھ تھک کیسے سہہ لے ہے اور اُسکی سرکشی تو دیکھو کہ سمجھانے پر بھی نہیں سمجھتا۔ عورت مرد دونوں جیسے سماج کو چیلنج دے رہے ہیں کہ دیکھیں ہمارا کوئی کیا کیے لیتا ہے۔ تو سماج بھی دکھا دے گا کہ اُسے کچھ نہ سمجھنے والے لوگ سُکھ کی نیند نہیں سو سکتے۔

اُسی رات کو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے گاؤں کے لیڈروں کی نشست ہوئی۔

داتا دین بولے "میری عادت کسی کی برائی کرنے کی نہیں ہے۔ سنسار میں کیا کیا کُکرم نہیں ہوتا۔ مجھ سے کیا مطلب ہے۔ مگر یہ رانڈ دھنیا تو مجھ سے لڑنے پر تُل گئی۔ بھائیوں کا حصہ دبا کر ہاتھ میں چار پیسے ہو گئے تو اب کچال کے سوا اور کیا سوجھے گا۔ نیچ جات جہاں پیٹ بھر روٹی کھائی اور ٹیڑھے چلے! اسی سے ساستروں میں کہا ہے کہ نیچ ذات لیتیائے بھلا"!

پٹیشوری نے ناریل کا کش لگاتے ہوئے کہا "یہی تو ان میں برائی ہے کہ جہاں چار پیسے دیکھے اور آنکھیں بدلیں۔ آج ہوری نے ایسی ہیکڑی جتائی کہ میں اپنا مُنھ لے کر رہ گیا۔ نہ جانے اپنے کو کیا سمجھتا ہے۔ اب سوچو اس بدکاری کا گاؤں میں کیا نتیجہ ہو گا۔ جھنیا کو دیکھ کر دوسری بدھواؤں کا من بڑھے گا کہ نہیں؟ آج بھولا کے گھر میں یہ بات ہوئی، کل ہمارے تمہارے گھر میں ہو گی۔ سماج تو ڈر کے بل سے چلتا ہے۔ آج سماج کا انکس جاتا رہے تو پھر دیکھو کہ سنسار میں کیسے کیسے انرتھ ہونے لگتے ہیں"!

جھنگری سنگھ دو بیویوں کے شوہر تھے۔ پہلی بیوی پانچ لڑکے لڑکیاں چھوڑ کر مری تھی۔ اُس وقت اس کی عمر تقریباً پینتالیس سال تھی۔ مگر آپ نے دوسری شادی کی اور جب اُس سے اولاد نہ ہوئی تو تیسرا بیاہ کر ڈالا۔ اب ان کی عمر پچاس سال تھی اور دو جوان بیویاں گھر میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کے بارے میں طرح طرح

کی باتیں پھیل رہی تھیں، مگر ٹھاکر صاحب کے ڈر سے کوئی کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ اور کہنے کی گنجائش بھی تو ہو۔ شوہر کی آڑ میں سب کچھ جائز ہے۔ مصیبت تو اُسے ہے جس کی کوئی آڑ نہیں۔ ٹھاکر صاحب عورتوں کی سختی سے نگرانی کرتے تھے اور انہیں غرور تھا کہ ان کی بیویوں کا گھونگٹ تک بھی کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ مگر گھونگٹ کے پردے میں کیا ہوتا ہے اُس کی اُنہیں کیا خبر؟

بولے "ایسی عورت کا تو سر کاٹ لے۔ ہوری نے اس رنڈی کو گھر میں رکھ کر سماج میں بِس بویا ہے۔ ایسے آدمیوں کو گاؤں میں رہنے دینا گاؤں بھر کو بھرشٹ کرنا ہے۔ رائے صاحب کو اس کی اطلاع دینی چاہیئے۔ صاف صاف کہہ دینا چاہیئے کہ اگر گاؤں میں یہ اندھیر چلا تو کسی کی آبرو سلامت نہ رہے گی۔"

پنڈت نوکھے رام کارکن بڑے اعلیٰ درجہ کے برہمن تھے۔ ان کے دادا کسی راجہ کے دیوان تھے مگر اپنا سب کچھ بھگوان کے چرنوں پر چڑھا کر سادھو ہو گئے تھے۔ ان کے باپ نے بھی رام نام کی بھکتی میں زندگی کاٹ دی تھی۔ نوکھے رام نے بھی وہی بھکتی ترکہ میں پائی تھی۔ علی الصبح پوجا پر بیٹھ جاتے تھے اور دس بجے تک بیٹھے ہوئے رام نام جپا کرتے تھے۔ مگر بھگوان کے سامنے سے اُٹھتے ہی اُنکی فطرت اس رُکاوٹ سے ٹکرا کر اُن کے دل، قول اور عمل سبھی کو زہر آلود بنا دیتی تھی۔ اِس تجویز میں اُنکے اختیارات کی توہین تھی۔ پھولے ہوئے گالوں میں دھنسی ہوئی آنکھیں نکال کر بولے "اس میں رائے صاحب سے کیا پوچھنا ہے؟ میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ لگا دو سو روپے تاوان، آپ گاؤں چھوڑ کر بھاگے گا۔ اِدھر میں بدکھلی بھی دائر کئے دیتا ہوں۔"

"پٹیشوری نے کہا "مگر لگان تو ادا کر چکا ہے۔"

جھنگری سنگھ نے تائید کی "ہاں لگان ہی کے لئے تو ہم سے تیس روپے

لئے ہیں۔"

نوکھے رام نے گھمنڈ سے کہا۔ "لیکن ابھی رسید تو نہیں دی۔ ثبوت کیا ہے کہ ابھی لگان ادا کر دیا ہے؟"

اتفاق رائے سے یہی طے ہوا کہ ہوری پر سو روپے جرمانہ کیا جائے۔ صرف ایک دن گاؤں کے آدمیوں کو جمع کر کے اُنکی منظوری لے لینے کا ناٹک ہونا ضروری تھا۔ ممکن ہے کہ اس میں دس پانچ روز کی دیر ہو جاتی مگر آج ہی جھنیا کے لڑکا پیدا ہوا اور دوسرے ہی روز گاؤں والوں کی پنچایت بیٹھ گئی۔ ہوری اور دھنیا دونوں اپنی اپنی قسمت کا فیصلہ سُننے کیلئے بُلائے گئے۔ چوپال میں اتنی بھیڑ تھی کہ کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ پنچایت نے فیصلہ کیا کہ ہوری پر سو روپے نقد اور تیس من غلے کا تاوان عائد کیا جائے۔

دھنیا بھری سبھا میں بھرے ہوئے گلے سے بولی "پنچو! غریب کو ستا کر سکھ نہ پاؤ گے۔ اتنا سمجھ لینا۔ ہم تو مٹ جائینگے کون جانے کہ اس گاؤں میں رہیں یا نہ رہیں مگر میرا سراپ تم کو بھی جرور سے جرور لگے گا۔ مجھ پر اتنا کڑا ڈنڈ اس لئے کیا جا رہا ہے کہ میں نے اپنی بہو کو اپنے گھر میں کیوں رکھا۔ کیوں اُسے گھر سے نکال کر سڑک کی بھکارن نہیں بنا دیا۔ یہی نیاؤ ہے، ایں؟"

پٹیشوری لالہ بولے "وہ تیری بہو ہے کہ ہرجائی؟"

ہوری نے دھنیا کو ڈانٹا۔ "تو کیوں بولتی ہے دھنیا۔ پنچ میں پرمیشر رہتے ہیں۔ ان کا جو نیاء ہے وہی میرے سر آنکھوں پر۔ اگر بھگوان کی یہی مرجی ہے کہ ہم گاؤں چھوڑ کر بھاگ جائیں تو ہمارا کیا بس ہے۔ پنچو، ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ کھلیان میں ہے۔ ایک دانہ بھی گھر میں نہیں آیا۔ جتنا چاہو لے لو۔ سب لینا چاہو تو لے لو۔ ہمارا بھگوان مالک ہے۔ جتنی کمی پڑے اس میں ہمارے بیل لے لینا!"

دھنیا دانت پیس کر بولی۔ میں نہ ایک دانہ اناج دوں گی اور نہ ایک کوڑی۔ جس میں ہوتا ہو چل کر مجھ سے لے لے۔ اچھی دل لگی ہے۔ سوچا ہوگا کہ ڈنڈ کے بہانے اس کی سب جیجات لے لو اور نذرانہ لے کر دوسروں کو دے دو۔ باغ بغیچا بیچ کر مجھ سے تر مالی اڑاؤ۔ دھنیا کے جیتے جی یہ نہیں ہونے کا، اور تمہاری لالسا (خواہش) تمہارے من ہی میں رہے گی۔ ہمیں نہیں رہنا ہے برادری میں۔ برادری میں رہ کر ہماری مکتی نہ ہو جائے گی۔ اب بھی اپنے پسینے کی کمائی کھاتے ہیں تب بھی اپنے پسینے کی کمائی کھائیں گے!"

ہوری نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا "دھنیا! تیرے پیروں پڑتا ہوں، تو چپ رہ! ہم سب برادری کے چاکر ہیں، اُس کے باہر نہیں جا سکتے۔ وہ جو ڈنڈ لگاتی ہے اُسے سر جھکا کر مان لے۔ نکو بن کر جینے سے تو گلے میں پھانسی لگا لینا اچھا ہے۔ آج مر جائیں تو برادری ہی تو اس مٹی کو پار لگا دے گی۔ برادری ہی تارے گی تو تریں گے۔ پنچو! مجھے اپنے جوان بیٹے کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو اگر میرے پاس کھلیان کے اناج کے سوائے اور کوئی جنس ہو۔ میں برادری کو دھوکا نہ دوں گا۔ پنچوں کو میرے بال بچوں پر ترس آوے تو اُن کی کچھ پرورش کریں۔ نہیں مجھے تو اُن کا حکم ماننا ہے۔"

دھنیا جھلا کر وہاں سے چلی گئی اور ہوری پہر رات گئے تک کھلیان سے اناج ڈھو ڈھو کر جھنگری سنگھ کی چوپال میں ڈھیر کرتا رہا۔ بیس من جو تھا، پانچ من گیہوں اور اتنا ہی مٹر، تھوڑا سا چنا اور کچھ تلہن بھی تھا۔ اکیلا آدمی اور دو گرہستیوں کا بوجھ۔ یہ جو کچھ ہوا وہ دھنیا کی محنت سے ہوا۔ جھنیا اندر کا سارا کام کر لیتی تھی اور دھنیا اپنی لڑکیوں کے ساتھ کھیتی میں لگ گئی تھی۔ دونوں نے سوچا تھا گیہوں اور تلہن سے لگان کی ایک قسط ادا ہو جائے گی اور ہو سکا تو تھوڑا تھوڑا سود بھی

دے دیں گے۔ جو کھانے کے کام آئے گا۔ جیسے تیسے پانچ چھ مہینے کٹ جائیں گے تب تک جوار، باجرا، مکا، دھان کے دن آجائیں گے۔ وہ ساری اُمیدیں مٹی میں مل گئیں۔ اناج تو ہاتھ سے گیا ہی، سو روپے کی گٹھری اور سر پر لد گئی۔ اب کھانے کا کہیں ٹھکانا نہیں اور گوبر کا کیا حال ہوا، رام جانے! اگر دل اتنا کچا تھا تو ایسا کام ہی کیوں کیا؟ مگر ہونہار کو کون ٹال سکتا ہے؟ برادری کا وہ خوف تھا کہ اپنے سر پر لاد کر اناج ڈھو رہا تھا گویا اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہا ہو۔ زمیندار، ساہوکار، سرکار کسی کا اتنا رُعب نہ تھا۔ کل بال بچے کیا کھائیں گے، یہ فکر روح کو خشک کئے دیتی تھی۔ مگر برادری کا خوف بھوت کی طرح سر پر سوار ہو کر کوڑے لگا رہا تھا۔ برادری سے الگ رہ کر جینے کا تو وہ خیال ہی نہ کر سکتا تھا۔ شادی، بیاہ، مونڈن، چھیدن، جینا مرنا سب کچھ برادری کے ہاتھ میں ہے۔ برادری اُس کی زندگی میں پیڑ کی طرح جمے ہوئے تھی اور اُس کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو رہی تھی۔ برادری سے نکل کر اُس کی زندگی کا جامہ تار تار ہو جائے گا۔

جب کھلیان میں صرف ڈیڑھ دو من جو اور رہ گیا تو دھنیا نے دوڑ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "اچھا اب رہنے دو! ڈھو تو چکے برادری کی لاج۔ اب بچوں کے لئے بھی کچھ چھوڑ دو گے کہ سب برادری ہی کے بھاڑ میں جھونک دو گے؟ میں تم سے ہار جاتی ہوں۔ میرے بھاگ میں تمہیں جیسے مورکھ کا ساتھ بدا تھا!"

ہوری نے اپنا ہاتھ چھڑا کر ٹوکری میں باقی غلہ بھرتے ہوئے کہا "یہ نہ ہوگا دھنیا۔ پنچوں کی آنکھ بچا کر ایک دانہ بھی رکھ لینا میرے لئے حرام ہے۔ میں لے جا کر سب کا سب وہاں ڈھیر کئے دیتا ہوں۔ پھر پنچوں کے من میں دیا آئے گی تو کچھ میرے بال بچوں کے لئے دے دیں گے، نہیں بھگوان مالک ہیں!"

دھنیا تلملا کر بولی "یہ پنچ نہیں ہیں، راکشس ہیں، پکے اور پورے راکشس؟"

یہ سب ہماری جگہ چھین جھپٹ کر مال مارنا چاہتے ہیں۔ ڈانڈ باندھ کا تو بہانہ ہے۔ سمجھتی جاتی ہوں پر تمہاری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ تم ان راچھسوں سے دیا کا آسرا رکھتے ہو۔ سوچتے ہو کہ دس پانچ من تمہیں دے دیں گے [illegible] دھو رکھو!

جب ہوری نے نہ مانا اور ٹوکری سر پہ رکھنے لگا تو دھنیا نے دونوں ہاتھوں سے پوری طاقت کے ساتھ ٹوکری پکڑ لی اور بولی: "اسے تو میں نہ لے جانے دوں گی۔ چاہے تم میری جان ہی لے لو۔ مر مر کر ہم نے کمایا، پہر رات گئے تک ہم نے سینچا تو اسی لئے کہ پنچ لوگ مونچھوں پہ تاؤ دے کر بھوگ لگا دیں اور ہمارے بچے دانے دانے کو ترسیں؟ تم نے اکیلے ہی تو سب کچھ نہیں کر لیا ہے۔ میں بھی اپنی لڑکیوں کے ساتھ ستی ہوئی ہوں۔ سیدھے سے ٹوکری نہیں رکھ دو نہیں آج سدا کے لئے ناتا ٹوٹ جائے گا۔ کہے دیتی ہوں۔"

ہوری سوچ بچار میں پڑ گیا۔ دھنیا کا کہنا سچ تھا۔ اُسے اپنے بال بچوں کی کمائی چھین کر تاوان دینے کا کیا حق ہے؟ وہ گھر کا مالک اس لئے ہے کہ سب کو پالے پوسے۔ اس لئے نہیں کہ اُن کی کمائی چھین کر برادری کی نظر میں سُرخ رو بنے۔ ٹوکری اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ آہستہ سے بولا: "تو ٹھیک کہتی ہے دھنیا۔ دوسرے کے حصے پر میرا کوئی بس نہیں ہے۔ جو کچھ بچا ہے وہ لے جا، میں جا کر پنچوں سے کہے دیتا ہوں۔"

دھنیا اناج کی ٹوکری گھر میں رکھ کر اپنی دونوں لڑکیوں کے ساتھ پوتے کی پیدائش کی خوشی میں گلا پھاڑ پھاڑ کر سوہر گا رہی تھی کہ سارا گاؤں سن لے۔ آج یہ پہلا موقع تھا کہ ایسے مبارک وقت میں برادری کی کوئی عورت وہاں نہ تھی۔ زچہ خانے سے جھنیا نے کہلا بھیجا تھا کہ سوہر گانے کا کام نہیں ہے۔ مگر دھنیا کب ماننے لگی؟ اگر برادری کو اُس کی پروا نہیں ہے تو وہ بھی برادری کی پروا نہیں کرتی۔

اُسی وقت ہوری اپنے گھر کو اسّی روپے پر جھنگری سنگھ کے یہاں رہن کر رہا تھا۔ تاوان کے روپئے کا اس کے سوا اور کوئی بندوبست نہ کر سکتا تھا۔ بیس روپئے تلہن، گیہوں اور مٹر سے مل گئے باقی کے لئے گھر لکھنا پڑا۔ نوکھے رام تو چاہتے تھے کہ بیل بکوا لئے جائیں۔ لیکن پٹیشوری اور داتادین نے اُس کی مخالفت کی۔ بیل بک گئے تو ہوری کھیتی کیسے کرے گا؟ برادری اُس کی جائداد سے روپئے وصول کرے مگر ایسا تو نہ کرے کہ وہ گاؤں چھوڑ کر بھاگ جائے بس اس طرح بیل بچ گئے۔

ہوری رہن نامہ لکھ کر کوئی گیارہ بجے رات کو گھر آیا تو دھنیا نے پوچھا۔ "اتنی رات تک وہاں کیا کرتے رہے؟"

ہوری نے جلاہے کا غصّہ داڑھی پر اُتارتے ہوئے کہا۔ "کرتا کیا رہا، اس کپوت کی کرنی بھرتا رہا! ابھاگا آپ تو آگ لگا کر بھاگ گیا، اب مجھے بجھانا پڑ رہا ہے۔ اسّی روپئے میں گھر رہن کرنا پڑا۔ کرتا کیا؟ اب حقّہ کھل گیا۔ برادری نے اپرادھ چھما کر دیا!"

دھنیا نے ہونٹ چبا کر کہا۔ "نہ حقّہ کھلتا تو ہمارا کیا بگڑ جاتا تھا؟ چار پانچ مہینے نہیں کسی کا حقّہ پیا تو کیا چھوٹے ہو گئے؟ میں کہتی ہوں کہ تم اتنے بھونداؤ کیوں ہو؟ میرے سامنے تو بڑے گیان والے بنتے ہو۔ پر باہر تمہارا منہ کیوں بند ہو جاتا ہے؟ لے دے کے باپ دادوں کی نشانی ایک گھر بچ رہا تھا سو آج تم نے اُس کا بھی وارا نیارا کر دیا۔ اسی طرح کل یہ تین چار بیگھے دھرتی ہے اسے بھی لکھ دینا اور تب گلی گلی بھیک مانگنا۔ میں پوچھتی ہوں کہ تمہارے منہ میں جیبھ نہ تھی کہ اُن پنچوں سے پوچھتے کہ تم کہاں کے بڑے دھرماتما ہو جو دوسروں پر ڈانڈ باندھ لگاتے پھرتے ہو؟ تمہارا تو منہ دیکھنا بھی پاپ ہے!"

ہوری نے ڈانٹا "چپ رہ، بہت بڑھ بڑھ کے نہ بول! برادری [illegible] ہیں

ابھی نہیں ہے پڑی۔ نہیں تو منھ سے بات نہ نکلتی۔"

دھنیا مشتعل ہو گئی۔ "کون سا پاپ کیا ہے جس کے لئے برادری سے ڈریں؟ کسی کے گھر چوری کی ہے؟ کسی کا مال کاٹا ہے؟ مہریا رکھ لینا پاپ نہیں ہے۔ ہاں رکھ کے چھوڑ دینا پاپ ہے۔ آدمی کا بہت سیدھا ہونا بھی برا ہے۔ اس کے سیدھے پن کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ کتے بھی منھ چاٹنے لگتے ہیں۔ آج ادھر تمہاری سراہنا ہوتی ہو گی کہ برادری کی کیسی مرجاد رکھ لی! میرے بھاگ پھوٹ گئے تھے کہ تم جیسے مرد سے پالا پڑا۔ کبھی سکھ کی روٹی نہ ملی۔"

"میں تیرے باپ کے پاؤں پڑنے گیا تھا؟ وہی تجھے میرے گلے باندھ گیا!"

"پتھر پڑ گیا تھا اُن کی سمجھ پر اور انہیں کیا کہوں؟ نہ جانے کیا دیکھ کر لٹو ہو گئے۔ ایسے کوئی بڑے سندر بھی تو نہ تھے تم۔"

بحث مذاق میں منتقل ہو گئی۔ "اسّی روپے گئے تو گئے لاکھ روپے کا پوتا تو مل گیا؟ اُسے تو کوئی نہ چھین لے گا۔ گوبر گھر لوٹ آوے، دھنیا الگ جھونپڑی میں سکھی رہے گی۔"

ہوری نے پوچھا "بچہ کس پر پڑا ہے؟"

دھنیا نے ہنس کر جواب دیا "بالکل گوبر پر پڑا ہے سچ!"

"تگڑا تو ہے؟"

"ہاں اچھا ہے۔"

(۱۲)

رات کو گوبر جھنیا کے ساتھ چلا تو ایسا کانپ رہا تھا جیسے اس کی ناک کٹ گئی ہو۔ جھنیا کو دیکھتے ہی سارے گاؤں میں کہرام مچ جائے گا۔ لوگ ہر طرف سے

مگر کیسا واویلا مچا دیں گے۔ دھنیا کتنی گالیاں دینے لگی۔ یہ سوچ سوچ کر اس کے پیر پیچھے رہے جاتے تھے۔ ہوری کا تو اسے خوف نہ تھا۔ وہ صرف ایک بار دھاڑیں گے پھر چپ ہو جائیں گے۔ خوف تھا دھنیا کا جو زہر کھانے لگے گی اور گھر میں آگ لگانے لگے گی۔ نہیں، اس وقت جھنیا کے ساتھ گھر نہیں جا سکتا۔

مگر کہیں دھنیا نے جھنیا کو گھر میں گھسنے ہی نہ دیا اور جھاڑو لے کر مارنے دوڑی تو وہ بے چاری کہاں جائے گی؟ اپنے گھر تو لوٹ ہی نہیں سکتی۔ کہیں کنوئیں میں کود پڑے، یا گلے میں پھانسی لگائے تو کیا ہو؟ اس نے لمبا سانس لیا۔ جگہ ان کے سر!

مگر اماں اتنی بے درد نہیں ہیں کہ مارنے دوڑیں۔ غصے میں دو چار گالیاں دیں گی۔ مگر جب جھنیا ان کے پاؤں پکڑ کر رونے لگے گی تو انہیں دیا آہی جائے گی۔ تب تک وہ آپ کہیں چھپا رہے گا۔ جب معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تب وہ ایک دن چپکے سے آئے گا اور اماں کو منا لے گا۔ اگر اس بیچ میں اسے کہیں مجوری مل جائے اور دو چار روپے کر گھر لوٹے گا تب تو پھر دھنیا کا غصہ بند ہی ہو جائے گا۔

جھنیا بولی "میری تو چھاتی دھڑک رہی ہے۔ میں کیا جانتی تھی کہ تم میرے گلے یہ روگ باندھ دو گے۔ نہ جانے کس بری ساعت میں تم نے دیکھا تھا۔ نہ تم گانے بینے آتے نہ یہ سب کچھ ہوتا۔ تم آگے آگے جا کر جو کچھ کہنا سننا ہو وہ کہہ سن لینا، میں پیچھے سے آ جاؤں گی۔"

گوبر نے کہا "نہیں نہیں، پہلے تم جانا اور کہنا کہ میں ہاٹ سے سودا بیچ کر گھر جا رہی تھی، رات ہو گئی ہے، اب کیسے جاؤں؟ تب تک میں آ جاؤں گا۔"

جھنیا نے متفکرانہ کہا "تمہاری اماں بڑی غصیل ہیں۔ میرا تو جی کانپتا ہے،

کہیں مجھے مارنے لگیں تو کیا کروں گی؟"

گوبر نے دھیرج دلایا "اماں کی عادت ایسی نہیں ہے۔ ہم لوگوں تک کو تو کبھی ایک تھپڑ مارا نہیں ہے، تمہیں کیا ماریں گی؟ اُن کو جو کچھ کہنا ہوگا مجھے کہیں گی، وہ تم سے تو بولیں گی بھی نہیں۔"

گاؤں قریب آگیا۔ گوبر نے رک کر کہا۔ "اب تم جاؤ۔"

جھنیا نے ضد کی "تم بھی دیر نہ کرنا۔"

"نہیں نہیں، چھن بھر میں آتا ہوں، تو چل تو!"

"میرا جی نہ جانے کیسا ہو رہا ہے، تمہارے اوپر غصہ آتا ہے۔"

"تم اتنی ڈرتی کیوں ہو؟ میں تو آہی رہا ہوں۔"

"اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ کسی دوسری جگہ بھاگ چلتے۔"

"جب اپنا گھر ہے تو کیوں کہیں بھاگیں۔ تم ناحق ڈر رہی ہو۔"

"جلدی سے آؤ گے نا؟"

"ہاں ہاں، ابھی آتا ہوں!"

"مجھ سے دغا تو نہیں کر رہے ہو کہ مجھے گھر بھیج کر تم کہیں چلتے بنو؟"

"اتنا نیچ نہیں ہوں جھنیا۔ جب تیری بانہہ پکڑی ہے تو مرتے دم تک نباہوں گا۔"

جھنیا گھر کی طرف چلی۔ گوبر لمحے بھر دُبدھے میں پڑا ہوا کھڑا رہا۔ پھر یکایک سر پر منڈلانے والی لعنت ملامت کا خیال خوفناک شکل اختیار کر کے اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کہیں سچ مچ اماں مارنے دوڑیں تو کیا ہوگا؟ اُس کے پیر زمین سے چپک گئے۔ اُس کے اور اُس کے گھر کے درمیان بس صرف آموں کا چھوٹا سا باغ تھا۔ جھنیا کی کالی پرچھائیں آہستہ آہستہ جاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اُس کے

حواسوں میں بڑی تیزی آگئی تھی۔ اُس کے کانوں میں ایسی بھنک پڑی جیسے اماں جھنیا کو گالیاں دے رہی ہیں۔ اُس کے دل کی کچھ ایسی حالت ہو رہی تھی گویا سر پہ گنڈاسے کا ہاتھ چلنے والا ہو بدن کا سارا خون جیسے خشک ہو گیا ہو۔ ایک لمحے کے بعد اُس نے دیکھا جیسے دھنیا گھر سے نکل کر کہیں جا رہی ہو۔ دادا کے پاس جاتی ہوگی۔ سایت دادا کھاپی کر مٹر کے کھیت پر چلے گئے ہوں۔ وہ اُس کھیت کی طرف چلا۔ جو اور گیہوں کے کھیتوں کو کچلتا روندتا ہوا اس طرح بھاگا جا رہا تھا۔ گویا پیچھے کوئی دوڑ آ رہی ہو۔ وہ ہے دادا کی جھونپڑی! وہ رُک گیا اور دبے پاؤں جاکر اُس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اُس کا قیاس ٹھیک نکلا۔ وہ پہونچا ہی تھا کہ دھنیا کی آواز سُنائی دی۔ وہ گجب ہو گیا! اماں اتنی بے درد ہیں! ایک اناتھ لڑکی پر اُنہیں کچھ بھی دیا نہیں آتی اور جو میں ابھی سامنے جاکر پھٹکار دوں کہ تم کو جھنیا سے بولنے کی کوئی مجال نہیں ہے تو ساری سیکھی نکل جائے۔ اچھا دادا بھی بگڑ رہے ہیں۔ کیلے کے لئے آج ٹھیکر بھی تیز ہو گیا۔ میں اُن کا ادب کرتا ہوں یہ اُسی کا پھل ہے۔ یہ تو دادا بھی وہیں جا رہے ہیں۔ اگر جھنیا کو اُنہوں نے مارا پیٹا تو مجھ سے نہ سہا جائے گا۔ بھگوان! اب تمہارا ہی بھروسہ ہے میں نہ جانتا تھا کہ اس سنکٹ میں جان پڑے گی۔ جھنیا مجھے اپنے من میں کتنا مکار، ڈرپوک اور کمینہ سمجھ رہی ہوگی۔ مگر اُسے مار کیسے سکتے ہیں! گھر سے نکال بھی کیسے سکتے ہیں؟ کیا گھر میں میرا حصہ نہیں ہے؟ اگر جھنیا پر کسی نے ہاتھ اُٹھایا تو آج مہابھارت ہو جائے گا۔ ماں باپ جب تک لڑکوں کی رچھا کریں تب تک ماں باپ ہیں، جب اُن میں ممتا ہی نہیں تو کیسے ماں باپ؟''

ہوری جیوں جھونپڑی سے نکلا، گوبر بھی دبے پاؤں آہستہ آہستہ پیچھے چلا مگر دروازے پر اُجالا دیکھ کر اُس کے پیر رُک گئے۔ اُس اُجالے کی لکیر کے اندر دو قدم نہیں رکھ سکتا وہ اندھیرے ہی میں دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا، اُس کی ہمت نے

جواب دے دیا، ہائے! بیچاری جھنیا پر یہ لوگ ستا رہے ہیں اور وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اُس نے کھیل کھیل میں جو ایک چنگاری پھینک دی تھی وہ سارے کھلیان کو بھسم کر چکی یہ اُس نے نہ سمجھا تھا۔ اور اب اُس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سامنے آ کر کہتا "ہاں میں نے چنگاری پھینکی تھی"۔ جن سہاروں سے وہ اپنے دل کو سنبھالے ہوئے تھا وہ سب اس زلزلے میں گر پڑے اور وہ جھونپڑا بھی گر پڑا۔ وہ پیچھے لوٹا۔ اب وہ جھنیا کو کیا مُنہ دکھائے؟

وہ کوئی سو قدم چلا گیا، اس طرح جیسے کوئی سپاہی میدان سے بھاگے۔ اُس نے جھنیا سے محبت اور وفا کی جو باتیں کہی تھیں وہ سب یاد آنے لگیں۔ وہ وصال کی میٹھی باتیں یاد آئیں جب وہ اپنے مجنونانہ سانسوں میں اپنی تمناؤں کو گویا اپنی جان نکال کر اُسکے قدموں پر رکھ دیتا تھا۔ جھنیا کسی پرند کی طرح اپنے چھوٹے سے گھونسلے میں اپنی تنہائی کی زندگی کاٹ رہی تھی، وہاں نر کا مجنونانہ اصرار نہ تھا۔ نہ وہ اُبلتی ہوئی خوشی اور نہ بچوں کی میٹھی آوازیں۔ مگر صیاد کا دام اور فریب بھی تو وہاں نہ تھا۔ گوبر نے اُس کے تنہائی والے گھونسلے میں جا کر اُسے کچھ سُکھ پہنچایا یا نہیں۔ یہ کون جانے۔ مگر اُسے عذاب میں ڈال ہی دیا تھا۔ وہ سنبھل گیا۔ بھاگتا ہوا سپاہی گویا اپنے ایک ساتھی کا بڑھاوا سُن کر پیچھے لوٹ پڑا۔

اُس نے دروازے پر آ کر دیکھا تو کواڑ بند ہو گئے تھے۔ کواڑوں کے دراڑوں سے روشنی کی شعاعیں باہر نکل رہی تھیں۔ اُس نے ایک دراز سے اندر جھانکا۔ دھنیا اور جھنیا بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہوری کھڑا تھا۔ جھنیا کی سسکیاں سُنائی دے رہی تھیں۔ اور دھنیا اُسے سمجھا رہی تھی۔ "بیٹی، تو چل کر گھر میں بیٹھ۔ میں تیرے کاکا اور بھائیوں کو دیکھ لوں گی۔ جب تک ہم جیتے ہیں کسی بات کی چنتا نہیں ہے۔ ہمارے رہتے تجھے کوئی ٹیڑھی آنکھ دیکھ بھی نہ سکے گا۔"

گوبر خوش ہو گیا۔ آج وہ کسی قابل ہوتا تو دادا اور اماں کو سونے سے منڈھ دیتا۔ اور کہتا "اب تم کچھ کام نہ کرو۔ آرام سے بیٹھے بیٹھے کھاؤ اور جتنا دان پُن کرنا چاہو کرو۔ جھنیا کے متعلق اب اُسے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ وہ اُسے جیسا سہارا دینا چاہتا تھا وہ مل گیا تھا۔ جھنیا اُسے دغاباز سمجھتی ہے تو سمجھے وہ تو جب ہی گھر آئے گا جب وہ پیسے کے زور سے گاؤں بھر کا منہ بند کر سکے اور دادا اور اماں اُسے گھر آنے کا کلنک نہ سمجھ کر گھرانے کا تلک سمجھیں۔ دل پر جتنا گہرا صدمہ ہوتا ہے وہ اپنے ردّ عمل کی صورت میں اتنا ہی مؤثر ہوتا ہے اس بدنامی نے گوبر کے دل کو متھ کر وہ رتن نکال لیا جو ابھی تک چھپا پڑا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اُسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا، اور اُس کے ساتھ ہی اسمیں مصمّم ارادہ پیدا ہو گیا۔ اب تک وہ کم سے کم کام کرنا اور زیادہ سے زیادہ کھانا اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال ہی نہ آیا تھا کہ گھر والوں کیلیا تھ بھی اُسکا کچھ فرض ہے۔ آج والدین کے اس عفو نے گو اُسکے دل میں نور پیدا کر دیا۔ جب دھنیا اور جھنیا اندر چلی گئیں تو ہوری کی اُسی جھونپڑی میں جا بیٹھا اور آئندہ کے لئے منصوبے باندھنے لگا۔"

شہر میں بیل داروں کو پانچ چھ آنے روز ملتے ہیں، یہ اُس نے سُن رکھا تھا۔ "اگر اُسے چھ آنے روج ملیں اور وہ ایک آنہ روج میں گجر کرے تو پانچ آنہ روز کی بچت ہو گی۔ مہینے میں دس روپئے ہوتے ہیں۔ اور سال میں سوا سو۔ وہ سوا سو کی تھیلی لیکر گھر آئے تو کس کی مجال ہے جو اُسکے سامنے منھ کھول سکے۔ یہی داتا دین اور یہی پٹیشوری آکر اُسکی ہاں میں ہاں ملائیں گے اور جھنیا تو گھمنڈ سے پھول اُٹھے گی۔ دو چار سال وہ اسی طرح کماتا رہے تو گھر کا سارا دُکھ دلدر دور ہو جائے"۔ ابھی تو سارے گھر کی کمائی بھی سوا سو نہیں ہوتی اب وہ اکیلا سوا سو کمائے گا۔ لوگ یہی تو کہیں گے کہ مجوری کرتا ہے۔ کہا کریں۔ مجوری کرنا کوئی پاپ تو نہیں ہے۔

اور سدا اچھا کرنے ہی تھوڑے ملیں گے۔ جیسے جیسے وہ کام میں ہشیار ہوگا۔ ویسے ویسے مجوری بھی تو بڑھے گی۔ تب وہ دادا سے کہے گا "کہ اب تم گھر میں بیٹھ کر بھگوان کا بھجن کرو۔ اس کھیتی میں جان کھپانے کے سوا اور کیا رکھا ہے؟ سب سے پہلے ایک بھینس لائے گا جو چار پانچ سیر دودھ دیگی اور دادا سے کہیگا کہ تم گئو ماتا کی سیوا کرو جس سے تمہارا لوک بھی بنے گا اور پرلوک بھی"!

اور کیا ایک آدمی میں اس کا گزر آرام سے نہ ہوگا؟ گھر لیکر کیا کرنا ہے! کسی جگہ پڑ رہیگا۔ سیکڑوں مندر اور دھرم سالے ہیں۔ اور پھر وہ جسکی مجوری کرے گا وہ کیا رہنے کی جگہ نہ دیگا؟ آٹا روپئے کا دس سیر آتا ہے۔ ایک آنہ کا ڈھائی پاؤ ہوا۔ ایک آنہ کا تو وہ آٹا ہی کھائیگا۔ لکڑی، دال، نمک، ساگ یہ سب کہاں سے آئیں گے؟ دونوں جون کے لئے سیر بھر تو آٹا ہی چاہئے۔ اوہ! کھانے کی کچھ نہ پوچھو۔ مٹھی بھر چنے سے بھی کام چل سکتا ہے اور حلوا پوری کھاکر بھی کام چل سکتا ہے، جیسی سمائی ہو۔ وہ آدھ سیر آٹا کھا کر دن بھر مجے سے کام کر سکتا ہے۔ ادھر ادھر سے اُپلے چن لئے تو لکڑی کا کام چل گیا۔ کبھی ایک پیسے کی دال لے لی اور کبھی آلو۔ آلو بھون کر بھرتا بنا لیا۔ یہاں دن کاٹنا ہے کہ چین کرنا ہے؟ پتل پر آٹا گوندھا اُپلوں پر باٹیاں سینکیں، آلو بھون کر بھرتا بنا لیا اور مجے سے کھا کر سو رہے۔ گھر پر کون دونوں جون روٹی ملتی ہے؟ ایک جون تو چربن ہی ملتا ہے۔ وہاں بھی ایک جون چربن ہی پر کاٹیں گے"!

اُسے شک ہوا کہ اگر مجوری نہ ملی تو وہ کیا کریگا۔ مگر مجوری کیوں نہ ملے گی؟ جب وہ جی توڑ کر کام کرے گا تو سو آدمی اُسے بلا لیں گے۔ کام سب کو پیارا ہوتا ہے چام نہیں پیارا ہوتا۔ یہاں بھی تو سوکھا پالا پڑتا ہے، اُوکھ میں دیمک لگتی ہے، گیہوں میں گردی لگتی ہے اور سرسوں میں لاہی لگ جاتی ہے۔ اُسے رات میں کوئی

کام مل جائے گا تو اُسے بھی نہ چھوڑیگا۔ دن بھر مجوری کی، رات کو کہیں چوکیداری کر لیگا۔ دو آنے بھی رات کے کام کے مل جائینگے تو چاندی ہے۔ جب لوٹے گا تو سب کے لئے ساڑیاں لائے گا۔ جھنیا کیلئے ہاتھ کا کنگن جرور بنوائے گا۔ اور دادا کے لئے منڈاسہ لائے گا۔"

یہی خیالی پلاؤ پکاتا ہوا وہ سو گیا۔ مگر ٹھنڈ میں نیند کہاں؟ کسی طرح رات کاٹی اور تڑکے ہی اُٹھ کر لکھنؤ کی سڑک پکڑی۔ بیس ہی کوس تو ہے، سانجھ (شام) تک پہونچ جائیگا۔ گاؤں کا کون آدمی وہاں پوچھا جاتا ہے اور وہ اپنا پتہ، ٹھکانا ہی کیوں لکھے گا؟ نہیں تو دادا دوسرے ہی دن سر پر سوار ہو جائیں گے۔ اُسے کچھ پچھتاوا تھا تو یہی کہ جھنیا سے کیوں نہ صاف صاف کہہ دیا کہ ابھی تو گھر جا۔ میں تھوڑے دنوں میں کچھ کما دھما کر لوٹوں گا، مگر تب وہ گھر جاتی ہی کیوں؟ کہتی کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اُسے وہاں کہاں کہاں باندھے پھرتا؟"

دن چڑھنے لگا۔ رات کو کچھ نہ کھایا تھا۔ بھوک لگی، پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ کہیں بیٹھ کر دم لینے کی خواہش ہوئی۔ بلا کچھ کھائے اب وہ نہیں چل سکتا۔ مگر پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ سڑک کے کنارے جھربیریوں کی جھاڑیاں تھیں۔ اُس نے تھوڑے سے بیر توڑ لئے اور پیٹ کو بہلاتا ہوا چلا۔ ایک گاؤں میں گڑ پکنے کی مہک آئی۔ اب جی نہ مانا۔ وہاں جاکر لوٹا ڈور مانگا اور پانی بھر کر چلو سے پینے بیٹھا تو ایک کسان نے کہا "ارے بھائی کیا یوں ہی پانی پیوگے۔ تھوڑا سا گڑ کھالو۔ اب کے اور چلائیں کولھو اور بنائیں کھانڈ، اگلے سال تک مل تیار ہو جائیگی تو ساری اوکھ کھڑی بک جائیگی۔ گڑ اور کھانڈ کے بھاؤ چینی ملے گی تو ہمارا گڑ کون لے گا۔" اُسنے ایک کٹورے میں گڑ کی کئی بنڈیاں لاکر دیں۔ گوبر نے گڑ کھاکر پانی پیا۔ تماکو تو پیتے ہوگے؟ گوبر نے بہانہ کیا۔ ابھی چلم نہیں پیتا۔ بوڑھے نے خوش ہو کر کہا "بڑا اچھا کرتے ہو بھیا! بُرا روگ

ایک بار پکڑ لے تو پھر جیتے جی نہیں چھوڑتا ۔"

انجن کو کوئلہ پانی مل گیا ۔ رفتار تیز ہوئی ۔ جاڑے کے دن ، نہ جانے کب دوپہر ہو گئی ، ایک جگہ دیکھا کہ ایک نوجوان عورت ایک پیڑ کے نیچے شوہر سے ستیہ گرہ کئے بیٹھی تھی ، شوہر سامنے کھڑا اُسے منا رہا تھا ۔ دو چار راہ گیر تماشہ دیکھنے کھڑے ہو گئے تھے گوبر بھی کھڑا ہو گیا ۔ تماشوں سے زیادہ دلچسپ زندگی کا اور کون ناٹک ہوگا ۔

عورت نے شوہر کیطرف گھور کر کہا "میں نہ جاؤں گی ، نہ جاؤں گی نہ جاؤں گی "

مرد نے گویا الٹی میٹم دیا " نہ جائے گی ؟ "

" نہ جاؤں گی "

" نہ جائے گی ؟ "

" نہ جاؤں گی "

مرد نے اُس کے بال پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا ۔ عورت زمین پر لوٹ گئی ۔

مرد نے ہار کر کہا " میں پھر کہتا ہوں کہ اُٹھ کر چل "

عورت نے اُسی استقلال سے کہا " میں تیرے گھر سات جنم نہ جاؤں گی ۔ چاہے بوٹی بوٹی کاٹ ڈال "

" میں تیرا گلا کاٹ لوں گا "

" تو پھانسی پاؤ گے "

مرد نے اُسکے بال چھوڑ دیئے اور سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا ۔ مردانگی انتہائی حد تک پہنچ گئی تھی ، کہ اُس کے آگے اب وہ نہ جا سکتی تھی ۔

ایک لمحے میں وہ پھر کھڑا ہوا ۔ اور ہاری ہوئی سی آواز میں بولا " تو جا تی کیا

ہے؟"

عورت بھی اُٹھ بیٹھی اور نہ ڈرنے والی آواز میں بولی۔ "میں یہی چاہتی ہوں تو مجھے چھوڑ دے!"

"تو کچھ مُنہ سے کہے گی بھی کہ کیا بات ہوئی؟"

"میرے بھائی باپ کو کوئی کیوں گالی دے!"

"کس نے گالی دی۔ تیرے بھائی باپ کو؟"

"جا کر اپنے گھر میں پوچھ!"

"بکے گی تب تو ہی پوچھوں گا!"

"تو کیا پوچھے گا؟ تجھ میں دم بھی ہے۔ جا کر ماں کے آنچل میں مُنہ چھپا کر سو رہ! وہ تیری ماں ہوگی، میری کوئی نہیں ہے۔ تو اُس کی گالیاں سن، میں کیوں سنوں؟ ایک روٹی کھاتی ہوں تو چار روٹی کا کام کرتی ہوں، کیوں کسی کی دھونس سہوں؟ میں تیرا ایک پُوت کا چھلّا بھی نہیں جانتی!"

راہ گیروں کو اس جھگڑے میں ناٹک کا مزا آ رہا تھا۔ مگر اُسکے جلد ختم ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ منزل کھوٹی ہو رہی تھی۔ ایک ایک کرکے لوگ کھسکنے لگے۔ گوبر کو مرد کی بیرحمی بُری لگ رہی تھی۔ بھیڑ کے سامنے تو کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ مگر میدان خالی ہوا تو بولا۔ "بھائی، مرد عورت کے بیچ میں بولنا تو نہ چاہئے، پر اتنی بیدردی بھی اچھی نہیں ہوتی۔"

مرد نے کوڑی سی آنکھیں نکال کر کہا۔ "تم کون ہو؟"

گوبر نے بلا خوف کہا۔ "میں کوئی ہوں۔ پر بے جا بات دیکھ کر سبھی کو بُرا لگتا ہے۔"

مرد نے سر ہلا کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مہرا نہیں آئی تبھی اتنا درد ہے۔"

"پھر یا آئے گی تو بھی اُس کا جھونٹا پکڑ کر نہ کھینچوں گا!"

"اچھا تم اپنی راہ لو۔ میری عورت ہے، میں اُسے ماروں گا۔ کاٹوں گا۔ تم کون ہوتے ہو۔ بیچ میں بولنے والے؟ چلے جاؤ سیدھے سے، یہاں کھڑے مت رہو۔"

"گوبر کا گرم خون اور گرم ہو گیا۔ وہ کیوں چلا جائے۔ سڑک سرکار کی ہے کسی کے باپ کی نہیں ہے۔ وہ جب تک چاہے کھڑا رہ سکتا ہے۔ وہاں سے اُسے ہٹانے کی مجال کسے ہے۔"

مرد نے ہونٹ چبا کر کہا۔ "تو تم نہ جاؤ گے، آؤں؟"

گوبر نے انگوچھا کمر میں باندھ لیا اور لڑنے کے لیے تیار ہو کر بولا۔ "تم آؤ یا نہ آؤ۔ پر میں تو تبھی جاؤں گا جب میری اِچھا ہو گی۔"

"یہ کون جانتا ہے کہ کس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔"

"تو تم نہ جاؤ گے؟"

"نہ"

مرد مُٹھی باندھ کر گوبر کی طرف جھپٹا۔ اُسی وقت عورت نے اُس کی دھوتی پکڑ لی اور اُسے اپنی طرف کھینچتی ہوئی گوبر سے بولی۔ "تم کیوں لڑائی لینے پر اُتارو ہو رہے ہو۔ جی! اپنی راہ کیوں نہیں جاتے؟ یہاں کوئی تماشا ہے۔ ہمارا آپس کا جھگڑا ہے۔ کبھی وہ مجھے مارتا ہے تو کبھی میں اُسے ڈانٹتی ہوں۔ تم سے مطلب؟"

گوبر یہ پھٹکار پا کر وہاں سے چل دیا۔ دل میں کہا "یہ عورت مار کھانے ہی لائق ہے۔"

گوبر آگے نکل گیا تو عورت نے اپنے شوہر کو ڈانٹ بتائی "تم سب سے لڑنے کیوں لگتے ہو۔ اُس نے کون سی بُری بات کہی تھی کہ تمہارے چوٹ لگ گئی؟ بُرا کام کرو گے تو دُنیا بُرا کہے گی ہی۔ پر ہے وہ کسی بھلے گھر کا اور اپنی برادری ہی کا جان پڑتا ہے۔ کیوں

اُسے اپنی بہن کے لئے نہیں ٹھیک کر لیتے؟"

شوہر نے شبہہ ظاہر کرتے ہوئے کہا "کیا اب تک کنوارا بیٹھا ہوگا؟"

"تو پوچھ ہی کیوں نہ لو؟"

مرد نے دس قدم دوڑ کر گوبر کو آواز دی اور ہاتھ سے ٹھہر جانے کا اشارہ کیا۔

گوبر نے سمجھا کہ شاید پھر اس کے سر پر بھوت سوار ہوا ہے، جب ہی للکار رہا ہے بنا مار کھائے، نہ مانے گا۔ اپنے گاؤں میں کُتّا بھی باگھ بن جاتا ہے۔ اچھا آنے دو۔

مگر اس کے مُنہ پر لڑائی کی للکار نہ تھی۔ دوستی کا بُلاوا تھا۔ اُس نے گاؤں نام اور ذات پوچھی، گوبر نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔ اس مرد کا نام کودئی تھا۔

"کودئی نے مسکرا کر کہا "ہم دونوں میں دنگا ہوتے ہوتے بچا۔ تم چلے آئے تو میں نے سوچا کہ تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں ناحق تم سے تن بیٹھا۔ کچھ کھیتی باڑی تو گھر میں ہوتی ہے نا؟"

گوبر نے بتایا کہ اُس کے موروثی پانچ بیگہ کھیت ہیں اور ایک ہل کی کھیتی ہوتی ہے۔

"میں نے تمہیں جو بُرا بھلا کہا ہے اُس کی ماپھی دو بھائی! اس میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ عورت گُن میں لچھمی ہے پر کبھی اس پر نہ جانے کون سا بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ اب تمہیں بتاؤ اماں پر میرا کیا بس ہے؟ پیدا تو انہیں نے کیا ہے اور پالا پوسا اُن ہی نے ہے۔ جب کوئی بات ہوگی تو میں تو جو کچھ کہوں گا وہ عورت ہی سے کہوں گا۔ اُس پر اپنا بس ہے۔ تمہیں سوچو کہ میں بیجا تو نہیں کہہ رہا ہوں۔ ہاں مجھے اُس کا جھونٹا پکڑ کر گھسیٹنا نہ تھا۔ مگر عورت جات کچھ تاڑنا دیئے بنا بھی تو بس میں نہیں رہتی۔ چاہتی ہے کہ اماں سے الگ ہو جائیں۔ تمہیں سوچو کہ کیسے الگ ہو جاؤں اور کس سے الگ ہو جاؤں؟ اپنی اماں سے؟ جس نے جنم دیا؟ یہ مجھ سے نہ ہوگا، چاہے عو

رہے یا جائے۔"

گوبر کو بھی اپنی رائے بدلنی پڑی۔ بولا "ماتا کا تو آدر کرنا سب ہی دھرم ہے بھائی! ماتا سے کون اُرن ہو سکتا ہے۔"

کودنی نے اُسے اپنے گھر چلنے کو کہا۔ آج وہ کسی طرح لکھنؤ نہیں پہونچ سکتا۔ کوس دو کوس جاتے جاتے سانجھ ہو ہی جائے گی۔ رات کو کہیں نہ کہیں تو ٹکنا ہی پڑے گا۔

گوبر نے مذاق کیا "نگائی مان گئی؟"

"نہ مانے گی تو کیا کرے گی؟"

"مجھے تو اُس نے ایسی پھٹکار بتائی کہ میں لجا گیا!"

"وہ اب پچھتا رہی ہے۔ جب تک ماتا جی کو سمجھا دینا۔ مجھ سے تو کچھ کہتے نہیں بنتا انہیں بھی سوچنا چاہیئے کہ بہو کے باپ بھائی کی گالی کیوں دیتی ہیں۔ ہماری بھی بہن ہے۔ چار دن میں اُس کی سگائی ہو جائے گی۔ اُس کی ساس ہمیں گالیاں دے گی تو اُس سے سُنا جائیگا؟ سب دوکھ نگائی ہی کا نہیں، ماتا کا بھی دوکھ ہی ہے۔ جب ہر بات میں وہ اپنی بیٹی کا پچھ کریں گی تو ہمیں بُرا لگے ہی گا۔ اُس میں اتنی بات اچھی ہے کہ گھر سے روٹھ کر چلی جائے۔ پر گالی کا جواب گالی سے نہیں دیتی۔"

گوبر کو رات کے لئے کوئی ٹھکانا چاہیئے تھا۔ کودنی کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں پھر اُسی جگہ آئے جہاں عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اب گھر گرہستن بن گئی تھی ذرا سا گھونگٹ نکال لیا تھا اور کچھ لجا سی رہی تھی کودنی نے مسکرا کر کہا "یہ تو آتے ہی نہ تھے کہتے تھے کہ ایسی ڈانٹ سُننے کے بعد اُن کے گھر کیسے جائیں۔"

عورت نے گھونگٹ کی آڑ سے گوبر کو دیکھ کر کہا "اتنی ہی ڈانٹ میں ڈر گئے؟ نگائی آ جائے گی تب کہاں بھاگو گے؟"

گاؤں قریب ہی تھا۔ گاؤں کیا تھا، پُروا تھا، دس بارہ گھروں کا جو آدھے کھپریل کے تھے اور آدھے پوس کے، کودئی نے اپنے گھر پہنچ کر کھاٹ نکالی اور اُس پر ایک دری بچھا دی۔ شربت بنانے کو کہہ کر چلم بھر لایا۔ اور لمحہ بھر بعد وہی عورت لوٹے میں شربت لے کر آئی اور گوبر کو پانی کا ایک چھینٹا مار کر گویا معافی مانگ لی۔ وہ اب اُس کا نندوئی ہو رہا تھا، پھر کیوں نہ ابھی سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دے؟

(۱۳)

گوبر منھ اندھیرے ہی اُٹھا اور کودئی سے رُخصت ہُوا۔ سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ اُس کا بیاہ ہو چکا ہے۔ بس اُس سے بیاہ کا کوئی چرچا ہی نہ کیا گیا۔ اس کی بھلمنساہت نے سارے گھر کو گرویدہ کر لیا تھا۔ کودئی کی ماں کو تو اُس نے ایسے میٹھے لفظوں میں اور اُس کی ماں والے درجے کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسی عُمدہ نصیحت دی کہ اُس نے خوش ہو کر دُعا دی تھی۔

"تم بڑی ہو ماتا جی! پوجنے جوگ ہو۔ تیرا ماں کے رِن سے سو جنم لیکر بھی اُرِن نہیں ہو سکتا، لاکھ جنم لیکر بھی اُرِن نہیں ہو سکتا، کروڑ جنم لیکر بھی نہیں . . . ."

بوڑھی اِس بے حساب بھگتی پر مگن ہو گئی۔ اس کے بعد گوبر نے جو کچھ کہا اُس میں بڑھیا کو اپنی بھلائی دکھائی دی۔

"اب جیسے آج ہی بہو گھر سے روٹھ کر چلی گئی تھی تو کس کی ہتک ہوئی؟ بہو کو کون جانتا ہے کس کی لڑکی ہے۔ کس کی ناتن ہے، کون جانتا ہے؟ ممکن ہے اُس کا باپ گھسیارا ہی رہا ہو . . . ."

بڑھیا نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "گھسیارا تو ہے ہی بیٹا، پکا گھسیارا! تڑکے

اُس کا مُنہ دیکھ لو تو دن بھر پانی نہ ملے ۔

گوبر بولا "تو ایسے آدمی کی ہنسی ہی کیا ہو سکتی ہے؟ ہنسی ہوئی تمہاری اور تمہارے آدمی کی۔ جس نے پوچھا، یہی پوچھا کہ کس کی بہو ہے۔ پھر وہ ابھی لڑکی ہے، ناسمجھ، اَلھڑ! نیچ ماں باپ کی لڑکی ہے، اچھی کہاں سے بن جائے؟ تم کو تو جیسے بوڑھے طوطے کو رام نام پڑھانا پڑے گا۔ مارنے سے تو وہ پڑھے گا نہیں، اُسے تو پریم ہی سے پڑھایا جا سکتا ہے۔ تاڑنا بھی دو پر اُس کے مُنہ مت لگو۔ اُس کا تو کچھ نہیں بگڑتا، تمہاری ہی ہتک ہوتی ہے۔"

جب گوبر چلنے لگا تو بڑھیا نے کھانڈ اور ستو ملا کر اُسے کھانے کو دیا۔ گاؤں کے اور کئی آدمی مزدوری کی تلاش میں شہر جا رہے تھے۔ بات چیت میں راستہ کٹ گیا اور نو بجتے بجتے سب کے سب امین آباد کے بازار میں جا پہنچے۔ گوبر حیران تھا کہ اتنے آدمی شہر میں کہاں سے آ گئے؟ آدمی پر آدمی گرا پڑتا تھا۔ اُس دن بازار میں چار پانچ سو مزدوروں سے کم نہ تھے۔ معمار، بڑھئی، لوہار، بیلدار، کھاٹ بننے والے، ٹوکری ڈھونے والے اور سنگ تراش سبھی کا مجمع تھا۔ گوبر یہ بھیڑ بھاڑ دیکھ کر نراس ہو گیا۔ اتنے سارے مزدوروں کو کہاں کام مل جاتا ہے؟ اور اُس کے ہاتھ میں تو کوئی اوزار بھی نہیں ہے۔ کوئی کیا جانے گا کہ وہ کون سا کام کر سکتا ہے؟ کوئی اُسے کیوں رکھنے لگا؟ بلا اوزار کے اُسے کون پوچھے گا؟

رفتہ رفتہ ایک ایک کر کے مزدوروں کو کام ملتا جاتا تھا۔ کچھ لوگ مایوس ہو کر گھر لوٹے جا رہے تھے۔ زیادہ تر وہ بوڑھے اور نکمّے بچ رہے تھے۔ جن کا کوئی پرسان نہ تھا۔ اُنہی میں گوبر بھی تھا مگر ابھی آج اُس کے پاس کھانے کو ہے، کوئی غم نہیں۔ یکایک خورشید نے مزدوروں کے بیچ میں آ کر اونچی آواز سے کہا "جس کو چھ آنے پر آج کام کرنا ہو وہ میرے ساتھ آئے۔ سب کو چھ آنے ملیں گے۔ پانچ بجے چھٹی ملے گی۔

دس پانچ معماروں اور بڑھیوں کے علاوہ سب کے سب اُنکے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ چار سوختہ حالوں کی ایک بڑی فوج سج گئی۔ آگے مرزا تھے۔ کندھے پر موٹا سا سوٹا رکھے ہوئے اور پیچھے بھوکوں مرنے والوں کی لمبی قطار تھی جیسے بھیڑیں ہوں۔

ایک بوڑھے نے مرزا سے پوچھا: "کون کام کرنا ہے۔ مالک؟"

مرزا صاحب نے جو کام بتایا اُس پر سب اور بھی تعجب میں آ گئے۔ صرف ایک کبڈی کھیلنا! یہ کیا آدمی ہے جو کبڈی کھیلنے کیلئے چھ آنے دے رہا ہے۔ سنکی تو نہیں ہے کوئی؟ بہت دھن پا کر آدمی سنکی ہو جاتا ہے۔ بہت پڑھ لینے سے بھی آدمی سنکی ہو جاتا ہے۔ کچھ کو یہ شبہ ہونے لگا کہ کہیں یہ مخول تو نہیں ہے، یہاں سے گھیر لے جا کر کہہ دے کہ کوئی کام نہیں ہے تو اُسکا کوئی کیا کر لیگا؟ وہ چاہے کبڈی کھلائے چاہے آنکھ مچولی اور چاہے گلی ڈنڈا، مگر مزدوری پہلے دے دے۔ ایسے جھکی آدمی کا کیا بھروسہ؟

گوبر نے ڈرتے ڈرتے کہا: "مالک! ہمارے پاس کچھ کھانے کو نہیں ہے۔ پیسے مل جائیں تو کچھ لے کر کھا لوں۔"

مرزا نے فوراً چھ آنے پیسے اُسکے ہاتھ میں رکھ دیئے اور للکار کر بولے

"مزدوری سب کو چلتے چلتے پیشگی دیدی جائے گی اُسکی فکر مت کرو۔"

مرزا صاحب نے شہر کے باہر تھوڑی سی زمین لے رکھی تھی۔ مزدوروں نے جا کر دیکھا تو ایک بڑا احاطہ گھرا ہوا تھا اور اُسکے اندر صرف ایک چھوٹی سی پھوس کی جھونپڑی تھی جس میں تین چار کرسیاں تھیں اور ایک میز جس پر کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ جھونپڑی بیلوں سے ڈھکی ہوئی بہت عمدہ معلوم ہوتی تھی۔ احاطہ میں ایک طرف آم، لیموں اور امرود کے پودے لگے ہوئے تھے اور دوسری طرف کچھ پھول،

زمین کا زیادہ حصّہ بنجر پڑا ہوا تھا۔ مرزا نے سب کو ایک قطار میں کھڑا کر کے پہلے ہی سب کو اُجرت تقسیم کر دی۔ اب کسی کو اُن کے پاگل ہونے میں شبہہ نہ رہا۔

گوبر جیسے پہلے ہی پا چکا تھا، مرزا نے اُسے بُلا کر پودے سینچنے کا کام سونپا۔ اُسے کبڈّی کھیلنے کو نہ ملے گی۔ دل مسوس کر رہ گیا۔ ان بوڑھوں کو اُٹھا کر پٹکتا۔ مگر کچھ پروا نہیں، بہت کبڈّی کھیل چکا ہے۔ پیسے تو مل گئے۔

آج مدّت کے بعد ان بوڑھوں کو کبڈّی کھیلنا نصیب ہوا۔ بیشتر تو ایسے تھے جنھیں یاد بھی نہ آتا تھا کہ کبھی کھیلی ہے یا نہیں۔ دن بھر شہر میں پستے تھے، پہر رات گئے گھر پہونچتے تھے اور جو کچھ روکھا سوکھا مل جاتا تھا اُسے کھا کر پڑ رہتے تھے۔ علی الصباح پھر وہی چرخہ شروع ہو جاتا تھا۔ زندگی بے مزہ اور بے لطف، صرف ایک ڈھرّے پر چلی جا رہی تھی۔ آج جو یہ موقع ملا تو بوڑھے بھی جوان بن گئے۔ ادھ مرے بوڑھے، ٹھٹھریاں لیے، منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، جانگھوں کے اوپر تک دھوتیاں یا تہمد چڑھائے خم ٹھونک ٹھونک کر اُچھل رہے تھے گویا اُن کی بوڑھی ہڈیوں میں جوانی سرایت کر گئی ہو۔ جھٹ پٹ پالی بن گئی۔ دو ہیر بن گئے۔ ساتھیوں کا چناؤ ہونے لگا اور بارہ بجتے بجتے کھیل شروع ہو گیا۔ جاڑوں کی ٹھنڈی دھوپ ایسے کھیلوں کے لئے بہت خوشگوار ہوتی ہے۔

اُدھر احاطہ کے پھاٹک پر مرزا صاحب تماشائیوں کو ٹکٹ بانٹ رہے تھے، اُن پر اسی طرح کوئی نہ کوئی خبط ہمیشہ سوار رہتا تھا۔ امیروں سے پیسہ لیکر غریبوں کو بانٹ دینا۔ اس بڈھی کبڈّی کا اشتہار کئی روز سے ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے پوسٹر چپاں کئے گئے تھے۔ نوٹس تقسیم ہوئے تھے۔ یہ کھیل اپنے ڈھنگ کا نرالا ہوگا۔ جیسے پہلے کبھی نہ ہوا ہوگا۔ ہندوستان کے بوڑھے آج بھی کیسے جوان مرد ہوتے ہیں۔ جنھیں یہ دیکھنا ہو وہ آئے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لے، جس نے یہ تماشا نہ دیکھا وہ پچھتائے گا۔

ایسا نادر موقع پھر نہ ملے گا۔ ٹکٹ دس آنے سے لے کر دو آنے تک کے تھے۔ تین بجتے بجتے پورا احاطہ بھر گیا۔ موٹروں اور فٹنوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ دو ہزار سے کم کا مجمع نہ تھا۔ رؤسا کے لئے کرسیاں، اور بنچوں کا انتظام تھا اور عوام کے لئے صاف ستھری زمین۔

مس مالتی، مہتا، کھنّا، تنکھا، اور رائے صاحب بھی موجود تھے۔

کھیل شروع ہوا تو مرزا نے مہتا سے کہا۔ "آئیے ڈاکٹر صاحب ایک پالی ہماری اور آپ کی بھی ہو جائے گی۔

مس مالتی بولیں "فلاسفر کا مقابلہ تو فلاسفر ہی سے ہو سکتا ہے۔"

مرزا نے مونچھوں پر تاؤ دیکر کہا۔ "تو کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں فلاسفر نہیں ہوں؟ میرے پاس ڈگری کی دُم نہیں ہے مگر ہوں میں فلاسفر۔ آپ میرا امتحان لے سکتے ہیں مہتا جی!"

مالتی نے پوچھا "اچھا بتائیے کہ آپ آیڈیلیسٹ ہیں یا میٹریلیسٹ (روحانیت کے قائل ہیں یا مادیت کے؟)"

"میں دونوں ہوں۔"

"یہ کیونکر؟"

"بہت اچھی طرح، جب جیسا موقع دیکھا ویسا بن گیا۔"

"تو آپ کا کوئی طے شدہ اصول نہیں ہے؟"

"جس بات کا آج تک کبھی تصفیہ نہ ہوا اور نہ کبھی ہو گا۔ اُس کے متعلق میں بھلا کیا طے کر سکتا ہوں؟ اور لوگ آنکھیں پھوڑ کر اور کتابیں چاٹ کر جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہاں میں یوں ہی پہنچ گیا۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ کسی فلاسفر نے عقلی گدے لگانے کے سوا اور بھی کچھ کیا ہے؟

ڈاکٹر مہتا نے اچکن کے بٹن کھولتے ہوئے کہا "تو چلئے ہماری اور آپ کی ہو جائے۔ اور کوئی مانے یا نہ مانے میں آپ کو فلاسفر مانتا ہوں۔"

مرزا نے کھنّا سے پوچھا "آپ کے لئے بھی کوئی جوڑ ٹھیک کریں؟"

مالتی "ہاں۔ ہاں، انہیں ضرور لے جائیے۔ مسٹر تنخا کے ساتھ۔"

کھنّا جھینپتے ہوئے بولے۔ "جی نہیں، مجھے معاف کیجئے۔"

مرزا نے رائے صاحب سے پوچھا "آپ کے لئے کوئی جوڑ لاؤں؟"

رائے صاحب بولے "میرا جوڑ تو اونکار ناتھ کا ہے۔ مگر وہ آج نظر نہیں آتے۔"

مرزا اور مہتا بھی برہنہ بدن، صرف جھانگیا پہنے ہوئے میدان میں پہونچ گئے تھے۔ ایک ادھر دوسرا ادھر کھیل شروع ہو گیا۔

عوام ان بوڑھی کلیلوں پر ہنستے تھے، تالیاں بجاتے تھے، گالیاں دیتے تھے للکارتے تھے اور بازیاں لگاتے تھے۔ واہ ذرا ان بوڑھے بابا کو دیکھو کس شان سے جا رہے ہیں جیسے سب کو مار کر ہی لوٹیں گے۔ اچھا، دوسری طرف سے بھی ان کے بڑے بھائی نکلے۔ دونوں کیسے پینترے بدل رہے ہیں۔ ان ہڈیوں میں ابھی بڑا جیوٹ ہے بھائی! ان لوگوں نے جتنا گھی کھایا ہے، اتنا تو ہمیں اب پانی بھی میسّر نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان دولت مند ہو رہا ہے۔ ہوتا ہوگا۔ ہم تو یہی دیکھتے ہیں کہ ان بوڑھوں جیسے جیوٹ کے جوان بھی آج کل مشکل سے نکلیں گے وہ اُدھر والے بوڑھے نے اُسے دبوچ لیا۔ بے چارہ چھوٹنے کیلئے کتنا زور مار رہا ہے مگر اب نہیں جا سکتا بچہ۔ ایک کو تین لپٹ گئے۔ اس طرح لوگ اپنی دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ اُن کی ساری توجہ میدان پر تھی۔ کھلاڑیوں کے دھکّے مکّے، اُچھل کود دھر پکڑ اور ان کے مرنے جینے میں سبھی محو ہو رہے تھے۔ کبھی چاروں طرف سے قہقہے اُٹھتے، کبھی کوئی بے انصافی یا دھوکے بازی دیکھ کر لوگ "چھوڑ دو، کا

شور برپا کرتے اور کچھ لوگ تو طیش میں آکر پالی کی طرف ہی دوڑ پڑتے۔ لیکن تھوڑے سے لوگ پنڈال میں اعلیٰ درجے کے ٹکٹ لے کر بیٹھے تھے انہیں اس کھیل میں کچھ زیادہ مزا نہ آرہا تھا۔ وہ اس سے زیادہ اہمیت کی گفتگو میں مصروف تھے۔

کھنّا نے جنجر کا گلاس خالی کرکے سگار جلایا اور رائے صاحب سے بولے۔ "میں نے آپ سے کہہ دیا کہ بینک اس سے کم سود پر کسی طرح منظوری نہ دیگا۔ اور یہ رعایت بھی میں نے آپ کے ساتھ کی ہے۔ کیونکہ آپ سے گھر کا معاملہ ہے۔"

رائے صاحب نے مونچھوں کے اندر مسکراتے ہوئے کہا "تو پھر گھر والوں کو اُلٹے چھرے سے حلال کرنا چاہیئے!"

"یہ آپ کیا فرماتے ہیں؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ سورج پرتاپ سنگھ سے آپنے صرف سات فیصدی ہی لیا ہے، مجھ سے نو فیصدی مانگ رہے ہیں اور اُس پر احسان بھی رکھتے ہیں۔ کیوں نہ ہو۔"

کھنّا نے قہقہہ لگایا۔ گویا یہ بات ہنسنے ہی کے لائق تھی۔ "اُن شرطوں پر میں آپسے بھی وہی سود لے لوں گا۔ ہم نے اُنکی جائداد رہن رکھلی ہے اور شاید وہ جائداد پھر اُن کے ہاتھ نہ جائے گی!"

"میں بھی اپنی کوئی جائداد نکال دوں گا۔ نو فی صدی سے کہیں بہتر ہے کہ فالتو جائداد الگ کردوں۔ میری جیکسن روڈ والی کوٹھی آپ نکلوا دیں کمیشن لے لیجئے گا۔"

"اُس کوٹھی کا آسانی سے نکلنا ذرا مشکل ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ جگہ بستی سے کتنی دور ہے۔ مگر خیر دیکھوں گا۔ آپ اس کی قیمت کیا اندازہ کرتے ہیں؟"

رائے صاحب نے ایک لاکھ پچیس ہزار بتائے۔ پندرہ بیگھے زمین تو ہے

اُس کے ساتھ۔ کھنّا متحیر سے ہو گئے۔ بولے "آپ آج کے پندرہ سال پہلے کا خواب دیکھ رہے ہیں، رائے صاحب! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اِدھر جائدادوں کی قیمت میں پچاس فی صدی کی کمی ہو گئی ہے۔"

رائے صاحب نے بُرا مان کر کہا۔ "جی نہیں پندرہ سال پہلے اس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ تھی۔"

"میں خریدار کی تلاش میں رہوں گا۔ مگر میرا کمیشن پانچ فی صدی ہوگا آپ سے۔"

"اوروں سے شاید دس فی صدی ہوا کیوں؟ کیا کروگے اتنے روپئے لے کر؟"

"آپ جو چاہے دے دیجئے گا۔ اب تو راضی ہوئے۔ شکر کے حصّے ابھی تک آپ نے نہ خریدے۔ اب بہت تھوڑے بچ رہے ہیں ہاتھ ملتے رہ جائیے گا۔ بیمہ کی پالیسی بھی آپ نے نہ لی۔ آپ میں ٹال مٹول کی بڑی عادت ہے۔ جب اپنے نفع کی باتوں میں ٹال مٹول ہے تب دوسروں کو آپ لوگوں سے کیا نفع ہو سکتا ہے۔ اِسی سے کہتے ہیں کہ ریاست آدمی کی عقل چر جاتی ہے۔ میرا بس چلے تو تعلقداروں کی ریاستیں ضبط کر لوں۔"

مسٹر تنکھا۔ مالتی پر جال پھینک رہے تھے۔ مالتی نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ چناؤ کے جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتی۔ مگر تنکھا اتنی آسانی سے ہار ماننے والے آدمی نہ تھے۔ آگے کہنیوں کے بل میز پر ٹیک لگا کر بولے۔ "آپ ذرا اُس معاملے پر پھر غور کریں میں کہتا ہوں کہ ایسا موقع شاید آپ کو پھر نہ ملے۔ رانی صاحبہ چندا کو آپ کے مقابلہ میں روپئے میں ایک آنہ چانس بھی نہیں ہے۔ میری خواہش صرف یہ ہے کہ کونسل میں صرف ایسے آدمی جائیں جنھوں نے زندگی میں کچھ تجربہ حاصل کیا ہو اور عوام کی کچھ خدمت بھی کی ہو جس عورت نے عیش و عشرت کے سوا کچھ جانا ہی نہیں جس نے عوام کو ہمیشہ موٹر کا پیڑول سمجھا جس کی سب سے قیمتی خدمات وہ پارٹیاں ہیں جو گورنروں

اور سکریٹریوں کو دی جاتی ہیں۔ اُس کے لئے کونسل میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ نئی کونسلوں میں بہت کچھ اختیار نمائندوں کے ہاتھ میں ہوگا اور میں نہیں چاہتا کہ وہ اختیار نامستحقوں کے ہاتھ میں جائے۔"

مالتی نے گلا چھڑانے کے لئے کہا۔ "لیکن صاحب میرے پاس دس بیس ہزار الکشن میں خرچ کرنے کے لئے کہاں ہے؟ رانی صاحبہ تو چار لاکھ خرچ کر سکتی ہیں۔ مجھے بھی سال میں ہزار پانچ سو روپئے اُن سے مل جاتے ہیں یہ رقم بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

"پہلے آپ یہ بتا دیں کہ آپ جانا چاہتی ہیں یا نہیں؟"

"جانا تو چاہتی ہوں بشرطیکہ فری پاس مل جائے۔"

"تو یہ میرا ذمہ رہا۔ آپ کو فری پاس مل جائے گا۔"

"جی نہیں معاف کیجئے میں ہار کی ذلت نہیں اُٹھانا چاہتی۔ جب رانی صاحبہ روپئے کی تھیلیاں کھول دیں گی اور ایک ایک ووٹ پر ایک ایک اشرفی چڑھنے لگے گی تو شاید آپ بھی اُدھر ووٹ دیں گے۔"

"آپ کے خیال میں چناؤ محض روپئے سے جیتا جا سکتا ہے۔"

"جی نہیں شخصیت بھی ایک چیز ہے۔ لیکن میں نے صرف ایک مرتبہ جیل جانے کے سوا اور عوام کی خدمت کی ہے؟ اور سچ پوچھئے تو اُس بار بھی میں اپنے مطلب سے گئی تھی، اُسی طرح جیسے رائے صاحب اور کھنا گئے تھے۔ اس نئے تمدن کی بنیاد دولت ہے، علم اور خدمت، خاندان اور ذات، سب دولت کے سامنے ہیچ ہیں کبھی کبھی تاریخ میں ایسے موقع آجاتے ہیں جب دولت کو تحریک کے مقابلہ میں نیچا دیکھنا پڑتا ہے۔ مگر اُسے مستثنیات میں سمجھئے۔ میں اپنی ہی بات کہتی ہوں کوئی غریب عورت دواخانے میں آجاتی ہے تو اُس سے بولتی تک نہیں، مگر عورت کوئی موٹر پہ آگئی تو

دروازے تک جاکر استقبال کرتی ہوں اور ایسی ناز برداری کرتی ہوں گویا وہ مجسّم دیوی ہو۔میرا اور رانی صاحبہ کا کوئی مقابلہ نہیں۔جیسی کونسلیں بن رہی ہیں اُن کے لئے رانی صاحبہ ہی موزوں ہیں۔"

اُدھر میدان میں مہتا کی ٹیم کمزور پڑتی جاتی تھی۔نصف سے زیادہ کھلاڑی مر چکے تھے۔مہتا نے اپنی زندگی میں کبھی کبڈی نہ کھیلی تھی۔مرزا اس فن میں اُستاد تھے۔مرزا کی تعطیلیں ناٹک کی مشق میں گذرتی تھیں، بھیس بنانے میں وہ اچھے اچھوں کو متعجب کر دیتے تھے۔مرزا کی ساری دلچسپی اکھاڑے میں تھی، پہلوانوں کے بھی اور پریوں کے بھی!"

"مالتی کا دھیان اُدھر ہی لگا ہُوا تھا۔اُٹھ کر رائے صاحب سے بولی"۔مہتا کی پارٹی تو بُری طرح پٹ رہی ہے"۔

رائے صاحب اور کھنّا میں بیمہ کی باتیں ہو رہی تھیں۔رائے صاحب اُس سے اُکتائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔مالتی نے گویا گلو خلاصی دے دی۔اُٹھ کر بولے "جی ہاں پٹ تو رہی ہے۔مرزا پکا کھلاڑی ہے"۔

"مہتا کو یہ کیا سنک سوجھی۔مُفت اپنی بھد کرا رہا ہے"۔

"اس میں کاہے کی بھد۔دل لگی ہی تو ہے"۔

"مہتا کی طرف سے جو باہر نکلتا ہے وہی مر جاتا ہے"۔

"ایک لمحہ بعد اُس نے پوچھا "کیا اس کھیل میں ہاف ٹائم نہیں ہوتا"؟

کھنّا کو شرارت سوجھی بولے "آپ چلے تھے مرزا سے مقابلہ کرنے، سمجھے تھے کہ یہ بھی فلسفہ ہے"۔

"میں پوچھتی ہوں اس کھیل میں ہاف ٹائم نہیں ہوتا؟"

کھنّا نے پھر چڑھایا۔"اب کھیل ہی ختم ہوا جاتا ہے۔مزہ آئے گا جب مرزا صاحب

مہتا کو دبوچ کر رگڑ دیں گے اور مہتا صاحب چلیں بولیں گے۔"
"میں تم سے نہیں پوچھتی، رائے صاحب سے پوچھتی ہوں۔"
رائے صاحب بولے "اس کھیل میں کیسا ہاف ٹائم؟ ایک ہی ایک آدمی کر کے تو سامنے آتا ہے۔"

"اچھا مہتا کا ایک آدمی اور مر گیا۔"

کھنّا بولے "آپ دیکھتی رہیے۔ اسی طرح سب مر جائیں گے۔ اور آخر میں مہتا صاحب بھی مریں گے۔"

مالتی جل گئی "آپ کی تو ہمّت نہ پڑی باہر نکلنے کی۔"

"میں دیہاتی کھیل نہیں کھیلتا۔ میرے لئے ٹینس ہے۔"

"ٹینس میں بھی میں تمہیں سیکڑوں گیم دے چکی ہوں۔"

"آپ سے جیتنے کا مجھے دعویٰ ہی کب ہے؟"

"اگر دعویٰ ہو تو میں تیار ہوں۔"

مالتی انہیں جھٹکار بتا کر پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ کسی کو مہتا سے ہمدردی نہیں ہے۔ کوئی صاحب یہ نہیں کہتے کہ اب کھیل ختم کر دیا جائے۔ مہتا بھی عجیب احمق آدمی ہیں، کچھ دھاندلی کیوں نہیں کر بیٹھتے؟ یہاں بھی اپنی انصاف پسندی دکھا رہے ہیں۔ ابھی ہار کر لوٹیں گے تو چاروں طرف سے تالیاں پڑیں گی۔ اب شاید بیس آدمی اور ان کی طرف ہوں گے، اور لوگ کتنے خوش ہو رہے ہیں!۔

جیوں جیوں خاتمہ قریب آتا جاتا تھا لوگ بیتاب ہوتے جاتے اور پالی کی طرف بڑھتے جاتے تھے۔ رسّی کا جو ایک کٹگھر سا بنایا گیا تھا وہ توڑ دیا گیا۔ والنٹیر روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر اس شوق کے نشے میں ان کی ایک بھی نہ چلتی تھی حتیٰ کہ بڑھاؤ آخری حد تک آ پہونچا اور مہتا تنہا بچ گئے۔ اب انہیں گونگے کا پارٹ کھیلنا

پڑے گا۔ اب سارا دار و مدار ان ہی پر ہے اگر وہ بچ کر اپنی پالی میں لوٹ آتے ہیں تو اُنکی پارٹی کی خیر ہے ورنہ شکست کی ساری ذِلّت و ندامت لئے ہوئے انہیں لوٹنا پڑتا ہے۔ وہ دوسری طرف کے جتنے آدمیوں کو چھو کر اپنی پالی میں آئینگے وہ سب مر جائیں گے اور اتنے ہی آدمی اُنکی طرف جی اُٹھیں گے۔ سب کی آنکھیں مہتا پر لگی ہوئی تھیں وہ مہتا چلے! لوگوں نے چاروں طرف سے آکر پالی کو گھیر لیا۔ اِنتہائی محویت تھی۔ مہتا کتنے اطمینان سے دُشمنوں کیطرف جا رہے ہیں اُنکی ہر حرکت لوگوں پر منعکس ہوتی جاتی ہے۔ کسی کی گردن ٹیڑھی ہوتی جاتی ہے تو کوئی آگے جھکا پڑتا ہے۔ فضا گرم ہو گئی ہے۔ پارہ حرارت کے انتہائی نقطے تک پہونچ گیا ہے۔ مہتا مخالف جماعت میں داخل ہوئے وہ جماعت پیچھے ہٹتی جاتی ہے اُنکا سنگٹھن اتنا مضبوط ہے کہ مہتا کی پکڑ میں کوئی نہیں آرہا ہے۔ بہتوں کو جو اُمید تھی کہ مہتا کم سے کم اپنی پارٹی کے دس پانچ آدمیوں کو جلا ہی دیں گے وہ مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔

دفعتاً مرزا ایک چھلانگ مارتے ہیں اور مہتا کی کمر پکڑ لیتے ہیں۔ مہتا اپنے چھڑانے کے لئے زور لگا رہے ہیں۔ مرزا کو پالی کی طرف کھینچے لئے آرہے ہیں۔ لوگ پاگل ہوئے جاتے ہیں۔ اب اس کا پتہ چلنا مشکل ہے کہ کون کھلاڑی ہے اور کوئی تماشائی۔ سب ایک میں ہل جُل گئے ہیں، مرزا اور مہتا میں کُشتی ہو رہی ہے۔ مرزا کے کئی بڈھے مہتا کیطرف لپکے اور اُن سے لپٹ گئے۔ مہتا زمین پر چپ چاپ پڑے ہوئے ہیں۔ اگر وہ کسی طرح کھینچ کر دو ہاتھ اور لے جائیں تو اُنکے پچاسوں آدمی جی اُٹھتے ہیں مگر وہ کسی طرح بھی نہیں کھسک سکتے۔ مرزا اُنکی گردن پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ مہتا کا چہرہ سُرخ ہو رہا ہے، آنکھیں بیر بہوٹی بنی ہوئی ہیں۔ پسینہ ٹپک رہا ہے، اور مرزا اپنے موٹے جسم کا بوجھ لئے ہوئے اُن کی پیٹھ پر اُچک رہے ہیں۔ مالتی نے قریب جا کر جوش میں کہا

"مرزا خورشید یہ فیئر نہیں ہے، بازی ڈران رہی۔"

خورشید نے مہتا کی گردن پر ایک رگڑا لگا کر کہا "جب تک یہ چیں نہ بولیں گے میں ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ کیوں نہیں چیں بولتے ہو؟"

مالتی اور آگے بڑھی "چیں بلانے کے لئے آپ اتنا جبر نہیں کر سکتے۔"

مرزا نے مہتا کی پیٹھ پر اچھل کر کہا "بیشک کر سکتا ہوں۔ آپ ان سے کہدیں کہ چیں بولیں، میں ابھی اُٹھا جاتا ہوں۔"

مہتا نے ایک بار پھر اُٹھنے کی کوشش مگر مرزا نے اُنکی گردن دبا دی۔

مالتی نے اُنکا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "یہ کھیل نہیں دُشمنی ہے۔"

"دُشمنی ہی سہی۔"

"آپ نہ چھوڑیں گے؟"

اُسی وقت جیسے کوئی زلزلہ آ گیا۔ مرزا صاحب زمین پر پڑے ہوئے تھے اور مہتا دوڑے ہوئے پالی کی طرف جا رہے تھے اور ہزاروں آدمی پاگلوں کی طرح ٹوپیاں، پگڑیاں اور چھڑیاں اُچھال رہے تھے۔ کیسے یہ کایا پلٹ ہوئی، کوئی سمجھ نہ سکا۔

مرزا نے مہتا کو گود میں اُٹھا لیا اور لئے ہوئے شامیانے تک آئے۔ ہر شخص کی زبان پر یہ الفاظ تھے "ڈاکٹر صاحب نے بازی مار لی۔" اور ہر شخص اس ہاری ہوئی بازی کی ایکبارگی پلٹ جانے پر متعجب تھا۔ سبھی مہتا کے جیوٹ اور دم اور استقلال کی تعریف کر رہے تھے۔

مزدوروں کے لئے پہلے ہی سے نارنگیاں منگا لی گئی تھیں انھیں ایک ایک نارنگی دیکر رُخصت کیا گیا۔ شامیانے میں مہمانوں کے چائے پانی کا انتظام تھا۔ مہتا اور مرزا ایک ہی میز پر آمنے سامنے بیٹھے۔ مالتی کے پاس بیٹھی۔

مہتانے کہا "مجھے آج ایک نیا تجربہ ہُوا۔ عورت کی ہمدردی بار کو جیت بنا سکتی ہے"۔

مرزا نے مالتی کی طرف دیکھا۔ "اچھا یہ بات تھی! ابھی تو مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ آپ یکایک اوپر کیسے آ گئے"۔

مالتی شرم سے سُرخ ہوئی جاتی تھی بولی "آپ بڑے بے مروّت آدمی ہیں۔ مرزا جی، مجھے آج معلوم ہُوا"۔

"قصور ان کا تھا۔ یہ کیوں چلیں نہیں بولتے تھے"۔

"میں تو چلیں نہ بولتا چاہے آپ میری جان ہی لے لیتے"۔

کچھ دیر دوستوں میں گپ شپ ہوتی رہی۔ پھر شکریہ اور مبارکباد کی تقریریں ہوئیں اور مہمان رُخصت ہوئے۔ مالتی کو بھی ایک مریض کے یہاں جانا تھا۔ پس وہ بھی چلی گئی۔ صرف مرزا اور مہتا رہ گئے۔ اُنہیں ابھی نہانا تھا، مٹی میں اَٹے ہوئے تھے۔ کپڑے کیسے پہنتے؟ گوبر پانی کھینچ لایا اور دونوں نہانے لگے۔

"مرزا نے پوچھا "شادی کب تک ہو گی؟"

مہتا نے حیرت سے پوچھا "کس کی؟"

"آپ کی"

"میری شادی! کس کے ساتھ؟"

"واہ آپ تو ایسا اُڑ رہے ہیں گویا یہ بھی کوئی چھپانے کی بات ہے"۔

"نہیں نہیں، میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے بالکل خبر نہیں ہے۔ کیا میری شادی ہونے جا رہی ہے؟"

"اور آپ کیا سمجھتے ہیں کہ مس مالتی آپ کی رفیق بن کر رہیں گی"۔

"نہیں نہیں میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے بالکل خبر نہیں ہے۔ کیا میری شادی

مہتا متانت سے بولے "آپ کا قیاس بالکل غلط ہے مرزا جی! مس مالتی خوبصورت ہیں، خوش مزاج ہیں، سمجھدار ہیں، روشن خیال ہیں۔ اور بھی اُن میں کتنی ہی خوبیاں ہیں۔ مگر میں اپنی زندگی کی رفیقہ میں جو بات دیکھنا چاہتا ہوں وہ اُن میں نہیں ہے اور نہ شاید ہو سکتی ہے۔ میرے ذہن میں عورت وفا اور ایثار کی مورت ہے جو اپنی بے زبانی اور اپنی قربانی سے اپنے کو بالکل مٹا کر شوہر کی روح کا ایک جزو بنجاتی ہے۔ قالب مرد کا رہتا ہے مگر جان عورت کی ہوا کرتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ مرد اپنے کو کیوں نہیں مٹاتا عورت ہی سے کیوں یہ اُمید کرتا ہے۔ مرد میں وہ سکت ہی نہیں ہے۔ وہ اپنے کو مٹائے گا تو کچھ نہ رہ جائیگا۔ وہ کسی گپھا میں جا بیٹھے گا اور وصالِ حق کا خواب دیکھنے لگے گا اُس میں جلال کی زیادتی ہے اور وہ اپنے گھمنڈ میں یہ سمجھ کر کہ وہ عقل کا پُتلا ہے سیدھا خدا میں جذب ہو جانے کا تصور کیا کرتا ہے۔ عورت زمین کی طرح صبر و سکون اور برداشت والی ہے۔ مرد میں عورت کے اوصاف آجاتے ہیں تو وہ مہاتما بن جاتا ہے اور عورت میں مرد کے گُن آجاتے ہیں تو وہ بدکار بن جاتی ہے۔ مرد راغب ہوتا ہے اُس عورت کی طرف جو ہمہ وجوہ مکمل ہو۔ مالتی نے ابھی مجھے راغب نہیں کیا۔ میں آپ سے کن الفاظ میں کہوں کہ عورت میری نگاہوں میں کیا ہے۔ دنیا میں جو کچھ خوبصورت ہے اُسی کے مجسمہ کو میں عورت کہتا ہوں۔ میں اُس سے اُمید رکھتا ہوں کہ میں اُسے مار بھی ڈالوں تو اس کے دل میں بدی کا خیال تک نہ آئے۔ اگر میں اُس کی آنکھوں کے سامنے کسی عورت کو پیار کروں تو بھی وہ حسد نہ کرے۔ ایسی عورت پا کر میں اُس کے قدموں پر گر پڑوں گا اور اُس پر اپنے آپ کو نچھاور کر دوں گا۔"

مرزا نے سر ہلا کر کہا "ایسی عورت آپ کو اس دنیا میں تو شاید ہی ملے!"

کھنّا نے ہاتھ مار کر کہا "وہ ایک نہیں ہزاروں! ورنہ دنیا ویران ہو جاتی"۔

"ایسی ایک ہی مثال دیجئے"۔

"مسٹر کھنّا ہی کو لیجئے"۔

"لیکن کھنّا!"

"کھنّا بدنصیب ہیں جو ہیرا پاکر اُسے کانچ سمجھ رہے ہیں۔ سوچئے کتنا ایثار ہے اور اُسکے ساتھ ہی کتنی محبت ہے۔ کھنّا کے صورت پرست دل میں شاید اُس کیلئے ذرا بھی جگہ نہیں ہے مگر آج کھنّا پر کوئی آفت آجائے تو وہ خود کو اُن پہ قربان کر دے گی۔ کھنّا آج اندھے یا کوڑھی ہو جائیں تو بھی اس کی وفاداری میں فرق نہ آئیگا۔ ابھی کھنّا اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں مگر آپ دیکھیں گے کہ ایک دن وہ اس کے پیر دھو دھو کر پئیں گے۔ میں ایسی بیوی نہیں چاہتا جس سے میں پروفیسر آئنسٹائن کے اصولوں پر بحث کر سکوں یا جو میری کتابوں کے پروف دیکھا کرے میں ایسی عورت چاہتا ہوں جو میری زندگی کو پاکیزہ اور روشن بنا دے اپنی محبت اور قربانی سے"۔

خورشید نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے کوئی بھولی بات یاد کر کے کہا "آپ کا خیال بہت درست ہے مسٹر مہتا۔ ایسی عورت کہیں مل جائے تو میں بھی شادی کر لوں۔ مگر اُمید نہیں ہے کہ مجھے ملے"۔

مہتا نے ہنس کر کہا "آپ بھی کھوج میں رہئے اور میں بھی ہوں۔ شاید قسمت جاگ اُٹھے"۔

"مگر مس مالتی آپ کو چھوڑنے والی نہیں۔ کہئے لکھ دوں"۔

"ایسی عورتوں سے صرف میں دل بہلاؤ کر سکتا ہوں، بیاہ نہیں۔ بیاہ تو خود اور سراپا نذر کر دینا ہے"۔

"اگر بیاہ یہی ہے تو محبت کیا ہے؟"

"محبت جب اُسی نذر کی صورت پکڑ لیتی ہے۔ جب ہی بیاہ ہے اور اُس کے قبل عیاشی ہے۔"

متا نے کپڑے پہنے اور رخصت ہو گئے۔ شام ہو گئی تھی۔ مرزا نے جا کر دیکھا تو گوبر ابھی تک پیڑوں کو سینچ رہا تھا۔ مرزا نے خوش ہو کر کہا "جاؤ اب تمہاری چھٹی ہے۔ کل پھر آؤ گے؟"

گوبر نے عاجزی سے کہا "میں کہیں نوکری کرنا چاہتا ہوں مالک!"

"نوکری کرنا ہے تو ہم تجھے رکھ لیں گے۔"

"کتنا ملے گا مالک؟"

"جتنا تو مانگے۔"

"میں کیا مانگوں، آپ جو چاہیں دے دیں۔"

"ہم تمہیں پندرہ روپے دیں گے اور خوب کس کر کام لیں گے۔"

گوبر محنت سے نہیں ڈرتا۔ اُسے روپے ملیں تو آٹھوں پہر کام کرنے کو تیار ہے۔ پندرہ روپے ملیں تو کیا پوچھنا وہ تو جان بھی دے دیگا۔ بولا "میرے لئے ایک کوٹھری مل جائے تو یہیں پڑا رہوں گا۔"

"ہاں ہاں، جگہ کا انتظام میں کر دوں گا۔ اسی جھونپڑی میں ایک طرف تم بھی پڑے رہنا۔"

گوبر کو جیسے بیکنٹھ مل گیا۔

(۱۴)

ہوری کی پوری فصل تجربانے کی نذر ہو چکی ہے۔ بیساکھ تو کسی طرح کٹ گیا مگر جیٹھ لگتے لگتے گھر میں غلے کا ایک دانہ نہ رہا۔ پانچ پانچ آدمی کھانے والے اور گھر میں غلہ

ندارد۔ دونوں وقت نہ ملے تو ایک وقت تو ملنا ہی چاہیئے۔ پیٹ بھر نہ ملے تو آدھا پیٹ سہی۔ فاقے سے کوئی کتنے دن رہ سکتا ہے۔ اُدھار لے تو کس سے؟ گاؤں کے سبھی چھوٹے بڑے مہاجنوں سے تو مُنھ چُرانا پڑتا تھا۔ مزدوری بھی کرے تو کس کی؟ جیٹھ میں تو اپنا ہی کام ڈھیروں تھا۔ ایکھ میں پانی لگا ہوا تھا مگر خالی پیٹ محنت بھی کیسے ہو۔

شام ہو گئی تھی۔ چھوٹا بچہ رو رہا تھا۔ ماں کو کھانا نہ ملے تو دودھ کہاں سے ہو؟ سونا یہ سب بات سمجھتی تھی مگر روپا کیا سمجھے؟ بار بار روٹی روٹی چلّا رہی تھی۔ دن بھر تو کچّی امیوں سے جی بہلایا مگر اب تو کوئی ٹھوس چیز چاہیئے۔ ہوری دُلاری سہُوانی سے اناج اُدھار مانگنے گیا تھا مگر وہ دُکان بند کرکے بازار چلی گئی تھی۔ منگرو شاہ نے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ ڈانٹ بھی بتائی۔ "اُدھار مانگنے چلے ہیں۔ تین سال سے دھیلا بیاج نہیں دیا۔ اُس پہ اُدھار دیئے جاؤ۔ اب دوسرے جنم میں دیں گے! کھوٹی نیت ہو جاتی ہے تو یہی حال ہوتا ہے۔ بھگوان سے بھی یہ کھوٹائی نہیں دیکھی جاتی۔ کارندے کی ڈانٹ پڑی تو کیسے چُپکے سے روپئے اُگل دیئے۔ میرا روپیہ تو روپیہ ہی نہیں ہے۔ اور گھر والی ہے تو اُس کا مجاج ہی نہیں ملتا۔"

وہاں سے آبدیدہ ہو کر لوٹا اور اُداس بیٹھا ہوا تھا کہ پُنیا آگ لینے آئی۔ رسوئی کے وقت دروازے پر جاکر دیکھا تو اندھیرا پڑا ہوا تھا۔ بولی "آج روٹی نہیں بنا رہی ہو کیا بھابی جی؟ اب تو بیرا ہو گئی ہے۔"

جب سے گوبر بھاگا تھا، پنیا اور دھنیا میں بول چال ہو گئی تھی۔ پنیا ہوری کا احسان بھی ماننے لگی تھی۔ ہیرا کو اب وہ گالیاں دیتی تھی۔ "ہتیارا گئو ہتیا کرکے بھاگا۔ مُنھ میں کالکھ لگی ہے، گھر کیسے آوے؟ اور آوے بھی تو گھر میں پاؤں نہ رکھنے دوں گی۔ گئو ہتیا کرتے اُسے لاج بھی نہ آئی۔ بہت اچھا ہوتا کہ پولس باندھ کر لے جاتی اور چکّی پسواتی۔"

دُھنیا کوئی حیلہ نہ کر سکی بولی۔ "روٹی کہاں سے بنے گھر میں دانہ تو ہے ہی نہیں۔ تیرے مہتو نے برادری کا پیٹ بھر دیا، بال بچے مریں یا جئیں۔ اب برادری جھانکتی تک نہیں۔"

پُنیا کی فصل اچھی ہوئی تھی اور وہ مانتی تھی کہ یہ ہوری کی بدولت ہے۔ ہیرا کے ہاتھوں کبھی اتنی برکت نہ ہوتی تھی بولی "اناج میرے گھر سے کیوں نہیں منگوا لیا۔ وہ بھی تو مہتو کی کمائی ہے کہ کسی اور کی؟ سُکھ کے دن آویں تو لڑ لینا، دُکھ تو ساتھ رونے ہی سے کٹتا ہے۔ میں کیا ایسی اندھی ہوں کہ آدمی کا دل نہیں پہچانتی؟ مہتو نے نہ سنبھالا ہوتا تو آج مجھے کہاں ٹھکانا تھا؟" وہ اُلٹے پاؤں لوٹی اور سونا کو بھی ساتھ لیتی گئی۔ ایک لمحے میں دو بڑے ٹوکرے اناج سے بھرے ہوئے لا کر آنگن میں رکھ دیئے۔ دو من سے کم جو نہ تھا۔ دُھنیا ابھی کچھ کہنے نہ پائی تھی کہ وہ پھر چل دی اور لمحہ بھر میں ایک بڑی سی ٹوکری ارہر کی دال سے بھری ہوئی لا کر رکھ دی اور بولی "چلو میں چولھا جلائے دیتی ہوں۔"

دُھنیا نے دیکھا تو ٹوکرے کے اوپر ایک چھوٹی سی ڈلیا میں چار پانچ سیر آٹا بھی تھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ وہ مغلوب ہوئی! آنکھوں میں محبت اور شکریئے کے آنسو بھر کر بولی "سب کا سب اُٹھا لائی کہ گھر میں بھی کچھ چھوڑا؟ کہیں بھاگا جاتا تھا؟"

آنگن میں بچہ کھٹولے پر پڑا رو رہا تھا۔ پُنیا اُسے گود میں لے کر دُلارتی ہوئی بولی "تمہاری دعا سے ابھی بہت ہے۔ بھابی جی! پندرہ من تو جو ہوا ہے۔ دس من گیہوں اور پانچ من مٹر۔ کیا چھپانا ہے۔ دونوں گھروں کا کام چل جائیگا۔ دو مہینے میں پھر مکا ہو جائے گی۔ آگے بھگوان مالک ہیں۔"

جھنیا نے آکر آنچل سے چھوٹی ساس کے چرن چھوئے۔ پُنیا نے اسیس دی۔

سونا آگ جلانے چلی اور روپا نے پانی کیلئے گھڑا اُٹھایا۔ رُکی ہوئی گاڑی چل پڑی۔ پانی میں رُکاوٹ کے سبب جو بھنور تھا، جھاگ تھا، شور تھا، بہاؤ کی تیزی تھی وہ رُکاوٹ ہٹ جانے سے آہستہ آہستہ بیٹھ گیا اور اُس کے ساتھ برابر ہو کر بہہ چلا!

پنیا بولی "مہتو کو ڈانڑ دینے کی ایسی جلدی کیا پڑی تھی؟"

دھنیا نے کہا "برادری میں آ جاتے کیسے ہوتے؟"

"بہا بھی! بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"کہہ بُرا کیوں مانوں گی؟"

"نہ کہوں گی، کہیں تم بگڑنے لگو؟"

"کہتی ہوں کہ کچھ نہ بولوں گی، کہہ تو؟"

"تمہیں جھنیا کو گھر میں نہ رکھنا چاہئے تھا!"

"تب کیا کرتی؟ وہ ڈوب مرتی تھی!"

"میرے گھر میں رکھ دیتیں، تب تو کوئی کچھ نہ کہتا!"

"یہ تو تو آج کہتی ہے۔ اُس دن بھیج دیتی تو جھاڑو لے کر دوڑتی!"

"اتنے خرچ میں تو گوبر کا بیاہ ہو جاتا!"

"ہونہار کو کون ٹال سکتا ہے؟ پگلی! ابھی اتنے ہی سے گلا نہیں چھوٹا۔ بھولا اب اپنی گائے کے دام مانگ رہا ہے۔ تب تو گائے دی تھی کہ میری سگائی کہیں کرا دو۔ اب کہتا ہے کہ مجھے سگائی نہیں کرنی۔ میرے روپے دے دو۔ اُس کے دونوں بیٹے لاٹھی لئے گھومتے ہیں۔ ہمارے کون بیٹھا ہے جو اُن سے لڑے؟ اِس ستیاناسی گائے نے تو آ کر گھر ہی چوپٹ کر دیا!"

کچھ اور باتیں کر کے پنیا آگ لے کر چلی گئی۔ ہوری سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اندر آ کر بولا "پنیا دل کی صاف ہے!"

"پھر ابھی تو دل کا سا پھٹا ہے؟"

دھنیا نے اندازہ تو رکھ لیا تھا مگر دل میں نادم ہو رہی تھی۔ نیم دلوں کا پھیرا ہے آج اُسے یوں نیچا دیکھنا پڑا۔

"تو کسی کا اُپکار نہیں مانتی، یہی تجھ میں بُرائی ہے!"

"اُپکار کیوں نہ مانوں؟ میرا آدمی اُس کی گرہستی کے پیچھے جان نہیں دے رہا ہے؟ پھر میں نے دان تھوڑے ہی لیا ہے۔ ایک ایک دانہ بھر دوں گی!"

مگر پانیا اپنی جٹھانی کے خیال اتنا سمجھ کر بھی ہوری کے احسان کا بدلہ چکاتی جاتی تھی۔ جب یہاں اناج ختم ہو جاتا تو من دو من دے جاتی۔ مگر جب چوماسہ آگیا اور برکھا نہ ہوئی تو مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا۔ ساون کا مہینہ آگیا تھا اور چاروں طرف بگولے اُٹھ رہے تھے۔ کنوؤں کا پانی بھی سوکھ گیا تھا اور اکھ دھوپ سے جلی جاتی تھی۔ ندی میں تھوڑا تھوڑا پانی ملتا تھا مگر اس کے لئے آئے دن لاٹھیاں نکلتی رہتی تھیں، یہاں تک کہ ندی نے بھی جواب دیدیا۔ جگہ جگہ چوریاں ہونے لگیں اور ڈاکے پڑنے لگے۔ علاقے بھر میں کہرام مچ گیا۔ آخر خیریت ہوئی کہ بھادوں میں پانی برس پڑا اور کسانوں کے دل ہرے ہو گئے۔ کتنی خوشی تھی اُس دن! پیاسی زمین گویا آسودہ ہی نہ ہوتی تھی اور پیاسے کسان اس طرح اُچھل رہے تھے گویا پانی نہیں اشرفیاں برس رہی ہیں! سمیٹ لو جتنا سمیٹتے بنے! کھیتوں میں جہاں بگولے اُٹھتے تھے وہاں ہل چلنے لگے۔ لڑکے گھروں سے نکل نکل کر تالابوں اور گڑھیوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ اوہو! تالاب تو آدھا بھر گیا! اور وہاں سے گڑھیا کی طرف دوڑے۔

مگر اب کتنا ہی پانی برسے اکھ تو ختم ہو گئی۔ ہاتھ ہاتھ بھر کی ہو جائے گی۔ مکا، جوار اور کودوں سے لگان تھوڑے ہی چکے گا؟ مہاجن کا پیٹ تھوڑے ہی بھرا

جائے گا؟ ہاں مویشیوں کے لئے چارہ ہو گیا۔ اور آدمی جی گیا۔

جب ماگھ گذر گیا اور بھولا کے روپے نہ ملے تو ایک روز وہ جھلّایا ہوا ہوری کے گھر آدھمکا اور بولا "یہی ہے تمہارا وعدہ؟ اسی منہ سے تم نے او کھ بیل کر میرے روپے دینے کا بچن دیا تھا؟ اب تو او کھ بیل چکے، لاؤ روپے میرے ہاتھ میں"۔

ہوری جب اپنی بپتا سنا کر اور منت و سماجت کر کے ہار گیا اور بھولا دروازے سے نہ ہٹا تو اُس نے جھنجلا کر کہا "تو مہتو ابھی تو میرے پاس روپے نہیں ہیں اور نہ مجھے کہیں اُدھار مل سکتے ہیں۔ میں کہاں سے لاؤں؟ دانے دانے کی تنگی ہو رہی ہے بسواس نہ ہو تو گھر میں جا کر دیکھ لو۔ جو کچھ ملے اُٹھا لے جاؤ"۔

بھولا نے بے مروّتی سے کہا "میں تمہارے گھر میں کیوں تلاشی لینے جاؤں؟ اور نہ مجھے اس سے واسطہ ہے کہ تمہارے پاس روپے ہیں کہ نہیں۔ تم نے او کھ بیل کر روپے دینے کہا تھا اور او کھ بیل چکے تو اب میرے روپے میرے حوالے کرو"۔

"تو پھر جو کہو وہ کروں"۔

"میں کیا کہوں؟"

"میں تم ہی پر چھوڑتا ہوں"۔

"میں تمہارے دونوں بیل کھول لے جاؤں گا"۔

ہوری نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا گویا اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ پھر سر جُھکا کر رہ گیا۔ بھولا کیا اُسے بھکاری بنا کر چھوڑ دینا چاہتا ہے؟ دونوں بیل چلے گئے تب تو اُس کے دونوں ہاتھ ہی کٹ جائیں گے۔ عاجزی سے بولا "دونوں بیل لے لوگے تو میرا تو سب سُوانا ہو جائے گا۔ اگر تمہارا دھرم یہی کہتا ہے تو کھول لے جاؤ"۔

تمہارے بنے بگڑنے کی مجھے پرواہ نہیں ہے۔ مجھے تو اپنے روپے چاہئیں"۔

"اور جو میں کہہ دوں کہ میں نے روپے دے دیئے ہیں؟"

بھولا سناٹے میں آگیا۔ اُسے بھی اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہوا۔ ہوری اتنی بڑی بے ایمانی کر سکتا ہے، یہ ممکن نہیں۔ تیز ہو کر بولا "اگر تم ہاتھ میں گنگا جلی لے کر کہہ دو کہ میں نے روپیہ دے دیا تو صبر کر لوں گا۔"

"کہنے کا من تو چاہتا ہے، مرنا گیا نہ کرنا، پر کہوں گا نہیں۔"

"تم کہہ ہی نہیں سکتے۔"

"ہاں بھیّا میں نہیں کہہ سکتا۔ ہنسی کر رہا تھا۔"

ایک لمحے تک وہ دبدبے میں پڑا رہا۔ پھر بولا "تم مجھ سے اتنا بیر کیوں پال رہے ہو، بھولا بھائی؟ جھنیا میرے گھر میں آگئی تو مجھے کون سا بیکنٹھ مل گیا؟ لڑکا ہاتھ سے گیا، دو سو روپیہ ڈانڈ الگ بھرنا پڑا۔ میں تو کہیں کا نہ رہا۔ اور اب تم بھی میری جڑ کھود رہے ہو۔ رام جانتے ہیں، میں بالکل نہ جانتا تھا کہ لونڈا کیا کر رہا ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ گانا سننے جاتا ہوگا۔ مجھے تو اُس دن پتہ چلا جب آدھی رات کو جھنیا گھر میں آگئی۔ اُس بکھت میں گھر میں نہ رکھتا تو سوچو کہاں جاتی کس کی ہو کر رہتی۔"

جھنیا بروٹھے کے دروازے پر چھپ کر کھڑی ہوئی یہ باتیں سن رہی تھی۔ باپ کو اب وہ باپ نہیں بیری سمجھتی تھی۔ ڈری کہ کہیں ہوری بیلوں کو دے نہ دیں۔ جاکر روپیا سے بولی "امّاں کو جلدی بلا لا، کہنا کہ بڑا کام ہے دیر نہ کرو۔"

دھنیا کھیت میں گوبر پھینکنے گئی تھی۔ بہو کا سندیسہ سنا تو آکر بولی "کاہے کو بلایا ہے۔ بہو میں تو گھبرا گئی۔"

"کاکا کو تم نے دیکھا ہے نا؟"

"ہاں دیکھا ہے، کسائی کی طرح باہر بیٹھا ہوا ہے۔ میں تو بولی ہی نہیں۔"

"ہمارے دونوں بیل مانگ رہے ہیں داداجی سے۔"

دھنیا کے پیٹ کی آنتیں اندر سمٹ گئیں بولی۔ "دونوں بیل مانگ رہے ہیں!"

"ہاں کہتے ہیں کہ یا تو ہمارا روپیہ دو یا دونوں بیل کھول لے جائیں گے۔"

"تیرے دادا نے کیا کہا؟"

"انہوں نے کہا کہ تمہارا دھرم کہتا ہو تو کھول لے جاؤ۔"

"تو کھول لے جائے، پر اسی دوار سے پر آ کر بھیک نہ مانگیں تو میرے نام پہ تھوک دینا۔ ہمارے لہو سے اسکی چھاتی ٹھنڈی ہوتی ہو تو ٹھنڈی کر لے۔"

وہ اسی طیش میں باہر آکر ہوری سے بولی۔ "جب تو دونوں بیل مانگ رہے ہیں تو دے کیوں نہیں دیتے؟ انکا پیٹ بھرے ہمارے رام مالک ہیں۔ ہمارے ہاتھ تو نہیں کاٹ لیں گے؟ اب تک اپنی مجوری کرتے تھے اب دوسرے کی مجوری کریں گے۔ بھگوان کی مرجی ہوگی تو پھر بیل بدھیا ہو جائیں گے۔ اور مجوری ہی کرتے رہے تو کون برائی ہے؟ سوکھا پالا آجر لگان کا بوجھ تو نہ رہیگا۔ میں نہ جانتی تھی کہ یہ ہمارے بیری ہیں نہیں تو گائے لیکر اپنے سر پر بلا کیوں باندھتی۔ اس نگوڑی کا پیرا جس دن سے آیا گھر تہس نہس ہو گیا۔"

بھولا نے اب تک جس ہتھیار کو چھپا رکھا تھا اب اسے نکالنے کا وقت آگیا اسے یقین ہو گیا کہ بیلوں کے سوا ان سب کے پاس اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ بیلوں کو بچانے کیلئے یہ لوگ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائینگے۔ اچھے نشانے باز کی طرح دل کو ٹھہرا کر بولا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ ہماری بے عزتی ہو اور تم چین سے بیٹھو تو یہ نہ ہوگا۔ تم اپنے سو دو سو کو روتے ہو اور یہاں لاکھ روپے کی آبرو بگڑ گئی۔ تمہاری کُشل اسی میں ہے کہ جیسے جھنیا کو گھر میں رکھا تھا ویسے ہی اسے گھر سے نکال دو۔" پھر نہ تو ہم بیل مانگیں گے اور نہ گائے کے دام لیں گے۔ اس نے ہماری ناک کٹوائی ہے تو

میں بھی اُسے ٹھوکریں کھاتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہاں رانی بنی بیٹھی رہے اور ہم مُنہ میں کالکھ پوتے اُس کے نام کو روتے رہیں۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتا۔ وہ میری بیٹی ہے۔ اپنے اُسے گود میں کھلایا ہے اور بھگوان ساکھی ہیں کہ میں نے اُسے کبھی بیٹوں سے کم نہیں سمجھا۔ پر آج اُسے بھیک مانگتے اور گھورے پر دانے چُنتے دیکھ کر میری چھاتی ٹھنڈی ہو جائے گی۔ جب باپ ہو کر میں نے اپنا دل اتنا کٹھور بنا لیا ہے تب سوچو کہ میرے دل پر کتنی بڑی چوٹ پڑی ہوگی؟ اس مُنہ جلی نے سات پیڑھی کا نام ڈبا دیا اور تم اُسے گھر میں رکھے ہوئے ہو۔ یہ میری چھاتی پر مونگ دَلنا نہیں تو اور کیا ہے؟"

دھنیا نے جیسے پتھر کی لکیر کھینچتے ہوئے کہا "تو مہتو میری بھی سُن! جو بات تم چاہتے ہو وہ نہ ہوگی، سو جنم نہ ہوگی۔ جھنیا ہماری جان کے ساتھ ہے۔ تم بیل ہی لیے جانے کہتے ہو سو لے جاؤ۔ اگر اس سے تمہاری کٹی ہوئی ناک جُڑتی ہو تو جوڑ لو اور پُرکھوں کی آبرو بچتی ہو تو بچا لو۔ جھنیا سے بُرائی ضرور ہوئی۔ جس دن اُس نے میرے گھر میں پاؤں رکھا میں جھاڑو لے کر مارنے اُٹھی تھی۔ مگر جب اُس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو گرنے لگے تو مجھے اُس پر ترس آ گیا۔ تم اب بوڑھے ہو گئے ہو مہتو، پر آج بھی تمہیں بیاہ کی دُھن سوار ہے، پھر وہ تو ابھی بچہ ہے۔"

بھولا نے اپیل بھری آنکھوں سے ہوری کو دیکھا۔ سُنتے ہو ہوری اس کی باتیں! اب میرا دوش نہیں، میں بنا بیل لئے نہ جاؤں گا۔"

ہوری نے استقلال سے کہا "لے جاؤ۔"

"پھر رونا مت کہ میرے بیل کھول لے گئے۔"

"نہیں روؤں گا۔"

بھولا بیلوں کی رسیاں کھول ہی رہا تھا کہ جھنیا پیوند دار ساڑی پہنے اور بچے کو گود میں لئے نکل کر باہر آ گئی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ کاکا لو میں اس گھر سے نکلی

جاتی ہوں اور جیسا تم چاہتے ہو اُسی طرح بھیک مانگ کر اپنا اور بچے کا پیٹ پالوں گی اور جب بھیک بھی نہ ملے تو کہیں ڈوب مروں گی۔"

بھولا کھسیا کر بولا "دور ہو میرے سامنے سے! بھگوان نہ کرے کہ مجھے تیرا مُنھ دیکھنا پڑے، کلمُنہی، کلنکنی کہیں کی! اب تیرے لئے ڈوب ہی مرنا ٹھیک ہے۔"

جھنیا نے اُس کی طرف تاکا بھی نہیں۔ اُس میں وہ غصہ تھا جو خود کو نگل جانا چاہتا ہے جس میں ہنسا نہیں، بلدان ہے۔ دھرتی اُس وقت مُنھ کھول کر اُسے نگل لیتی تو وہ اپنے آپ کو کتنا دھنیہ مانتی۔ اُس نے آگے قدم بڑھایا۔

مگر وہ دو قدم بھی نہ گئی تھی کہ دھنیا نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا اور تسنخنی بھری محبت سے بولی "تو کہاں جاتی ہے بہو؟ چل گھر میں! یہ تیرا گھر ہے ہمارے جیتے جی اور ہمارے مرنے پر بھی۔ ڈوب مرے وہ جسے اپنی اولاد سے بیر ہو! اس بھلے آدمی کو مُنھ سے ایسی بات نکالتے لاج بھی نہیں آتی۔ مجھ پر دھونس جماتا ہے۔ نیچ! لے جا بیلوں کا کھون پی ......"

جھنیا روتی ہوئی بولی "اماں جب اپنا باپ ہو کے مجھے دھتکار رہا ہے تو مجھے ڈوب ہی مرنے دو۔ مجھ ابھاگنی کے کارن تو تمہیں دکھ ہی ملا۔ جب سے آئی، تمہارا گھر مٹی میں مل گیا۔ تم نے اتنے دن مجھے جس پریم سے رکھا ماں بھی نہ رکھتی، بھگوان مجھے پھر جنم دیں تو تمہاری کوکھ سے دیں۔ یہی میری اچھا ہے۔"

دھنیا اُسے اپنی طرف کھینچتی ہوئی بولی "وہ تیرا باپ نہیں ہے۔ تیرا بیری ہے ہتیارا۔ ماں ہوتی تو اُسے در دہوتا۔ کر سگائی، ٹھہر یا جوتوں سے نہ پیٹتے تو پھر کہنا!"

جھنیا ساس کے پیچھے پیچھے گھر میں چلی گئی۔ اُدھر بھولا نے جا کر دونوں بیلوں کو کھونٹوں سے کھولا اور ہانکتا ہوا گھر چلا جیسے کسی نیوتے میں آکر پوریوں کے عوض

جوتے پڑے ہوں۔" اب کہو کھیتی اور بجاؤ بنسی۔ میری بے اِجّتی کرنا چاہتے ہیں سب، جانے کب کی عداوت نکال رہے ہیں۔ نہیں تو ایسی لڑکی کو کون بھلا آدمی اپنے گھر میں رکھے گا؟ سب کے سب بے سرم ہو گئے ہیں۔ لونڈے کا کہیں بیاہ نہ ہوتا تھا اسی سے۔ اور اس رانڈ جھنیا کی ڈھٹائی دیکھو کہ آ کر میرے آگے کھڑی ہو گئی۔ دوسری لڑکی ہوتی تو مُنھ نہ دکھاتی۔ آنکھ کا پانی مر گیا ہے۔ سب کے سب دُشٹ اور مورکھ ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ جھنیا اب ہماری ہو گئی۔ یہ نہیں جانتے کہ جو اپنے باپ کے گھر نہ رہی وہ کسی کے گھر نہ رہے گی۔ بکھت بُرا ہے نہیں تو بیچ بجار میں اس چُڑیل دھنیا کے جھونٹے پکڑ کر گھسیٹتا۔ مجھے کتنی گالیاں دیتی ہیں۔"

پھر اُس نے دونوں بیلوں کو دیکھا۔ کتنے تیار ہیں۔ "اچھی جوڑی ہے جہاں چاہو سو روپئے میں بیچ سکتا ہوں۔ میرے اسّی روپئے کھرے ہو جائیں گے۔" ابھی وہ گاؤں کے باہر بھی نہ نکلا تھا کہ پیچھے سے داتا دین، پٹیشوری، سوبھا اور دس بیس آدمی اور دوڑے آتے دِکھائی دیئے۔ بھولا کا لہو سرد ہو گیا۔ "اب فوجداری ہو گئی۔ بیل بھی چھن جائیں گے، مار بھی پڑے گی۔ وہ رُک گیا کمر کس کر۔ مرنا ہے تو لڑ کر مرے گا۔"

داتا دین نے پاس جا کر کہا۔ "یہ تم نے کیا اندھیر کیا بھولا؟ ایں! اُس کے بیل کھول لائے اور وہ کچھ بولا نہیں اسی سے تم سیر ہو گئے۔ سب لوگ اپنے اپنے کام میں لگے تھے کسی کو کھبر بھی نہ ہوئی۔ ہوری نے تنک سا اشارہ کیا ہوتا تو تمہارا ایک ایک بال بِن جاتا۔ بھلا چاہتے ہو تو لے چلو بیل! کچھ بھی بھلمنسی نہیں ہے تم میں۔"

پٹیشوری بولے۔ "یہ اُس کے سیدھے پن کا پھل ہے۔ تمہارے روپئے اُس پر آتے ہیں تو جا کر دیوانی میں دعویٰ کرو اور ڈگری کراؤ۔ بیل کھول لانے کا تمہیں کیا اِکھتیار ہے؟ ابھی پھوجداری میں دعویٰ کر دے تو بندھے بندھے پھرو۔"

بھولا نے دب کر کہا۔ "تو لالہ صاحب ہم کچھ جبردستی تھوڑے ہی کھول لائے

ہوری نے آپ دیئے!"

پٹیشوری نے سوبھا سے کہا۔ "تم بیلوں کو لوٹا دو سوبھا کسان اپنے بیل خوشی سے دے دے گا تو بیل ہیں کون کو جتے گا؟"

بھولا بیلوں کے سامنے کھڑا ہو گیا "ہمارے روپئے دلوا دو ہمیں بیلوں کو لے کر کیا کرنا ہے؟"

"ہم بیل لئے جاتے ہیں۔ اپنے روپئے کے لئے دعویٰ کرو اور نہیں تو مار کر گرا دیئے جاؤ گے۔ روپئے دیئے تھے تم نے؟ ایک منحوس گائے بیچارے کے سر منڈھ دی اور اب اُس کے بیل کھولے لئے جاتے ہو!"

بھولا بیلوں کے سامنے سے نہ ہٹا۔ کھڑا رہا گم صُم اور مضبوطی سے جما ہُوا، جیسے مر کر ہی ہٹے گا۔ پٹواری سے محبّت کرکے وہ کیسے پیش پاتا؟

داتا دین نے ایک قدم آگے بڑھ کر اپنی جھکی کمر کو سیدھا کرکے للکارا "تم سب کھڑے تاکتے کیا ہو؟ مار کے بھگا دو اِس کو ہمارے گاؤں سے بیل کھولے جائیگا؟"

بنسی طاقتور جوان تھا۔ اُس نے بھولا کو زور سے دھکّا دیا۔ بھولا سنبھل نہ سکا، گر پڑا۔ اُٹھنا چاہتا تھا کہ بنسی نے پھر ایک گھونسہ جمایا۔

ہوری دوڑتا ہُوا آ رہا تھا۔ بھولا نے اُس کی طرف دس قدم بڑھ کر پوچھا "ایمان سے کہنا ہوری مہتو! میں نے بیل جبردستی کھول لئے ہیں؟"

داتا دین نے اُس کا مطلب یوں نکالا "یہ کہتے ہیں کہ ہوری نے اپنی خوشی سے بیل مجھے دیئے۔ ہمیں اُلّو بناتے ہیں!"

ہوری نے لجاتے ہوئے کہا۔ "یہ مجھ سے کہنے لگے کہ یا تو جھنیا کو گھر سے نکال دو۔ یا میرے روپئے دے دو، نہیں بیل کھول لے جاؤں گا۔ میں نے کہا میں بہو کو تو نہ نکالوں گا اور نہ میرے پاس روپئے ہیں مگر تمہارا دھرم کہے تو بیل کھول لو بیٹیانی کے

دھرم پہ چھوڑ دیا اور انہوں نے بیل کھول لیے"!
"ٹھیک شوری نے اداس ہو کر کہا "جب تم نے دھرم پہ چھوڑ دیا تب کا ہے کی جبر دستی ؟ اسکے دھرم نے کہا تو لئے جاتا ہے ۔ لے جاؤ بھیا بیل تمہارے ہیں"
داتا دین نے ناٹک کی "ہاں جب دھرم کی بات آگئی تو کوئی کیا کہے ؟"
سب کے سب ہوری کو حقارت سے دیکھتے ہوئے بار کو لوٹ پڑے اور فتحمند بھولا شان سے گردن اٹھائے ہوئے بیلوں کو لے چلا۔

(۱۵)

مالتی ظاہر میں تتلی ہے مگر باطن میں شہد کی مکھی اسکی زندگی میں ہنسی ہی ہنسی نہیں ہے ۔ صرف گڑ کھا کر کون جی سکتا ہے ؟ اور جیئے بھی تو وہ کوئی سکھ کی زندگی نہ ہوگی۔ وہ ہنستی ہے اسلئے کہ اسکی بھی قیمت ملتی ہے ۔ اِسکا چہکنا اور چمکنا اسلئے نہیں ہے کہ وہ چہکنے اور چمکنے ہی کو زندگی سمجھتی ہے یا اسنے اپنے آپ کو اپنی آنکھوں میں اتنا ٹھا بنا لیا ہے کہ جو کچھ کرے اپنے ہی لئے کرے ۔ نہیں ، وہ اسلئے چہکتی ہے اور مذاق کرتی ہے کہ اس سے اسکے فرض کا بار کسی قدر ہلکا ہو جاتا ہے ۔ اسکے باپ ان عجیب آدمیوں میں تھے جو صرف زبان کی مدد سے لاکھوں کے وارے نیارے کرتے تھے ۔ بڑے بڑے زمینداروں اور رئیسوں کی جائدادیں فروخت کرانا ، انہیں قرض دلانا یا انکے معاملوں کو افسروں سے مل کر طے کرا دینا یہی انکا کاروبار تھا ۔ دوسرے لفظوں میں وہ دلال تھے ۔ اس طبقے کے لوگ بڑے طباع ہوتے ہیں جس کام سے کچھ ملنے کی امید ہو اسے اٹھا لیں گے اور کسی نہ کسی طرح اسے پورا بھی کر دیں گے کسی راجہ کی شادی کسی راجکماری سے طے کرا دی اور دس بیس ہزار مار لئے ۔ یہی دلال جب چھوٹے چھوٹے سودے کرتے ہیں تو "ٹاؤٹ" کہے جاتے ہیں اور ہم ان سے نفرت کرتے ہیں ۔ بڑے بڑے کام

کرکے وہی ماؤنٹ راجاؤں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے اور گورنروں کی میز پر چائے پیتا ہے مسٹر کول ان ہی خوش نصیبوں میں تھے۔ ان کے تین لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ انکا ارادہ تھا کہ تینوں کو انگلستان بھیج کر تعلیم کی چوٹی تک پہنچا دیں۔ اور بہت سے بڑے آدمیوں کیطرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ وہاں تعلیم پاکر آدمی کچھ اور ہو جاتا ہے۔ شاید وہاں کی آب و ہوا میں ذہن کو تیز کر دینے کی کوئی طاقت ہے۔ مگر اُن کی یہ خواہش ایک تہائی سے زیادہ پوری نہ ہوئی۔ مالتی انگلستان ہی میں تھی کہ اُن پر فالج گرا، اور انہیں نکما بنا گیا۔ اب بڑی مشکل سے دو آدمیوں کے سہارے اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ زبان تو بالکل بند ہی ہوگئی تھی، اور جب زبان ہی بند ہوگئی تو آمدنی بھی بند ہوگئی۔ جو کچھ تھی زبان ہی کی کمائی تھی۔ کچھ بچا رکھنے کی عادت نہ تھی۔ غیر مقررہ آمدنی تھی اور ویسا ہی خرچ تھا، پس ادھر کئی سال سے تنگحال ہو رہے تھے، کل ذمہ داری مالتی پر آپڑی تھی۔ مالتی کے چار پانچ سو روپیوں میں وہ ٹھاٹھ باٹ تو کیا نبھتا، ہاں اتنا تھا کہ لڑکیوں کی تعلیم ہوتی جاتی تھی اور بھلے مانسوں کی طرح زندگی بسر ہو رہی تھی۔ مالتی صبح سے پہر رات تک دوڑتی رہتی تھی چاہتی تھی کہ والد پرہیز سے رہیں مگر والد صاحب کو کباب و شراب کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ کسی طرح گلا نہ چھوٹتا تھا۔ کہیں سے کچھ نہ ملتا تو ایک مہاجن سے اپنے بنگلے پر نوٹ لکھ کر ہزار دو ہزار لے لیتے تھے۔ مہاجن اُن کا پرانا دوست تھا جس نے انکی بدولت لین دین میں لاکھوں پیدا کئے تھے اور مروت کی وجہ سے کچھ بولتا نہ تھا۔ اُس کے پچیس ہزار ہو چکے تھے اور جب چاہتا قرقی کرا سکتا تھا۔ مگر دوستی کی لاج نبھاتا جاتا تھا۔ خود پرستوں میں جو بے غیرتی آجاتی ہے وہ مسٹر کول میں بھی تھی۔ تقاضے ہوا کریں انہیں پروا نہ تھی۔ مالتی ان کی فضول خرچی پر جھنجلاتی رہتی تھی مگر ان کی ماں جو مجسم دیوی تھی اور اس زمانے میں بھی شوہر کی خدمت کرنا نسوانی زندگی کا مقصد سمجھتی تھی، اُسے سمجھا دیتی تھی۔ اس لئے خانہ جنگی کی نوبت نہ آتی تھی۔

شام ہوگئی۔ ہوائیں ابھی تک گرمی تھی۔ آسمان پر دھند چھایا ہوا تھا۔ مالتی اور اس کی دونوں بہنیں بنگلے کے سامنے گھاس پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ پانی نہ پانے کے سبب وہاں کی دوب جل گئی تھی اور اندر کی مٹی باہر نکل آئی تھی۔ مالتی نے پوچھا "مالی کیا بالکل پانی نہیں دیتا؟"

منجھلی بہن سروج نے کہا "پڑا پڑا سویا کرتا ہے سُوکر۔ جب کہو تو بیس بہانے بنانے لگتا ہے۔"

سروج۔ بی۔ اے میں پڑھتی تھی، دُبلی، لمبی، زرد، خشک اور تلخ مزاج۔ اُسے کسی کی کوئی بات پسند نہ آتی تھی، ہمیشہ عیب نکالتی رہتی تھی۔ ڈاکٹروں کی صلاح تھی کہ وہ کوئی محنت کا کام نہ کرے اور پہاڑ پر رہے، مگر گھر کی حالت ایسی نہ تھی کہ اُسے پہاڑ پر بھیجا جا سکتا۔

سب سے چھوٹی وردا کو سروج سے اس لئے مغائرت تھی کہ سارا گھر سروج کو ہاتھوں ہاتھ لئے رہتا تھا وہ چاہتی تھی کہ جس بیماری میں اتنا آرام ہے وہ اُسے ہی کیوں نہیں ہو جاتی؟ گوری سی مغرور تندرست اور شوخ آنکھوں والی لڑکی تھی چہرے پر فہم و فراست کی جھلک تھی۔ سروج کے سوا اُسے کل دُنیا سے ہمدردی تھی۔ سروج کی بات کی مخالفت کرنا اُس کا خاصہ تھا بولی "دن بھر دادا جی بازار بھیجتے رہتے ہیں، فرصت ہی کہاں پاتا ہے؟ مرنے کی چھٹی تو ملتی نہیں، پڑا پڑا سوئے گا؟"

سروج نے ڈانٹا "دادا جی اُسے کب بازار بھیجتے ہیں ری؟ جھوٹی کہیں کی؟"

"روز بھیجتے ہیں روز۔ ابھی تو آج ہی بھیجا تھا۔ کہو تو بُلوا کر پُچھوا دوں؟"

"پُچھوا سکے گی بُلواؤں؟"

"مالتی ڈر گئی۔ دونوں گتھ جائیں گی تو بیٹھنا مشکل کر دیں گی۔ بات بدل کر بولی۔

"اچھّا خیر، ہوگا آج ڈاکٹر مہتا کی تمہارے یہاں تقریر ہوئی تھی، سروج؟"

سروج نے ناک سکیڑ کر کہا " ہاں ہوئی تو تھی، مگر کسی نے پسند نہیں کی۔ آپ فرمانے لگے کہ دُنیا میں عورتوں کا دائرہ مردوں سے بالکل الگ ہے، اور عورتوں کا مردوں کے دائرے میں آنا اس جگ کا ایک کلنک ہے۔ سب لڑکیوں نے تالیاں اور سیٹیاں بجانی شروع کیں۔ بیچارے شرمندہ ہو کر بیٹھ رہے۔ کچھ عجیب سے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ پریم شاعروں کا تصور ہے۔ ٹھوس زندگی میں اس کا کہیں پتہ نہیں۔ لیڈی ہکّو نے ان کا خوب مضحکہ اُڑایا۔"

مالتی نے اعتراض کیا " لیڈی ہکّو نے؟ اس بارے میں وہ بھی کچھ بولنے کی ہمّت رکھتی ہیں! انھیں ڈاکٹر صاحب کا لکچر شروع سے آخر تک سُننا چاہیئے تھا۔ اُنھوں نے دل میں لڑکیوں کو کیا سمجھا ہوگا؟"

"پورا لکچر سُننے کی برداشت کسے تھی؟ وہ تو جیسے زخم پر نمک چھڑک رہے تھے۔"

"تو پھر اُنھیں بُلایا ہی کیوں تھا؟ آخر انھیں عورتوں سے کوئی بَیر تو ہے نہیں۔ جس بات کو ہم سچ سمجھتے ہیں وہی تو وہ بھی کہتے ہیں۔ عورتوں کو خوش کرنے کے لئے وہ اُن کی سی کہنے والوں میں نہیں ہیں، اور پھر ابھی یہ کون جانتا ہے کہ عورتیں جس راستے پر چلنا چاہتی ہیں وہی ٹھیک ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آگے چل کر اپنی رائے بدلنی پڑے۔"

اُس نے فرانس اور جرمنی واٹلی کی عورتوں کی زندگی کا معیار بتلایا اور کہا کہ " جلد ہی ویمنس لیگ (مجلس نسواں) کی طرف سے مہتا کا لکچر ہونے والا ہے۔"

سروج کو تعجب ہوا۔ بولی "مگر آپ بھی تو کہتی ہیں کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق مساوی ہونے چاہئیں"

"اب بھی کہتی ہوں، لیکن مخالف پارٹی والے کیا کہتے ہیں یہ بھی تو سُننا چاہئے ممکن ہے کہ ہم ہی غلطی پر ہوں" یہ لیگ اِس شہر کی نئی انجمن ہے۔ اور مالتی کی کوشش سے قائم ہوئی ہے۔ شہر کی سب ہی تعلیم یافتہ خواتین اُس میں شریک ہیں۔ مہتا کی اوّل تقریر نے عورتوں میں بڑی ہلچل مچادی تھی اور لیگ نے طے کیا تھا کہ اُنہیں خوب دنداں شکن جواب دیا جائے۔ مالتی ہی پر یہ بار ڈالا گیا تھا۔ مالتی کئی روز تک اپنی بات کی حمایت میں دلائل اور ثبوت کی تلاش کرتی رہی۔ اور بھی کئی عورتیں اپنی تقریریں لکھ رہی تھیں۔ اُس دن جب مہتا شام کو لیگ کے ہال میں پہونچے تو معلوم ہوتا تھا ہال پھٹ جائے گا۔ اُنھیں فخر ہوا کہ اُن کی تقریر سُننے کے لئے اتنا شوق! اور وہ شوق صرف چہرے پر اور آنکھوں میں نہ تھا! آج سبھی عورتیں سونا اور ریشم سے لدی ہوئی تھیں گویا کسی بارات میں آئی ہوں۔ مہتا کو مغلوب کرنے کے لئے پوری طاقت سے کام لیا گیا تھا، اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ جگمگاہٹ طاقت کا جزو نہیں ہے؟ مالتی نے تو آج کے لئے نئے فیشن کی ساڑی نکالی تھی، نئی کاٹ کے جمپر بنوائے تھے اور رنگ روغن اور پھولوں سے خوب سجی ہوئی تھی جیسے اُس کا بیاہ ہو رہا ہو۔ لیگ میں اتنی دھوم دھام اور کبھی نہ ہوئی تھی ڈاکٹر مہتا تنہا تھے، پھر بھی دیویوں کے دل کانپ رہے تھے۔ سچائی کی ایک چنگاری جھوٹ کے ایک پہاڑ کو جلا کر خاک کر سکتی ہے۔

سب سے پیچھے کی صف میں مرزا اور کھنّا اور اڈیٹر صاحب بھی موجود تھے رائے صاحب لکچر شروع ہونے کے بعد آئے اور پیچھے کھڑے ہو گئے۔

مرزا نے کہا "آ جائیے آپ بھی۔ کھڑے کب تک رہیئے گا؟"
رائے صاحب بولے "نہیں بھئی وہاں میرا دم گھٹنے لگے گا"
"تو میں کھڑا ہوتا ہوں آپ بیٹھئے"

رائے صاحب نے اُن کے کندھے دبائے "تکلف کی ضرورت نہیں، بیٹھے رہیے، میں تھک جاؤں گا تو آپ کو اُٹھا دوں گا اور میں بیٹھ جاؤں گا۔ اچھّا مس مالتی جلسے کی صدر ہوتی ہیں۔ کھنّا صاحب کچھ انعام دلوا دیئے"

کھنّا نے رونی صورت بنا کر کہا "اب مسٹر مہتا پر نگاہ ہے، میں تو گر گیا"

مہتا کی تقریر شروع ہوئی "دیویو! جب میں اس طرح آپ کو مخاطب کرتا ہوں تو آپ کو کوئی بات کھٹکتی نہیں۔ آپ اس عزت کو اپنا حق سمجھتی ہیں۔ مگر کیا آپ نے کسی عورت کو مردوں کے لئے دیوتا استعمال کرتے سُنا ہے؟ اُسے آپ دیوتا کہیں تو وہ سمجھے گا کہ آپ اُسے بنا رہی ہیں۔ آپ کے پاس دان کے لئے دیا ہے بھگتی اور تیاگ ہے۔ مرد کے پاس دان کے لئے کیا ہے؟ وہ دیوتا نہیں، لیوتا ہے وہ حقوق کے لئے ہنسا کرتا ہے، لڑتا ہے اور فتنہ فساد اُٹھاتا رہتا ہے۔" تالیاں بجیں۔ رائے صاحب نے کہا "عورتوں کو خوش کرنے کا اس نے کتنا اچھا ڈھنگ نکالا ہے"

بجلی کے اڈیٹر کو بُرا لگا "کوئی نئی بات نہیں، میں کتنی ہی بار یہی کہہ چکا ہوں"

مہتا آگے بڑھے "اس لئے جب میں دیکھتا ہوں کہ ہماری ترقی یافتہ دیویاں بھگتی اور تیاگ کی زندگی سے اُکتا کر لڑائی فساد اور ہنسا کی زندگی کی طرف دوڑ رہی ہیں اور سمجھ رہی ہیں کہ اسی میں سُکھ ہے تو میں اُنھیں مُبارکباد نہیں دے سکتا"

مسز کھنّا نے مالتی کی طرف غرور سے دیکھا۔ مالتی نے گردن جھکالی۔

خورشید بولے "اب کہئے۔ مہتا دلیر آدمی ہے۔ سچ بات کہتا ہے اور مُنہ پر"

بجلی کے اڈیٹر نے ناک سکوڑی "اب وہ دن لد گئے جب دیویاں ان چلموں

میں آجاتی ہیں۔ اُن کے حقوق ہضم کرتے جاؤ اور کہتے جاؤ کہ آپ دیوی ہیں، ماتا ہیں، لچھمی ہیں۔"

مہتا آگے بڑھے "عورت کو مرد کے بھیس میں مردانہ کاموں میں مشغول دیکھ کر مجھے اُسی طرح دُکھ ہوتا ہے جیسے مرد کو عورت کے روپ میں زنانہ کام کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے یقین ہے کہ ایسے مردوں کو آپ اپنی محبت اور عقیدت کا مستحق نہیں سمجھتیں۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسی عورتیں بھی مرد کی عقیدت و محبت کی مستحق نہیں بن سکتیں۔"

کھنّا کے چہرے پر دل کی خوشی چمک اُٹھی۔

رائے صاحب نے چٹکی لی۔ "آپ بہت خوش ہیں کھنّا جی!"

کھنّا بولے "نالتی ملے تو پوچھوں کہ اب کہیے۔"

مہتا آگے بڑھے "میں انسانی ارتقاء میں عورت کے درجے کو مرد کے درجے سے بہتر سمجھتا ہوں، اُسی طرح جیسے پریم، تیاگ اور بھگتی کو ہنسا اور شر و فساد سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اگر ہماری دیویاں پیدائش اور پرورش کے پاک مندر کو چھوڑ کر۔ ہنسا اور لڑائی کے خون ریز میدان میں آنا چاہتی ہیں تو اُن سے سماج کا بھلا نہ ہوگا۔ میں اس بارے میں مستقل ہوں۔ مرد نے اپنے گھمنڈ میں اپنی شیطانی شہرت کو زیادہ اہمیت دی ہے وہ اپنے بھائی کا حق چھین کر اور اُس کا خون بہا کر سمجھنے لگا کہ اُس نے بڑی فتح پائی۔ جن بچوں کو دیویوں نے اپنے خون سے پیدا کیا اور پالا اُنھیں بموں اور مشین گنوں اور ٹینکوں کا شکار بنا کر وہ خود کو فاتح سمجھتا ہے۔ اور جب ہماری ہی مائیں اُن کی پیشانی پر زعفرانی ٹیکا لگا کر اور اُنھیں اپنی دُعاؤں کی زرہ پہنا کر خونی میدان میں بھیجتی ہیں تو کیا عجب کہ مرد نے خونریزی ہی کو دنیوی فلاح کی چیز سمجھے اور اُس

کی خونی رغبت روز بروز بڑھتی گئی! اور آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ شیطنت زور پکڑ کر کل دُنیا کو روندتی، جانداروں کو کچلتی، ہری بھری کھیتوں کو جلاتی اور آباد بستیوں کو اُجاڑتی چلی جاتی ہے۔ دیویو! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ اس شیطنت میں مدد دے کر اس میدانِ جنگ میں کود کر دُنیا کی بھلائی کریں گی؟ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ تباہ کاروں کو اپنا کام کرنے دیجئے اور آپ اپنے دھرم پر نگاہ رکھئے۔"

گھنّا بولے" مالتی کی گردن ہی نہیں اُٹھتی۔"

رائے صاحب نے ان خیالات کی تائید کی" مہتا کہنے تو ٹھیک ہی ہیں۔"

بجلی کے ایڈیٹر بگڑے" مگر کوئی نئی بات تو نہیں کہی۔ تحریکِ نسواں کے مخالفین ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتوں کا سہارا لیا کرتے ہیں۔ میں یہ مانتا ہی نہیں کہ تیاگ اور پریم سے دُنیا نے ترقی کی۔ دنیا نے ترقی کی ہے جواں مردی سے، محنت سے، عقل سے اور جذبہ سے!"

خورشید نے کہا" اچھا، سُننے دیجئے گا یا اپنی ہی گاتے جائیے گا؟"

مہتا کی تقریر جاری تھی" دیویو! میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں جو کہتے ہیں کہ عورت اور مرد میں مساوی طاقت و رغبت ہے اور اُن میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس سے زیادہ بھیانک جھوٹ کا میں خیال ہی نہیں کر سکتا۔ یہ وہ جھوٹ ہے جو پشتہا پشت کے حاصل کئے ہوئے تجربے کو اُسی طرح ڈھک لینا چاہتا ہے۔ جیسے بادل کا ایک ٹکڑا سورج کو ڈھک لیتا ہے۔ میں آپ کو آگاہ کئے دیتا ہوں کہ آپ اس جال میں نہ پھنسیں، عورت مرد سے اُتنی ہی برتر ہے جتنی روشنی تاریکی سے۔ انسان کے لئے چھما دَیا، تیاگ اور اہنسا زندگی کے اعلیٰ ترین معیار ہیں۔ عورت اُس معیار پہ پہنچ چکی ہے۔ مرد دھرم اور روحانیت اور رشیوں کا سہارا لے کر اُس معیار پر پہنچنے کے لئے صدیوں

سے زور لگا رہا ہے مگر اب تک کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں کہتا ہوں اُس کی ساری روحانیت ایک طرف اور عورتوں کا ایثار ایک طرف۔"

تالیاں بجیں اور سارا ہال ہل اُٹھا، رائے صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ مہتا وہی کہتے ہیں جو اُن کے دل میں ہے۔"

ادنکار ناتھ نے تنقید کی "لیکن باتیں سبھی پُرانی ہیں، بالکل سڑی ہوئی۔"

"پُرانی بات بھی روحانی طاقت کے ساتھ کہی جاتی ہے تو نئی ہو جاتی ہے۔"

"جو ایک ہزار روپئے ہر مہینے لے کر عیش و عشرت میں اُڑاتا ہو اُس میں روحانیت جیسی شئے رہ نہیں سکتی، یہ صرف پُرانے خیال والی [redacted]نوں اور ویسے ہی مردوں کے خوش کرنے کے ڈھنگ ہیں۔"

کھنّا نے مالتی کی طرف دیکھا "یہ کیوں پھولی جا رہی ہیں؟ انھیں تو شرمانا چاہئے"

خورشید نے کھنّا کو اُکسایا۔ "اب تم بھی ایک لکچر دے ڈالو کھنّا، ورنہ مہتا تمہیں اُکھاڑ پھینکے گا۔ نصف میدان تو اُس نے ابھی مار لیا ہے۔"

کھنّا کھسیا کر بولے "میری نہ کہئے، میں نے ایسی کتنی ہی چڑیوں کو پھانس کر چھوڑ دیا ہے۔"

رائے صاحب نے خورشید کی طرف آنکھیں مار کر کہا۔ "آج کل آپ عورتوں کے سماج کی طرف بہت آتے جاتے ہیں سچ کہنا، کتنا چندہ دیا؟"

کھنّا جھینپ گئے۔ "میں ایسے سماجوں کو چندہ نہیں دیا کرتا جو ہُنر بازی کا ڈھونگ کر کے بدکاری پھیلاتے ہیں۔"

مہتا کی تقریر جاری تھی۔ "مرد کہتا ہے کہ جتنے فلسفے اور سائنس کے موجد ہوئے وہ سب مرد تھے۔ جتنے بڑے بڑے مہاتما ہوئے وہ سب مرد تھے۔ سبھی سورما، سبھی سیاسی ماہر بڑے بڑے جہاز راں اور بڑے بڑے سب کچھ مرد ہی تھے۔ مگر ان

بڑوں کی جماعت نے مل کر کیا کیا؟ مہاتماؤں اور مذہبی بانیوں نے دُنیا میں خون کی ندیاں بہانے اور نفرت کی آگ بھڑکانے کے سوا اور کیا کیا؟ سورماؤں نے بھائیوں کی گردن کاٹنے کے سوا اور کیا یادگار چھوڑی؟ سیاسی ماہروں کے نشانات اب صرف مٹی ہوئی سلطنتوں کے کھنڈر رہ گئے ہیں۔ اور موجدوں نے انسان کو مشین کا غلام بنا دینے کے سوا اور کون سا مسئلہ حل کر دیا؟ مردوں کے بنائے ہوئے تمدّن میں سکون کہاں ہے، تعاون کہاں ہے؟"

اونکار ناتھ اٹھ کر جانے کو تیّار ہوئے "رئیسوں کے منہ سے بڑی بڑی باتیں سُن کر بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔"

خورشید نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا آپ بھی ایڈیٹر صاحب پورے پونگا ہی رہے ارے یہ دُنیا ہے۔ جس کے جی میں جو آتا ہے کہتا ہے۔ کچھ لوگ سُنتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں۔ چلیئے قصّہ ختم۔ ایسے ایسے بے شمار مہتا آئیں گے اور چلے جائیں گے اور دُنیا اپنی چال چلتی رہے گی۔ یہاں بگڑنے کی کون سی بات ہے؟"

"جھوٹ سُن کر مجھ سے رہا نہیں جاتا۔"

رائے صاحب نے بڑھاوا دیا "فاحشہ کے منہ سے ستّیوں کی سی بات سُن کر کس کا جی نہ جلے گا؟"

اونکار ناتھ پھر بیٹھ گئے۔ مہتا کی تقریر جاری تھی "میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا باز کو چڑیوں کا شکار کرتے دیکھ کر ہنس کو یہ زیب دے گا کہ وہ مانسرور کی پُرسکون فضا کو چھوڑ کر چڑیوں کا شکار کرنے لگے؟ اور اگر وہ شکاری بن جائے تو کیا آپ اُسے مُبارکباد دیں گی؟ ہنس کے پاس اُتنی تیز چونچ نہیں ہے، اتنے تیز چنگل نہیں ہیں، اتنی تیز آنکھیں نہیں ہیں، اتنے تیز پر نہیں ہیں اور اُتنی تیز خون کی پیاس نہیں ہے ان آلات کو اکٹھا کرنے میں اُسے صدیاں لگ جائیں گی، پھر بھی وہ باز بن سکے گا یا

نہیں اس میں شک ہے۔ مگر باز بنے یا نہ بنے، وہ ہنس نہ رہ جائے گا، وہ ہنس جو موتی چگتا ہے!"

خورشید نے تنقید کی "یہ تو شاعروں کی مہی دلیلیں ہیں۔ مادہ باز بھی اُسی طرح شکار کرتی ہے۔ جیسے نر باز۔"

اونکھرناتھ خوش ہو گئے "اس پر آپ فلاسفر بنتے ہیں، ایسی ہی دلیلوں کے بل بوتے پر!"

کھنّا نے دل کا غبار نکالا "فلاسفر نہیں فلاسفر کی دُم ہیں۔ فلاسفر وہ ہے جو....."

اونکارناتھ نے بات پوری کی "جو سچّائی سے جَو بھر بھی نہ ڈِگے۔"

کھنّا کو یہ بات پسند نہ آئی۔ "میں سچّائی جھٹائی نہیں جانتا، میں تو فلاسفر اُسے کہتا ہوں جو سچّا فلاسفر ہو۔"

خورشید نے داد دی۔ "فلاسفہ کی آپ نے کتنی سچّی تعریف کی ہے۔ واہ! سبحان اللہ! فلاسفر وہ ہے جو سچّا فلاسفر ہو! کیوں نہ ہو۔"

مہتا آگے بڑھے۔ "میں نہیں کہتا کہ عورتوں کو علم کی ضرورت نہیں ہے۔ ہے اور مردوں سے زیادہ۔ میں نہیں کہتا کہ عورتوں کو طاقت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہے اور مردوں سے زیادہ۔ لیکن وہ علم نہیں اور وہ طاقت نہیں جس سے مرد نے دنیا کو میدانِ جنگ بنا ڈالا ہے۔ اگر وہی علم اور وہی طاقت آپ بھی لے لیں گے تو دُنیا رگِستان بن جائے گی آپ کا علم اور آپ کا اقتدار تشدّد اور بربادی میں نہیں، پیدائش اور پرورش میں ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ووٹوں سے انسان کو نجات ہو گی یا دفتروں اور عدالتوں میں زبان اور قلم چلانے سے اُدّھار ہو جائے گا؟ ان نقلی غیر قدرتی اور تباہ کُن حقوق کے لئے آپ اُن حقوق کو چھوڑ دینا چاہتی ہیں جو آپ کو قدرت نے عطا کئے ہیں؟"

سروج اب تک بڑی بہن کے ادب سے ضبط کئے بیٹھی تھی۔ اب نہ رہا گیا۔

پکار اُٹھی: "ہمیں ووٹ چاہیئے مردوں کے برابر۔"

اور کئی نوعمر عورتوں نے نعرے لگائے: "ووٹ! ووٹ!"

اونکار ناتھ نے کھڑے ہو کر زور سے کہا "نسوانی طبقے کے مخالفوں کی پگڑی نیچی ہو!"

مالتی نے میز پر ہاتھ ٹپک کر کہا "چُپ رہو، جو لوگ موافقت یا مخالفت میں کچھ کہنا چاہیں گے اُنھیں کافی موقع دیا جائے گا۔"

مہتا بولے "ووٹ نئے جگ کا جال ہے، فریب ہے، کلنک ہے، دھوکا ہے اُس کے چکّر میں پڑ کر آپ نہ اِدھر کی ہوں گی نہ اُدھر کی۔ کون کہتا ہے کہ آپ کا دائرۂ عمل محدود ہے اور اُس میں آپ کو جوہر نمائی کا موقع نہیں ملتا۔ ہم سبھی پہلے انسان ہیں، بعد کو اور کچھ۔ ہماری زندگی ہمارا گھر ہے۔ وہیں ہماری پیدائش ہوتی ہے، وہیں ہماری پرورش ہوتی ہے۔ اور وہیں زندگی کے سارے کاروبار ہوتے ہیں۔ اگر یہ دائرہ محدود ہے تو لا محدود کون سا ہے؟ کیا وہ کشمکش کی جگہ جہاں باقاعدہ چھینا جھپٹی ہے؟ جس کارخانے میں انسان اور اُس کا نصیب بنتا ہے اُسے چھوڑ کر آپ اُن کارخانوں میں جانا چاہتی ہیں جہاں انسان پیسا جاتا ہے جہاں اُس کا خون نکالا جاتا ہے!"

مرزا نے ٹوکا "مردوں کے ظلم ہی نے تو ان میں بغاوت کی اسپرٹ پیدا کر دی ہے۔"

مہتا بولے "بیشک مردوں نے یہ بے انصافی کی ہے مگر اُس کا یہ جواب نہیں ہے بے انصافی کو مٹایئے لیکن خود کو مٹا کر نہیں۔"

مالتی بولی "عورتیں اس لئے حقوق چاہتی ہیں کہ اُن کا استعمال کریں اور مردوں کو اُن کے بے جا استعمال سے باز رکھیں۔"

مہتا نے جواب دیا "دنیا میں سب سے بڑے حقوق خدمت اور قربانی سے ملتے ہیں اور وہ آپ کو ملے ہوئے ہیں۔ اُن حقوق کے سامنے ووٹ کوئی چیز نہیں

مجھے افسوس ہے کہ ہماری بہنیں مغرب کی بات سے رہی ہیں جہاں عورتوں نے اپنا مرتبہ کھو دیا ہے اور مالکہ کے درجے سے گر کر شوق و پسند کی چیز بن گئی ہیں۔ مغرب کی عورت آزاد ہونا چاہتی ہے۔ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ عیش کر سکے۔ ہماری ماؤں کا یہ معیار کبھی نہیں رہا۔ اُنھوں نے صرف خدمت کے حقوق سے ہمیشہ گرستی چلائی۔ مغرب میں جو چیزیں عمدہ ہیں وہ اُن سے لیجئے تمدّن میں ہمیشہ لین دین ہوتا آیا ہے مگر کورانہ تقلید تو دماغی کمزوری ہی کی علامت ہے۔ مغرب کی عورت آج گھر کی مالکہ نہیں رہنا چاہتی۔ عیش و عشرت کی زبردست خواہش نے اُسے بالکل آزاد بنا دیا ہے۔ اُس نے اپنی شرم اور بزرگی کو جو اُس کی سب سے بڑی پونجی تھی شوخی اور تفریح کی پسندی پر قربان کر دیا ہے۔ جب میں وہاں کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو اپنی شکل کی یا اپنے بھرے ہوئے گول بازوؤں کی، یا اپنی عریانی کی نمائش کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے اُن پر رحم آتا ہے۔ اُن کی خواہشوں نے اُنھیں اتنا مغلوب کر دیا ہے کہ وہ اپنی لاج کا بچاؤ بھی نہیں کر سکتیں۔ عورت کی اس سے زیادہ اور کیا گراوٹ ہو سکتی ہے؟

رائے صاحب نے تالیاں بجائیں۔ ہال تالیوں سے گونج اُٹھا جیسے پٹاخوں کی باڑھیں چھوٹ رہی ہوں۔ مرزا صاحب نے اڈیٹر سے کہا "اس کا جواب تو آپ کے پاس کبھی نہ ہوگا؟"

اڈیٹر نے بے پروائی سے کہا "ساری تقریر میں اُنھوں نے یہی ایک بات سچ کہی ہے۔"

"تب تو آپ بھی مہتا کے مُرید ہوئے؟"

"جی نہیں، ہم لوگ کسی کے مُرید نہیں ہوتے۔ میں اس کا جواب کھوج نکالوں گا۔ بجلی میں دیکھئے گا۔"

"اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ حق کی تلاش نہیں کرتے صرف اپنی بات کے لئے لڑنا چاہتے ہیں"

رائے صاحب نے آڑے ہاتھوں لیا "اسی پر آپ کو اپنی حق پسندی کا غرّہ ہے" ایڈیٹر صاحب مستقل رہے "۔ وکیل کا کام اپنے موکّل کا بھلا دیکھنا ہے، سچ یا جھوٹ کی جانچ نہیں"

"تو یوں کہئے کہ آپ عورتوں کے وکیل ہیں"

"میں اُن سب ہی لوگوں کا وکیل ہوں جو کمزور ہیں بے کس ہیں اور مظلوم ہیں" مہتا جی کہہ رہے تھے "اور یہ مردوں کی سازش ہے۔ عورتوں کو اونچی چوٹی سے گھسیٹ کر اپنے برابر بنانے کے لئے، اُن مردوں کے برابر جو بزدل ہیں، جن میں ازدواجی زندگی کی ذمہ داری سنبھالنے کی قابلیت نہیں ہے جو آزادانہ نفس پرستی کی لہر میں سانڈوں کی طرح دوسروں کے ہرے بھرے کھیتوں میں منہ مار کر اپنی کمینہ خواہشوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں! مغرب میں اُن کی سازش کامیاب ہو گئی اور عورتیں تیلیاں بن گیئں۔ مجھے یہ کہتے شرم آتی ہے کہ اس تیاگ اور تپسیا کی سرزمین ہندوستان میں بھی کچھ وہی ہوا بہہ چلی ہے خصوصاً ہماری تعلیمیافتہ بہنوں پر وہ جادو بڑی تیزی سے چڑھ رہا ہے۔ وہ گرست عورت کے دھرم کو چھوڑ کر تتلیوں کا رنگ پکڑ رہی ہیں۔"

سروج بھڑک کر بولی "ہم مردوں کی صلاح نہیں مانگتے۔ اگر وہ اپنے بارے میں آزاد ہیں تو عورتیں بھی اپنے لئے آزاد ہیں۔ لڑکیاں اب شادی کو پیشہ نہیں بنانا چاہتیں۔ اب تو وہ صرف پریم کے ناتے بیاہ کریں گی۔"

زور سے تالیاں بجیں، خاص کر اگلی قطاروں میں جہاں عورتیں تھیں، مہتا نے جواب دیا "جسے تم پریم کہتی ہو وہ دھوکا ہے، بھڑکی ہوئی خواہش کا بگڑا ہوا روپ، اُسی طرح جیسے سنیاس صرف بھیک مانگنے کی مہذب شکل ہے۔ وہ پریم اگر ازدواجی زندگی میں کم ہے تو آزادانہ عیش میں بالکل نہیں۔ سچی خوشی،

سچا سکون، صرف خدمت میں ہے۔ وہی حقوق کا منبع ہے۔ وہی طاقت کے پیدا ہونے کی جگہ ہے۔ خدمت ہی وہ سیمنٹ ہے جو زن و شوہر کو تمام عمر محبت اور باہمی امداد کے رشتے میں جوڑے رکھتا ہے، جس پر بڑے بڑے صدمہ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جہاں خدمت نہیں ہے وہیں طلاق ترک اور باہمی بداعتقادی ہے اور آپ پر مردانہ زندگی کی کشتی کا ناخدا ہونے کے سبب زیادہ ذمہ داری ہے۔ آپ چاہیں تو کشتی کو آندھی اور طوفان میں بھی پار لگا سکتی ہیں اور آپ نے غفلت کی تو کشتی ڈوب جائے گی اور اُس کے ساتھ آپ بھی ڈوبنے سے نہ بچ سکیں گی۔"

تقریر ختم ہوگئی۔ مسئلہ بحث طلب تھا اور کئی عورتوں نے اجازت مانگی مگر دیر بہت ہوگئی تھی، اِس لئے مالتی نے مہتا کا شکریہ ادا کرکے جلسہ برخاست کر دیا ہاں یہ اطلاع دے دی گئی ہے کہ اگلے اتوار کو اس موضوع پر کئی دیویاں اپنے خیالات کا اظہار کریں گی۔

رائے صاحب نے مہتا کو مبارکباد دی "آپ نے میرے جی کی باتیں کہیں مسٹر مہتا! میں آپ کے ایک ایک لفظ سے متفق ہوں۔"

مالتی ہنسی "آپ کیوں نہ مبارک باد دیں گے، چُور چُور موسیرے بھائی جو ہوتے ہیں۔ مگر سارا اُپدیش غریب عورتوں ہی کے سر پر کیوں تھوپا جاتا ہے ان ہی کے سر پر کیوں معیار اور ایثار پر عمل کرنے کی ذمہ داری لادی جاتی ہے؟"

مہتا بولے "اس لئے کہ وہ بات کو سمجھتی ہیں۔"

کھنّا نے مالتی کی طرف اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ کر گویا اُس کے دل کی بات سمجھتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب کے یہ خیالات ابھی تو کوئی سو سال سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں۔"

مالتی نے تُرش رو ہو کر پوچھا "کون سے خیالات؟"

"یہی خدمت اور فرض وغیرہ کے"

"اگر آپ کو یہ خیالات سو سال پچھڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں تو مہربانی کر کے اپنے تازہ خیالات تبلایئے عورت مرد کیسے سکھی رہ سکتے ہیں۔ اس کا کوئی تازہ نسخہ آپ کے پاس ہے؟"

کھنّا کھسیا گئے۔ بات کہی تھی۔ مالتی کو خوش کرنے کے لئے وہ اور بگڑ اٹھی۔ بولے "یہ نسخہ مہتا صاحب کو معلوم ہو گا"

"ڈاکٹر صاحب نے بتلا دیا اور آپ کے خیال میں وہ سو سال پرانا ہے تو نیا نسخہ آپ کو تبلانا چاہئے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ دنیا میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو کبھی پرانی ہو ہی نہیں سکتیں سماج میں اس طرح کے مسئلے ہمیشہ اٹھتے رہتے ہیں اور ہمیشہ اٹھتے رہیں گے"

مسز کھنّا برآمدے میں چلی گئی تھیں۔ مہتا نے اُن کے پاس جا کر پرنام کرتے ہوئے پوچھا "میری تقریر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

مسز کھنّا نے آنکھیں جھکا کر کہا "اچھی تھی بہت اچھی۔ مگر ابھی آپ کنوارے ہیں جبھی عورتیں دیویاں ہیں، برتر ہیں اور زندگی کے جہاز کی ناخدا ہیں۔ بیاہ کر لیجئے پھر پوچھوں گی کہ اب عورتیں کیا ہیں اور بیاہ آپ کو کرنا پڑے گا کیونکہ آپ بیاہ سے منہ چرانے والے مردوں کو بزدل کہہ چکے ہیں"

مہتا ہنسے "اُسی کے لئے تو زمین تیار کر رہا ہوں"

"مس مالتی کا جوڑا بھی اچھا ہے"

"شرط یہی ہے کہ وہ کچھ دن آپ کے چرنوں میں بیٹھ کر آپ سے استریوں کا دھرم سیکھیں"

"وہی شوارتھی مردوں کی بات! آپ نے مردوں کے فرائض سیکھ لئے ہیں؟"

"یہی سوچ رہا ہوں کہ کس سے سیکھوں۔"

"مسٹر کھنّا آپ کو بہت اچھی طرح سکھا سکتے ہیں۔"

مہتا نے قہقہہ مارا "نہیں بس وہ فرض بھی آپ ہی سے سیکھوں گا۔"

"اچھی بات ہے، مجھی سے سیکھئے۔ پہلی بات یہی ہے۔ کہ بھول جائیے کہ عورت برتر ہے اور ساری ذمہ داری اُسی پر ہے۔ برتر مرد ہے اور اُسی پر گرہستی کا سارا بار ہے۔ عورت میں خودی اور نفس کشی اور فرض کی ادائیگی کا احساس سب کچھ وہی پیدا کر سکتا ہے۔ اگر اس میں یہ باتیں نہیں ہیں تو عورت میں بھی نہ آئیں گی عورتوں میں جو آج یہ بغاوت ہے اُس کا سبب مردوں میں اُن اوصاف کا نہ ہونا ہے۔"

مرزا صاحب نے مہتا کو گود میں اٹھا لیا اور بولے "مبارک !"

مہتا نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا "آپ کو میری تقریر پسند آئی ؟"

"تقریر تو خیر جیسی تھی ویسی تھی مگر کامیاب خوب رہی۔ آپ نے پری کو شیشہ میں اُتار لیا۔ اپنا بھاگ سراہیئے کہ جس نے آج تک کسی کو منھ نہیں لگایا وہ آپ کا کلمہ پڑھ رہی ہے۔"

مسنر کھنّا نے دبی زبان سے کہا "جب نشہ ٹھہر جائے تو کہئے"

مہتا نے بے پروائی سے کہا "مجھ جیسے کتاب کے کیڑے کو کون عورت پسند کرے گی دیوی جی ؟ میں تو پکا معیار پرست ہوں۔"

مسنر کھنّا نے اپنے شوہر کو موٹر کی طرف جاتے دیکھا تو اُدھر چلی گئیں مرزا بھی باہر نکل گئے۔ مہتا نے پلیٹ فارم پر سے اپنی چھڑی اُٹھائی اور باہر جانا چاہتے تھے کہ مالتی نے آکر اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور اصرار کرتی ہوئی بولی "آپ ابھی نہیں جا سکتے۔ چلئے، پاپا سے آپ کی ملاقات کراؤں اور آج وہیں کھانا بھی کھایئے ؟"

مہتا نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا "نہیں مجھے معاف کیجئے۔ وہاں سروج میری جان

کھا جائے گی۔ میں ان لڑکیوں سے بہت گھبراتا ہوں۔"

"نہیں نہیں، میں ذمہ لیتی ہوں جو منہ بھی کھولے۔"

"اچھا آپ چلئے میں ذرا دیر میں آجاؤں گا۔"

"جی، نہیں یہ نہ ہوگا میرا موٹر سروج کو لے کر چل دیا۔ آپ مجھ کو پہنچاتے تو چلیں گے ہی۔"

دونوں مہتا کے موٹر میں بیٹھے۔ موٹر چلا۔ لمحہ بھر بعد مہتا نے پوچھا "میں نے سنا ہے کہ کھنّا جی اپنی بیوی کو مارا کرتے ہیں۔ جب سے مجھے اُن کی صورت سے نفرت ہو گئی ہے۔ جو آدمی اتنا بے رحم ہو اُسے میں انسان نہیں سمجھتا۔ اُس پر آپ عورتوں کی بڑی خیر خواہ بنتی ہیں! تم نے کبھی اُنھیں سمجھایا نہیں ہے؟"

مالتی ذرا بگڑ کر بولی "تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے، یہ آپ بھول رہے ہیں۔"

"میں تو ایسے کسی سبب کا خیال ہی نہیں کر سکتا کہ کوئی مرد اپنی عورت کو مارے۔"

"خواہ عورت کتنی ہی بدزبان ہو؟"

"ہاں کتنی ہی۔"

"تو آپ ایک نئی قسم کے آدمی ہیں۔"

"اگر مرد بدزبان ہو تو تمہاری رائے میں اُس مرد پر ہنٹروں کی بوچھار کرنی چاہیے، کیوں؟"

"عورت میں جتنی چھما ہو سکتی ہے اُتنی مرد میں نہیں۔ آپ نے خود آج یہ بات تسلیم کی ہے۔"

"تو عورت کی چھما ہی کا یہ صلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم کھنّا کو منہ لگا کر اُسے اور بھی شہہ دیتی ہو۔ تمہاری وہ جتنی عزّت کرتی ہے، تم سے اُسے جتنی عقیدت ہے

اُس کے سبب تم بڑی آسانی سے اُسے سیدھا کر سکتی ہو۔ مگر تم اُس کی صفائی دے کر خود اُس قصور میں شریک ہو جاتی ہو۔"

مالتی برافروختہ ہو کر بولی۔" تم نے اس وقت یہ تذکرہ فضول ہی چھیڑ دیا میں کسی کی بُرائی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر ابھی آپ نے گوبندی دیوی کو پہچانا نہیں۔ آپ نے اُن کی بھولی بھالی، سیدھی سادی صورت دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ دیوی ہیں۔ میں اُنھیں اتنا اونچا درجہ نہیں دینا چاہتی۔ اُنھوں نے مجھے بدنام کرنے کی جتنی کوشش کی ہے۔ مجھ پر جیسے جیسے حملے کئے ہیں، وہ بیان کروں تو آپ دنگ رہ جائیں گے اور تب آپ کو ماننا پڑے گا کہ ایسی عورت کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیئے۔"

"آخر اُنھیں آپ سے جو اتنی نفرت ہے اُس کا کوئی سبب تو ہوگا؟"

"سبب اُن سے پوچھئے۔ مجھے کسی کے دل کا حال کیا معلوم؟"

"اُن سے بلا پوچھے بھی قیاس کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے۔ اگر کوئی مرد میرے اور میری عورت کے درمیان میں آنے کی ہمت کرے تو میں اُسے گولی مار دوں گا اور اُسے نہ مار سکوں گا تو اپنے سینے میں مار لوں گا۔ اسی طرح اگر میں کسی عورت کو اپنے اور اپنی بیوی کے درمیان میں لانا چاہوں تو میری بیوی کو بھی حق ہے کہ وہ جو چاہے سو کرے۔ اس بارے میں میں کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ یہ غیر سائنٹیفک جذبہ ہے جو ہم نے اپنے وحشی آباؤ اجداد سے پایا ہے اور آج کل کچھ لوگ اُسے نامہذب اور غیر مجلسی سلوک کہیں گے۔ لیکن میں ابھی تک اُس جذبہ پر فتح نہیں پا سکا اور نہ پانا چاہتا ہوں۔ اِس بارے میں میں قانون کی پروا نہیں کرتا۔ میرے گھر میں میرا قانون ہے۔"

مالتی نے تند لہجے میں پوچھا" مگر آپ نے یہ قیاس کیسے کر لیا کہ میں آپ کے لفظوں میں کھنّا اور گوبندی کے بیچ میں آنا چاہتی ہوں؟ آپ اپنے قیاس سے

میری توہین کر رہے ہیں۔ میں کھنّا کو اپنی جوتیوں کی نوک کے برابر بھی نہیں سمجھتی۔"

موہنا نے بے اعتباری کے لہجے میں کہا "یہ آپ دل سے نہیں کہہ رہی ہیں مس مالتی! کیا آپ ساری دنیا کو بیوقوف سمجھتی ہیں؟ جو بات سبھی سمجھ رہے ہیں اگر وہی بات مسٹر کھنّا بھی سمجھیں تو میں انھیں الزام نہیں دے سکتا۔"

مالتی نے بگڑ کر کہا "دنیا کو دوسروں کے بدنام کرنے میں مزا آتا ہے۔ یہ اس کا خاصّہ ہے۔ میں اس کا خاصّہ کیسے بدل دوں؟ لیکن یہ مفت کی بدنامی ہے ہاں میں اتنی بے مروّت نہیں ہوں کہ کھنّا کو اپنے پاس آتا دیکھ کر دُتکار دیتی۔ میرا کام ہی ایسا ہے کہ مجھے سبھی کی آؤ بھگت کرنا پڑتی ہے اگر کوئی اس کا کچھ اور مطلب نکالتا ہے تو وہ ...... وہ ......"

مالتی کا گلا بھر آیا اور اس نے منھ پھیر کر رومال سے آنسو پونچھے۔ پھر ایک لمحہ بعد بولی "اوروں کے ساتھ تم بھی مجھے ...... مجھے اس کا رنج ہے .... مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی"

پھر شاید اسے اپنی کمزوری پر افسوس ہوا۔ وہ تیز ہو کر بولی "آپ کو مجھ پر حملہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر آپ بھی انھیں مردوں میں ہیں جو کسی عورت مرد کو ساتھ دیکھ کر ان پر انگلی اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے تو شوق سے اٹھائیے۔ مجھے ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ اگر کوئی عورت آپ کے پاس بار بار کسی نہ کسی حیلے سے آئے، آپ کو اپنا دیوتا سمجھے، ہر ایک بات میں آپ سے صلاح لے، آپ کے پیروں تلے آنکھیں بچھائے، آپ کا اشارہ پاتے ہی آگ میں کود پڑنے کو تیار ہو جائے تو میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ اس سے بے رخی نہ کریں گے۔ اگر آپ اسے ٹھکرا سکتے ہیں تو آپ انسان نہیں ہیں۔ اس کے خلاف آپ کتنے ہی دلائل لا کر رکھ دیں مگر میں مانوں گی نہیں میں تو کہتی ہوں کہ بے رخی تو دور رہی، ٹھکرانے کی تو بات ہی کیا، آپ اس عورت

کے پیر دھو دھو کر پئیں گے، اور بہت دن گذرنے کے قبل ہی وہ آپ کے دل کی رانی ہوگی۔ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ میرے سامنے کھنّا کا کبھی نام نہ لیجئے گا۔"

مہتانے اِس لپیٹ میں گویا ہاتھ سینکتے ہوئے کہا "وہ شرط یہی ہے کہ میں کھنّا کو آپ کے ساتھ نہ دیکھوں۔"

"میں انسانیت کا خون نہیں کر سکتی۔ وہ آئیں گے تو میں اُنھیں۔ بھگاؤں گی۔ نہیں۔"

"اُن سے کہئے کہ اپنی اہلیہ کے ساتھ انسانیت سے پیش آئیں۔"

"میں کسی کے نجی معاملے میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھتی اور نہ مجھے اس کا کوئی حق ہے۔"

"تو آپ کسی کی زبان بھی بند نہیں کر سکیں۔"

مالتی کا بنگلہ آگیا۔ موٹر رُکی۔ مالتی اُتر پڑی اور بلا ہاتھ ملائے چلی گئی۔ وہ یہ بھی بھول گئی کہ اُس نے مہتا کو کھانے کی دعوت دی ہے۔ وہ تخلیہ میں جاکر خوب رونا چاہتی ہے۔ گو بندی نے پہلے بھی حملے کئے ہیں۔ مگر آج اُس نے جو حملہ کیا ہے وہ بہت سخت اور دل شکن ہے؟"

(۱۶)

رائے صاحب کو جب خبر ملی کہ علاقے میں ایک واردات ہو گئی اور ہوری سے گاؤں کے پنچوں نے جرمانہ وصول کر لیا ہے تو فوراً نوکھے رام کو بُلا کر جواب طلب کیا۔ انھیں اس کی اطلاع نہیں دی گئی؟ ایسے نمک حرام اور دغاباز آدمی کے لئے اُن کے دربار میں جگہ نہیں ہے۔

انوکھے رام نے اتنی گالیاں کھائیں تو ذرا گرم ہو کر بولے "میں اکیلا تھوڑے ہی تھا۔ گاؤں کے اور پنچ بھی تو تھے۔ میں اکیلا کیا کر سکتا تھا؟"

رائے صاحب نے اُن کی توند کی طرف برچھی کی سی نوک دار نگاہوں سے دیکھا ”مت بکو جی! تمھیں اُسی وقت کہنا چاہیئے تھا کہ جب تک سرکار کو اطلاع نہ ہو جائے میں پنچوں کو جرمانہ نہ وصول کرنے دوں گا۔ پنچوں کو میرے اور میری رعایا کے درمیان میں دخل دینے کا حق ہی کیا ہے؟ اِس ڈانٹر باندھ کے سوا علاقے میں اور کون سی آمدنی ہے؟

وصولی سرکار کے گھر گئی، بقایا اسامیوں نے دبا لیا۔ اور میں کہاں جاؤں؟ کیا کھاؤں، تمہارا سر؟ یہ لاکھوں روپئے سال کا خرچ کہاں سے آئے؟ افسوس ہے کہ دو پشتوں سے کارندے کا کام کرتے رہنے پر بھی مجھے آج تمھیں یہ بات بتلانی پڑتی ہے۔ کتنے روپئے وصول ہوئے تھے ہوری سے؟“

نوکھے رام نے سٹپٹا کر کہا ”اسّی روپئے۔“

”نقد؟“

”نکد اُس کے پاس کہاں تھے سرکار؟ کچھ اناج دیا، کچھ میں اپنا گھر لکھ دیا۔“

رائے صاحب نے اپنی غرض کو چھوڑتے ہوئے ہوری کی طرفداری کی۔

”اچھّا تو آپ نے اور آپ کے بگلا بھگت پنڈت نے مل کر ایک معتبر اسامی کو تباہ کر دیا! میں پوچھتا ہوں کہ تم لوگوں کو کیا حق تھا کہ میرے علاقے میں مجھے اطلاع دیئے بغیر میرے اسامی سے جرمانہ وصول کرتے؟ اگر میں چاہوں تو اِسی بات پر آپ کو اور اُس چھلئے پٹواری اور اُس مکّار پنڈت کو سات سات سال کے لئے جیل بھجوا سکتا ہوں۔ آپ نے سمجھ لیا کہ آپ ہی علاقے کے بادشاہ ہیں۔ میں کہے دیتا ہوں کہ آج شام تک جُرمانے کی پوری رقم میرے پاس پہنچ جائے ورنہ اچھّا نہ ہوگا۔ میں ایک ایک سے چکّی پسوا کر چھوڑوں گا۔ جایئے، ہاں ہوری اور اُس کے لڑکے کو میرے پاس بھیج دیجئے گا۔“

نوکھے رام نے دبی زبان سے کہا "اُس کا لڑکا تو گاؤں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ جس رات کو یہ واردات ہوئی اُسی رات کو بھاگا تھا۔"

رائے صاحب نے غصہ سے کہا "جھوٹ مت بکو۔ تمہیں معلوم ہے کہ جھوٹ سے میرے بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ میں نے آج تک کبھی نہیں سُنا کہ کوئی نوجوان اپنی چہیتی کو اُس کے گھر سے لا کر پھر خود بھاگ جائے۔ اگر اُسے بھاگنا ہی ہوتا تو وہ اُس لڑکی کو لاتا ہی کیوں؟ تم لوگوں کی اِس میں بھی ضرور کوئی شرارت ہے۔ تم گنگا میں ڈوب کر بھی اپنی صفائی دو تو میں ماننے کا نہیں۔ تم لوگوں نے اپنے سماج کی پیاری مرجاد کی حفاظت کے لئے اُسے دھمکایا ہوگا۔ بیچارا بھاگ نہ جاتا تو کیا کرتا؟"

نوکھے رام اس کی مخالفت نہ کر سکے۔ مالک جو کچھ کہیں سب ٹھیک ہے وہ یہ بھی نہ کہہ سکے کہ آپ خود چل کر جھوٹ سچ کی جانچ کر لیں۔ بڑے آدمیوں کا غصّہ پوری پوری اطاعت چاہتا ہے اپنے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سُن سکتا

پنچوں نے رائے صاحب کا یہ فیصلہ سُنا تو نشہ ہرن ہو گیا۔ غلّہ تو ابھی جیوں کا تیوں پڑا ہوا تھا مگر روپئے تو کب کے غائب ہو چکے تھے۔ ہوری کا مکان رہن لکھا گیا تھا۔ مگر اُس مکان کو دیہات میں کون پوچھتا؟ جیسے ہندو عورت شوہر کے ساتھ ہی گھر کی مالکہ ہے اور شوہر کے چھوڑ دینے پر کہیں کی نہیں رہتی اُسی طرح یہ گھر ہوری کے لئے تو لاکھ روپئے کا ہے مگر اُس کی اصلی قیمت تو کچھ بھی نہیں، اور اِدھر رائے صاحب روپئے لئے بغیر ماننے کے نہیں۔ یہی ہوری جا کر رو آیا ہوگا۔ پٹیشوری لال سب سے زیادہ خائف تھے۔ اُن کی تو نوکری ہی چلی جائے گی۔ چاروں آدمی اس مشکل مسئلے پر غور کر رہے تھے مگر کسی کی عقل کام نہ کرتی تھی، ایک دوسرے کو الزام دیتا تھا۔ پھر خوب جھگڑا ہوا

پٹیشوری نے اپنی لمبی گردن ہلا کر کہا" میں منع کرتا تھا کہ ہوری کے معاملے میں ہمیں چپ ہو کر رہ جانا چاہیئے۔ گائے کے معاملے میں سب کو تاوان دینا پڑا اب اس معاملے میں تاوان ہی سے گلا نہ چھوٹے گا بلکہ نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ مگر لوگوں کو روپئے کی پڑی تھی نکالو بیس بیس روپئے۔ اب بھی کسل ہے۔ کہیں رائے صاحب نے رپٹ کر دی تو سب کے سب بندھ جاؤ گے"۔

داتا دین نے اپنا برہمنی جلال دکھا کر کہا" میرے پاس بیس روپئے تو کیا، بیس پیسے بھی نہیں ہیں۔ برہمنوں کو بھوج دیا گیا، ہوم ہوا، کیا اس میں کچھ لگا ہی نہیں؟"

"رائے صاحب کی ہمت ہے کہ مجھے جہل لے جائیں۔ برمہ بن کر گھر کا گھر مٹا دوں گا۔ ابھی انھیں کسی برہمن سے پالا نہیں پڑا"

جھنگری سنگھ نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی۔ وہ رائے صاحب کے نوکر نہیں ہیں۔ انھوں نے ہوری کو مارا نہیں، پیٹا نہیں، اُس پر کوئی دَباؤ ڈالا نہیں، ہوری اگر پراسچت کرنا چاہتا تھا تو اُنھوں نے اس کا موقع دیا۔ اس کے لئے انھیں کوئی دُوکھ نہیں دے سکتا۔ مگر نوکھے رام کی گردن اتنی آسانی سے نہ چھوٹ سکتی تھی۔ یہاں مزے سے بیٹھے بیٹھے راج کرتے تھے۔ مشاہرہ تو دس روپئے سے زیادہ نہ تھا مگر ایک ہزار سالانہ سے زائد آمدنی تھی۔ صدہا آدمیوں پر حکومت چار چار پیادے حاضر، بیگار میں سارا کام ہو جاتا تھا، تھانیدار تک کرسی دیتے تھے۔ یہ چین انھیں اور کہاں تھا؟ اور پٹیشوری تو نوکری کی بدولت مہاجن بنے ہوئے تھے۔ کہاں جا سکتے تھے؟ دو تین روز اسی تردد میں پڑے رہے کہ اس مصیبت سے کس طرح نجات ہو۔ آخر انھیں ایک راستہ سوجھ گیا۔ کبھی کبھی کچہری میں انھیں "بجلی" دیکھنے کو مل جاتی تھی۔ اگر ایک

گمنام خط اس کے ایڈیٹر کے خدمت میں بھیج دیا جائے کہ رائے صاحب کس طرح اسامیوں سے جرمانہ وصول کرتے ہیں توجہ کو لینے کے دینے پڑ جائیں تو کھیے رام بھی متفق ہو گئے دونوں نے مل کر کسی طرح ایک خط لکھا اور رجسٹری سے بھیج دیا۔

ایڈیٹر اونکار ناتھ تو ایسے خطوں کی تاک میں رہتے تھے۔ خط پاتے ہی فوراً رائے صاحب کو اطلاع دی۔ انھیں ایک ایسی خبر ملی ہے جس پر اعتبار کرنے کو اُن کا جی نہیں چاہتا مگر نامہ نگار نے ایسے ثبوت دیئے ہیں کہ یکایک بے اعتباری بھی نہیں کی جا سکتی۔ کیا یہ سچ ہے کہ رائے صاحب نے اپنے علاقے کے ایک اسامی سے اسی پچھتے تاوان اس لئے وصول لیا کہ اس کے لڑکے نے ایک بیوہ کو اپنے گھر رکھ لیا تھا؟ ایڈیٹر کا فرض انھیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اس معاملے کی جانچ کریں اور عوام کی بھلائی کے لئے اُسے چھاپ دیں۔ رائے صاحب اس کے متعلق جو کہنا چاہیں اُسے بھی وہ چھاپ دیں گے۔ ایڈیٹر صاحب دل سے چاہتے ہیں کہ یہ خبر غلط ہو لیکن اگر اس میں کچھ بھی سچائی ہوئی تو اُسے شائع کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ دوستی اُنھیں فرض کے راستے سے نہیں ہٹا سکتی۔

رائے صاحب کو یہ خبر ملی تو اُنھوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ پہلے تو اُنھیں یہ تحریک ہوئی کہ جا کر اونکار ناتھ کو پچاس ہنٹر گن کر لگائیں کہ جہاں وہ خط چھاپنا ہو وہیں یہ حال بھی چھاپ دینا۔ لیکن اس کا انجام سوچ کر دل کو ٹھنڈا کیا اور فوراً ان سے ملنے چلے اگر دیر کی اور اونکار ناتھ نے وہ حال چھاپ دیا تو اُن کی ساری نیکنامی پر پانی پھر جائے گا۔

اونکار ناتھ سیر کر کے لوٹے تھے اور کل کے اخبار کے لئے اڈیٹوریل لکھنے کی فکر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر دل چرخے کی طرح اُڑا اُڑا پھرتا تھا۔ اُن کی اہلیہ نے رات میں اُنھیں کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالی تھیں جو ابھی تک کانٹوں کی طرح چبھ رہی

تھیں۔ انہیں کوئی مفلس کہہ لے، بدتہذیب کہہ لے، بیوقوف کہہ لے، وہ ذرا بھی بُرا نہ مانتے تھے مگر یہ کہنا کہ ان میں مروت نہیں ہے، ان کی برداشت کے باہر تھا۔ اور پھر اپنی بیوی کو یہ کہنے کا کیا حق ہے؟ اُس سے تو یہ اُمید کی جاتی ہے کہ کوئی ایسا کہے تو اُس کا منہ بند کر دے۔ بیشک وہ ایسی خبریں نہیں چھاپتے ایسے نوٹ نہیں لکھتے کہ سر پر کوئی آفت آجائے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں ان سیاہ قانونوں کے زمانے میں وہ اور کر ہی کیا سکتے ہیں؟ مگر وہ کیوں سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالتے، اسی لئے تو کہ ان کے گھر والوں کو تکلیف نہ اُٹھانی پڑے اور ان کی اس برداشت کا اُنھیں یہ صلہ مل رہا ہے۔ کیا اندھیر ہے! ان کے پاس روپیہ نہیں ہے تو بنارسی ساڑی کیسے منگا دیں؟ ڈاکٹر سیٹھ اور پروفیسر بھاٹیا اور نہ جانے کس کس کی بیویاں بنارسی ساڑی پہنتی ہیں تو وہ کیا کریں؟ کیوں اُن کی بیوی ان ساڑی والیوں کو اپنی کھدر کی ساڑی سے نادم نہیں کرتی؟ ان کی تو خود تو یہ عادت ہے کہ کسی بڑے آدمی سے ملنے جاتے ہیں تو موٹے سے موٹے کپڑے پہن لیتے ہیں اور کوئی کچھ رائے زنی کرے تو اس کا مُنھ توڑ جواب دینے کو وہ تیار رہتے ہیں اُن کی بیوی میں کیا وہی خودداری نہیں ہے؟ وہ کیوں دوسروں کا ٹھاٹ باٹ دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہے؟ اُسے سمجھنا چاہیئے کہ وہ ایک محبِّ وطن کی بیوی ہے جس کے پاس حبّ الوطنی کے سوا اور کون سی پونجی ہے؟ اسی کو آج افتتاحیہ مضمون بنانے کا خیال کرتے کرتے ان کا دھیان رائے صاحب کے معاملے پر جا پہنچا۔

رائے صاحب اِس اطلاع کا کیا جواب دیتے ہیں، یہ دیکھنا ہے۔ اگر وہ اپنی صفائی دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو کوئی بات نہیں، ورنہ اگر وہ یہ سمجھیں کہ او نکانڈلا دباؤ، خوف یا مروّت میں آ کر اپنے فرض سے مُنھ موڑ لیں گے تو یہ اُن کی خام خیالی ہے۔ اس ساری تپسیا کا بدلا اُنھیں اس کے سوا اور کیا ملتا ہے کہ موقع ملنے پر

وہ اِن قانونی ڈاکوؤں کی کرتوت کھول دیں۔ اُنھیں خوب معلوم ہے کہ رائے صاحب بڑے با اثر آدمی ہیں۔ کونسل کے ممبر ہونے کے علاوہ حکّام میں بھی اُن کا کافی رسوخ ہے وہ چاہیں تو اُن پر جھوٹے مقدمے چلوا سکتے ہیں، اپنے غنڈوں سے اُنھیں راہ چلتے پٹوا سکتے ہیں۔ مگر اونکار ناتھ اِن باتوں سے نہیں ڈرتا۔ جب تک اس کے جسم میں جان ہے وہ ظالموں کی خبر لیتا ہی رہے گا۔

دفعتاً موٹر کی آواز سُن کر وہ چونک پڑے اور فوراً کاغذ لے کر اپنا مضمون شروع کر دیا۔ ایک ہی لمحہ میں رائے صاحب ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔

اونکار ناتھ نے نہ ان کا خیر مقدم کیا، نہ مزاج پُرسی کی اور نہ کرسی دی اُنھیں اس طرح دیکھا گویا کوئی ملزم ان کی عدالت میں آیا ہو اور رُعب کی آواز میں پوچھا "آپ کو میرا پرزہ مل گیا تھا؟ میں خط لکھنے کے لئے مجبور تھا، میرا فرض تو یہ تھا کہ خود اس کی تحقیقات کرتا مگر مروّت میں اُصولوں کا کچھ خون کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیا اُس خبر میں کچھ سچّائی ہے؟"

رائے صاحب اس کی سچّائی سے انکار نہ کر سکے اگرچہ ابھی تک انھیں جرمانے کے روپئے نہیں ملے تھے۔ اور وہ اس کے ملنے سے صاف اِنکار کر سکتے تھے مگر وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ کس پہلو پر چلتے ہیں۔

اونکار ناتھ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تب تو میرے لئے اُس خبر کو چھاپ دینے کے سوا اور کوئی چارا نہیں ہے مجھے اس کا افسوس ہے کہ مجھے اپنے ایک بڑے خیر خواہ دوست کے متعلق کچھ لکھنا پڑ رہا ہے مگر فرض کے مقابلے میں شخص کوئی چیز نہیں۔ ایڈیٹر اگر اپنا فرض نہ پورا کر سکے تو اُسے اس جگہ پر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

رائے صاحب کرسی پر بیٹھ گئے اور پان کے بیڑے مُنھ میں ڈال کر بولے

"لیکن یہ آپ کے حق میں اچھّا نہ ہوگا مجھے تو جو کچھ ہونا ہے وہ بعد کو ہوگا مگر آپ کو فوراً سزا مل جائے گی۔ اگر آپ دوستوں کی پروا نہیں کرتے تو میں بھی اسی پالیسی کا آدمی ہوں۔"

اونکار ناتھ نے ایک شہید کی عظمت اختیار کرتے ہوئے کہا "اس کا تو مجھے کبھی ڈر نہیں ہوا۔ جس روز میں نے ایڈیٹر ہونے کی ذمّہ واری لی اُسی روز اپنی جان کا موہ چھوڑ دیا اور میرے نزدیک ایڈیٹر کی سب سے شاندار موت یہی ہے کہ وہ حق و انصاف پر اپنے کو قربان کر دے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں آپ کا چیلنج منظور کرتا ہوں۔ میں اب تک آپ کو اپنا دوست سمجھتا آیا تھا مگر اب آپ لڑنے پر تیار ہیں تو لڑائی ہی سہی۔ آخر میں آپ کے اخبار کا پانچ گنا چندہ کیوں دیتا ہوں؟ صرف اس لئے کہ وہ میرا غلام بنا رہے۔ مجھے ایشور نے رئیس بنایا ہے۔ آپ کے بنانے سے نہیں بنا ہوں۔ معمولی چندہ پندرہ روپئے ہے اور میں پچھتّر روپئے دیتا ہوں تو اِسی لئے کہ آپ کا مُنھ بند رہے۔ جب آپ گھاٹے کا رونا روتے ہیں اور امداد کے لئے اپیل کرتے ہیں اور ایسی شاید ہی کوئی سہ ماہی جاتی ہو جب آپ کی اپیل نہ نکلے، تو میں ایسے ہر موقع پر آپ کی کچھ نہ کچھ امداد کر دیتا ہوں کس لئے؟ دیوالی، دسہرہ اور ہولی میں آپ کے یہاں سوغات بھیجتا ہوں اور سال میں پچیس مرتبہ آپ کی دعوت کرتا ہوں۔ کس لئے؟ آپ رشوت اور فرض دونوں کو ساتھ ساتھ نہیں نباہ سکتے۔"

اونکار ناتھ گرم ہو کر بولے "میں نے کبھی رشوت نہیں لی۔"

رائے صاحب نے پھٹکارا "اگر یہ رشوت نہیں ہے تو رشوت کیا ہے؟ ذرا مجھے سمجھا دیجئے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے علاوہ اور سب گدھے ہیں جو بے غرضانہ آپ کا گھاٹا پورا کرتے ہیں؟ نکالئے اپنا کھاتہ اور مجھے بتایئے کہ اب تک آپ کو

میری ریاست سے کتنا مل چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہزاروں کی رقم نکلے گی۔ اگر آپ کو سودیشی چلا کر بدیشی دواؤں اور چیزوں کا اشتہار چھاپتے شرم نہیں آتی تو میں کیوں اپنے اسامیوں سے تاوان اور جرمانہ لینے میں شرم کروں؟ یہ نہ سمجھئے کہ آپ ہی کسانوں کے بہبود کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ مجھے کسانوں کے ساتھ جلنا مرنا ہے، مجھ سے بڑھ کر دوسرا اُن کا ہی خواہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن میرا گزر کیسے ہو؟ افسروں کو دعوتیں کہاں سے دوں؟ سرکاری چندے کہاں سے دوں؟ خاندان کے صدہا آدمیوں کی ضروریات کیسے پوری کروں؟ میرے گھر کا کیا خرچ ہے، یہ شاید آپ جانتے ہیں۔ تو کیا میرے گھر میں روپے پھلتے ہیں؟ آئیں گے تو اسامیوں ہی کے گھر سے۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ زمیندار اور تعلقدار دُنیا بھر کا سُکھ لوٹ رہے ہیں۔ اُن کی اصلی حالت کا آپ کو پتہ نہیں۔ اگر وہ دھرماتما بن کر رہیں تو ان کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے حکام کو ڈالیاں نہ دیں تو جیل گھر ہو جائے۔ ہم بچھو نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ سب کو ڈنک مارتے پھریں اور نہ غریبوں کا گلا دبانا کوئی بڑی خوشی کی بات ہے مگر رواجوں کو نبھانا پڑتا ہے۔ جس طرح آپ میرے رئیس ہونے کا فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ اُسی طرح اور سب لوگ بھی ہمیں سونے کا انڈا دینے والی مُرغی سمجھتے ہیں۔ آیئے میرے بنگلے پر تو دکھاؤں کہ صبح سے شام تک کتنے نشانے مجھ پر پڑتے ہیں۔ کوئی کشمیر سے شال دوشالے لئے چلا آتا ہے، کوئی گراموفون لئے سر پر سوار ہے اور کوئی کچھ۔ چندے والے تو بے شمار، کیا سب کے سامنے اپنا دُکھڑا لے کر بیٹھ جاؤں؟ کیا یہ لوگ میرے دروازے پر دُکھڑا سننے آتے ہیں؟ آتے ہیں مجھے اُلو بنا کر مجھ سے کچھ اینٹھنے کے لئے۔ آج رواج کا خیال چھوڑ دوں تو تالیاں پٹنے لگیں۔ حکام کو ڈالیاں نہ دوں تو باغی سمجھا جاؤں۔ تب آپ اپنے مضامین سے میری حفاظت نہ کریں گے کانگریس میں شریک ہوا، اس کا تاوان ابھی تک دیتا جاتا ہوں۔

کالی کتاب میں نام درج ہو گیا۔ میرے سر پر کتنا قرض ہے یہ بھی کبھی آپ نے پوچھا؟ اگر سبھی مہاجن ڈگریاں کرالیں تو میرے ہاتھ کا چھلا تک بک جائے گا۔ آپ کہیں گے کیوں یہ جھگڑے پالتے ہو؟ سات پشتوں سے جن حالات میں رہتا آیا ہوں اُن سے اب نکل نہیں سکتا۔ گھاس چھیلنا اب میرے لئے ناممکن ہے۔ آپ کے پاس زمین نہیں جائداد نہیں، رواجی بندش نہیں، آپ بے خوف ہو سکتے ہیں مگر آپ بھی دُم دبائے بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ کو کچھ خبر ہے کہ عدالتوں میں کتنی رشوت چل رہی ہے، کتنے غریبوں کا خون ہو رہا ہے، کتنی عورتیں بدراہ ہو رہی ہیں۔ بے لوثہ بکھنے کا؟ مثال میں دیتا ہوں مع ثبوت کے۔"

اونکارناتھ کچھ نرم ہو کر بولے "جب کبھی ایسا موقع آیا ہے میں نے قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔"

رائے صاحب بھی کچھ نرم ہوئے "ہاں میں مانتا ہوں کہ دو ایک موقعوں پر آپ نے جواں مردی دکھائی مگر آپ کی نظر ہمیشہ اپنے فائدے پر رہی، عوام کے فائدے پر نہیں۔ آنکھیں نہ نکالئے اور نہ چہرہ سُرخ بنائیے جب کبھی آپ میدان میں آئے اس کا اچھا نتیجہ یہی ہوا کہ آپ کی عزت اور آمدنی میں اضافہ ہوا۔ اگر میرے ساتھ بھی آپ وہی چال چل رہے ہوں تو میں آپ کی خاطر کرنے کو تیار ہوں۔ روپئے نہ دوں گا کیوں کہ وہ رشوت ہے، آپ کی اہلیہ کے لئے کوئی زیور بنوا دوں گا۔ ہے منظور؟ اب میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ آپ کو جو خبر ملی ہے وہ غلط ہے، مگر یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اپنے اور سبھی بھائیوں کی طرح میں بھی اسامیوں سے جرمانہ لیتا ہوں اور سال میں دس پانچ ہزار روپئے میرے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ اگر آپ میرے منھ سے یہ لقمہ چھیننا چاہیں گے تو آپ گھاٹے میں رہیں گے۔ آپ بھی دُنیا میں آرام سے رہنا چاہتے ہیں اور میں بھی رہنا چاہتا ہوں۔ اس سے کیا فائدہ کہ آپ انصاف اور فرض کا ڈھونگ کر کے مجھے زیر بار کریں اور خود بھی زیر بار ہوں دل کی بات کہئے۔ میں آپ کا دشمن نہیں ہوں۔ آپ کے ساتھ کتنے ہی

بار ایک چوکے ہیں، ایک میز پر کھا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ تکلیف میں ہیں۔ آپ کی حالت میری حالت سے بھی بدتر ہے۔ ہاں اگر آپ نے شبہ ہریش چندر بننے کی قسم کھائی ہے تو آپ کی خوشی۔ اب میں چلتا ہوں۔"

رائے صاحب کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اونکار ناتھ نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر مصالحانہ انداز سے کہا "نہیں نہیں، ابھی آپ کو بیٹھنا پڑے گا۔ میں اپنی پوزیشن صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ آپ نے میرے ساتھ جو سلوک کئے ہیں ان کے لئے میں آپ کا احسان مند ہوں۔ مگر یہاں اُصول کی بات آگئی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اُصول جان سے بھی زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔"

رائے صاحب کرسی پر بیٹھ کر ذرا میٹھے لہجے میں بولے "اچھا بھئی جو چاہے لکھو میں تمہارے اُصولوں کو توڑنا نہیں چاہتا۔ اور تو کیا ہوگا بدنامی ہوگی ہاں کہاں تک نام کے پیچھے مروں؟ کون ایسا تعلقدار ہے جو اسامیوں کو تھوڑا بہت نہیں ستاتا؟ کتا ہڈی کی حفاظت کرے تو کھائے کیا؟ میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ آئندہ آپ کو اس طرح کی کوئی شکایت نہ ملے گی۔ اگر آپ کو مجھ پر یقین ہے تو اس دفعہ معاف کیجئے کسی دوسرے ایڈیٹر سے میں ایسی خوشامد کرتا۔ اُسے سر بازار پٹوا تا۔ لیکن مجھ سے آپ کی دوستی ہے بس مجھے دبنا ہی پڑے گا۔ یہ اخباروں کا زمانہ ہے۔ سرکار تک ان سے دبتی ہے، میری ہستی کیا؟ آپ جسے چاہیں بنا دیں اور جسے چاہیں بگاڑ دیں۔ خیر یہ جھگڑا ختم کیجئے۔ کہئے آج کل اخبار کی کیا حالت ہے؟ کچھ گاہک بڑھے؟"

اونکار ناتھ نے ناراضامندی سے کہا "کسی نہ کسی طرح کام چلا جاتا ہے اور موجودہ حالت میں میں اس سے زیادہ اُمید نہیں رکھتا۔ میں اس طرف دولت اور آرام کی خواہش لے کر نہیں آیا تھا۔ اس لئے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے

میں پبلک کی خدمت کرنے آیا تھا اور وہ حتی الامکان کئے جاتا ہوں۔ ملک و قوم کا بھلا ہو، یہی میری خواہش ہے۔ ایک شخص کے سُکھ دُکھ کی کوئی قیمت نہیں"

رائے صاحب نے ذرا اور مُلائم ہو کر کہا "یہ سب ٹھیک ہے بھائی صاحب لیکن خدمت کے لئے بھی جینا ضروری ہے۔ مالی افکار میں مبتلا ہوتے ہوئے آپ یکسوئی کے ساتھ خدمت بھی تو نہیں کر سکتے۔ کیا گاہکوں کی تعداد بالکل نہیں بڑھ رہی؟"

"بات یہ ہے کہ میں اپنے اخبار کا معیار کو نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میں بھی آج سینما کے اسٹاروں کی تصاویر اور ان کی سوانح عمریاں چھاپنے لگوں تو گاہک بڑھ سکتے ہیں۔ مگر اپنا تو یہ شعار نہیں اور بھی کتنے ہی ایسے ہتھکنڈے ہیں جن سے اخبار کے ذریعے روپیہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں اُنھیں بُرا سمجھتا ہوں"

"اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج آپ کی اتنی عزت ہے۔ میں ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں، معلوم نہیں آپ اُسے منظور کریں گے یا نہیں۔ آپ میری جانب سے سو آدمیوں کے نام مفت پرچہ جاری کر دیجئے اور قیمت میں دے دوں گا"

اونکار ناتھ نے ممنونیت سے سر جھکا کر کہا "میں شکریہ کے ساتھ آپ کا دان قبول کرتا ہوں۔ افسوس یہی ہے کہ اخباروں کی جانب سے لوگوں میں بڑی بے توجہی ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور مندروں کے لئے پیسے کی کمی نہیں ہے مگر آج تک ایک بھی ایسا سخی نہ نکلا جو اخباروں کی اشاعت کے لئے دان دیتا۔ حالانکہ تعلیمی مقصد جتنے کم خرچ میں اخباروں سے پورا ہو سکتا ہے اتنا اور کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ جیسے تعلیم گاہوں کو مختلف انجمنوں سے امداد ملتی ہے اُسی طرح اگر اخبار نویسوں کو بھی ملنے لگے تو ان غریبوں کو اپنا جتنا وقت اور جتنی جگہ اشتہاروں کی نذر کرنا پڑتی ہے وہ کیوں کرنا پڑے۔ میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں"

رائے صاحب رُخصت ہو گئے۔ اونکار ناتھ کے چہرے پر خوشی کی جھلک نہ تھی رائے صاحب نے کسی طرح کی شرط نہ کی تھی، کوئی بندش نہ لگائی تھی، مگر اونکار ناتھ آج اتنی بڑی نصیحت پاکر بھی اس امداد کو نامنظور نہ کر سکے۔ حالت ایسی تھی کہ انھیں نجات کی کوئی تدبیر ہی نہ سوجھ رہی تھی۔ پریس کے ملازموں کی تین مہینے کی تنخواہ باقی تھی کاغذ والے کو ایک ہزار سے زیادہ دینا تھا۔ یہی کیا کم تھا کہ انھیں ہاتھ نہیں پھیلانا پڑا۔

اُن کی اہلیہ گومتی نے آکر خفگی سے کہا "کیا ابھی کھانے کا وقت نہیں آیا؟ یا یہ بھی کوئی قاعدہ ہے کہ جب تک ایک نہ بج جائے جگہ سے نہ اُٹھو۔ کب تک کوئی چولھا تاکتا رہے؟"

اونکار ناتھ نے غمگین آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ گومتی کی خفگی غائب ہو گئی۔ وہ اُن کی مشکلات کو سمجھتی تھی۔ دوسری عورتوں کے زیور کپڑے دیکھ کر کبھی کبھی اس کے دل میں مخالفت کا جذبہ جاگ اُٹھتا تھا اور وہ شوہر کو دو چار کھری کھوٹی سُنا جاتی تھی۔ مگر اصل میں یہ غصّہ ان پر نہیں بلکہ خود اپنی بدقسمتی پر تھا اور اس کی تھوڑی سی آنچ خواہ مخواہ اونکار ناتھ تک پہونچ ہی جاتی تھی۔ وہ ان کی ریاضت دیکھ کر دل میں کڑھتی بھی تھی۔ اور اُن سے ہمدردی بھی رکھتی تھی بس اُنھیں تھوڑا سا خبطی سمجھتی تھی۔ اُن کا اُداس چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

"کیوں اُداس ہو، پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہے کیا؟"

اونکار ناتھ کو مسکرانا پڑا۔ "کون اُداس ہے؟ میں! مجھے تو آج جتنی خوشی ہے اتنی تو اپنے بیاہ کے دن بھی نہ ہوئی تھی۔ آج صبح صبح پندرہ سو کا سودا ہوا ہے، کسی اچھے کا مُنہ دیکھا تھا۔"

گومتی کو یقین نہ آیا بولی "جھوٹے ہو۔ تمھیں پندرہ سو کہاں ملے جاتے ہیں؟

ہاں پندرہ کہو تو مانے لیتی ہوں"

"نہیں نہیں، تمہارے سر کی قسم، پندرہ سو مارے۔ ابھی رائے صاحب آئے تھے، سو گاہکوں کا چندہ اپنی طرف سے دینے کا وعدہ کر گئے ہیں۔

گومتی کا چہرہ اُتر گیا "تو بل چکے!"

"نہیں رائے صاحب وعدے کے پکے ہیں"

"میں نے کسی تعلقدار کو وعدے کا پکا دیکھا ہی نہیں۔ دادا ایک تعلقدار کے نوکر تھے۔ سال سال بھر تنخواہ نہ ملتی تھی۔ اسے چھوڑ کر دوسرے کی نوکری کی اس نے دو سال تک ایک پائی نہ دی۔ ایک بار دادا گرم ہو پڑے تو مار کر بھگا دیا۔ ان کے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں"

"میں آج ہی بل بھیجتا ہوں"

"بھیجا کرو۔ کہہ دیں گے کہ کل آنا کل اپنے علاقے پر چلے جائیں گے اور تین مہینے میں لوٹیں گے"

اونکارناتھ شک میں پڑ گئے کہیں رائے صاحب بعد کو مکر گئے تو وہ کیا کریں گے؟ پھر بھی دل کڑا کر کے بولے "ایسا نہیں ہو سکتا۔ کم سے کم رائے صاحب کو میں اتنا دھوکے باز نہیں سمجھتا۔ میرا اُن کے یہاں کچھ باقی نہیں ہے"

گومتی نے اسی مشکوک انداز سے کہا "اسی سے تو میں تمہیں بدھو کہتی ہوں ذرا کسی نے ہمدردی دکھائی اور تم پھول اُٹھے یہ موٹے رئیس ہیں۔ ان کے پیٹ میں ایسے کتنے ہی وعدے ہضم ہو سکتے ہیں جتنے وعدے کرتے ہیں اگر سب پورا کرنے لگیں تو بھیک مانگنے کی نوبت آجائے۔ میرے گاؤں کے ٹھاکر صاحب تو دو دو تین تین سال تک بنیوں کا حساب نہ کرتے تھے۔ نوکروں کی تنخواہ تو برائے نام دیتے تھے سال بھر کام لیا اور جب نوکروں نے تنخواہ مانگی تو مار کر نکال دیا۔ کئی بار اسی نادہندی

یہی اُن کے لڑکوں کے نام اسکول سے کٹ گئے۔ آخر انہوں نے لڑکوں کو گھر بلا لیا۔ ایک بار ریل کا ٹکٹ بھی آدھا مانگا تھا۔ یہ رائے صاحب بھی تو ان ہی کے بھائی بند ہیں۔ چلو کھانا کھاؤ اور پکّا حلوہ جو تمہارے بھاگ میں لکھا ہے۔ یہ سمجھ لو، یہ بڑے آدمی تمہیں پھٹکارتے رہیں تو بھی اچھا ہے۔ یہ اگر تمہیں ایک پیسہ دینگے تو اسکا چوگنا اپنے اسامیوں سے وصول کر لیں گے۔ ابھی انکے بارے میں جو کچھ چاہئے بولو لکھو مگر تب تو ٹھکر سہاتی ہی کہنی پڑے گی۔"

پنڈت جی کھا رہے تھے مگر لقمہ منہ میں پھنسا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آخر دل کا بوجھ ہلکا کئے بغیر کھانا مشکل ہو گیا۔ بولے "اگر روپئے نہ دیئے تو ایسی خبر لوں گا کہ یاد کریں گے۔ اُن کی چوٹی میرے ہاتھ میں ہے۔ گاؤں کے لوگ جھوٹی خبر نہیں دے سکتے۔ سچی خبر دیتے تو اُن کی جان نکلتی ہے۔ جھوٹی کیا دیں گے؟ رائے صاحب کے خلاف ایک رپورٹ میرے پاس آئی ہے۔ چھاپ دوں تو بچہ کو گھر سے نکلنا مشکل ہو جائے۔ مجھے وہ خیرات نہیں دے رہے ہیں، بڑے دباؤ میں پڑ کر اس راہ میں آئے ہیں۔ پہلے دھمکیاں دے رہے تھے۔ جب دیکھا کہ یوں کام نہ چلے گا تو یہ چارا پھینکا۔ میں نے بھی سوچا کہ ایک ان کے ٹھیک ہو جانے سے تو ملک سے ظلم مٹا جاتا نہیں، پھر کیوں نہ اس دان کو قبول کر لوں؟ میں اپنے معیار سے گر گیا ہوں ضرور، لیکن اتنے پر بھی رائے صاحب نے دغا کی تو میں بھی شرارت پر اُتر آؤں گا۔ جو غریبوں کو لوٹتا ہے اُسے لوٹنے کے لئے اپنے ضمیر کو بہت سمجھانا بجھانا پڑے گا۔"

(۱۷)

گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ رائے صاحب نے پنچوں کو بلا کر خوب ڈانٹا اور ان لوگوں نے جتنے روپئے وصول کئے تھے وہ سب اُن کے پیٹ سے نکال لئے۔ وہ تو اُن لوگوں

کوئی بھی جوا رہے تھے لیکن ان لوگوں نے ہاتھ پاؤں جوڑ کے ٹھیک کر لیا تھا۔ تب جا کر چھٹکارا ملا۔ دھنیا کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ گاؤں میں گھوم گھوم کر پنچوں کو نادم کرتی پھرتی تھی "آدمی نہ سنے غریبوں کی پکار، بھگوان تو سنتے ہیں۔ لوگوں نے سوچا تھا کہ ان سے ڈانڈ لے کر مجھ سے پھلوریاں کھائیں گے پر بھگوان نے ایسا طمانچہ لگایا کہ پھلوریاں منہ سے باہر نکل پڑیں۔ ایک ایک کے دو دو بھرنے پڑے۔ اب چاٹو میرا گھر لے کر۔"

مگر بیلوں کے بغیر کھیتی کیسے ہو! گاؤں میں بوائی شروع ہو گئی۔ کاتک کے مہینے میں کسان کے بیل مر جائیں تو اس کے دونوں ہاتھ کٹ جاتے ہیں۔ ہوری کے دونوں ہاتھ کٹ گئے تھے۔ اور سب لوگوں کے کھیتوں میں ہل چل رہے تھے، بیج ڈالے جا رہے تھے، کہیں کہیں گیت کی تانیں سنائی دیتی تھیں مگر ہوری کے کھیت کسی بیکس عورت کے گھر کی طرح سونے پڑے تھے۔ پُنیا کے پاس بھی گوئی تھی، سوبھا کے پاس بھی گوئی تھی۔ مگر انہیں اپنے کھیتوں کی بوائی سے فرصت کہاں کہ ہوری کے کھیت بوئیں؟ ہوری دن بھر اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا۔ کہیں اس کے کھیت میں جا بیٹھتا، کہیں اس کی بوائی کرا دیتا۔ اس طرح کچھ اناج مل جاتا۔ دھنیا، سونا، روپا سبھی دوسروں کی بوائی میں لگی رہتی تھیں۔ جب تک بوائی رہی، پیٹ کی روٹیاں ملتی گئیں، اور کوئی خاص تکلیف نہ ہوئی۔ دماغی تکلیف تو ضرور ہوتی تھی مگر کھانے بھر کو مل جاتا تھا۔ رات کو روز میاں بیوی میں تھوڑی سی لڑائی ہو جاتی تھی۔

یہاں تک کہ کاتک بیت گیا اور گاؤں میں مزدوری کا ملنا مشکل ہو گیا۔ اب سارا دار و مدار ایکھ پر تھا جو کھیتوں میں کھڑی تھی۔

رات کا وقت تھا، سردی خوب پڑ رہی تھی۔ ہوری کے گھر میں آج کچھ کھانے کو نہ تھا۔ دن کو تو تھوڑا سا بھُنا ہوا مٹر مل گیا تھا مگر اس وقت چولہا جلنے کا کوئی ڈول

نہ تھا۔ روپا بھوک سے بے حال تھی اور دروازے پر الاؤ کے آگے بیٹھی رو رہی تھی۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں ہے تو کیا مانگے، کیا کھائے؟

جب بھوک نہ برداشت ہوئی تو وہ آگ مانگنے کے بہانے پنیا کے گھر گئی۔ وہ باجرے کی روٹی اور بتھوے کا ساگ پکا رہی تھی۔ مہک سے روپا کے منھ میں پانی بھر آیا۔

کیا ابھی تیرے گھر میں آگ نہیں جلی رہی؟"

روپا نے عاجزی سے کہا "آج تو گھر میں کچھ تھا ہی نہیں کہاں سے آگ جلتی؟"

"تو پھر آگ کاہے کو مانگنے آئی ہے؟"

"دادا تمباکو پئیں گے"

پنیا نے اپلے کی آگ اس کی طرف پھینک دی مگر روپا نے آگ اٹھائی نہیں اور پاس جا کر بولی "تمہاری روٹیاں مہک رہی ہیں، کاکی! مجھے باجرے کی روٹیاں بڑی اچھی لگتی ہیں"

پنیا نے مسکرا کر پوچھا "کھائے گی؟"

"اماں ڈانٹیں گی"

"اماں سے کون کہنے جائے گا؟"

روپا نے پیٹ بھر روٹیاں کھائیں اور جوٹھے منہ بھاگی ہوئی گھر چلی گئی۔

ہوری اداس بیٹھا تھا کہ پنڈت داتا دین نے آ کر پکارا۔ ہوری کا سینہ دھڑکنے لگا۔ کیا کوئی نئی مصیبت آنے والی ہے؟ آگے ان کے پیر چھوئے اور الاؤ کے سامنے ان کے لیے ماچی رکھ دی۔

داتا دین نے بیٹھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا "ابکی تو تمہارے کھیت پرتی

پڑ گئے ہوری۔ تم نے گاؤں بھر کسی سے کچھ کہا ہی نہیں، نہیں تو بھولا کی مجال تھی کہ تمہارے دوار سے بیل کھول لے جاتا۔ یہیں لہو گنگا بہہ جاتی۔ میں تم سے جنیؤ ہاتھ میں لے کر کہتا ہوں ہوری کہ میں نے تمہارے اوپر ڈنڈ نہ لگایا تھا۔ دھنیا مجھے ناحق بدنام کرتی پھرتی ہے۔ یہ سب پٹیشوری لالہ اور جھینگری سنگھ کی کارستانی ہے۔ میں تو لوگوں کے کہنے سے پنچایت میں بیٹھ بھر گیا تھا۔ وہ لوگ تو اور کڑا ڈنڈ لگا رہے تھے۔ میں نے کہہ سن کر کم کرایا۔ مگر اب سب لوگ سر پہ ہاتھ دھر رو رہے ہیں۔ سمجھتے تھے کہ یہاں ان ہی کا راج ہے۔ یہ نہ جانتے تھے کہ گاؤں کا راجا کوئی اور ہے۔ تو اب اپنے کھیتوں کی بوائی کا کیا بندوبست کر رہے ہو؟"

ہوری نے رُندھے گلے سے کہا "کیا بتاؤں مہراج! پرتی رہیں گے۔"

"پرتی رہیں گے! یہ تو بڑا انرتھ ہوگا۔"

"بھگوان کی یہی مرجی ہے تو اپنا کیا بس ہے؟"

"میرے ہوتے تمہارے کھیت کیسے پرتی رہیں گے۔ کل میں تمہاری بوائی کرا دوں گا۔ ابھی کھیتوں میں کچھ تری ہے۔ اُپج دس دن پیچھے ہوگی۔ اسکے سوا اور کوئی بات نہیں ہمارا تمہارا آدھا ساجھا رہیگا۔ اس میں نہ تمہیں کوئی ٹوٹا ہے نہ ہمیں۔ میں نے آج بیٹھے بیٹھے سوچا تو جی بڑا دکھی ہوا کہ جُتے جتائے کھیت پرتی پڑے جاتے ہیں۔"

ہوری سوچ میں پڑ گیا۔ چوماسا بھر ان کھیتوں میں کھاد ڈالی، جوتا اور آج صرف بوائی کے لئے آدھی فصل دینی پڑ رہی ہے۔ اس پر احسان کیسا جتا رہے ہیں۔ مگر اس سے تو اچھا ہی ہے کہ کھیت پرتی پڑ جائیں اور کچھ نہ ملے گا تو لگان تو نکل ہی آئے گا۔ نہیں ابکے ادا نہ ہوا تو بیدخلی آئی دھری ہے۔"

اُس نے یہ تجویز منظور کر لی۔

داتا دین خوش ہو کر بولے "تو چلو، میں ابھی بیج تول دوں جس میں سویرے کا

جھنجھٹ نہ رہے۔ روٹی تو کھا لی ہے نا؟"

ہوری نے لجاتے ہوئے آج گھر میں چولھا نہ جلنے کی بات کہی۔

داتا دین نے میٹھے اپنے پن کے انداز سے کہا "ارے تمہارے گھر میں چولھا نہیں جلا تو تم نے مجھ سے کہا بھی نہیں! ہم تمہارے بیری تو نہیں تھے۔ اسی بات پر تم سے میرا جی کڑھتا ہے۔ ارے بھلے آدمی، اس میں لاج شرم کی کونسی بات ہے؟ ہم سب ایک ہی تو ہیں۔ تم شودر ہوئے تو کیا، ہم براہمن ہوئے تو کیا، ہیں تو سب ایک ہی گھر کے۔ دن سب کے برابر نہیں جاتے۔ کون جانے کل میرے ہی اوپر کوئی سنکٹ آ پڑے تو میں تم سے اپنا دکھ نہ کہوں گا تو کس سے کہوں گا؟ اچھا جو ہوا سو ہوا، چلو بھائی ٹکے اناج کے ساتھ تمہیں من دو من کھانے کو بھی تول دوں گا!"

آدھ گھنٹے میں ہوری من بھر جو کا ٹوکرا سر پہ رکھے آیا اور گھر کی چکی چلنے لگی۔ دھنیا روتی تھی اور سوت کے ساتھ پیستی تھی۔ بھگوان اسے کس پاپ کا یہ ڈنڈ دے رہے ہیں۔

دوسرے دن بوائی شروع ہوئی۔ ہوری کا سارا کنبہ اس طرح کام میں لگا ہوا تھا جیسے سب کچھ پا رہا ہے۔ کئی دن کے بعد سینچائی بھی اس طرح ہوئی۔ داتادین کو مفت کے مزدور مل گئے۔ اب بھی کبھی ان کا لڑکا ماتادین بھی گھر میں آنے لگا۔ جوان آدمی تھا، بڑا عیاش اور بات چیت کا میٹھا۔ داتادین جو کچھ بھی جھپٹ کر لاتے تھے وہ اسے بھنگ بوٹی میں اڑاتا تھا۔ ایک چماری سے اس کی آشنائی ہو گئی تھی اس لئے ابھی تک بیاہ نہ ہوتا تھا۔ وہ رہتی الگ تھی مگر سارا گاؤں یہ بھید جانتے ہوئے بھی کچھ بول نہ سکتا تھا۔ ہمارا دھرم ہے کھانا۔ کھانا پاک رہے پھر ہمارے دھرم پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی۔ روٹیاں ڈھال بن کر بے دھرمی سے ہمیں بچاتی

ملی۔

اب ساجھے کی کھیتی ہونے سے مانا دین کو جھنیا سے گفتگو کرنے کا موقع ملنے لگا۔ وہ ایسے وقت آتا جب گھر میں جھنیا کے سوا اور کوئی نہ ہوتا۔ کبھی کسی بہانے سے کبھی کسی بہانے سے۔ جھنیا شکیل نہ تھی لیکن جوان تھی اور اس کی چماری سے بہتر تھی۔ کچھ دن شہر میں رہ چکی تھی۔ پہننا اوڑھنا، بول چال، وغیرہ سے واقف تھی، اور حیادار بھی تھی جو عورت میں سب سے زیادہ کشش کی چیز ہے۔ مانا دین کبھی کبھی اس کے بچے کو گود میں اُٹھا لیتا اور پیار کرتا۔ جھنیا خوش ہو جاتی تھی۔

ایک دن اُس نے جھنیا سے کہا "تم کیا دیکھ کر گوبر کے ساتھ آئیں، جھونا؟"

جھنیا نے لجاتے ہوئے کہا "بھاگ کھینچ لایا مہراج، اور کیا کہوں؟"

مانا دین نے افسوس سے کہا "بڑا بیوفا آدمی ہے۔ تم جیسی لچھمی کو چھوڑ کر نہ جانے کہاں مارا مارا پھر رہا ہے۔ منچلا آدمی ہے اس سے مجھے شک ہوتا ہے کہ کہیں اور نہ پھنس گیا ہو۔ ایسے آدمیوں کو تو گولی مار دینی چاہیئے۔ آدمی کا دھرم ہے کہ جس کی بانہہ پکڑے اُسے نباہے۔ یہ کیا کہ ایک آدمی کی زندگی بگاڑ دی اور آپ دوسرا گھر جھانکنے لگے"۔

عورت رونے لگی۔ مانا دین نے اِدھر اُدھر تاک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور سمجھانے لگا۔ "تم اس کی کیوں پروا کرتی ہو، جھونا؟ چلا گیا تو چلا جانے دو۔ تمہارے لئے کس بات کی کمی ہے؟ روپیہ پیسہ۔ گہنا کپڑا، جو چاہو مجھ سے لو"۔

جھنیا نے آہستہ سے ہاتھ چھڑا لیا اور پیچھے ہٹ کر بولی "سب تمہاری دیا ہے مہراج! میں تو کہیں کی نہ رہی۔ گھر سے بھی گئی اور یہاں سے بھی گئی۔ نہ مایا ملی نہ رام ہی ملے۔ دُنیا کا رنگ ڈھنگ نہ جانتی تھی۔ اس کی میٹھی میٹھی باتیں سُن کر جال میں پھنس گئی"۔

ماتادین نے گوبر کی برائی کرنی شروع کی۔ "وہ تو پورا لفنگا ہے، نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ جب دیکھو ماں باپ سے لڑائی۔ کہیں پیسہ پا جائے تو فوراً جوا کھیلنے لگے، چرس اور گانجے میں اس کی جان بستی تھی۔ بھلے لوگوں کے ساتھ تھوڑا بیٹھا، بہو بیٹیوں کو چھیڑنا بھی اس کا کام تھا۔ تھانیدار صاحب بدمعاشی میں اس کا چالان کرنے والے تھے، ہم لوگوں نے بڑی منتی کی تب جا کے چھوڑا۔ دوسروں کے کھیت کھلیان سے اناج اڑا لیا کرتا تھا۔ وہ کئی بار پکڑا گیا پر گاؤں گھر کا سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔"

سونا نے باہر سے آ کر کہا "دو بھابھی! اماں نے کہا ہے کہ اناج نکال کر دھوپ میں ڈال دو، نہیں تو پیس کر بہت نکلے گا۔ پنڈت نے تو جیسے اس میں پانی ڈال دیا۔"

ماتادین نے اپنی صفائی دی "معلوم ہوتا ہے کہ تیرے گھر میں برسات نہیں ہوتی۔ پچھا سے میں اکٹھی ہی نمی ہو جاتی ہے۔ اناج تو اناج ہی ہے۔"

یہ کہتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔ سونا نے آ کر اس کا کھیل بگاڑ دیا۔

سونا نے جھنیا سے پوچھا "ماتادین کیا کہنے آئے تھے؟"

جھنیا نے ماتھا سکیڑ کر کہا "دو گھڑی مانگ رہے تھے، میں نے کہہ دیا کہ یہاں نہیں ہے۔"

"یہ سب بہانہ ہے۔ بڑا برا آدمی ہے۔"

"مجھے تو بڑا بھلا آدمی لگتا ہے۔ کیا برائی ہے اس میں؟"

"تم نہیں جانتیں۔ سلیا چمارن کو رکھے ہے۔"

"تو اسی سے برا آدمی ہو گیا؟"

"اور کاہے سے آدمی برا کہا جاتا ہے؟"

"تمہارے بھیا بھی تو مجھے لائے ہیں۔ وہ بھی ویسے آدمی ہیں؟"

سونا نے اس کا جواب نہ دے کر کہا "میرے گھر میں پھر کبھی آئے گا تو دھتکار

دوں گی۔"

"اور جو اس سے تمہارا بیاہ ہو جائے؟"

سونا شرما گئی "تم تو بھابھی گالی دیتی ہو۔"

"کیوں اس میں گالی کی کیا بات ہے؟"

"تجھ سے بولے تو منہ جھلس دوں۔"

"تو کیا تمہارا بیاہ کسی دیوتا سے ہوگا؟ گاؤں میں ایسا سندر سجیلا جوان دوسرا کون ہے؟"

"تو تم ہی چلی جاؤ اس کے ساتھ، سلیا سے لاکھ درجے اچھی ہو۔"

"میں کیوں چلی جاؤں؟ میں تو ایک کے ساتھ چلی آئی، چاہے وہ اچھا ہو یا برا۔"

"تو میں بھی جس کے ساتھ بیاہ ہوگا اس کے ساتھ چلی جاؤں گی، اچھا ہو یا برا۔"

"اور جو کسی بوڑھے کے ساتھ بیاہ ہو گیا؟"

سونا ہنسی "میں اس کے لیے نرم نرم روٹیاں بناؤں گی، اس کی دوائیاں کوٹوں چھانوں گی، اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھاؤں گی اور جب مر جائے گا، تو منہ ڈھانک کے روؤں گی۔"

"اور جو کسی جوان کے ساتھ ہوا؟"

"تب تمہارا سر، ہاں نہیں تو!"

"اچھا بتاؤ، تمہیں بوڑھا اچھا لگتا ہے کہ جوان؟"

"جو اپنے کو چاہے وہی جوان ہے، جو نہ چاہے وہی بوڑھا ہے۔"

"بھگوان کرے کہ تمہارا بیاہ کسی بوڑھے سے ہو جائے تو دیکھوں کہ تم اسے کیسے چاہتی ہو۔ تب تو مناؤ گی کہ یہ نگوڑا کسی طرح مر جائے تو کسی جوان کو لے کر بیٹھ جاؤں۔"

"مجھے تو اس بوڑھے پر دیا آوے ہے۔"

اس سال اِدھر شکر کا ایک مِل کھل گیا تھا۔ اُس کے کارندے اور دلال گاؤں گاؤں گھوم کر کسانوں کی کھڑی ایکھ مول لیتے تھے۔ یہ وہی مِل تھا جسے مسٹر کھنّا نے کھولا تھا۔ ایک دن کارندہ اس گاؤں میں بھی آیا۔ کسانوں نے جو اس سے مول تول کیا تو معلوم ہوا کہ گُڑ بنانے میں کوئی بچت نہیں ہے۔ جب گھر میں ایکھ پیل کر بھی وہی دام ملتے ہیں، تو پیلنے کی زحمت کیوں اُٹھائی جائے۔ سارا گاؤں کھڑی ایکھ بیچنے کو تیار ہو گیا۔ اگر کچھ کم ہی ملے تو پروا نہیں، "نقد" تو ملے گا۔ کسی کو بیل لینا تھا کسی کو لگان دینا تھا، اور کوئی مہاجن سے گلا چھڑانا چاہتا تھا۔ ہوری کو بیل لینے تھے۔ اب کے ایکھ کی پیداوار اچھی نہ تھی۔ پس یہ بھی اندیشہ تھا کہ مال نہ پڑے گا۔ اور جب گُڑ کے بھاؤ مِل کی چینی ملے گی تو گُڑ لے ہی گا کون؟ سبھی نے بیعانے لے لیے۔ ہوری کو کم از کم ایک سو روپے کی امید تھی۔ اتنے میں ایک معمولی جوڑ آ جائے گی۔ لیکن مہاجنوں کو کیا کرے؟ داتادین، منگرو، دُلاری، جھنگری سنگھ، سبھی تو جان کھا رہے تھے۔ اگر مہاجنوں کو دینے لگے تو سو روپے سود بھر کو بھی نہ ہوں گے۔ کوئی ایسی حکمت نہ سوجھتی تھی کہ ایکھ کے روپے آ جائیں اور کسی کو خبر نہ ہو۔ جب بیل گھر آ جائیں گے تب کوئی کیا کرے گا؟ گاڑی تُلے گی تو سارا گاؤں دیکھے ہی گا۔ تول پر جو روپے ملیں گے وہ سب کو معلوم ہی ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ منگرو اور داتادین ہمارے ساتھ رہیں۔ اِدھر روپے ملے اور اُدھر انہوں نے گردن دبائی۔

شام کو گردھر نے پوچھا "تمہاری اوکھ کب تک جائے گی، ہوری کاکا؟"

ہوری نے جھانسہ دیا "ابھی تک تو کچھ ٹھیک نہیں ہے بھائی، تم کب تک لے جاؤ گے؟"

گردھر نے بھی جھانسہ دیا "ابھی تو میرا بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے کاکا!"

اور لوگ بھی اسی طرح باتیں کرتے تھے۔ کسی کو کسی پر اعتبار نہ تھا۔ جھنگری سنگھ کے سبھی قرض دار تھے اور سب یہی چاہتے تھے کہ اس کے ہاتھ روپیے نہ جانے پائیں ورنہ وہ سب کا سب ہضم کر جائے گا۔ اور جب دوسرے دن اسامی پھر روپیہ مانگنے جائے گا تو نیا کاغذ، نیا نذرانہ اور نئی تحریر!۔

دوسرے دن سوبھا آکر بولا "دادا کوئی ایسی تدبیر کرو کہ جھنگری کو کڑی آ جائے۔ ایسا گرے کہ پھر نہ اُٹھے"۔

ہوری نے مسکرا کر کہا "کیوں، اس کے بال بچے نہیں ہیں کیا؟"

"اس کے بال بچوں کو دیکھیں کہ اپنے بال بچوں کو؟ وہ تو دو دو عورتوں کو آرام سے رکھتا ہے اور یہاں تو ایک ہی کو روکھی روٹی بھی نہیں ملتی۔ ساری جمع لے لے گا، ایک پیسہ بھی گھر نہ لانے دے گا"

"میری تو حالت اور بھی بُری ہے بھائی۔ اگر روپیے ہاتھ سے نکل گئے تو جیٹ جاؤں گا۔ گوئی کے بنا تو کام نہ چلے گا"۔

"ابھی تو دو تین دن اوکھ ڈھوتے لگیں گے۔ جیوں ہی ساری اوکھ پہنچ جائے جمعدار سے کہیں کہ بھیّا کچھ لے لے مگر اوکھ جھٹ پٹ تول دے۔ دام پیچھے دینا۔ ادھر جھنگری سے کہہ دیں گے کہ ابھی روپیے نہیں ملے"۔

ہوری نے سوچ کر کہا "جھنگری ہم سے تم سے کئی گنا چالاک ہے سوبھا۔ جاکر منیم سے ملے گا اور اسی سے روپیہ لے لے گا۔ ہم تم تاکتے ہی رہ جائیں گے۔ جن کھنڈسالوں کا مل ہے ان ہی کے مہاجنی کوٹھی بھی ہے۔ دونوں ایک ہیں"۔

سوبھا نراس ہو کر بولا "نہ جانے ان مہاجنوں سے کبھی پنڈ چھوٹے گا کہ نہیں؟"

ہوری بولا "اس جنم میں تو کوئی آس نہیں ہے بھائی! ہم راج پاٹ، سکھ چین

نہیں چاہئے، ہاں موٹا جھوٹا پہننا اور موٹا جھوٹا کھانا اور مرجاد کے ساتھ رہنا چاہئے ہیں وہ بھی نہیں ہو پاتا۔"

سوبھا نے شیطنت سے کہا "میں تو دادا، ان سبھوں کو ایک چکمہ دوں گا۔ جمعدار کو کچھ دے دلاکر اس بات پر راضی کر لوں گا کہ روپئے کے لئے ہمیں خوب دوڑائیں جھنگری کہاں تک دوڑیں گے؟"

ہوری نے مٹلس کر کہا "یہ سب کچھ نہ ہوگا بھیا! کُشل اسی میں ہے کہ جھنگری سنگھ کے ہاتھ پاؤں جوڑ دو۔ ہم جال میں پھنسے ہوئے ہیں، جتنا ہی پھڑپھڑائیں گے اتنا ہی اور پھنستے جائیں گے۔"

"تم تو دادا، بوڑھوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ کٹگھرے میں پھنسے بیٹھے رہنا تو مردی نہیں ہے۔ پھندا اور جکڑ جائے تو جکڑ جائے پر گلا چھڑانے کے لئے بل تو لگانا ہی پڑے گا۔ یہی تو ہوگا کہ جھنگری گھر دوار نیلام کرا لیں گے، کرا لیں نیلام! میں تو چاہتا ہوں کہ ہمیں کوئی روپیہ نہ دے، ہمیں بھوکوں مرنے دے، لاتیں کھانے دے، ایک پیسہ بھی اُدھار نہ دے! لیکن پیسہ والے اُدھار نہ دیں تو بیاج کہاں سے پاویں؟ ایک ہمارے اوپر دعویٰ کرتا ہے تو دوسرا ہمیں کچھ کم بیاج پر روپیہ دیکر اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے۔ میں تو اسی دن روپیہ لینے جاؤں گا جس دن جھنگری کہیں چلا گیا ہوگا۔"

ہوری کا دل بھی پھر گیا! بولا "ہاں ٹھیک ہے۔"

"اوکھ تلوا دیں گے، پھر روپیہ اپنی گھات دیکھ کر لائیں گے۔"

"بس بس یہی چال چلو۔"

دوسرے دن بڑے سویرے گاؤں کے کئی آدمیوں نے ایکھ کاٹنا شروع کیا ہوری بھی اپنے کھیت میں گنڈاسہ لے کر پہنچا۔ اُدھر سے سوبھا بھی اس کی مدد کو آ گیا۔

پنیا، جھنیا، دھنیا، سونا سبھی کھیت میں پہنچ گئیں۔ کوئی اکھ کاٹتا تھا، کوئی چھیلتا تھا، کوئی گٹھے باندھتا تھا۔ مہاجنوں نے جو اکھ کٹتے دیکھا تو پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ ایک طرف سے دُلاری دوڑی، دوسری طرف سے منگرو ساہ، تیسری طرف سے داتادین اور پٹیشوری اور جھنگری کے پیادے۔ دُلاری ہاتھ پیروں میں موٹے موٹے چاندی کے کڑے پہنے، کانوں میں سونے کے جھومکے ڈالے، آنکھوں میں کاجل لگائے، بوڑھے شباب کو رنگے اور سنوارے ہوئے آکر بولی "پہلے میرے روپے دے دو تب اوکھ کاٹنے دوں گی۔ میں جتنا ہی گم کھاتی ہوں، اُتنا ہی تم سیر ہوتے ہو۔ دو سال سے ایک دھیلا بیاج نہیں دیا۔ پچاس تو میرے بیاج ہی کے ہوتے ہیں!"

ہوری نے گھگھیا کر کہا "بھابھی، اوکھ کاٹ لینے دو، اس کے روپے ملتے ہیں تو جتنا ہو سکے گا تمہیں بھی دوں گا۔ نہ گاؤں چھوڑ کر بھاگا جاتا ہوں نہ اتنی جلدی مرا جاتا ہوں۔ کھیت میں کھڑی ہے تو اوکھ روپے اُلٹ دے گی!"

دُلاری نے اس کے ہاتھ سے گنڈاسہ چھین کر کہا "نیت اتنی کھوٹی ہے تم لوگوں کی جبھی تو برکت نہیں ہوتی!"

آج پانچ سال ہوئے، ہوری نے دُلاری سے تیس روپے لئے تھے۔ تین سال میں تیس کے سو ہو گئے۔ اس وقت اسٹامپ لکھا گیا۔ دو سال میں اس پر پچاس روپے سود چڑھ گیا تھا۔

ہوری بولا "سیٹھانی، نیت تو کبھی نہیں بگاڑی، اگر بھگوان چاہیں گے تو پائی پائی چکا دوں گا۔ ہاں آج کل تنگ ہو گیا ہوں، جو چاہے کہہ لو!"

سیٹھانی کو جاتے دیر نہ ہوئی تھی کہ منگرو ساہ پہنچے۔ سیاہ رنگ، توند کمر کے نیچے لٹکتی ہوئی، دو بڑے بڑے دانت سامنے جیسے کاٹ کھانے کو نکلے ہوئے، سر پر ٹوپی گلے میں چادر، عمر ابھی پچاس سے زیادہ نہیں مگر لاٹھی کے سہارے چلتے تھے۔ گٹھیا کا عارضہ

تھا۔ کھانسی بھی آتی تھی۔ لاٹھی ٹیک کر کھڑے ہو گئے اور ہوری کو ڈانٹ بتائی "پہلے ہمارے روپئے دے دو ہوری، تب اور کچھ کہنا۔ ہم نے روپئے ادھار دیئے تھے، دان نہیں دیا تھا۔ تین تین سال ہو گئے نہ سود نہ بیاج۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ تم میرے روپئے ہضم کر جاؤ گے میں تمہارے مردے سے بھی وصول کر لوں گا۔"

سوبھا مسخرا تھا بولا "تب کاہے کو گھبراتے ہو ساہ جی؟ ان کے مردے سے وصول کر لینا۔ نہیں ایک دو سال کے آگے پیچھے دونوں ہی سرگ میں پہنچ گے تب وہیں بھگوان کے آگے اپنا حساب چکا لینا۔"

منگرو نے سوبھا کو بہت برا بھلا کہا، جمع مار، بے ایمان وغیرہ۔ "لینے کی بیر تو دم ہلاتے ہو اور جب دینے کی باری آتی ہے تو گرّاتے ہو۔ گھر بکوا لوں گا، بیل بدھیے نیلام کرا لوں گا۔"

سوبھا نے پھر چھیڑا "اچھا ایمان سے بتاؤ ساہ جی، کتنے روپئے دیئے تھے جس کے اب تین سو ہو گئے ہیں؟"

"جب تم سال کا سال سود نہ دو گے تو آپ ہی بڑھیں گے۔"

"پہلے پہل کتنے روپئے دیئے تھے تم نے؟ پچاس ہی تو؟"

"کتنے دن ہوئے یہ بھی تو دیکھو۔"

"پانچ چھ سال ہوئے ہوں گے۔"

"دس سال ہو گئے پورے، گیارہواں جا رہا ہے۔"

"پچاس روپئے سے تین سو لیتے ہوئے تمہیں تنک بھی شرم نہیں آتی؟"

"شرم کیسی؟ روپئے دیئے ہیں کہ خیرات مانگتے ہیں۔"

ہوری نے انھیں بھی منت سماجت کر کے رخصت کیا۔ داتا دین نے ہوری کی شرکت میں کھیتی کی تھی۔ بیج دے کر آدھی فصل لے لیں گے۔ اس وقت کچھ چھیڑ چھاڑ کرنا مصلحت

کے خلاف تھا۔ جھنگری سنگھ نے مل کے مینجر سے پہلے ہی سب کچھ کہہ سن رکھا تھا۔ ان کے پیاوے گاڑیوں پر اوکھ لدوا کر ناؤ پر پہنچا رہے تھے۔ ندی ناؤ سے نصف میل پر تھی۔ ایک گاڑی دن بھر میں سات آٹھ چکر کر لیتی تھی اور ناؤ ایک کھیوے میں پچاس گاڑیوں کا بوجھ لاد لیتی تھی۔ اس طرح بڑی کفایت ہوتی تھی۔ اس سہولت کا بندوبست کر کے جھنگری سنگھ نے سارے علاقے کو اپنا ممنون بنا لیا تھا۔

تول شروع ہوتے ہی جھنگری نے مل کے پھاٹک پر آسن جما لیا۔ ہر ایک کی اوکھ تولاتے تھے، قیمت کا پرزہ لیتے تھے، خزانچی سے روپے وصول کرتے تھے اور اپنی باقی کاٹ کر اسامی کو دے دیتے تھے۔ اسامی کتنا ہی روئے چیخے، مگر وہ کسی کی نہ سنتے تھے۔ مالک کا یہی حکم تھا، اُن کا کیا بس؟

ہوری کو ایک سو بیس روپئے ملے۔ اس میں سے جھنگری نے اپنے کل روپئے مع سود کاٹ کر کوئی پچیس روپیے ہوری کے حوالے کئے۔

ہوری نے روپئے کی طرف بے غرضانہ انداز سے دیکھ کر کہا "یہ لے کر میں کیا کروں گا ٹھاکر؟ یہ بھی تم ہی لے لو۔ میرے لئے مجوری بہت ملے گی۔"

جھنگری نے پچیسوں روپئے زمین پر پھینک کر کہا "لو یا پھینک دو، تمہاری خوشی۔ تمہارے کارن مالک کی گھڑکیاں کھائیں اور ابھی رائے صاحب سر پر سوار ہیں کہ ڈنڈ کے روپئے ادا کرو۔ تمہاری گریبی پر ترس کھا کر اتنے روپئے دیتا ہوں، نہیں ایک دھیلا بھی نہ دیتا۔ اگر رائے صاحب نے کڑائی کی تو گھر سے دینے پڑیں گے۔"

ہوری نے چپکے سے روپئے اٹھا لئے اور باہر نکلا کہ نوکھے رام نے للکارا۔ ہوری نے جا کر پچیسوں روپئے ان کے ہاتھ میں رکھ دیئے اور بلا کچھ کہے فوراً بھاگ گیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔

سوبھا کو بھی اتنے ہی روپئے ملے تھے وہ باہر نکلا تو ٹیٹیشوری نے آگھیرا۔

سوبھا بدل پڑا، بولا "میرے پاس روپئے نہیں ہیں، تمہیں جو کچھ کرنا ہے کرلو۔"

ٹیٹیشوری نے گرم ہوکر کہا "اوکھ بیچی ہے کہ نہیں؟"

"ہاں بیچی ہے۔"

"تمہارا یہی وعدہ تو تھا کہ اوکھ بیچ کر روپیہ دوں گا؟"

"ہاں تھا تو۔"

"پھر کیوں نہیں دیتے؟"

"میرے پاس اب جو کچھ بچا ہے وہ بال بچوں کے لئے ہے۔"

ٹیٹیشوری نے دھمکا کر کہا "تم تو روپئے دوگے سوبھا، اور ہاتھ جوڑ کر اور آج ہی۔ ابھی جتنا چاہو بہک لو۔ ایک رپٹ میں جاؤ گے چھ مہینے کو، پورے چھ مہینے کو، نہ ایک دن کم نہ جیادہ۔ یہ جو روج جُوا کھیلتے ہو وہ ایک رپٹ میں نکل جائے گا۔ میں جمیندار یا مہاجن کا نوکر نہیں ہوں۔ میں سرکار بہادر کا نوکر ہوں جس کا دُنیا بھر راج ہے، اور جو تمہارے مہاجن جمیندار دونوں کا مالک ہے۔"

ٹیٹیشوری لال آگے بڑھ گئے۔ سوبھا اور ہوری کچھ دور چپ چاپ چلے گویا اس دھمکی نے اُنہیں بدحواس کر دیا ہو۔ پھر ہوری نے کہا "سوبھا اس کے روپئے دیدو، سمجھ لو کہ اوکھ میں آگ لگ گئی۔ میں نے بھی یہی سوچ کر جی کو سمجھا لیا ہے۔"

سوبھا نے چوٹ کھائے ہوئے لہجے سے کہا "ہاں دے دوں گا دادا۔ نہ دوں گا تو جاؤں گا کہاں؟"

سامنے سے گرودھر تاڑی پئے ہوئے۔ جھومتا چلا آتا تھا۔ دونوں کو دیکھ کر بولا۔

"جھنگڑیا نے سب کا سب لے لیا، ہوری کا کا۔ چبینا کو بھی ایک پیسہ نہ چھوڑا۔ ہتیا ہی نہیں کا! رو دیا، ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا مگر اس پاپی کو دیا نہ آئی۔"

سو بھانے کہا "دو تاڑی تو پئے ہوئے ہو، اس پر کہتے ہو کہ ایک پیسہ نہ چھوٹا!"

گبر دھر نے پیٹ دکھا کر کہا "بھا بخہ ہو گئی! جو پانی کی بوند بھی گلے کے نیچے گئی ہو، ایک اکنی منھ میں دبا لی تھی سو اسی کی تاڑی پی لی۔ سوچا کہ سال بھر پسینہ بہایا ہے تو ایک دن تاڑی تو پی لوں۔ مگر سچ کہتا ہوں کہ نشہ نہیں ہے۔ ایک آنے میں نشہ کیا ہو گا؟ ہاں جھوم رہا ہوں جس میں لوگ سمجھیں کہ بہت پئے ہوئے ہے۔ بڑا اچھا ہوا کا کا، بیباکی ہو گئی۔ بیس لئے تھے جس کے ایک سو سا ٹھ بھرے، کچھ حد ہے!"

ہوری گھر پہنچا تو روپا پانی لے کر دوڑی، سونا چلم بھر لائی، دھنیا نے چربن اور نمک لا کر رکھ دیا اور سبھی آس بھری آنکھوں سے اس کی طرف تاکنے لگیں۔ جھنیا بھی چوکھٹ پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ ہوری اداس بیٹھا تھا، کیسے منھ ہاتھ دھوئے؟ کیسے چربن چبائے؟ ایسا نادم اور ملول تھا گویا خون کر کے آیا ہو۔

دھنیا نے پوچھا "کتنے کی تول ہوئی؟"

"ایک سو بیس ملے، پر سب وہیں لٹ گئے۔ دھیلا بھی نہ بچا!"

دھنیا سر سے پیر تک جل گئی۔ دل میں ایسا اشتعال ہوا کہ اپنا منھ نوچ ڈالے۔ بولی "تم جیسا بدھو آدمی بھگوان نے کیوں بنایا؟ کہیں ملتے تو ان سے پوچھتی۔ تمہارے ساتھ ساری جندگی مٹی ہو گئی۔ بھگوان موت بھی نہیں دیتے کہ اس جنجال سے جی چھوٹے۔ اٹھا کر سب روپے اپنے بہنوئیوں کو دے دیئے، اب اور کون آمدنی ہے جس سے گوئی آوے گی؟ ہل میں کیا مجھے جوتو گے یا آپ جتو گے؟ میں کہتی ہوں کہ تم بوڑھے ہوئے اور تمہیں اتنی اکل بھی نہ آئی کہ گوئی بھر کے تو روپے نکال لیتے۔ کوئی تمہارے ہاتھ سے چھین تھوڑے ہی لیتا۔ پوس کی یہ سردی ہے اور کسی کے تن پر لتا نہیں ہے۔ لے جاؤ سب کو ندی میں ڈبا دو! رو رو کر مرنے سے تو ایک دن مر جانا اچھا ہے۔ کب تک پوال میں گھس کر رات کاٹیں گے؟ اور پوال میں گھس بھی رہیں تو پوال کھا کر رہا تو

نہ جائے گا، تمہاری اچھا ہو گھاس ہی کھاؤ پر ہم سے گھاس نہ کھائی جائے گی۔"

یہ کہتے کہتے وہ مسکرا پڑی۔ اتنی دیر میں اس کی سمجھ میں یہ بات آنے لگی تھی کہ مہاجن جب سر پر سوار ہو جائے اور اپنے ہاتھ میں روپے ہوں اور مہاجن جانتا ہو کہ اس کے پاس روپے ہیں تو اسامی اپنی جان کیسے بچا سکتا ہے؟

ہوری سر جھکائے اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔ دھنیا کا مسکرانا اسے نہ دکھائی دیا بولا "مجوری تو ملے گی۔ مجوری کر کے کھائیں گے۔"

دھنیا نے پوچھا "کہاں ہے اس گاؤں میں مجوری؟ اور کون منھ لے کر مجوری کرو گے؟ مہتو نہیں کہلاتے!"

ہوری نے حقّے کے کئی کش لگا کر کہا "مجوری کرنا کوئی پاپ نہیں ہے۔ مجور بن جائے تو کسان ہو جاتا ہے اور کسان بگڑ جائے تو مجور ہو جاتا ہے۔ مجوری کرنا بدا نہ ہوتا تو یہ سب بپت کیوں آتی؟ کیوں گائے مرتی؟ کیوں لڑکا نالایک نکل جاتا؟"

دھنیا نے بہو بیٹیوں کی طرف دیکھ کر کہا "تم سب کی سب کیوں گھیرے کھڑی ہو؟ جاؤ اپنا کام دیکھو۔ وہ اور ہیں جو باہر سے آتے ہیں تو بال بچوں کیلئے دو چار پیسے کا کچھ لئے آتے ہیں۔ یہاں تو یہ لالچ لگ رہا ہو گا کہ روپیہ ترا اوپر کیسے؟ ایک کم نہ ہو جائے گا! اسی سے ان کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی۔ جو کھرچ کرتے ہیں انہیں ملتا ہے۔ جو نہ کھا سکیں، نہ پہن سکیں انہیں روپیہ ملے ہی کیوں؟ دھرتی میں گاڑنے کے لئے؟"

ہوری نے ہنس کر پوچھا "کہاں ہے وہ گڑی ہوئی جمع؟"

"جہاں رکھی ہے، وہیں ہو گی۔ رونا تو یہی ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی پیسے کے لئے مرتے ہو۔ چار پیسے کا کچھ لا کر بچوں کے ہاتھ پر رکھ دیتے تو پانی میں نہ پڑ جاتے۔ جھنگڑی سے تم کہہ دیتے کہ ایک روپیہ مجھے دے دو، نہیں تو میں تمہیں ایک پیسہ نہ دوں گا۔

جا کر عدالت میں لینا، تو وہ ضرور دیتا۔"

ہوری شرمندہ ہو گیا۔ اگر وہ جھنیا کے پچیسوں روپے تو کھے رام کو نہ دے دیتا تو وہ کیا کر لیتے؟ بہت ہوتا تو بقایا پر دو چار آنہ سود لے لیتے۔ مگر اب تو بھول ہو گئی۔

جھنیا نے اندر جا کر سونا سے کہا "مجھے تو دادا پر بڑی دیا آتی ہے۔ بیچارے دن بھر کے تھکے ماندے گھر آئے تو اماں کوسنے لگیں۔ مہاجن گلا دبائے تھا تو کیا کرتے؟"

"تو بیل کہاں سے آویں گے؟"

"مہاجن اپنے روپئے چاہتا ہے۔ اُسے تمہارے گھر کے دکھڑوں سے کیا مطلب؟"

اماں وہاں ہوتیں تو مہاجن کو نیچا دکھا دیتیں۔ ابھاگا رو کر رہ جاتا۔"

جھنیا نے مذاق کیا "تو یہاں روپیوں کی کون کمی ہے؟ مہاجن سے تنگ ہنس کر بول دو۔ پھر دیکھو کہ وہ سارے روپئے چھوڑ دیتا ہے کہ نہیں۔ سچ کہتی ہوں کہ دادا کا سب دکھ دلدر دور ہو جائے۔"

سونا نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا منہ دبا کر کہا "بس چپ رہنا۔ نہیں کہے دیتی ہوں۔ ابھی جا کر اماں سے ماتادین کی ساری بات کھول دوں تو رونے لگو۔"

جھنیا نے پوچھا "کیا کہہ دو گی اماں سے؟ کہنے کی کوئی بات بھی ہو۔ جب وہ کسی بہانے سے گھر میں آجاتے ہیں تو کیا کہہ دوں کہ نکل جاؤ؟ پھر مجھ سے کچھ لے تو نہیں جاتے، کچھ اپنا ہی دے جاتے ہیں۔ سوائے میٹھی میٹھی باتوں کے وہ جھنیا سے کچھ نہیں پا سکتے اور اپنی میٹھی باتوں کو مہنگے داموں بیچنا بھی مجھے آتا ہے۔ میں ایسی انّاڑی نہیں ہوں کہ کسی کے جھانسے میں آجاؤں۔ ہاں جب جانوں گی کہ تمہارے بھیّا نے وہاں

کسی کو رکھ لیا ہے۔ تب کی نہیں چلاتی۔ تب میرے اوپر کسی کا کوئی بندھن نہ رہے گا۔ ابھی تو مجھے لبسو اس ہے کہ وہ میرے ہی اور میرے ہی کارن انھیں گلی گلی ٹھوکر کھانا پڑ رہا ہے ہنسنے بولنے کی بات اور ہے۔ پر میں اُن سے بسواس گھات نہ کروں گی۔ جو ایک سے دو ہو گیا وہ کسی کا نہیں رہتا۔"

سو بھاگ نے آگر ہوری کو پکارا اور پچیس روپے اس کے ہاتھ میں رکھ کر بولا " بھیا، تم جاکر یہ روپئے لالا کو دے دو۔ مجھے اُس گھڑی نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔"

ہوری روپئے لے کر اُٹھا ہی تھا کہ سنکھ کی آواز کانوں میں آئی۔ گاؤں کے دوسرے سرے پر دھیان سنگھ نامی ایک ٹھاکر رہتے تھے۔ فوج میں نوکر تھے اور کئی دن ہوئے کہ دس سال بعد رخصت لے کر آئے تھے۔ بغداد، عدن، سنگاپور، برما چاروں طرف گھوم چکے تھے۔ اب بیاہ کرنے کی فکر تھی۔ اس لئے پوجا پاٹ کر کے برہمنوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے۔

ہوری نے کہا " معلوم ہوتا ہے کہ سانوں ادھیائے پورے ہو گئے۔ آرتی ہو رہی ہے۔"

سو بھا بولا " ہاں معلوم تو ہوتا ہے، چلو آرتی لے لیں۔"

سو بھانے متفکرانہ لہجے میں کہا " تم جاؤ، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

دھیان سنگھ جس دن آئے تھے سب کے گھر سیر سیر بھر مٹھائی بانٹی تھی۔ ہوری سے جب کبھی راستے میں مل جاتے تو خیر و عافیت پوچھتے۔ اُن کی کتھا جا کر آرتی میں کچھ نہ دینا ذلت کی بات تھی۔

آرتی کا تھال اُن ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ اُن کے سامنے ہوری کیسے خالی ہاتھ آرتی لے گا۔ اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ وہ کتھا میں جائے ہی نہیں۔ اتنے آدمیوں میں انھیں

کیا یاد آئے گی کہ ہوری نہیں آیا۔ کوئی رجسٹر لیے تو بیٹھا نہیں کہ کون آیا۔ وہ جا کر چارپائی پر لیٹ رہا۔

مگر وہ دل میں مسوس مسوس کر رہ جاتا تھا۔ اسکے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے، تانبے کا ایک پیسہ! آرتی کے پن اور مہاتم کا اُسے بالکل دھیان نہ تھا۔ بات تھی صرف بیوہار کی۔ ٹھاکر جی کی آرتی ہو تو وہ صرف اپنی بھگتی کی بھینٹ دے سکتا تھا، مگر رواج کیسے توڑے؟ سب کی نگاہوں میں ہیچ کیسے بنے؟

دفعتاً وہ اُٹھ بیٹھا۔ کیوں رواج کی غلامی کرے؟ رواج کیلئے آرتی کا پن کیوں چھوڑے؟ لوگ ہنسیں گے تو ہنس لیں، اُسے پروا نہیں ہے۔ بھگوان اُسے بُرے کاموں سے بچائے رکھیں، اور وہ کچھ نہیں چاہتا۔

وہ ٹھاکر کے گھر کی طرف چل پڑا۔

(۱۸)

کھنا اور گوبندی میں نہیں پٹتی۔ کیوں نہیں پٹتی؟ یہ بتلانا مشکل ہے۔ نجوم کے نقطۂ خیال سے اُن کے ستاروں میں کوئی مخالفت ہے حالانکہ شادی کے وقت اُن سب کی پوری مطابقت کر لی گئی تھی۔ کوک شاستر کے حساب سے اس اَن بَن کا کوئی اور بھید ہو سکتا ہے اور نفسیات والے کچھ اور ہی سبب کھوج سکتے ہیں۔ ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ اُن میں نہیں پٹتی۔ کھنا دولت مند ہیں، حُسن پرست ہیں، ملنسار ہیں، شکیل ہیں، خاصے پڑھے لکھے ہیں اور شہر کے خاص لوگوں میں ہیں۔ گوبندی حور نہ ہو کر خوبصورت ضرور ہے۔ گندمی رنگ، شرمیلی آنکھیں جو سامنے ایک بار اُٹھ کر پھر جھک جاتی ہیں، رُخساروں پہ سُرخی نہ ہو کر چکناہٹ ہے، نازک بدن، اعضاء کا تناسب درست، گول گول بازو، چہرہ پہ ایک طرح کی بدمزگی جس میں کچھ غرور کی جھلک بھی ہے۔ گویا

دنیا کے کاروبار کو ہیچ سمجھتی ہے۔ کھنّا کے پاس عیش کے ظاہری سامانوں کی کمی نہیں۔ اعلیٰ درجے کا بنگلہ ہے، اعلیٰ درجے کا فرنیچر، اعلیٰ درجے کا موٹر، اور بے انتہا دولت، مگر گوبندی کی نظر میں گویا ان اشیاء کی کوئی وقعت نہیں۔ اس کھارے سمندر میں وہ پیاسی پڑی رہتی ہے۔ بچوں کی پرورش و پرداخت اور گرہستی کے چھوٹے موٹے کام ہی اس کیلئے سب کچھ ہیں۔ وہ ان میں اتنی منہمک رہتی ہے کہ عیش و عشرت کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ کشش کیا چیز ہے اور وہ کیسے پیدا ہو سکتی ہے اس پر اس نے کبھی غور نہیں کیا۔ وہ مرد کا کھلونا نہیں، نہ اس کی لطف آفرینی کی چیز ہے پھر کیوں دلکش بننے کی کوشش کرے؟ اگر مرد اس کا اصلی حسن دیکھنے کیلئے آنکھیں نہیں رکھتا، حسینوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے تو یہ اس کی بدقسمتی ہے۔ وہ اسی محبت اور اسی لگن سے شوہر کی خدمت کئے جاتی ہے گویا نفرت اور رغبت کے جذبات کو مغلوب کر لیا ہو۔ اور یہ بے انتہا دولت تو جیسے اس کی روح کو کچلے ڈالتی ہے باقی رہتی ہے۔ اس نمود و نمائش سے چھٹکارا پانے کیلئے اس کا جی ہمیشہ للچایا کرتا ہے۔ اپنی سادہ اور قدرتی زندگی میں وہ کتنا خوش رہ سکتی تھی، اسکا وہ ہمیشہ خواب دیکھتی رہتی ہے۔ تب کیوں مالتی اس کی راہ میں آکر حائل ہو جاتی؟ کیوں طوائفوں کے مجرے ہوتے؟ کیوں یہ شک اور تصنّع اور بے اطمینانی اس کی زندگی کے راستے میں کانٹے بنتے؟ بہت پہلے جب وہ بالکا ودیالیہ میں پڑھتی تھی، اسے شاعری کا روگ لگ گیا تھا، جس میں درد و غم ہی زندگی کا ماحصل ہے دولت اور عشرت تو صرف اسلئے ہیں کہ ان کی ہولی جلائی جائے، جو انسان کو لغویت اور پریشانی کی طرف لے جاتی ہیں۔ وہ اب بھی کبھی کبھی نظم کہتی تھی، مگر سناتے کسے؟ اس کی نظم صرف دل کی لہر اور تخئیل کی اڑان نہ تھی، اس کے ایک ایک لفظ میں اس کی زندگی کا درد اور یاس کے آنسو، دل کی ٹھنڈی جلن جلوہ گر ہوتی تھی۔ کسی ایسی جگہ جا بسنے کی خواہش تھی، جہاں وہ ظاہرداریوں اور غلطیوں سے دور

رہ کر اپنی پُرسکون کُٹیا میں قدرتی مسرّت کا لُطف اُٹھائیے۔ کھنّا اسکے اشعار دیکھتے تو مضحکہ اُڑاتے اور کبھی کبھی پھاڑ کر پھینک بھی دیتے۔ اور دولت کی یہ دیوار روز بروز بلند ہوتی جاتی تھی اور دونوں کو ایک دوسرے سے دور اور جُدا کرتی جاتی تھی۔ کھنّا اپنے گاہکوں کے ساتھ جتنا ہی میٹھا اور نرم تھا گھر میں اتنا ہی تلخ اور سخت۔ اکثر غصّے میں گوبندی کو بُری بات کہہ بیٹھتا، خوش خلقی اس کیلئے صرف دُنیا کو ٹھگنے کا ایک ذریعہ تھی، انسانی سرشت نہیں۔ ایسے موقعوں پر گوبندی اپنے سونے کے کمرے میں جا بیٹھتی اور رات کی رات رویا کرتی اور کھنّا دیوان خانے میں مجرے سُنتا یا کلب میں جا کر شراب کی بوتلیں خالی کرتا۔ لیکن سب کچھ ہونے پر بھی کھنّا اس کے سب کچھ تھے۔ وہ پامال اور ذلیل ہو کر بھی کھنّا کی لونڈی تھی۔ اس سے لڑے گی، جلے گی، روئے گی، مگر رہے گی ان ہی کی۔ ان سے جُدا گانہ زندگی کا وہ کوئی خیال ہی نہ کر سکتی تھی۔

آج مسٹر کھنّا کسی بُرے کا مُنہ دیکھ کر اُٹھے تھے۔ سویرے ہی اخبار کھولا تو ان کے کئی اسٹاکوں کا نرخ گھٹ گیا تھا جسمیں اُنہیں کئی ہزار کا نقصان ہوتا تھا۔ شکر مل کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی تھی اور فساد کرنے پر آمادہ تھے۔ نفع کی اُمید پر چاندی خریدی تھی مگر اسکا بھاؤ آج اور بھی زیادہ گر گیا تھا۔ راے صاحب سے جو سودا ہو رہا تھا اور جسمیں اُنہیں بڑے نفع کی اُمید تھی وہ کچھ دنوں کیلئے ٹلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پھر رات کو زیادہ پی جانے کے سبب اسوقت دردِ سر اور اعضاء شکنی کا غلبہ تھا۔ اُدھر شوفر نے موٹر کے انجن میں کچھ خرابی پیدا ہو جانے کی بات کہی تھی اور لاہور میں ان کے بلینک پر ایک دیوانی مقدمہ دائر ہو جانے کی خبر بھی ملی تھی۔ بیٹھے ہوئے دل میں جھنجھلا رہے تھے کہ اسی وقت گوبندی نے کہا "بھیشم کا بُخار آج بھی نہیں اُترا۔ کسی ڈاکٹر کو بُلا لو۔"

روز ہی ایک نہ ایک شکایت رہا کرتی تھی۔ آج کھانسی ہے تو کل بخار، کبھی پیچش ہی ہے کبھی ہرے پیلے دست آ رہے ہیں۔ دس مہینے کا ہو گیا تھا مگر لگتا تھا پانچ چھ مہینے ہی کا۔ کھنّا نے سوچ لیا تھا کہ یہ لڑکا بچے گا نہیں۔ بس اُسکی طرف سے بے پروا رہتے تھے مگر گوبندی اسی وجہ سے اس کو اور سب بچوں سے زیادہ چاہتی تھی۔

کھنّا نے پدرانہ شفقت ظاہر کرتے ہوئے کہا "بچوں کو دواؤں کا عادی بنا دینا ٹھیک نہیں اور تمہیں دوا دیتے رہنے کا مرض ہے۔ ذرا کچھ ہوا اور ڈاکٹر بلاؤ۔ ایک روز اور دیکھو، آج تیسرا ہی دن تو ہے، شاید آج خود بخود اُتر جائے۔"

گوبندی نے اصرار کیا "تین دن سے نہیں اُترا۔ خانگی دوائیں کر کے ہار گئی۔"

کھنّا نے پوچھا "اچھی بات ہے، بلائے دیتا ہوں، کسے بلاؤں؟"

"بلا لو ڈاکٹر ناگ کو۔"

"اچھی بات ہے اُن ہی کو بلاتا ہوں۔ مگر یہ سمجھ لو کہ نام ہو جانے ہی سے کوئی اچھا ڈاکٹر نہیں ہو جاتا۔ ناگ فیس خواہ کتنی ہی لے لیں مگر اُن کی دوا سے کسی کو شفا پاتے نہیں دیکھا۔ وہ تو مریضوں کو جنّت ہی بھیجنے کے لئے مشہور ہیں۔"

"تو جسے چاہو اُسے بلا لو۔ میں نے تو ناگ کو اس لئے کہا تھا کہ وہ کئی بار آ چکے ہیں۔"

"مس مالتی کو کیوں نہ بلا لوں؟ فیس بھی کم اور بچوں کا حال لیڈی ڈاکٹر جیسا سمجھے گی ویسا کوئی مرد ڈاکٹر نہیں سمجھ سکتا۔"

گوبندی نے جل کر کہا "میں مس مالتی کو ڈاکٹر نہیں سمجھتی۔"

آج ہزاروں آدمیوں کی جان بچا رہی ہیں یہ سب کچھ چیز نہیں ہے؟"

"ہوگا مجھے اُن پہ بھروسہ نہیں ہے۔ وہ مُردوں کے دل کا علاج کر لیں اور کسی کی دوا اُن کے پاس نہیں ہے" بس ٹھن گئی۔ کھنا گرج اُٹھے۔ گوبندی برس پڑی۔ اُن کے درمیان میں مالتی کا نام آجانا ہی گویا اعلانِ جنگ تھا۔

کھنّا نے سارے کاغذات زمین پر پھینک کر کہا "تمہارے ساتھ زندگی تلخ ہو گئی"۔

گوبندی نے چُبھتی ہوئی آواز میں کہا "تو مالتی سے بیاہ کر لو نا! ابھی کیا بگڑا ہے، اگر وہ ہاں ڈالی لگے ہے"

"تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟"

"یہی کہ مالتی تم جیسوں کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہے، مالک بنا کر نہیں"۔

"تمہاری نگاہ میں میں اتنا ذلیل ہوں!"

اور انہوں نے اس کے خلاف ثبوت دینا شروع کیا۔ مالتی جتنی اُن کی عزّت کرتی ہے اُتنی شاید ہی کسی کی کرتی ہو۔ رائے صاحب اور راجہ صاحب کو مُنہ تک نہیں لگاتی، مگر اُن سے ایک... دن بھی ملاقات نہ ہو تو شکایت کرتی ہے......

گوبندی نے ان ثبوتوں کو ایک پھونک میں اُڑا دیا "اسی لئے کہ وہ تمہیں سب سے زیادہ آنکھوں کا اندھا سمجھتی ہے۔ دوسروں کو اتنی آسانی سے بیوقوف نہیں بنا سکتی"۔

کھنّا نے ڈینگ ماری "چاہوں تو آج مالتی سے بیاہ کر سکتا ہوں۔ آج ابھی......"

"مگر گوبندی کو بالکل یقین نہیں ہے۔ تم سات جنم تک ناک رگڑو تو بھی وہ تم سے بیاہ نہ کرے گی۔ تم اس کے ٹٹو ہو، گھاس کھلائے گی، کبھی کبھی تمہارا منھ سہلائے گی۔ تمہارے پٹھوں پہ ہاتھ پھیرے گی، مگر اسی لئے کہ تمہارے اوپر سواری کسے۔ تم جیسے ایک ہزار احمق اس کی جیب میں ہیں۔"

گوبندی آج بہت بڑھی جاتی تھی معلوم ہوتا ہے کہ آج وہ اُن سے لڑنے کو تیار ہو کر آئی ہے۔ ڈاکٹر کے بلانے کا تو صرف حیلہ تھا۔ کھنّا اپنی قابلیت، اہلیت اور مردیت پر اتنا بڑا حملہ کیسے سہ سکتے تھے، بولے "تمہارے خیال میں، میں، احمق اور نادان ہوں تو یہ ہزاروں کیوں میرے دروازے پہ ناک رگڑتے ہیں؟ کون راجا یا تعلقدار ہے جو مجھے سجدہ نہیں کرتا۔ سیکڑوں کو اُلّو بنا کر چھوڑ دیا۔"

"یہی تو مالتی کی خصوصیت ہے کہ جو اوروں کو سیدھے اُسترے سے مونڈتا ہے اُسے وہ اُلٹے چھُرے سے مونڈتی ہے۔"

"تم مالتی کی چاہے جتنی بُرائی کرو، تم اس کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہو۔"

"میری نظر میں تو وہ بیسواؤں سے گئی گذری ہے کیونکہ وہ پردے کی آڑ سے شکار کھیلتی ہے۔"

دونوں نے اپنے اپنے آتشیں تیر سَر کئے۔ کھنّا نے گوبندی کو کوئی دوسری سخت سے سخت بات کہی ہوتی تو اُسے اتنی بُری نہ لگتی، مگر مالتی سے اس کا یہ نفرت انگیز مقابلہ اس کی برداشت کے باہر تھا۔ گوبندی نے بھی کھنّا کو خواہ مخواہ جو کچھ کہا ہوتا وہ اتنے گرم نہ ہوتے لیکن مالتی کی یہ تحقیر وہ نہیں سہ سکتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے کمزور مقامات سے واقف تھے۔ دونوں کے نشانے ٹھیک بیٹھے اور دونوں تڑپ اُٹھے۔ کھنّا کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ گوبندی کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ کھنّا جوش میں

اُٹھے اور اس کے دونوں کان پکڑ کر زور سے مل دیئے، اور پھر تین چار طمانچے بھی لگا دئے۔ گوبندی روتی ہوئی اندر چلی گئی۔

ذرا دیر میں ڈاکٹر ناک آئے اور سول سرجن مسٹر ڈاڈ آئے اور وید راج نیلکنٹھ شاستری آئے۔ مگر گوبندی اپنے بچے کو لئے کمرے میں بیٹھی رہی۔ کس نے کیا کہا، کیا تشخیص کی، اُسے کچھ معلوم نہیں۔ جس مصیبت کا وہ خیال کر رہی تھی وہ آج اُس پر آ گئی۔ کھنّا نے گویا آج اس سے ناتا توڑ لیا، جیسے اُسے گھر سے نکال کر دروازہ بند کر لیا۔ جو حُسن کا بازار لگا کر بیٹھتی ہے جس کا سایہ بھی وہ اپنے اوپر نہیں پڑنے دینا چاہتی، وہ ...... وہ اس پر حد پر وہ حکومت کرے، یہ نہ ہوگا! کھنّا اس کے شوہر ہیں، انکو اُسے سمجھانے بجھانے کا حق ہے، ان کی مار بھی وہ سہہ سکتی ہے مگر مالتی کی حکومت! ناممکن! لیکن بچّے کا بخار جب تک اُتر نہ جائے وہ ہل نہیں سکتی۔ خودداری کو بھی فرض کے سامنے سر جھکانا پڑے گا۔

دوسرے روز بچّے کا بخار اُتر گیا تھا۔ گوبندی نے ایک ٹانگہ منگوایا اور گھر سے نکلی۔ جہاں اس کی اتنی بے عزّتی ہو وہاں وہ اب نہیں رہ سکتی۔ صدمہ اتنا سخت تھا کہ بچّوں کی محبّت بھی معدوم ہو گئی تھی۔ ان کے متعلق اس کا جو فرض تھا اُسے وہ پورا کر چکی ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ کھنّا کا فرض ہے۔ ہاں گود کے بچّے کو وہ کسی طرح نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ اسکی جان کے ساتھ ہے۔ اور وہ اس گھر سے صرف اپنی جان لیکر نکلے گی اور کوئی چیز اُسکی نہیں ہے۔ اُنہیں یہ دعویٰ ہے کہ اس کی پرورش کرتے ہیں، گوبندی دکھا دے گی کہ اُن کے آسرے سے الگ ہو کر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ تینوں بچّے اسوقت کھیلنے گئے تھے۔ گوبندی کا جی چاہا کہ ایک مرتبہ انہیں پیار کر لے۔ مگر وہ کہیں بھاگی تو نہیں جاتی، بچّوں کو اس سے محبّت ہو گی تو اس کے پاس جائیں گے،

صرف کھنّا کا سہارا نہیں لینا چاہئے۔

شام ہو گئی تھی۔ پارک میں خوب چہل پہل تھی۔ لوگ ہری گھاس پر لیٹے ہوئے ہوا خوری کا لطف اُٹھا رہے تھے۔ گوبندی حضرت گنج سے ہوتی ہوئی چڑیا گھر کی طرف مڑی تھی کہ موٹر پر مالتی اور کھنّا سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اُسے معلوم ہوا کہ کھنّا نے اسکی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا اور مالتی مسکرائی۔ نہیں، شاید یہ اُسی کا وہم ہو۔ کھنّا مالتی سے اسکی ہجو نہ کریں گے۔ مگر کتنی بے شرم ہے۔ سُنا ہے کہ اسکی اچھی پریکٹس ہے، گھر کی بھی مالدار ہے، پھر بھی یوں خود کو فروخت کرتی پھرتی ہے۔ نہ جانے کیوں بیاہ نہیں کر لیتی؟ مگر اس سے بیاہ کرے ہی گا کون؟ نہیں، یہ بات نہیں۔ مردوں میں ایسے بہت سے گدھے ہیں جو اُسے پا کر خود کو خوش نصیب سمجھیں گے، لیکن مالتی خود تو کسی کو پسند کرے۔

اور بیاہ میں کون سا سکھ رکھا ہوا ہے؟ بہت اچھا کرتی ہے جو بیاہ نہیں کرتی۔ ابھی سب اُن کے غلام ہیں تب وہ ایک کی لونڈی ہو کر رہ جائے گی۔ بہت اچھا کر رہی ہے۔ ابھی تو یہ حضرت بھی اس کے تلوے چاٹتے ہیں شادی بعد معاملہ اُلٹا ہو جائے گا۔ اور سوسائٹی میں دو چار ایسی عورتیں بھی رہیں تو اچھا۔ مردوں کے کان تو گرم کرتی رہیں گی۔

آج گوبندی کے دل میں مالتی سے بڑی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ وہ مالتی پر حملہ کر کے اس کے ساتھ بے انصافی کر رہی ہے۔ کیا میری حالت دیکھ کر اُس کی آنکھیں نہ کھلتی ہوں گی؟ ازدواجی زندگی کی دُرگت اپنی آنکھوں دیکھ کر اگر وہ اس جال میں نہیں پھنستی تو کیا بُرا کرتی ہے؟

چڑیا گھر میں چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گوبندی نے تانگہ روک دیا

میں تر ہو گئے۔ ابھی ذرا ہی دیر پہلے لان سینچا گیا تھا اور گھاس کے نیچے پانی بہہ رہا تھا عجلت میں اس نے پیچھے نہ مڑ کر ایک قدم اور آگے رکھا تو پیر کیچڑ میں سن گئے۔ اُس نے پیر کی طرف دیکھا۔ اب یہاں دھونے کا پانی کہاں ملے گا؟ اس کی ساری ہی پریشانی کافور ہو گئی اور پیر دھو کر صاف کرنے کی نئی فکر پیدا ہو گئی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ رُک گیا۔ جب تک پیر نہ صاف ہو جائیں وہ کچھ سوچ نہیں سکتی۔

دفعتاً ایک لمبا پائپ گھاس میں چھپا نظر آیا جس میں سے پانی نکل رہا تھا۔ اس نے جا کر پیر دھوئے، چپل دھوئے، ہاتھ منہ دھویا، تھوڑا سا پانی چلو میں لے کر پیا اور پائپ کے اُس پار خشک زمین پر جا بیٹھی۔ اُداسی میں موت کی یاد فوراً آ جاتی ہے۔ کہیں وہ یہیں بیٹھے بیٹھے مر جائے تو کیا ہو؟ تانگہ والا فوراً جا کر کھنّا کو خبر دے گا۔ کھنّا سنتے ہی خوش ہو جائیں گے مگر دُنیا کو دکھانے کے لئے آنکھوں پر رومال رکھ لیں گے۔ بچّوں کے لئے کھلونے اور تماشے ماں سے زیادہ عزیز ہیں۔ یہ ہے اس کی زندگی، جس کے لئے کوئی دو بوند آنسو بہانے والا بھی نہیں! پھر اُسے وہ دن یاد آیا۔ جب اس کی ساس زندہ تھی اور کھنّا بدراہ نہ ہوئے تھے۔ اُس وقت اُسے ساس کا بات بات پر بگڑنا بُرا لگتا تھا۔ آج اُسے ساس کی اس خفگی میں محبت کی مٹھاس گھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اُس وقت وہ ساس سے روٹھ جاتی تھی اور ساس اُسے دُلار سے مناتی تھی۔ آج وہ مہینوں روٹھی پڑی رہے تو کسے پروا ہے! یکایک اُس کا من اُڑ کر ماں کے چرنوں میں جا پہنچا۔ ہائے، آج امّاں ہوتیں تو کیوں اس کی دُرگت ہوتی؟ اُن کے پاس اور کچھ نہ تھا تو محبت بھری گود تو تھی، پیار بھرا آنچل تو تھا، جس میں منہ ڈال کر وہ رو لیتی! لیکن نہیں، وہ روئے گی نہیں۔ اُس دیوی کو سورگ میں دُکھی نہ بنائے گی۔ میرے لئے وہ جو کچھ زیادہ سے زیادہ کر سکتی تھیں وہ کر گئیں، میرے نصیبے کا ساتھی ہونا تو اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ اور وہ

کیوں روئے؟ وہ اب کسی کی ماتحت نہیں ہے، وہ اپنے گزر بسر کیلئے کما سکتی ہے۔ وہ کل ہی گاندھی آشرم سے چیزیں لے کر بیچنا شروع کر دے گی۔ شرم کس بات کی؟ یہی تو ہوگا کہ لوگ انگلی اٹھا کر کہیں گے کہ وہ جا رہی ہے کھنّا کی بیوی! لیکن اس شہر میں رہوں کیوں؟ کسی دوسرے شہر میں کیوں نہ چلی جاؤں جہاں مجھے کوئی جانتا ہی نہ ہو؟ دس بیس روپے کما لینا ایسا کیا مشکل ہے۔ اپنے پسینے کی کمائی تو کھاؤں گی، پھر تو کوئی مجھ پر رعب نہ جمائے گا۔ یہ حضرت تو اسی لئے اتنا مزاج کرتے ہیں کہ وہ میری پرورش کرتے ہیں۔ میں خود اب اپنی پرورش کروں گی۔

دفعتاً اس نے مہتا کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اسے الجھن ہوئی۔ اس وقت تو بالکل تنہا رہنا چاہتی تھی۔ کسی سے بولنے کی طبیعت نہ تھی۔ مگر یہاں بھی ایک صاحب آ ہی گئے۔ اس پر بچہ بھی رونے لگا تھا۔

مہتا نے پاس جا کر تعجب سے پوچھا ”آپ اس وقت یہاں کیسے آگئیں؟“

گوبندی نے بچے کو چپ کراتے ہوئے کہا ”اسی طرح جیسے آپ آگئے!“

مہتا نے مسکرا کر کہا ”میری بات نہ چلایئے، دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا! لایئے میں بچے کو چپ کرا دوں!“

”آپ نے یہ ہنر کب سیکھا؟“

”مشق کرنا چاہتا ہوں، اس کا امتحان جو ہوگا!“

”اچھا، امتحان کے دن قریب آگئے؟“

”یہ تو میری تیاری پر ہے۔ جب تیار ہوں گا، بیٹھ جاؤں گا۔ چھوٹی چھوٹی سندوں کے لئے ہم پڑھ پڑھ کر آنکھیں پھوڑ لیا کرتے ہیں، پھر یہ تو زندگی کے کاروبار کا امتحان ہے!“

"اچھی بات ہے، میں بھی دیکھوں گی کہ آپ کس ڈویژن میں پاس ہوتے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے بچّے کو اُن کی گود میں دے دیا۔ انہوں نے اُسے کئی بار اُچھالا تو وہ چپ ہو گیا۔ بچوں کی طرح ڈینگ مارتے ہوئے بولے "دیکھا آپ نے، کیسا منتر کے زور سے چپ کرا دیا! اب میں بھی کہیں سے ایک بچہ لاؤں گا۔"

گوبندی نے مذاق کیا "بچہ ہی لائیے گا یا اس کی ماں بھی؟"

مہتا نے مذاقیہ مایوسی سے سر ہلا کر کہا "ایسی عورت تو کہیں ملتی ہی نہیں!"

"کیوں، مس مالتی نہیں ہیں؟ خوبصورت، تعلیم یافتہ، ہنرمند، دلفریب! اور آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"مس مالتی میں وہ ایک بات بھی نہیں ہے جو میں اپنی اہلیہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

گوبندی نے اس نازبرت کا مزا لیتے ہوئے کہا "اُن میں کیا بُرائی ہے، سنوں تو۔ بھونرے ہمیشہ منڈلاتے رہتے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ آج کل مردوں کو ایسی ہی عورتیں پسند آتی ہیں۔"

مہتا نے بچّے کے ہاتھوں سے اپنی مونچھیں بچاتے ہوئے کہا "میری بیوی کچھ اور ہی قماش کی ہوگی۔ وہ ایسی ہوگی جس کی میں پوجا کر سکوں گا۔"

گوبندی اپنی ہنسی نہ روک سکی "تو آپ عورت نہیں کوئی مورت چاہتے ہیں۔ عورت تو ایسی آپ کو شاید ہی کہیں ملے۔"

"جی نہیں، ایسی ایک دیوی تو اسی شہر میں ہے۔"

"سچ! ذرا میں بھی اس کے درشن کرتی، اور اسی طرح بننے کی کوشش

کرتی؟"

"آپ اُسے خوب جانتی ہیں۔ وہ ایک لکھپتی کی بیوی ہے مگر عیش و عشرت کو ہیچ سمجھتی ہے۔ جو بے رُخی اور بے عزتی سہہ کر بھی اپنے فرض سے منحرف نہیں ہوتی جو مادیت کی قربان گاہ پر خود کو چڑھا دیتی ہے، جس کیلئے ایثار ہی سب سے بڑا حق ہے اور جو اس قابل ہے کہ اس کی مورت بنا کر پوجی جائے۔"

گوبندی کے دل میں خوشی کی لہر اُٹھی۔ سمجھ کر بھی نہ سمجھنے کا بہانہ کرتی ہوئی بولی "ایسی عورت کی آپ تعریف کرتے ہیں مگر میری سمجھ میں تو وہ رحم کے قابل ہے۔"

مہتا نے تعجب سے کہا "رحم کے قابل! آپ اُس کی توہین کرتی ہیں۔ وہ مکمل عورت ہے، اور جو مکمل عورت ہو سکتی ہے وہی مکمل بیوی بھی ہو سکتی ہے۔"

"لیکن وہ معیار موجودہ زمانے کے لئے نہیں ہے۔"

"وہ معیار ابدی ہے اور لافانی ہے۔ انسان اُسے مٹا کر خود کو مٹا رہا ہے۔"

گوبندی کا دل شگفتہ ہوا جا رہا تھا۔ ایسی لرزشیں وہاں کبھی ہوئی تھیں۔ جن لوگوں سے ان کا تعارف تھا ان میں مہتا کا درجہ سب سے اونچا تھا۔ اُن کی زبان سے یہ حوصلہ افزائی پا کر وہ متوالی ہوئی جا رہی تھی۔ اُسی نشہ میں بولی "تو چلئے مجھے اُن کے درشن کرا دیجئے۔"

مہتا نے بچے کے رُخساروں میں مُنہ چھپا کر کہا "وہ تو یہیں بیٹھی ہوئی ہیں۔"

"کہاں ہیں، میں تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔"

"میں اُسی دیوی سے بول رہا ہوں۔"

گوبندی نے زور سے قہقہہ لگایا "آپ نے آج مجھے بنانے کی ٹھان لی،

کیوں ؟"

مہتانے عقیدت سے کہا "دیوی جی! آپ میرے ساتھ ناانصافی کر رہی ہیں اور مجھ سے زیادہ خود اپنے ساتھ۔ دُنیا میں ایسے بہت کم لوگ ہیں جن سے میری دلی عقیدت ہو۔ اُن ہی میں ایک آپ ہیں۔ آپ کا تحمّل، ایثار، اخلاق، سب بے نظیر ہیں۔ میں اپنی زندگی میں سب سے بڑے سُکھ کا جو تصوّر کر سکتا ہوں وہ آپ جیسی کسی دیوی کے چرنوں کی سیوا ہے۔ جس نسائیت کو میں مکمّل مانتا ہوں آپ اس کی زندہ مثال ہیں"۔

گوبندی کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل پڑے۔ اس عقیدت کی زرہ کو پہن کر وہ کس آفت کا مقابلہ نہ کر سکے گی؟۔ اس کے رونگٹیں رونگٹیں سے جیسے ایک میٹھے گیت کا راگ جاری ہو گیا۔

اُس نے اپنی نسوانی خوشی کو ضبط کر کے کہا "آپ فلسفی کیوں ہوئے مہتا جی؟ آپ کو تو شاعر ہونا چاہیئے تھا"۔

مہتا سادگی سے ہنس کر بولے "کیا آپ سمجھتی ہیں کہ فلسفی ہوئے بغیر ہی کوئی شاعر ہو سکتا ہے؟ فلسفہ تو محض ایک درمیانی منزل ہے"۔

"تو ابھی آپ شاعری کی راہ میں ہیں۔ مگر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ شاعر کو دُنیا میں کبھی آرام نہیں ملتا؟"

"جسے دُنیا ہیچ کہتی ہے وہی شاعر کے لئے راحت ہے۔ دولت اور شہرت، حُسن اور طاقت، علم اور عقل، یہ برکتیں دُنیا کو خواہ کتنا ہی فریفتہ کریں مگر شاعر کے لئے اُن میں ذرا بھی کشش نہیں ہے۔ اس کی کشش و مسرّت کی چیز تو مری ہوئی اُمیدیں، مٹی ہوئی یادگاریں اور ٹوٹے دلوں کے آنسو ہیں۔ جس دن اِن چیزوں سے اُسے محبت نہ رہے گی، اُس دن وہ شاعر نہ رہ جائے گا۔ فلسفہ زندگی کے

بھیدوں سے صرف کھیلتا ہے، مگر شاعر ان میں جذب ہو جاتا ہے۔ میں نے آپ کی دو چار نظمیں پڑھی ہیں اور ان میں جتنا سرور، جتنی لرزش، جتنا میٹھا درد اور جتنی رلانے والی دیوانگی ملی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ قدرت نے ہمارے ساتھ کتنی بڑی بے انصافی کی ہے کہ اُس نے آپ جیسی کوئی دوسری دیوی نہیں بنائی!!

گووندی نے حسرت بھرے لہجے میں کہا "نہیں مہتا جی! یہ آپ کا خیال ہے ایسی عورتیں یہاں آپ کو جگہ جگہ ملیں گی اور میں تو اُن سب سے گئی گزری ہوں، جو عورت اپنے مرد کو خوش نہ رکھ سکے، خود کو اُس کی طبیعت کے موافق نہ بنا سکے، وہ بھی کوئی عورت ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ مالتی سے یہ ہنر سیکھوں۔ جہاں میں ناکامیاب ہوں وہاں وہ کامیاب ہے۔ میں اپنے کو بھی اپنا نہیں بنا سکتی، وہ دوسروں کو بھی اپنا بنا لیتی ہے۔ کیا یہ اُس کیلئے فخر کی بات نہیں ہے؟"

مہتا نے مُنہ بنا کر کہا "شراب اگر لوگوں کو پاگل کر دیتی ہے تو کیا اُسے پانی سے بہتر سمجھا جائے" جو پیاس بجھاتا ہے، جلاتا ہے اور تسکین دیتا ہے؟"

گووندی نے مذاق سے کہا "کچھ بھی ہو، میں تو سمجھتی ہوں کہ پانی مارا مارا پھرتا ہے اور شراب کے لئے گھر بار بک جاتا ہے۔ اور پھر شراب جتنی ہی تیز اور نشیلی ہو، اتنی ہی اچھی! میں تو سُنتی ہوں کہ آپ کو بھی شراب کا شوق ہے!!"

گووندی مایوسی کی اُس حالت میں پہنچ گئی تھی جب انسان کو سچائی اور دھرم میں بھی شبہہ ہونے لگتا ہے مگر مہتا کا دھیان اِدھر نہ گیا۔ ان کا دھیان تو آخری فقرے سے جیسے چپک کر رہ گیا تھا۔ اپنی شراب نوشی پر انھیں جتنی ندامت اور پشیمانی آج ہوئی اتنی بڑی بڑی نصیحتوں سے بھی نہ ہوئی تھی۔ دلائل کا اُن کے پاس جواب تھا اور دندان شکن، مگر اس میٹھی چٹکی کا اُنھیں کوئی جواب نہ سوجھا، وہ پچھتائے کہ کہاں سے کہاں اُنھیں شراب کی بات سوجھی۔ اُنھوں نے خود مالتی کی

مشابہت شراب سے کی تھی نگران کا وار اُلٹ کر کے سر پر پڑا۔ نادم ہو کر بولے "ہاں دیوی جی میں جانتا ہوں کہ مجھ میں وہ شوق ہے۔ میں اپنے لئے اُس کی ضرورت بتا کر اور اُس کے تخیل افزا اوصاف کا ثبوت دے کر عذرِ گناہ نہ کروں گا، جو گناہ سے بھی بدتر ہے۔ البتہ آج آپ کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ اب شراب کا ایک قطرہ بھی حلق کے نیچے نہ جانے دوں گا۔"

گوبندی نے سناٹے میں آکر کہا "یہ آپ نے کیا کیا، جیتا جی! ایشور گواہ ہے کہ میرا یہ مطلب نہ تھا مجھے اِس کا افسوس ہے۔"

"نہیں، آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ آپ نے ایک شخص کا ادھار کر دیا۔"

میں نے آپ کا ادھار کر دیا! میں تو خود آپ سے اپنے ادھار کی التجا کرنے جا رہی ہوں۔"

"مجھ سے؟ زہے نصیب!"

گوبندی نے رقت سے کہا "ہاں آپ کے سوا مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آتا جسے میں اپنی کہانی سناؤں دیکھئے یہ بات اپنے ہی تک رکھئے گا، حالانکہ آپ سے ایسا کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اب اپنی زندگی ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے۔ مجھ سے اب تک جتنی تپسیا ہو سکی وہ میں نے کی، لیکن اب نہیں سہا جاتا۔ مالتی مجھے ہر طرح مٹائے ڈالتی ہے۔ میں اپنے کسی ہتھیار سے اُس پر فتح نہیں پا سکتی۔ آپ کا اُس پر بہت کچھ اثر ہے۔ وہ جتنی آپ کی عزت کرتی ہے، شاید اور کسی مرد کی نہیں کرتی۔ اگر آپ کسی طرح مجھے اس کے پنجے سے چھڑا دیں تو عمر بھر آپ کا احسان مانوں گی۔ اُسی کے ہاتھوں میرا سہاگ لُٹا جا رہا ہے۔ آپ اگر مجھے بچا سکتے ہیں تو بچائیے۔ میں آج گھر سے یہ سوچ کر چلی تھی کہ پھر واپس نہ جاؤں گی۔ میں نے بڑا زور مارا کہ

موت کی ساری بندشوں کو توڑ کر پھینک دوں لیکن عورت کا دل بڑا کمزور ہے مہتا جی محبت اسکی جان ہے۔ زندہ رہتے ہوئے محبت کا توڑنا اس کے لئے ناممکن ہے۔ میں نے آج تک اپنا دکھ اپنے ہی دل میں رکھا مگر آج آپ سے آنچل پھیلا کر بھیک مانگتی ہوں۔ مالتی سے مجھے چھٹکارا دلا دیجئے۔ میں اس جادوگرنی کے ہاتھوں مٹی جا رہی ہوں......"

اُس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ وہ زار قطار رونے لگی۔

مہتا اپنی نظروں میں کبھی اتنا اونچے نہ اُٹھے تھے۔ اُس وقت بھی نہیں، جب ان کی تصنیف کو فرانس کی اکیڈمی نے موجودہ صدی کی بہترین تصنیف قرار دیا تھا اور اُنہیں مبارکباد دی تھی۔ جس مورت کی وہ سچے دل سے پوجا کرتے تھے۔ جسے دل میں وہ اپنی عبادت کی دیوی سمجھے ہوئے تھے اور زندگی کے ناقابلِ فہم معاملات میں جس سے ہدایت پانے کی اُمید رکھتے تھے، وہ آج ان سے بھیک مانگ رہی تھی! انہیں اپنے میں ایسی طاقت کا احساس ہوا کہ وہ پہاڑ کو بھی چکنا چور کر سکتے ہیں اور سمندر کو بھی تیر کر پار کر سکتے ہیں۔ اُن پر نشہ سا چھا گیا جیسے بچہ کسی چوبی گھوڑے پر چڑھ کر یہ سمجھ رہا ہو کہ وہ ہوا میں اُڑا جا رہا ہے۔ کام کتنا مشکل ہے۔ اسکی خبر نہ رہی اپنے اصولوں کا کتنا خون کرنا پڑیگا۔ اس کا بالکل خیال نہ رہا۔ تسکین دیکر بولے۔ "آپ مالتی کی طرف سے بے فکر رہیں۔ وہ آپ کی راہ سے ہٹ جائے گی۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ آپ اُسکے سبب سے اتنی دُکھی ہیں۔ میری عقل کا قصور، آنکھوں کا قصور، خیال کا قصور، اور کیا کہوں؟ ورنہ آپ کو اتنی تکلیف کیوں سہنی پڑتی!!"

گوبندی کو شک ہوا۔ بولی "مگر شیرنی سے اس کا شکار چھیننا آسان نہیں ہے یہ سمجھ لیجئے!!"

مہتا نے استقلال سے کہا "عورت کا دل زمین کی طرح ہے جس سے شیرینی بھی

مل سکتی ہے اور تلخی بھی، اس کے اندر پڑنے والے تخم ہی جیسی تاثیر ہو۔"

"آپ پچھتا رہے ہوں گے کہ کہاں سے کہاں آج اس سے بھینٹ ہو گئی؟"

"میں اگر کہوں کہ مجھے آج ہی زندگی کا حقیقی لطف ملا ہے تو شاید آپ کو یقین نہ آئے۔"

"میں نے آپ کے سر پر اتنا بڑا بار رکھ دیا۔"

مہتا نے عقیدت کے لہجے میں کہا "آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں دیوی جی! میں کہہ چکا کہ میں آپ کا خادم ہوں۔ آپ کے فائدے کیلئے میری جان بھی چلی جائے تو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ اسے شاعرانہ جذبہ نہ سمجھئے۔ یہ میری زندگی کی سچائی ہے۔ میری زندگی کا کیا معیار ہے۔ آپ سے یہ بتا دینے کی خواہش میں ضبط نہیں کر سکتا۔ میں قدرت کا پجاری ہوں اور انسان کو اسکی قدرتی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ جو خوش ہو کر ہنستا ہے، غمگین ہو کر روتا ہے اور غصے میں آکر مار ڈالتا ہے۔ جو دکھ اور سکھ دونوں کو دباتے ہیں۔ جو رونے کو کمزوری اور ہنسنے کو سبکی سمجھتے ہیں اُن سے میرا کوئی لگاؤ نہیں۔ زندگی میرے لئے خوشی بھرا کھیل ہے، سادہ اور کھلا ہوا، جہاں برائی، حسد اور جلن کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔ میں ماضی کی فکر نہیں کرتا اور نہ مستقبل کی پرواہ کرتا ہوں۔ میرے لئے حال ہی میں سب کچھ ہے۔ مستقبل کی فکر ہمیں بزدل بنا دیتی ہے، ماضی کا بوجھ ہماری کمر توڑ دیتا ہے۔ ہم میں زندگی کی طاقت اتنی کم ہے کہ ماضی اور مستقبل میں پھیلا دینے سے وہ اور بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ ہم مفت کا بوجھ اپنے اوپر لاد کر رواجوں اور عقیدوں اور تاریخ کے ملبے کے نیچے دبے پڑے ہیں، اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ وہ طاقت ہی نہیں رہی۔ جو طاقت، جو عقل، انسانی فرائض کے پورا کرنے میں لگنی چاہیئے تھی، باہمی امداد میں اور بھائی چارے میں، وہ پرانی عداوتوں کا بدلہ لینے اور آباؤ اجداد کا قرضہ ادا کرنے میں تمام ہو جاتی ہے۔ اور

جو یہ ایشور اور مکتی کا چکر ہے اس پر تو مجھے ہنسی ہی آتی ہے۔ یہ مکتی اور بھکتی تو انتہائی خودی کا ہے جو ہماری انسانیت کو تباہ کئے ڈالتی ہے۔ جہاں زندگی ہے، کھیل ہے چہک ہے، پریم ہے، وہیں ایشور ہے، اور زندگی کو سکھی بنانا ہی عبادت ہے، وہی نجات ہے! گیان والا کہتا ہے کہ ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ آئے، آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ میں کہتا ہوں اگر تم ہنس نہیں سکتے تو تم انسان نہیں ہو، پتھر ہو۔ وہ گیان جو انسانیت کو پیس ڈالے گیان نہیں ہے۔ کولھو ہے۔ مگر معاف کیجئے میں تو ایک پورا لکچر ہی دے گیا۔ اب دیر ہو رہی ہے، چلئے میں آپ کو پہنچا دوں۔ بچہ بھی میری گود میں سو گیا۔"

گوبندی نے کہا "میں تو ٹانگہ لائی ہوں۔"

"ٹانگے کو یہیں سے رخصت کئے دیتا ہوں۔"

مہتا ٹانگے کے پیسے دیکر لوٹے تو گوبندی نے کہا "لیکن آپ مجھے کہاں لے جائیں گے؟"

مہتا نے چونک کر پوچھا "کیوں، آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔"

"وہ میرا گھر نہیں ہے، مہتا جی!"

"اور مسٹر کھنا کا گھر ہے؟"

"یہ بھی کیا پوچھنے کی بات ہے۔ اب وہ گھر میرا نہیں رہا۔ جہاں بے عزتی اور فضیحت ہو اُسے میں اپنا گھر نہیں سمجھتی اور نہ سمجھ سکتی ہوں۔"

مہتا نے درد بھری آواز میں جس کا ایک ایک حرف اُنکے دل سے نکل رہا تھا، کہا "نہیں دیوی جی، وہ گھر آپ کا ہے اور سدا رہیگا۔ اُس گھر کو آپ نے بنایا ہے، اس کے رہنے والوں کو آپ نے رچایا ہے، اور جس طرح جان جسم کو چلاتی ہے ویسے ہی آپ نے اُسے چلایا ہے۔ جان نکل تو جسم کی کیا حالت

ہو گی؟ ماں کا درجہ بہت بڑی عظمت کا ہے، دیوی جی! اور ویسے درجے کی بے عزتی اور فضیحت کہاں نہیں ہوتی؟ ماں کا کام حیات افزائی ہے۔ جسکے ہاتھوں میں ایسی بے مثل طاقت ہے اُسے اسکی کیا پروا کہ اُس سے کون رُوٹھتا ہے یا کون بگڑتا ہے؟ جان کے بغیر جیسے جسم نہیں رہ سکتا ویسے ہی جان کیلئے جسم ہی موزوں ترین مسکن ہے۔ میں آپ کو دھرم اور تیاگ کا کیا اُپدیش دوں؟ آپ تو اسکی جیتی جاگتی مورت ہی ہیں! میں تو یہی کہوں گا۔۔۔"

گوبندی نے بے صبری سے کہا "لیکن میں صرف ماں تو ہوں نہیں، بلکہ عورت بھی ہوں"!

جھنا نے ایک منٹ تک چُپ رہنے کے بعد کہا "ہاں ہیں! لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عورت صرف ماں ہے اور اسکے علاوہ وہ جو کچھ ہے وہ سب اُسی کا محض ابتدائی ظہور ہے۔ ماں ہونا دنیا کی سب سے بڑی ریاضت، سب سے بڑا ایثار اور سب سے بڑی فتح ہے۔ میں ایک لفظ میں اُسے زندگی کا، شخصیت کا اور انسانیت کا جذب ہو جانا کہوں گا۔ آپ مسٹر کھنّا کے بارے میں اتنا ہی سمجھ لیں کہ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے یا کرتے ہیں وہ جنوں کی حالت میں۔ مگر اس جنوں کے رفع ہونے میں بہت دن نہ لگیں گے اور وہ وقت بہت جلد آئیگا جب وہ آپ کو اپنی پرستش کی چیز سمجھیں گے"!

گوبندی نے اسکا کچھ جواب نہ دیا۔ آہستہ آہستہ موٹر کی طرف چلی، مہتا نے بڑھ کر موٹر کا دروازہ کھول دیا اور گوبندی اندر جا بیٹھی۔ موٹر چلا مگر دونوں خاموش تھے۔

گوبندی جو اپنے دروازے پر پہنچ کر گاڑی سے اُتری تو مہتا نے برقی روشنی میں دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں۔

بچے گھر سے نکل آئے اور "اماں، اماں" کہتے ہوئے ماں سے لپٹ گئے۔ گوبندی کے چہرے پر مادرانہ عظمت کا نور چمک اُٹھا۔

اس نے مہتا سے کہا "اس تکلیف کے لئے آپ کا بہت بہت شکریہ" اور سر نیچا کر لیا۔ آنسو کا ایک قطرہ اُس کے رُخسار پر ڈھلک آیا تھا۔

مہتا کی آنکھیں بھی اشک آلود ہو گئیں، اس شان و شوکت اور عیش و عشرت کے سامانوں کے درمیان میں بھی اس عورت کا دل کتنا مغموم ہے!

(۱۹)

مرزا خورشید کا احاطہ کلب بھی ہے، کچہری بھی اور اکھاڑا بھی۔ دن بھر بھیڑ لگی رہتی ہے۔ محلے میں اکھاڑے کیلئے کہیں جگہ نہ ملتی تھی۔ مرزا نے ایک چھپر ڈلوا کر اکھاڑا بنوا دیا ہے وہاں روز سو پچاس کُشتی باز جمع ہو جاتے ہیں، مرزا بھی اُن کے ساتھ زور آزمائی کرتے ہیں۔ محلے کی پنچائتیں بھی یہیں ہوتی ہیں۔ میاں بیوی ساس بہو اور بھائی بھائی کے جھگڑوں بکھیڑوں کا یہیں نپٹارا ہوتا ہے۔ محلے کی سوشل زندگی کا یہی مرکز ہے اور سیاسی تحریک کا بھی۔ آئے دن سبھائیں ہوتی رہتی ہیں۔ یہیں والنٹیر ٹھہرتے ہیں۔ یہیں اُن کا پروگرام بنتا ہے، یہیں سے شہر کی سیاسی تحریک چلائی جاتی ہے۔ پچھلے جلسے میں مالتی شہری کانگریس کمیٹی کی صدر چن لی گئی ہے جب سے اس مقام کی رونق اور بڑھ گئی ہے۔

گوبر کو یہاں رہتے سال بھر ہو گیا ہے۔ اب وہ سیدھا سادا دیہاتی نوجوان نہیں ہے۔ اُس نے بہت کچھ دُنیا دیکھ لی ہے۔ اس کے رنگ ڈھنگ بھی کچھ کچھ سمجھنے لگا ہے۔ اصل میں تو وہ اب بھی دیہاتی ہے، پیسے

کو دانت سے پکڑتا ہے، مطلب کو کبھی نہیں چھوڑتا اور محنت سے جی نہیں چُراتا، نہ کبھی ہمت ہارتا ہے مگر شہر کی ہوا بھی اُسے لگ گئی ہے۔ اس نے پہلے مہینے میں تو صرف مزدوری کی اور آدھے پیٹ کھا کر تھوڑے روپئے بچا لئے۔ پھر وہ کچالو اور دہی بڑے کے خوانچے لگانے لگا۔ ادھر زیادہ منافع دیکھا تو نوکری چھوڑ دی۔ گرمیوں میں شربت اور برف کی دوکان بھی کھول دی۔ لین دین میں کھرا تھا پس اُسکی ساکھ جم گئی۔ جاڑا آیا تو اُسنے شربت کی دوکان بند کر دی اور گرم چائے پلانے لگا۔ اب اُسکی روزانہ آمدنی ڈھائی تین روپے سے کم نہیں ہے۔ اُسنے انگریزی فیشن کے بال کٹا لئے ہیں، باریک دھوتی اور پمپ شو پہنتا ہے، ایک سُرخ اُونی چادر خرید لی ہے اور پان سگرٹ کا بھی شوقین ہو گیا ہے۔ جلسوں میں آنے جانے سے اُسے کچھ کچھ سیاسی واقفیت بھی ہو چلی ہے۔ قوم اور فرقہ کا مطلب سمجھنے لگا ہے۔ سوشل رواجوں کا خیال اور دُنیوی ملامت کا خوف اب اسے بہت کم رہ گیا ہے۔ آگے دن کی پنچایتوں نے اُسے نڈر بنا دیا ہے جس بات کے پیچھے وہ یہاں گھر سے دور مُنہ چھپائے پڑا ہوا ہے اُسی طرح کی بلکہ اُس سے بھی زیادہ بڑی باتیں یہاں روز ہوا کرتی ہیں اور کوئی کہیں بھاگتا نہیں۔ پھر وہی کیوں اتنا ڈرے اور مُنہ چھپائے؟

اتنے دنوں میں اُس نے ایک پیسہ بھی گھر نہیں بھیجا۔ وہ والدین کو روپیہ پیسہ کے معاملے میں اتنا ہوشیار نہیں سمجھتا۔ وہ لوگ تو روپیہ پاتے ہی آسمانوں میں اُڑنے لگیں گے۔ دادا کو فوراً یگیّہ کرنے کی اور اماں کو گہنے بنوانے کی دُھن سوار ہو جائے گی۔ ایسے فضول کاموں کیلئے اُس کے پاس روپئے نہیں ہیں۔ اب وہ چھوٹا موٹا مہاجن ہے۔ پڑوس کے یکّہ اور گاڑی والوں اور دھوبیوں کو سُود پر روپیہ قرض دیتا ہے۔ ان دس گیارہ مہینوں ہی میں اُس نے اپنی محنت اور کفایت سے اپنی جگہ بنا لی ہے اور اب جھنیا کو بھی لا کر رکھنے کی بات سوچ رہا ہے۔

تیسرے پہر کا وقت ہے، وہ سڑک کے نل پر نہا کر آیا ہے اور شام کے لئے آلو اُبال رہا ہے کہ مرزا خورشید آکر دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ گوبر اب اُنکا نوکر نہیں ہے مگر ادب اُسی طرح کرتا ہے اور اُن کے لئے جان دینے کو تیار رہتا ہے۔ دروازے پر آکر پوچھا "کیا حکم ہے سرکار؟"

مرزا نے کھڑے کھڑے کہا "تمہارے پاس کچھ روپئے ہوں تو دے دو۔ آج تین دن سے بوتل خالی پڑی ہوئی ہے، طبیعت بہت بے چین ہو رہی ہے"

گوبر نے اس سے پہلے بھی دو تین بار مرزا کو روپئے دیئے تھے مگر اب تک وصول نہ کر سکا تھا۔ تقاضا کرتے ڈرتا تھا اور مرزا صاحب روپئے لیکر دینا نہ جانتے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں روپیہ رُکتا ہی نہ تھا۔ اِدھر آیا اور اُدھر غائب۔ یہ تو نہ کہہ سکا کہ میں روپئے نہ دوں گا یا میرے پاس روپئے نہیں ہیں، شراب کی بُرائی کرنے لگا "آپ اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے سرکار؟ کیا اس کے پینے سے کچھ فائدہ ہوتا ہے؟"

مرزا نے کوٹھری کے اندر آکر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم سمجھتے ہو کہ میں چھوڑنا نہیں چاہتا اور شوق سے پیتا ہوں۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم اپنے روپیوں کیلئے نہ ڈرو، میں ایک ایک کوڑی ادا کر دونگا"

گوبر مستقل رہا "میں سچ کہتا ہوں مالک، میرے پاس اس سمے روپئے نہیں ہیں۔ روپیہ ہوتا تو آپ سے انکار نہ کرتا"

"دو روپئے بھی نہیں دے سکتے؟"

"اس سمے تو نہیں ہیں"

"میری انگوٹھی گرو رکھ لو"

گوبر کا جی للچا اُٹھا مگر بات کیسے بدلے؟ بولا "یہ آپ کیا کہتے ہیں مالک۔ روپئے ہوتے تو آپ کو دے دیتا۔ انگوٹھی کی کون بات تھی؟"

مرزا نے عاجزانہ اصرار سے کہا "میں پھر تم سے کبھی نہ مانگوں گا گوبر مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔ اس شراب کی بدولت میں نے لاکھوں کی حیثیت بگاڑ دی اور بھکاری بن گیا۔ اب مجھے بھی ضد پڑ گئی ہے کہ خواہ بھیک ہی مانگنی پڑے مگر اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

جب گوبر نے ابکے بھی انکار کیا تو مرزا صاحب مایوس ہو کر چلے گئے۔ شہر میں انکے ہزاروں ملنے والے تھے۔ کتنے ہی ان کی بدولت بن گئے تھے۔ کتنوں ہی کی آڑے وقت پر انھوں نے مدد کی تھی مگر ایسوں سے وہ ملنا بھی پسند نہ کرتے تھے اُنھیں ہزاروں ٹٹکے معلوم تھے جن سے وہ وقتاً فوقتاً روپیوں کے ڈھیر لگا سکتے تھے مگر روپئے کی اُن کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی۔ اُن کے ہاتھ میں روپئے جیسے کاٹتے تھے کسی نہ کسی بہانے اُڑا کر ہی اُن کا دل سکون پاتا تھا۔

گوبر آلو چھیلنے لگا۔ سال ہی بھر کے اندر وہ اتنا چالاک ہو گیا تھا اور پیسے جوڑنے میں اتنا ہوشیار کہ تعجب ہوتا تھا۔ جس کوٹھری میں وہ رہتا ہے وہ مرزا صاحب نے ہی دی ہے۔ اس کوٹھری اور برآمدے کا کرایہ بڑی آسانی سے پانچ روپیہ مل سکتا ہے۔ گوبر تقریباً سال بھر سے اسی میں رہتا ہے لیکن نہ کبھی مرزا نے کرایہ مانگا نہ اس نے دیا۔ اُنھیں شاید یہ خیال بھی نہ تھا کہ اس کوٹھری کا کچھ کرایہ بھی مل سکتا ہے۔

فوراً دیر میں ایک یکہ والا روپیہ مانگنے آیا۔ الہ دین نام تھا، سر گھٹا ہوا، ڈاڑھی کھچڑی اور کانا۔ اسکی لڑکی رخصت ہو رہی تھی اور پانچ روپئے کی اُسے بڑی ضرورت تھی۔ گوبر نے ایک آنہ روپیہ سود پر روپئے دے دیئے۔

الہ دین نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "بھیّا اب بال بچّوں کو بُلا لو۔ کب تک ہاتھ سے ٹھونکتے رہو گے ؟"

گوبر نے شہر کے خرچ کا رونا رو دیا "تھوڑی آمدنی میں گرہستی کیسے چلے گی ؟"

الہ دین بیڑی جلاتے ہوئے بولا "آمدنی اللہ دے گا، بھیّا! سوچو کتنا آرام ملے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ جتنا تم اکیلے خرچ کرتے ہو اسی میں گرہستی چل جائے گی۔ عورت کے ہاتھ میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ خدا قسم، جب میں اکیلا یہاں رہتا تھا تو چاہے جتنا ہی کماؤں مگر سب کھا پی کر برابر ہو جاتا تھا۔ بیڑی تماکھو کو بھی پیسہ نہ رہتا۔ اس پر حیرانی الگ۔ تھکے ماندے آؤ تو گھوڑے کو ٹہلاؤ اور کھلاؤ، پھر نانبائی کی دوکان پر دوڑو۔ ناک میں دم آگیا۔ جب سے بیوی آگئی ہے اُسی کمائی میں اس کی روٹیاں بھی نکل آتی ہیں اور آرام بھی ملتا ہے۔ آخر آدمی آرام ہی کے لئے تو کماتا ہے۔ جب جان کھپا کر بھی آرام نہ ملا تو زندگی ہی برباد ہو گئی۔ میں تو کہتا ہوں کہ تمہاری کمائی بڑھ جائے گی بھیّا۔ جتنی دیر میں آلو اور مٹر اُبالتے ہو اتنی دیر میں دو چار پیالے چائے بیچ لو گے۔ اب چائے بارہوں مہینے چلتی ہے رات کو لیٹو گے تو عورت پاؤں دبائے گی۔ ساری تھکاوٹ مٹ جائے گی!"

یہ بات گوبر کے دل نشیں ہو گئی۔ جی اُچاٹ ہو گیا۔ اب تو وہ جھنیا کو لاکر ہی رہیگا۔ آلو چولھے پر چڑھے رہ گئے۔ اور اس نے گھر جانے کی تیاری کر دی۔ مگر یاد آیا کہ ہولی آرہی ہے، اس لئے ہولی کا سامان بھی لیتا چلے۔ بخیلوں میں خوشی کے موقعوں پر دل کھول کر خرچ کرنے کی جو ایک عادت ہوتی ہے اُس نے گوبر کو بھی اُکسایا۔ آخر اسی دن کیلئے تو کوڑی کوڑی جوڑ رہا تھا۔ وہ ماں، بہنوں اور جھنیا سب کیلئے ایک ایک جوڑ ساڑھی لے جائیگا۔ ہوری کے لئے ایک دھوتی اور ایک چادر۔ سونا کیلئے ایک شیشی تیل لے جائے گا اور ایک جوڑ چپل۔ روپا کے لئے جاپانی

گڑیاں اور جھنیا کے لئے ایک پٹاری جس میں تیل، سیندور اور آئینہ ہوگا۔ بچے کیلئے ٹوپ اور فراک جو بازار میں تیار ملتا ہے۔ اُس نے روپئے نکالے اور بازار چلا۔ دوپہر تک سب چیزیں آگئیں۔ بستر بھی بندھ گیا۔ محلّے والوں کو خبر ہوگئی کہ گوبر گھر جارہا ہے۔ کئی مرد عورت اُسے رُخصت کرنے آئے۔ گوبر نے انھیں اپنا گھر سپرد کرتے ہوئے کہا "تمہیں لوگوں پر گھر چھوڑے جاتا ہوں۔ بھگوان نے چاہا تو ہولی کے دوسرے دن آجاؤنگا!"

ایک نوجوان عورت نے مُسکراکر کہا "مہریا کو لئے بنا نہ آنا، نہیں گھر میں نہ گھسنے پاؤگے!"

دوسری زیادہ عمر والی نے نصیحت کی۔ "ہاں اور کیا، بہت دنوں تو چولھا پھونک چکے۔ ٹھکانے سے روٹی تو ملے گی!"

گوبر نے سب کو "رام رام" کیا۔ ہندو بھی تھے، مسلمان بھی۔ سبھی میں دوستانہ تھا۔ سب ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک تھے۔ روزہ رکھنے والے روزہ رکھتے تھے، ایکادشی رکھنے والے ایکادشی۔ کبھی کبھی مذاق میں ایک دوسرے پر چھینٹے بھی اُڑا لیتے تھے۔ گوبر الہ دین کی نماز کو "اُٹھابیٹھی" کہتا تھا۔ الہ دین پیپل کے نیچے والے سیکڑوں چھوٹی بڑی شیو کی مورتوں کو "بٹھرے" بناتا، مگر فرقہ دارانہ تعصّب کا نام بھی نہ تھا۔

گوبر گھر جا رہا ہے اور سب ہنسی خوشی سے رُخصت کرنا چاہتے ہیں۔

اتنے میں بھودے یکّہ لے کر آگیا۔ ابھی دن بھر کا گشت لگا کر آیا تھا۔ خبر ملی کہ گوبر گھر جا رہا ہے، ویسے ہی یکّہ ادھر پھیر دیا۔ گھوڑے نے احتجاج کیا۔ اُسے کئی چابک لگائے۔ گوبر نے یکہ پر سامان رکھا۔ یکّہ بڑھا۔ بہنے والے گلی کے موڑ تک پہنچانے گئے۔ تب گوبر نے سب کو "رام رام" کیا اور یکّے پر بیٹھ گیا۔ سڑک پر

یکہ سرپٹ دوڑا جا رہا تھا، گوبر گھر جانے کی خوشی میں مست تھا، بھورے اُسے گھر پہنچانے کی خوشی میں مست تھا۔ اور گھوڑا اٹھا پانی حار، اُڑا چلا جا رہا تھا۔ بات کی بات میں اسٹیشن آگیا۔

گوبر نے خوش ہو کر ایک روپیہ کمر سے نکال کر بھورے کیطرف بڑھاتے ہوئے کہا "لو گھروالی کے لئے مٹھائی لیتے جانا"۔

بھورے نے تشکرانہ حقارت سے اس کیطرف دیکھا "تم مجھے غیر سمجھتے ہو بھیا؟ ایک دن یکے پر بیٹھ گئے تو میں تم سے انعام لونگا! جہاں تمہارا پسینہ گرے وہاں اپنا لہو گرانے کو تیار رہوں۔ اتنا چھوٹا دل نہیں پایا ہے اور لے بھی لوں تو گھر والی مجھے جیتا چھوڑے گی ؟"

گوبر نے پھر کچھ نہ کہا، شرمندہ ہو کر اپنا اسباب اُتارا اور ٹکٹ لینے چلا۔

(۲۰)

بھاگن اپنی جھولی میں نئی زندگی کی پونجی لیکر آپہنچا تھا۔ آم کے پیڑ دونوں ہاتھوں سے بور کی مہک بکھیر رہے تھے اور کوئل آم کی ڈالیوں میں چھپی ہوئی اپنے راگوں کی خفیہ خیرات تقسیم کر رہی تھی۔

گاؤں میں ایکھ کی بوائی شروع ہو گئی تھی۔ ابھی دھوپ نہیں نکلی مگر ہوری کھیت میں پہنچ گیا ہے۔ دھنیا، سونا، روپا، تینوں تلیا سے ایکھ کے بھیگے ہوئے تھے نکال نکال کر کھیت میں لا رہی ہیں اور ہوری گنڈاسے سے ایکھ کے ٹکڑے کر رہا ہے۔ اب وہ داتا دین کی مزدوری کرنے لگا ہے۔ کسان نہیں، مزدور ہے۔ داتا دین سے اب اسکا پروہت اور ججمان کا ناتا نہیں، بلکہ مالک اور مزدور کا رشتہ ہے۔

داتا دین نے انگوٹھا اٹھا "ہاتھ اور پھرتی سے چلاؤ ہوری! اس طرح تو تم دن بھر میں نہ کاٹ سکو گے"!

ہوری نے زخم کھائے ہوئے تکبر کے ساتھ کہا "چلا ہی تو رہا ہے مہاراج، بیٹھا تو نہیں ہوں"۔

داتا دین مزدوروں سے کس کر کام لیتے تھے۔ اِسی لئے کوئی مزدور اُن کے یہاں ٹھہرتا نہ تھا۔ ہوری ان کے مزاج سے واقف تھا، مگر جاتا کہاں؟ پنڈت اس کے سامنے کھڑے ہو کر بولے "چلانے چلانے میں فرق ہے۔ ایک چلانا وہ ہے کہ گھڑی بھر میں کام تمام۔ دوسرا چلانا وہ ہے کہ دن بھر میں بھی ایک بوجھ نہ کٹے"۔

ہوری نے زہر کا گھونٹ پی کر زیادہ تیزی سے ہاتھ چلانا شروع کیا۔ ادھر مہینوں سے اُسے پیٹ بھر کھانا نہ ملتا تھا۔ عموماً ایک وقت تو چبینا ہی پڑتا تھا اور دوسرے وقت بھی کبھی آدھے پیٹ کھانا ملا، کبھی فاقہ ہو گیا۔ کتنا ہی چاہتا تھا کہ ہاتھ جلد جلد اُٹھے، مگر ہاتھ جواب دے رہا تھا۔ اُس پر داتا دین سر پر سوار تھے۔ لمحہ بھر دم لے لینے پاتا تو تازہ ہو جاتا مگر دم کیسے لے؟ جھڑکیاں پڑنے کا ڈر تھا۔

دھنیا اور دونوں لڑکیاں ایکھ کے گٹھے لئے بھیگی ساڑیوں سے لت پت، کیچڑ میں سنی ہوئی آئیں اور گٹھے پٹک کر ذرا دم لینے لگیں کہ داتا دین نے ڈانٹ بتائی "یہاں تماشا کیا دیکھتی ہے دھنیا، جا اور اپنا کام کر۔ پیسے سینت میں نہیں آتے۔ پہر بھر میں تو ایک گٹھا لائی ہے۔ اس حساب سے تو دن بھر میں ادھ نہ ڈھل پائے گی"۔

دھنیا نے تیوری بدل کر کہا "کیا تنک دم بھی نہ لینے دو گے مہراج؟ ہم بھی

آدمی ہیں۔ تمہاری مجوری کرنے سے بیل تو نہیں ہو گئے۔ جو اکھوپڑی پر ایک گھٹا لاؤ کرلاؤ تو پتہ چلے!"

داتا دین بگڑ اٹھے "پیسے دیتے ہیں کام کرنے کے لئے، دم لینے کے لئے نہیں۔ دم لینا ہے تو گھر میں جاکر دم لو۔"

دھنیا کچھ کہنے ہی جا رہی تھی کہ ہوری نے ڈانٹا "تو جاتی کیوں نہیں دھنیا، کیوں حجت کر رہی ہے؟"

دھنیا نے بندھنے کو اٹھاتے ہوئے کہا "جا تو رہی ہوں، پر چلتے ہوئے بیل کو آوگی نہ لگانا چاہیئے!"

داتا دین نے سرخ آنکھیں نکال کر کہا "معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مجاج ٹھنڈا نہیں ہوا، سبھی دانے کو ترستے ہو!"

دھنیا بھلا کیوں چپ رہنے لگی، بولی "تمہارے دروازے پر بھیک مانگنے تو نہیں جاتی؟"

داتا دین نے تیز لہجے میں کہا "اگر یہی حال ہے تو بھیک بھی مانگوگی!"

دھنیا کے پاس جواب تیار تھا مگر سونا اسے کھینچ کر تلیا کی طرف لے گئی ورنہ بات بڑھ جاتی۔ لیکن آواز کی پہنچ کے باہر جاکر اس نے دل کی بھڑاس نکالی "بھیک مانگو تم جو بھکمنگوں کی جات ہو، ہم تو مجور ٹھہرے، جہاں کام کریں گے وہیں چار پیسے پائیں گے!"

سونا نے حقارت سے کہا "اماں، جانے بھی دو۔ تم تو وکھت نہیں دیکھتیں، بات بات پر لڑنے لگ جاتی ہو!"

ہوری پاگلوں کی طرح سر سے اوپر گنڈاسہ اٹھا اٹھا کر اکھ کے ٹکڑے ڈھیر کرتا جاتا تھا۔ اس کے اندر جیسے آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اس میں غیر قدرتی طاقت

آگئی تھی۔ اس میں پُشتہا پُشت سے بہتا ہوا پانی تھا وہ اس وقت گویا بھاپ بن کر اُس کو مشین کی سی کورانہ طاقت دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ سر چکرانے لگا۔ پھر اُس کے ہاتھ مشین کی رفتار سے بلا تھکے اور بلا رُکے اٹھ رہے تھے۔ اُس کے بدن سے پسینہ ٹپک رہا تھا، مُنہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور سر میں دَھمکے کی آواز ہو رہی تھی، مگر اس پر جیسے کوئی بھوت سوار ہو گیا ہو۔

دفعتاً اس کی آنکھوں میں بالکل اندھیرا چھا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ زمین میں دھنسا جا رہا ہے۔ اُس نے سنبھلنے کی کوشش میں خالی ہاتھ پھیلا دیئے اور بے ہوش ہو گیا۔ گنڈاسہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ اوندھے مُنہ زمین پر گر پڑا۔ اُسی وقت دھنیا ایکھ کا گٹھا لئے آئی۔ دیکھا تو کئی آدمی ہوری کو گھیرے کھڑے ہیں۔ ایک ہلوا ہا داتا دین سے کہہ رہا تھا "مالک! تمہیں ایسی بات نہ کہنی چاہیئے جو آدمی کو لگ جائے۔ پانی مرتے ہی مرتے تو مرے گا!"

دھنیا ایکھ کا گٹھا پٹک کر پاگلوں کی طرح دَوڑی ہوئی ہوری کے پاس گئی اور اُس کا سر اپنی جانگھ پر رکھ کر زور زور سے روتے چلانے لگی۔ "تم مجھے چھوڑ کر کہاں جاتے ہو؟ اری سونا، دوڑ کر پانی لا اور جا کر سوبھا سے کہہ دے کہ دادا بے حال ہیں۔ ہائے رام! اب میں کہاں جاؤں۔ اب کس کی ہو کر رہوں گی؟ کون مجھے دھنیا کہہ کر پکارے گا۔۔۔؟"

لالہ پٹیشوری بھاگے ہوئے آئے اور محبت بھری سختی سے بولے "کیا کرتی ہے دھنیا، ہوش سنبھال! ہوری کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ گرمی سے بیہوش ہو گئے ہیں۔ ابھی ہوش آیا جاتا ہے۔ دل اتنا کچا کرے گی تو کیسے کام چلے گا؟"

دھنیا نے پٹیشوری کے پیر پکڑ لئے اور روتی ہوئی بولی "کیا کروں لالا، جی نہیں مانتا۔ بھگوان نے سب کچھ ہر لیا۔ میں صبر کر گئی۔ اب دھیرج نہیں ہوتا

ہائے میرا ہیرا!"

سونا پانی لائی۔ پٹیشوری نے ہوری کے منھ پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ کئی آدمی اپنے اپنے انگوچھوں سے ہوا دے رہے تھے۔ ہوری کا بدن سرد پڑ گیا تھا۔ پٹیشوری کو بھی تشویش ہوئی۔ مگر دھنیا کو وہ برابر دلاسا دیئے جاتے تھے۔

دھنیا نے بے صبری سے کہا "ایسا کبھی نہیں ہوا تھا لالا، کبھی نہیں!"

پٹیشوری نے پوچھا "رات کچھ کھایا تھا؟"

دھنیا بولی "ہاں روٹیاں بنائی تھیں، پر آج کل ہمارے اوپر جو بیت رہی ہے وہ کیا تم سے چھپا ہے؟ مہینوں سے پیٹ بھر روٹی نہیں نصیب ہوئی کتنا سمجھاتی ہوں کہ جان رکھ کر کام کرو لیکن آرام تو ہمارے بھاگ میں لکھا ہی نہیں ہے!"

دفعتاً ہوری نے آنکھیں کھول دیں اور اُڑتی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

دھنیا جیسے جی اُٹھی۔ بے قرار ہو کر اس کے گلے سے لپٹ کر بولی "اب کیسا جی ہے تمہارا؟ میری تو جان نہوں (ناخنوں) میں آگئی تھی!"

ہوری نے کمزور آواز میں کہا "اچھا ہوں۔ نہ جانے کیسا جی ہو گیا تھا!"

دھنیا نے محبت بھرے شکوے سے کہا "دیہہ میں دم تو ہے نہیں اور کام کرتے ہو جان ہوم کر۔ لڑکوں کا بھاگ تھا کہ بچ گئے ورنہ نہیں تو تم نے ہی ڈبو دیا تھا!"

پٹیشوری نے ہنس کر کہا "دھنیا تو رو پیٹ رہی تھی!"

ہوری نے بے صبری سے پوچھا "سچ مچ تو رو رہی تھی دھنیا؟"

دھنیا نے پٹیشوری کو پیچھے ڈھکیل کر کہا "انھیں بکنے دو تم۔ پوچھو کہ یہ کیوں کام دھندا چھوڑ کر گھر سے دوڑے آئے تھے!"

پٹیشوری نے چڑھایا "تو ہی ہیرا ہیرا" کہہ کر روتی تھی۔ اب لاج کے مارے
ٹکراتی ہے۔ چھاتی پیٹ رہی تھی"۔

ہوری نے دھنیا کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا "پگلی ہے اور کیا اب
نہ جانے کون سا سکھ دیکھنے کے لئے مجھے جلائے رکھنا چاہتی ہے"۔

دو آدمی ہوری کو سہارا دیکر گھر لے گئے اور چارپائی پر لٹا دیا۔ داتا دین تو
کڑھ رہے تھے کہ بوائی میں دیر ہوئی جاتی ہے، مگر ماتا دین اتنا بے رحم نہیں تھا وہ
دوڑ کر گھر سے گرم دودھ لایا اور ایک شیشی میں گلاب کا عرق بھی۔ دودھ پی کر
ہوری میں جان سی آ گئی۔

اسی وقت گوبر ایک مزدور کے سر پر اپنا سامان لادے ہوئے آتا دکھائی
دیا۔

گاؤں کے کتے پہلے تو بھونکتے ہوئے اسکی طرف دوڑے۔ پھر دُم ہلانے لگے۔
رُوپا نے کہا "بھیا آئے، بھیا آئے" اور تالیاں بجاتی ہوئی دوڑی۔ سونا بھی
دو تین قدم آگے بڑھی مگر اپنی خوشی کو ضبط کر گئی۔ ایک سال میں اس کا شباب کچھ
اور رنگیلا ہو گیا تھا۔ جھنیا بھی گھونگھٹ نکالے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔

گوبر نے والدین کے پیر چھوئے، اور روپا کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ دھنیا نے
اُسے اسیس دی اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر گویا اپنے ماں ہونے کا صلہ پا گئی۔
اس کا دل غرور سے اُمڈا پڑتا تھا۔ آج تو وہ رانی ہے۔ اس پھٹے حال میں بھی رانی
ہے! کوئی اس کا منھ دیکھے! رانی بھی لجا جائے گی۔ گوبر کتنا بڑا ہو گیا ہے اور
پہن اوڑھ کر کیسا بھلا آدمی سا لگتا ہے۔ دھنیا کے دل میں کبھی بدشگونی کا اندیشہ نہ ہوا
تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ گوبر خیریت سے ہے اور خوش ہے۔ آج اُسے آنکھوں دیکھ کر
گویا اسکی زندگی کی خاک میں گم شدہ جواہر مل گیا۔ مگر ہوری نے منھ پھیر لیا تھا۔

گوبر نے پوچھا ”دادا کو کیا ہوا ہے، اماں؟“

دھنیا گھر کا حال سنا کر اسے رنجیدہ نہ کرنا چاہتی تھی، بولی ”کچھ نہیں ہے بیٹا، ذرا سر میں درد ہے۔ چلو کپڑے اتارو، ہاتھ منہ دھو۔ کہاں تھے تم اتنے دن؟ بھلا اس طرح کوئی گھر سے بھاگتا ہے؟ اور کبھی ایک چٹھی تک نہ بھیجی۔ آج سال بھر کے پیچھے جا کے سدھ لی ہے۔ تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پھوٹ گئیں۔ یہی آسرا لگا رہتا تھا کہ کب وہ دن آوے گا اور کب تمہیں دیکھوں گی۔ کوئی کہتا تھا کہ مرچ بھاگ گیا اور کوئی ڈمرا ٹاپو بتاتا تھا۔ میری تو سن سن کے جان سوکھی جاتی تھی۔ کہاں رہے اتنے دن؟“

گوبر نے شرماتے ہوئے کہا ”کہیں دور نہیں گیا تھا اماں! یہیں لکھنؤ میں تھا۔“

”اور اتنے پاس رہ کر بھی کبھی چٹھی تک نہ لکھی!“

ادھر سونا اور روپا اندر گوبر کا سامان کھول کر چیزوں کو آپس میں بانٹنے لگی تھیں۔ مگر جھنیا دور کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر آج رکھائی کا سرخ رنگ جھلک رہا ہے۔ گوبر نے اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے آج وہ اس کا بدلہ لے گی۔ اسامی کو دیکھ کر مہاجن اس سے وہ روپئے وصول کرنے بھی بے چین ہو رہا ہے جو اس نے بٹے کھاتے میں ڈال دیئے تھے۔ بچہ ان چیزوں کی طرف لپک رہا تھا اور چاہتا تھا کہ سب کی سب ایک ساتھ منہ میں بھر لے۔ مگر جھنیا اسے گود سے نہ اتارتی تھی۔

سونا بولی ”بھیا تمہارے لئے آئینہ اور کنگھی لائے ہیں، بھابھی!“

جھنیا نے رکھائی سے کہا ”مجھے آئینہ کنگھی نہ چاہیئے، اپنے پاس رکھے رہیں!“

روپانے بچے کی چمکدار ٹوپی نکالی "ارے واہ یہ تو جُنّو کی ٹوپی ہے!" اور اُسے بچے کے سر پر پہنا دیا۔

جھنیا نے ٹوپی اُتار کر پھینک دی اور یکایک گوبر کو اندر آتے دیکھ کر وہ بچے کو لئے ہوئے اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔

گوبر نے دیکھا کہ سارا سامان کھلا پڑا ہے۔ اس کا جی تو چاہتا ہے کہ پہلے جھنیا سے مل کر اپنا قصور معاف کرائے مگر اندر جانے کی ہمت نہیں پڑی۔ وہیں بیٹھ گیا اور چیزیں نکال نکال کر ہر ایک کو دینے لگا۔ مگر روپا اس لئے پھول گئی کہ اس کے لئے چپّل کیوں نہیں آئے "اور سونا اُسے چڑھانے لگی "تو کیا کرے گی چپّل لے کر؟ اپنی گڑیا کھیل۔ ہم تو تیری گڑیا دیکھ کر نہیں روتے، پھر تو میرا چپّل دیکھ کر کیوں روتی ہے؟"

مٹھائی بانٹنے کی ذمہ داری دھنیا نے اپنے اوپر لی۔ اتنے دنوں کے بعد لڑکا کُشل سے گھر آیا ہے۔ وہ گاؤں بھر میں بائن بنٹوائے گی۔ ایک گلاب جامن روپا کے لئے اونٹ کے منہ میں زیرے کی طرح تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہانڈی اس کے سامنے رکھ دی جائے اور وہ کود کود کر کھائے۔

اب صندوق کھلا اور اس میں سے ساڑیاں نکلنے لگیں۔ سبھی کنارے دار تھیں۔ جیسی ٹھاکر یا چودھری لالا کے گھر میں پہنی جاتی ہیں۔ مگر ہیں بڑی ہلکی۔ ایسی باریک ساڑیاں بھلا کتنے دن چلیں گی؟ بڑے آدمی چاہے جتنی باریک ساڑیاں پہنیں، اُن کی عورتوں کو بیٹھنے اور سونے کے سوا اور کون کام ہے؟ یہاں تو کھیت کھلیان بھی کچھ ہے! اچھا بوری کے لئے دھوتی کے سوا ایک دوپٹہ بھی ہے!

دھنیا خوش ہو کر بولی "یہ تم نے بڑا اچھا کیا بیٹا۔ اُن کا دوپٹہ بالکل تار تار ہو گیا تھا!"

گوبر کو اتنی دیر میں گھر کی حالت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ دھنیا کی ساڑی میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ سونا کی ساڑی سر پر پھٹی ہوئی تھی اور اس میں سے بال دکھائی دے رہے تھے۔ روپا کی دھوتی میں چاروں طرف جھالر سی لٹک رہی تھی۔ سبھی کے چہرے روکھے سوکھے، چکناہٹ کا بدن پر کہیں نام نہ تھا۔ جدھر دیکھو افلاس کا دور دورہ تھا۔

لڑکیاں تو ساڑیوں میں مگن تھیں، دھنیا کو لڑکے کے لئے کھانے کی فکر ہوئی گھر میں تھوڑا سا جو کا آٹا شام کے لئے رکھا ہوا تھا اس وقت تو چبینے پر گزر ہوتا تھا، مگر گوبر اب وہ گوبر تھوڑے ہی ہے۔ اس سے جو کا آٹا کھایا بھی جائے گا؟ پردیس میں نہ جانے کیا کیا کھاتا پیتا رہا ہوگا۔ جاکر دُلاری کی دوکان سے گیہوں کا آٹا۔ چاول اور گھی اُدھار لائی۔ ادھر مہینوں سے دُلاری ایک پیسے کی چیز بھی اُدھار نہ دیتی تھی مگر آج اس نے ایک بار بھی نہ پوچھا کہ پیسے کب دو گی۔

اُس نے پوچھا "گوبر تو خوب کما کر آیا ہے نا؟"

دھنیا بولی "ابھی تو کچھ نہیں کھلا دیدی۔ ابھی میں نے بھی کچھ کہنا ٹھیک نہیں سمجھا۔ ہاں سب کے لئے کنارے دار ساڑیاں لایا ہے۔ تمہارے اسیرباد سے اچھی طرح لوٹ آیا۔ میرے لئے تو یہی بہت ہے۔"

دُلاری نے دعا دی۔ "بھگوان کریں وہ جہاں رہے کُسل سے رہے۔ ماں باپ کو اور کیا چاہیئے۔ لڑکا سمجھدار ہے اور لڑکوں کی طرح اُڑاؤ نہیں ہے۔ ہمارے روپئے ابھی نہ ملیں تو بیاج تو دے دو۔ دن بدن بوجھ بڑھ ہی تو رہا ہے۔"

ادھر سونا چُنّو کو اس کا فراک اور ٹوپ اور جوتا پہنا کر "راجا" بنا رہی تھی۔ بچہ ان چیزوں کو پہننے سے زیادہ ہاتھ میں لے کر کھیلنا اور پھاڑنا پسند کرتا تھا۔ اندر گوبر اور جھنیا میں روٹھنے اور منانے کا ناٹک ہو رہا تھا۔

جھنیا نے حقارت سے دیکھ کر کہا "مجھے لاکر یہاں بیٹھا دیا، آپ پردیس کی راہ لی۔ پھر نہ کھوج نہ کھبر، کہ مرتی ہے یا جیتی ہے۔ سال بھر بعد اب جاکر تمہاری نیند ٹوٹی ہے۔ کتنے بڑے کپٹی ہو تم۔ میں تو سوچتی ہوں کہ تم میرے پیچھے پیچھے آ رہے ہو گے اور آپ اڑے تو سال بھر کے پیچھے لوٹے۔ مردوں کا بسواس ہی کیا؟ کہیں کوئی اور تاک لی ہو گی۔ سوچا ہو گا کہ ایک گھر کے لئے ہے۔ ایک باہر کے لئے بھی ہو جائے۔"

گوبر نے صفائی دی "جھنیا میں بھگوان کو ساکھی دیکر کہتا ہوں جو میں نے کبھی کسی کی طرف تاکا بھی ہو۔ لاج اور ڈر کے مارے گھر سے بھاگا تو، مگر تیری یاد ایک منٹ کے لئے بھی من سے نہ اترتی تھی۔ اب تو میں نے طے کر لیا ہے کہ تجھے بھی لیتا جاؤں گا۔ اسی لئے آیا ہوں۔ تیرے گھر والے تو بہت بگڑے ہوں گے؟"

"دادا تو میری جان ہی لینے پر اتارو تھے؟"

"سچ!"

"تینوں آدمی یہاں چڑھ آئے تھے۔ پر اماں نے ایسی پھٹکار بتائی کہ منہ لے کر رہ گئے۔ ہاں ہمارے دونوں بیل کھول لے گئے۔"

"اتنی بڑی جبردستی، اور دادا کچھ بولے نہیں؟"

"دادا کس کس سے لڑتے؟ گاؤں کے لوگ تو نہیں لے جانے دیتے تھے پر دادا ہی اپنی بھلمنسی میں آ گئے تو اور لوگ کیا کرتے؟"

"تو اب کھیتی باڑی کیسے ہو رہی ہے؟"

"کھیتی باڑی سب ٹوٹ گئی۔ تھوڑی سی پنڈت مہاراج کے ساجھے میں ہے۔ اوکھ بوئی ہی نہیں گئی۔"

گوبر کی کمر میں اس وقت دو سو روپے تھے۔ اس کی گرمی یوں ہی کم نہ تھی۔ یہ حال سُنکر تو اس کے بدن میں آگ ہی لگ گئی بولا "تو پھر پہلے میں ان ہی سے سمجھتا ہوں۔ انکی یہ مجال کہ میرے دُوارے پر سے بیل کھول لے جائیں۔ یہ ڈاکہ ہے کُھلا ہُوا ڈاکہ۔ تین تین سال کو چلے جائیں گے تینوں۔ یوں نہ دیں گے تو عدالت سے لوں گا۔ سارا گھمنڈ توڑ دوں گا۔"

وہ اسی جوش میں چل پڑا تھا کہ جھنیا نے پکڑ لیا اور بولی "تو چلے جانا، ابھی ایسی جلدی کا ہے کی ہے؟ کچھ آرام کر لو، کچھ کھا پی لو۔ سارا دن تو پڑا ہے یہاں بڑی بڑی پنچایت ہوئی۔ پنچایت نے اسی روپے تاوان لگایا اور تیس من اناج اوپر سے۔ اسی میں تو اور تباہی آگئی۔"

سونا بچے کو کپڑے اور جوتے پہنا کر لائی۔ کپڑے پہن کر وہ جیسے سچ مچ راجا ہو گیا تھا۔ گوبر نے اُسے گود میں لے لیا۔ مگر اس وقت بچے کے پیار میں اُسے خوشی نہ ہوئی۔ اس کا خون اُبل اُٹھا اور کمر کے روپے آنچ کو زیادہ تیز کر رہے تھے۔ وہ ایک ایک سے سمجھے گا۔ پنچوں کو اس پر تاوان لگانے کا حق ہی کیا ہے؟ کون ہوتا ہے کوئی اس کے بیچ میں بولنے والا؟ اس نے ایک عورت رکھ لی تو پنچوں کے باپ کا کیا بگڑا؟ اگر اسی بات پر وہ فوجداری میں دعویٰ کر دے تو لوگوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑ جائیں۔ ساری گرہستی تہس نہس ہو گئی۔ کیا سمجھ لیا ہے اُسے ان لوگوں نے؟

بچہ اس کی گود میں ذرا سا مُسکرایا، پھر زور سے چیخ اُٹھا جیسے کوئی ڈراؤنی چیز دیکھ لی ہو۔

جھنیا نے بچے کو اس کی گود سے لے لیا اور بولی "اب جا کر نہا دھو لو۔ کس سوچ میں پڑ گئے؟ یہاں سب سے لڑنے لگو تو ایک دن نباہ نہ ہو۔ جس کے پاس

پیسہ ہے وہی بڑا آدمی ہے، وہی بھلا آدمی ہے۔ پیسہ نہ ہو اس پر سبھی رُعب جماتے ہیں۔"

"میرا اندھا پن تھا کہ گھر سے بھاگا، نہیں تو دیکھتا کہ کیسے کوئی ایک دھیلا ڈنڈ لیتا ہے۔"

"شہر کی ہوا کھا آئے ہو تب یہ باتیں سوجھنے لگی ہیں، نہیں گھر سے بھاگتے ہی کیوں؟"

"یہی جی چاہتا ہے کہ لاٹھی اُٹھاؤں اور پٹیشوری، داتا دین، جھنگری سب سالوں کو مار کر گرا دوں اور ان کے پیٹ سے روپئے نکال لوں۔"

"روپئے کی بہت گرمی چڑھی ہوئی ہے سا ہت لاؤ نکالو، دیکھوں تو کہ اتنے دن میں کیا کما لائے ہو؟"

اس نے گوبر کی کمر میں ہاتھ لگایا۔ گوبر کھڑا ہو کر بولا "ابھی کیا کمایا؟ ہاں اب تم چلو گی تو کماؤں گا۔ سال بھر تو شہر کے رنگ ڈھنگ پہچاننے ہی میں لگ گئے۔"

"اماں جانے دیں گی تب تو؟"

"اماں کیوں نہ جانے دیں گی، اُن سے مطلب؟"

"واہ! میں ان کی راجی بنا کہیں نہ جاؤں گی۔ تم تو چھوڑ کر چلتے بنے اور میرا کون تھا یہاں؟ وہ اگر گھر میں نہ گھسنے دیتیں تو میں کہاں جاتی؟ جب تک جیوں گی ان کا جس گاؤں گی اور تم بھی کیا پردیس ہی کرتے رہوگے؟"

"اور یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا؟ کماؤ اور بھرو، اس کے سوائے یہاں اور کیا دھرا ہے؟ تھوڑی سی سمجھ ہو اور آدمی کام کرنے سے نہ ڈرے تو وہاں بھوکوں نہیں مر سکتا۔ یہاں تو سمجھ کچھ کام ہی نہیں کرتی۔ دادا کیوں مجھ سے مُنہ پُھلائے

ہوئے ہیں ہوتا۔

"اپنا بھاگ بُرا ہو کہ مُنہ بھُلا کر رہے جاتے ہیں۔ تم نے اِدھر تو اتنا بڑا کیا تھا کہ اسی برس میں پا جاتے تو مُنہ لال کر دیتے!"

"تو تمہیں بھی بہت گالیاں دیتے ہوں گے؟"

"کبھی نہیں، بھول کے بھی نہیں! - امّاں تو پہلے مَر گئی تھیں، پر دادا نے تو کبھی کچھ نہیں کہا۔ جب بُلاتے ہیں تو بڑے پیار سے۔ میرا سَر بھی دُکھتا ہے تو بے چین ہو جاتے ہیں۔ اپنے باپ کو دیکھتے تو میں انھیں دیوتا سمجھتی ہوں۔ امّاں کو سمجھایا کرتے ہیں کہ بہو کو کچھ نہ کہنا۔ تمہارے اوپر سینکڑوں بار بگڑ چکے ہیں کہ لے سے گھر میں بیٹھا کہا آپ نہ جانے کہاں بھاگ گیا۔ آج کل پیسے پیسے کی تنگی ہے۔ اوکھ کے رو پئے باہر ہی باہر اُڑ گئے۔ اب تو مجوری کرنی پڑتی ہے۔ آج بیچارے کھیت میں کام کرتے کرتے بیہوش ہو گئے۔ رونا پیٹنا مچ گیا۔ تب سے پڑے ہیں!"

گوبر مُنہ ہاتھ دھو کر اور بالوں کو خوب سنوار کر گاؤں فتح کرنے نکلا۔ دونوں چچاؤں کے گھر جا کر "رام رام" کر آیا۔ پھر اور دوستوں سے ملا۔ گاؤں میں کوئی خاص تبدیلی نہ تھی۔ ہاں پٹیشوری کی نئی بیٹھک بن گئی تھی اور جھنگری سنگھ نے دروازے پر نیا کنواں کھدوا لیا تھا۔ گوبر کے دل میں مخالفت اور بھی تُم تُھونکنے لگی جس سے ملا اُس نے اس کی خاطر کی اور نوجوانوں نے تو اُسے اپنا ہیرو بنا لیا اور اُس کے ساتھ لکھنؤ جانے کو تیار ہو گئے۔ سال ہی بھر میں وہ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

دفعتاً جھنگری سنگھ اپنے کنوئیں پر نہاتے ہوئے مل گئے گوبر نکلا مگر نہ سلام کیا نہ بولا۔ وہ ٹھا کر کو دکھا دینا چاہتا تھا کہ میں تمہیں کچھ نہیں سمجھتا۔ جھنگری سنگھ نے خود ہی پوچھا "کب آئے گوبر؟ مجے میں تو رہے؟ کہیں

نوکر تھے لکھنؤ میں؟"

گوبر نے رعونت سے کہا "لکھنؤ گلامی کرنے نہیں گیا تھا۔ نوکری ہے تو گلامی۔ میں بیوپار کرتا تھا۔"

ٹھاکر نے تعجب سے اسے سر سے پیر تک دیکھا "کتنا روج کماتے تھے؟"

گوبر نے جھری کو بھالا بنا کر ان کے اوپر چلایا "یہی کوئی ڈھائی تین روپئے پل جاتے تھے۔ کبھی چمک گئی تو چار بھی مل گئے۔ اس سے بیسی نہیں۔"

جھنگری بہت تو خرچ کھسوٹ کر کے بھی پچیس تیس سے زیادہ نہ کما پاتے تھے اور یہ گنوار لونڈا سو روپئے کمانے لگا۔ ان کا سر جھک گیا۔ اب وہ کس دعوی سے اس پر رعب جما سکتے ہیں؟ ذات میں وہ ضرور اونچے ہیں مگر ذات کون دیکھتا ہے؟ اس سے مقابلہ کرنے کا یہ وقت نہیں، اب تو اس کی منت ہی کر کے کچھ کام نکالا جا سکتا ہے بولے "اتنی کمائی کم نہیں ہے بیٹا، جو خرچ کرتے بنے۔ گاؤں میں تو تین آنے بھی نہیں ملتے بھوانی (ان کے بڑے لڑکے کا نام تھا) کو بھی کہیں کام دلا دو تو بھیج دوں۔ نہ پڑھے نہ لکھے، ایک نہ ایک جھگڑا کھڑا کئے رہتا ہے۔ کہیں ٹھیکے خالی ہو تو کہنا، نہیں تو ساتھ ہی لیتے جانا۔ تمہارا تو ساتھی ہے۔ طلب تھوڑی ہو، کچھ بات نہیں، ہاں چار پیسے کی اوپری گنجائش ہو۔"

گوبر نے گھمنڈ بھری ہنسی کے ساتھ کہا "یہی اوپری آمدنی کی چاٹ تو آدمی کو بگاڑ دیتی ہے، ٹھاکر! پر ہم لوگوں کی عادت ایسی بگڑ گئی ہے کہ جب تک بے ایمانی نہ کریں، پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ لکھنؤ میں ٹھیکی مل سکتی ہے مگر ہر ایک مہاجن ایماندار اور چوکس آدمی چاہتا ہے۔ میں بھوانی کو کسی کے گلے باندھ تو دوں پر پیچھے انہوں نے کہیں ہاتھ لپکایا تو وہ گردن پکڑے گا۔ دنیا میں علم کی پوچھ نہیں ہے ایمان کی پوچھ ہے!"

یہ طمانچہ لگا کہ گوبر آگے بڑھ گیا۔ جھنگری دل مسوس کر رہ گئے "لونڈا کتنے گھمنڈ کی باتیں کرتا ہے جیسے دھرم کا اوتار ہی ہو"۔

اسی طرح گوبر نے داتا دین کو بھی رگڑا۔ وہ کھانا کھانے جا رہے تھے کہ گوبر کو دیکھ کر خوش ہو کر بولے "مزے میں تو رہے گوبر؟ سنا کہ وہاں کوئی اچھی جگہ پا گئے ہو"۔ ماتادین کو بھی کہیں حیلے سے لگا دو نا؟ بھنگ پی کر پڑے رہنے کے سوا اور کون کام ہے؟"

گوبر نے بتایا "تمہارے گھر میں کس بات کی کمی ہے مہاراج؟ جس ججمان کے یہاں جا کر کھڑے ہو جاؤ، کچھ نہ کچھ مار ہی لاؤ گے۔ پیدا ہونے میں تم، مرنے میں تم، شادی میں تم، غمی میں تم، کھیتی کرتے ہو، لین دین کرتے ہو، دلالی کرتے ہو، کسی سے کچھ بھول چوک ہو جائے تو ڈانڈ باندھ لگا کر اس کا گھر لوٹ لیتے ہو۔ اتنی کمائی میں پیٹ نہیں بھرتا؟ کیا کرو گے بہت سا دھن بٹور کر؟ کہ ساتھ لے جانے کی کوئی جگت نکالی ہے؟"

داتا دین نے دیکھا کہ گوبر کتنی ڈھٹائی سے بول رہا ہے، ادب لحاظ جیسے بالکل بھول سا گیا ہو۔ ابھی شاید نہیں جانتا کہ باپ میری مجوری کر رہا ہے۔ سچ ہے۔ چھوٹی ندی کو امنڈتے دیر نہیں لگتی۔ مگر چہرے پر کدورت نہ آنے دی۔ جیسے بڑے بوڑھے بچوں سے مونچھیں اکھڑوا کر بھی ہنستے ہیں، انہوں نے بھی اس طعنے کو ہنسی میں لیا اور ہنستے ہوئے کہا "لکھنؤ کی ہوا کھا کے تو بڑا اجنٹ ہو گیا ہے گوبر! لا، کیا کما کے لایا ہے؟ کچھ نکال! سچ کہتا ہوں گوبر، تمہاری یاد بہت آتی تھی۔ اب تو رہو گے کچھ دن؟"

"ہاں، ابھی تو رہوں گا کچھ دن، ان پنچوں پر دعویٰ کرنا ہے جنہوں نے ڈنڈ کے بہانے میرے ڈیڑھ سو روپئے ہڑپ لئے ہیں۔ دیکھوں، کون میرا حقہ پانی

بند کرتا ہے اور کون برادری مجھے جات باہر کرتی ہے!"

یہ دھمکی دے کر وہ آگے بڑھا۔ اس کی تمکنت نے اس کے نوجوان عقیدت مندوں کو مرعوب کر دیا تھا۔

ایک نے کہا "کر دو دعویٰ گوبر بھیّا! بڈھا کالا سانپ ہے جس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ تم نے اچھی ڈانٹ بتائی۔ پٹواری کے کان بھی جرا گرم کر دو۔ بڑا پاجی ہے۔ باپ بیٹے میں آگ لگا دے۔ بھائی بھائی میں آگ لگا دے۔ کارندے سے مل کر اسامیوں کا گلا کاٹتا ہے۔ اپنے کھیت پیچھے جوتو، پہلے اس کے کھیت جوت دو۔ اپنی سینچائی پیچھے کرو، پہلے اس کی سینچائی کر دو۔

گوبر نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "مجھ سے کیا کہتے ہو بھائی سال بھر میں بھول تھوڑے ہی گیا ہوں۔ یہاں مجھے رہنا ہی نہیں ہے، نہیں تو ایک ایک کو نچا کر چھوڑتا۔ اب کے ہولی دھوم دھام سے مناؤ اور سبھی کا سوانگ بنا کر ان سبھوں کے خوب بھگو بھگو کر لگاؤ!"

ہولی کا پروگرام بننے لگا۔ خوب بھنگ گھٹے، دودھیا بھی اور نمکین بھی! اور رنگوں کے ساتھ کالکھ بھی بنے اور مکھیوں کے منہ پر کالکھ ہی پوتی جائے۔ ہولی میں کوئی بول ہی کیا سکتا ہے؟ پھر سوانگ نکلے اور پنچوں کی خوب بھد کی جائے۔ روپے پیسے کی کوئی پروا نہیں، گوبر بھائی کما کر آئے ہیں۔

گوبر کھانا کھا کر بھولا سے ملنے چلا۔ جب تک اپنی جوڑی لا کر اپنے دروازے پر نہ باندھ دے، اسے چین نہیں۔ وہ لڑنے مرنے پر آمادہ تھا۔

ہوری نے عاجزانہ لہجے میں کہا "جھگڑا مت بڑھاؤ بیٹا! بھولا گوئی لے گئے، بھگوان اُن کا بھلا کرے! پر روپئے تو آتے ہی تھے!"

گوبر نے جھڑک کر کہا "دادا، تم بیچ میں نہ بولو۔ ان کی گائے پچاس کی تھی

ہماری جوڑی ڈیڑھ سو میں آئی تھی۔ تین سال ہم نے جوتی۔ پھر بھی سو کی تو تھی ہی۔ وہ اپنے روپئے کے لئے دعویٰ کرتے، ڈگری کراتے یا جو چاہتے کرتے، ہمارے دوار سے جوڑی کیوں کھول لے گئے؟ اور تمہیں کیا کہوں؟ اِدھر گرہ کی کھو بیٹھے اِدھر اُدھر ڈیڑھ سو روپئے تاوان کے بھرے۔ یہ ہے سِدھائی کا پھل! میرے سامنے جوڑی لے جاتے تو دیکھتا، تینوں کو یہیں دھرتی پر سُلا دیتا۔ اور پنچوں سے تو بات تک نہ کرتا۔ دیکھتا کہ کون مجھے برادری سے الگ کئے دیتا ہے۔ مگر تم بیٹھے تاکتے رہے۔"

ہوری نے خطاوار کی طرح سر جھکا لیا مگر دھنیا یہ زیادتی کیسے دیکھ سکتی تھی؟ بولی "بیٹا تم بھی تو اندھیر کرتے ہو۔ حُقّہ پانی بند ہو جاتا تو گاؤں میں نباہ ہوتا؟ جوان لڑکی بیٹھی ہے، اس کا بھی کہیں ٹھکانا لگانا ہے کہ نہیں؟ مرنے جینے میں آدمی برادری......"

گوبر نے بات کاٹی "حُقّہ پانی سب تو تھا، برادری میں آدر بھی تھا، پھر میرا بیاہ کیوں نہیں ہوا؟ بولو۔ اس لئے کہ گھر میں روٹی نہ تھی۔ روپئے ہوں تو نہ حُقّہ پانی کا کام ہے نہ بھائی برادری کا۔ دُنیا پیسے کی ہے، اور کوئی کچھ نہیں پوچھتا۔"

دھنیا تو بچّے کا رونا سُنکر اندر چلی گئی اور گوبر بھی گھر سے نکلا۔ ہوری بیٹھا سوچ رہا تھا کہ لڑکے کی سمجھ جیسے کھل گئی ہے۔ کیسی بے لاگ بات کہتا ہے۔ اس کی اُلٹی سمجھ نے ہوری کے ایمان و اخلاق کو مغلوب کر دیا تھا۔

دفعتاً ہوری نے اس سے پوچھا "میں بھی چلوں؟"

"میں لڑائی کرنے نہیں جاتا، دادا! ڈرو نہیں۔ میری طرف تو قانون ہے، میں کیوں لڑائی کرنے لگا؟"

"میں بھی چلوں تو کوئی ہرج ہے؟"

"ہاں بڑا اہرج ہے، تم بنی بات بگاڑ دو گے!"
ہوری چپ ہو گیا اور گوبر چل دیا۔
پانچ منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ دھنیا بچے کو لئے ہوئے باہر نکلی اور بولی
کیا گوبر چلا گیا، اکیلے؟ میں کہتی ہوں کہ تمہیں بھگوان کبھی بدھی دیں گے یا نہیں۔ بھولا
کیا یوں ہی گوئی سار دے گا؟ تینوں اُس پر ٹوٹ پڑیں گے، باج کی طرح۔
بھگوان ہی کسل کریں۔ اب کِس سے کہوں کہ دوڑ کر گوبر کو پکڑے؟ تم سے
تو میں ہار گئی!"
ہوری نے کونے سے ڈنڈا اُٹھایا اور گوبر کے پیچھے دوڑا۔ گاؤں کے باہر
آ کر اس نے نظر دوڑائی، ایک ہلکی سی لکیر اُفق سے ملی ہوئی دکھائی دی۔ اتنی ہی دیر
میں گوبر اتنی دُور کیسے نکل گیا۔ ہوری کا دل اُسے ملامت کرنے لگا۔ اُس نے
کیوں گوبر کو روکا نہیں؟ اگر وہ ڈانٹ کر کہہ دیتا کہ بھولا کے گھر مت جاؤ تو گوبر کبھی
نہ جاتا اور اب اس سے دَوڑا بھی تو نہیں جاتا۔ وہ ہار کر وہیں بیٹھ گیا اور بولا۔
"اس کی رَچّھا کرو مہابیر سوامی!"
گوبر اس گاؤں میں پہنچا تو کچھ لوگ برگد کے نیچے بیٹھے ہوئے، جُوا کھیل رہے
تھے۔ اُسے دیکھ کر لوگوں نے سمجھا کہ پولیس کا سپاہی ہے۔ کوڑیاں سمیٹ کر
بھاگے کہ دفعتاً جنگی نے پہچان کر کہا "ارے یہ تو گوبر دھن ہے!"
گوبر نے دیکھا کہ جنگی پیڑ کی آڑ میں کھڑا جھانک رہا ہے بولا "ڈرو مت
جنگی بھیّا میں ہوں۔ رام رام! آج ہی آیا ہوں۔ سوچا کہ چل سب سے مِلتا آؤں۔
پھر نہ جانے کب آنا ہو۔ میں تو بھیّا تمہارے آشیرباد سے بڑے مزے میں نکل گیا۔
جس راجا کی نوکری میں ہوں اُس نے مجھ سے کہا ہے کہ ایک دو آدمی مل جائیں
تو لیتے آنا۔ چوکیداری کیلئے چاہیئے۔ میں نے کہا سرکار! ایسے آدمی دوں گا کہ

چاہے جان چلی جائے پر وہ میدان سے ہٹنے والے نہیں۔ چاہو تو میرے ساتھ چلو۔ اچھی جگہ ہے۔"

گوبر نے بڑے یقین سے کہا "بس کچھ چلتا مت کرو۔ سب کچھ اپنے ہی ہاتھ میں ہے جو چاہو گے ہو جائے گا۔ ہم نے سوچا کہ جب گھر ہی میں آدمی ہے تو باہر کیوں جائیں؟"

"کام چاہے جو کیداری کرو چاہے ٹکادے پر جاؤ۔ ٹکادے کا کام سب سے اچھا ہے۔ اسامی سے گنٹھ گئے اور ادھر مالک سے آکر کہہ دیا کہ گھر پہ ملا ہی نہیں۔ چاہو تو روپئے آٹھ آنے روج بنا سکتے ہو۔"

"رہنے کو جگہ بھی ملتی ہے؟"

"جگہ کی کون کمی؟ پورا محل پڑا ہے، پانی کا نل، بجلی کی بتّی۔ کسی بات کی کمی نہیں۔ کامتا ہیں کہ کہیں گئے ہیں؟"

"دودھ لے کر گئے ہیں۔ مجھے کوئی ہاٹ نہیں جانے دیتا۔ کہتے ہیں کہ تم تو گانجہ پی جاتے ہو۔ میں اب بہت کم پیتا ہوں بھیّا، پر دو پیسے روج تو چاہئے۔ تم کامتا سے کچھ نہ کہنا۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"ہاں ہاں، بے کھٹکے چلو۔ ہولی کے بعد۔"

"تو پکّی رہی۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے بھولا کے دروازے پر جا پہنچے۔ بھولا بیٹھے ہوئے سُتلی کات رہے تھے۔ گوبر نے لپک کر ان کے پیر چھوئے اور اس وقت اس کا گلا واقعی بھر آیا۔ بولا "کاکا، مجھ سے جو کچھ بھول چوک ہوئی ہو وہ چھما کرو۔"

بھولا نے سُتلی کاتنا بند کر دیا اور پتھریلی آواز میں بولا "کام تو تم نے ایسا ہی کیا تھا گوبر کہ تمہارا سر کاٹ لوں تو بھی پاپ نہ لگے گا، مگر اپنے دروازے پر آئے ہو

تو اب کیا کہوں۔ جاؤ جیسا میرے ساتھ کیا اُس کا ڈنڈ بھگوان دیں گے۔ کب آئے؟"

گوبر نے خوب نمک مرچ لگا کر اپنی تقدیر کے چمکنے کا حال کہہ سنایا اور جھنیا کو اپنے ساتھ لے جانے کی منظوری چاہی۔ بھولا کو جیسے بِسا نگے بر وا ہی بل گیا۔ جھنگی گھر پر ایک نہ ایک فساد کرتا رہتا تھا۔ باہر چلا جائے گا تو چار پیسے پیدا کرے گا۔ نہ کسی کو کچھ دے گا۔ اپنا بوجھ تو اُٹھائے گا۔

گوبر نے کہا "نہیں کا کا، بھگوان نے چاہا اور ان سے رہتے بنا تو سال دو سال میں آدمی ہو جائیں گے۔"

"ہاں جب ان سے رہتے بنے۔"

"سر پہ آ پڑتی ہے تو آدمی آپ سنبھل جاتا ہے۔"

"تو کب تک جانے کا ارادہ ہے؟"

"ہولی کر کے چلا جاؤں گا۔ یہاں کھیتی باڑی کا سلسلہ پھیلا دوں تو بے فکر ہو جاؤں۔"

"ہوری سے کہو کہ اب بیٹھ کے رام رام جپیں۔"

"کہتا تو ہوں، لیکن جب اُن سے بیٹھا رہا جائے۔"

"وہاں کسی بید سے تو تمہاری جان پہچان ہوگی۔ کھانسی بہت آ رہی ہے ہو سکے تو کوئی دوائی بھیج دینا۔"

"ایک نامی بید تو میرے پڑوس ہی میں ہیں۔ اُن سے حال کہہ کے دوا بنوا کر بھیج دوں گا۔ کھانسی رات کو تنگ کرتی ہے کہ دن کو؟"

"نہیں بیٹا، رات کو۔ آنکھ نہیں لگتی۔ نہیں تو وہاں کوئی ڈول ہو تو میں بھی وہیں چل کر رہوں۔ یہاں تو کچھ پرتا نہیں پڑتا۔"

"روجگار کا مجا تو وہاں ہے کا کا۔ یہاں کیا ہوگا؟ یہاں روپئے کا دس سیر

دودھ بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ حلوائیوں کے گلے لگانا پڑتا ہے۔ وہاں پانچ چھ سیر کے بھاؤ سے چاہو تو ایک گھڑی میں منوں دودھ بیچ لو۔"

جنگی گوبر کے لیئے دودھیا شربت بنانے چلا گیا تھا۔ بھولا نے تخلیہ دیکھ کر کہا "اور بھیا، اب اس جنجال سے جی اُدب گیا ہے۔ جنگی کا حال دیکھتے ہی ہو۔ کامتا دودھ لے کر جاتا ہے۔ چارا پانی، کھولنا باندھنا سب مجھے کرنا پڑتا ہے۔ اب تو یہی چاہتا ہوں کہ سکھ سے کہیں ایک روٹی کھاؤں اور پڑا رہوں۔ کہاں تک ہائے ہائے کروں۔ روج لڑائی جھگڑا۔ کس کس پاؤں سہلاؤں؟ کھانسی آتی ہے، رات کو اُٹھا نہیں جاتا۔ کوئی ایک لوٹا پانی کو بھی نہیں پوچھتا۔ پگہیا ٹوٹ گئی ہے پر کسی کو اس کی سُدھ نہیں ہے۔ جب میں بناؤں گا تبھی بنے گی۔"

گوبر نے یگانگت کے ساتھ کہا "تم چلو لکھنؤ کاکا، پانچ سیر کا دودھ بیچو نگد۔ کتنے بڑے بڑے آدمیوں سے میری جان پہچان ہے۔ من بھر دودھ کی نکاسی کا جمہ تو میں لیتا ہوں۔ میری چائے کی دوکان بھی ہے۔ دس سیر دودھ تو میں ہی روج لیتا ہوں۔ تمہیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔"

جنگی شربت لے آیا۔ گوبر نے ایک گلاس پی کر کہا "تم تو سانجھ سبیرے چائے کی دوکان ہی پر بیٹھ جاؤ کاکا، تو ایک روپیہ کہیں نہیں گیا۔"

بھولا نے ایک منٹ بعد ذرا شرماتے ہوئے کہا "گھستے میں بٹیا آدھی اندھا ہو جاتا ہے۔ میں تمہاری گوئی کھول لایا تھا سو لیتے جانا۔ یہاں کون کھیتی باڑی ہوتی ہے۔"

"یہ تو تم نے ایک نئی گوئی ٹھیک کر لی ہے، کاکا!"

"نہیں نہیں، نئی گوئی لے کر کیا کروگے؟ یہی لیتے جاؤ۔"

"تو میں تمہارے روپے بھجوا دوں گا۔"

"روپے کہیں باہر تھوڑے ہی ہیں بیٹا، گھر ہی میں تو ہیں۔ برادری کا ڈھکوسلا ہے۔ نہیں تم میں اور ہم میں کون پھرک ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے خوش ہونا چاہئے تھا کہ جھنیا بھلے گھر میں ہے اور سکھ سے ہے، اور میں اس کے خون کا پیاسا بن گیا تھا۔"

شام کو گوبر یہاں سے چلا تو گوئی اس کے ساتھ تھی اور جنگی دہی کی دو ہانڈیاں لئے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔

(۲۱)

دیہاتوں میں سال کے چھ مہینے کسی نہ کسی جشن میں ڈھول مجیرے بجتے ہی رہتے ہیں۔ ہولی کے ایک ماہ قبل سے ایک ماہ بعد تک پھاگ ہوتا رہتا ہے، اساڑھ لگتے ہی آلھا شروع ہو جاتا ہے اور ساون بھادوں میں کجلیاں ہوتی ہیں۔ کجلیوں کے بعد رامائن شروع ہو جاتی ہے۔ سمری بھی ان مشاغل سے مستثنیٰ نہیں۔ مہاجن کی دھمکیاں اور کارندوں کی گالیاں اس جشن میں خلل نہیں ڈال سکتیں۔ گھر میں غلہ نہیں ہے، بدن پر کپڑا نہیں ہے، گانٹھ میں پیسہ نہیں ہے، تو کوئی پروا نہیں۔ زندگی کی تفریحی رغبتیں تو دبائی نہیں جا سکتیں، بلا ہنسے ہوئے تو رہا نہیں جا سکتا۔

یوں تو ہولی میں گانے بجانے کا خاص مقام نوکھے رام کی چوپال تھی۔ وہیں بھنگ چھنتی تھی، وہیں رنگ اڑتا تھا، وہیں ناچ ہوتا تھا۔ اس جشن میں کارندے صاحب کے دس پانچ روپے خرچ ہو جاتے تھے۔ اور کس میں یہ سکت تھی کہ اپنے دروازے پر جلسہ کراتا؟

مگر اب کے گوبر نے گاؤں کے سارے نوجوانوں کو اپنے یہاں کھینچ لیا ہے اور

نوکھے رام کی چوپال خالی پڑی ہے۔ گوبر کے دروازے پر بھنگ گھٹ رہی ہے۔ پان
کے بیڑے لگ رہے ہیں، رنگ گھولا جا رہا ہے۔ فرش بچھا ہوا ہے، گانا ہو رہا ہے
اور چوپال میں بالکل سناٹا ہے۔ بھنگ رکھی ہوئی ہے مگر پیئے کون؟ ڈھول مجیرا
سب موجود ہے مگر گائے بجائے کون؟ جسے دیکھو، گوبر کے دروازے کیطرف دوڑا
چلا جا رہا ہے۔ یہاں بھنگ میں گلاب، زعفران اور بادام کی بہار ہے۔ ہاں سیر بھر
بادام گوبر خود لایا ہے۔ پیتے ہی کلیجہ تر ہو جاتا ہے اور آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ خمیرہ
تمباکو بھی لایا ہے، خاص بسوان کی۔ رنگ میں بھی کیوڑا ڈالا گیا ہے۔ وہ روپیہ کمانا
بھی جانتا ہے اور خرچ کرنا بھی۔ گاڑ کر رکھو تو کون دیکھتا ہے۔ جو دولت کی ہی تو زیبائش
ہے! اور صرف بھنگ ہی نہیں ہے بلکہ جتنے گویے ہیں اُن سب کا نیوتا بھی ہے۔ اور
گاؤں میں نہ ناچنے والوں کی کمی ہے، نہ گانے والوں کی اور نہ سوانگ بھرنے والوں
کی۔ رسو بھا ہی لنگڑوں کی ایسی نقل کرتا ہے کہ کوئی کیا کریگا، اور آواز کی نقل میں تو
اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ جسکی بولی کہو اسکی بولے انسان کی بھی اور حیوان کی بھی!
گردھر بھی نقل کرنے میں بے نظیر ہے۔ وکیل کی نقل وہ کرے، پٹواری کی نقل وہ
کرے۔ تھانیدار، چپراسی، سیٹھ، سبھی کی نقل وہ کر سکتا ہے۔ ہاں غریب کے پاس
ویسا ساز و سامان نہیں ہے مگر ابکے گوبر نے اس کیلئے سبھی سامان منگا دیا ہے
اور اسکی نقلیں دیکھنے کے قابل ہوں گی۔

یہ چرچا اتنا پھیلا کہ شام ہی سے تماشائیوں کا ہجوم ہونے لگا۔ قرب و جوار
کے گاؤں سے دیکھنے والوں کی ٹولیاں آنے لگیں اور دس بجتے بجتے تین چار ہزار
آدمیوں کا مجمع ہو گیا۔ اور جب گردھر جھنگری سنگھ کا روپ بھرے ہوئے اپنی منڈلی
کیساتھ کھڑا ہوا تو لوگوں کو کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہ ملتی تھی۔ وہی بے بالوں کا سر، وہی
بڑی بڑی مونچھیں، اور وہی بڑھا اور لٹکتا ہوا پیٹ۔ بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں اور بیچ

ٹھکرائن بیٹھی تنکا چھیل رہی ہیں۔

ٹھاکر ٹھکرائن کو عاشقانہ انداز سے دیکھ کر کہتے ہیں "اب بھی تمہارے اوپر وہ جوبن ہے کہ کوئی جوان بھی دیکھ لے تو تڑپ جائے" اور ٹھکرائن پھول کر جواب دیتی ہے کہ "جبھی تو نئی نویلی لائے!"

"اُسے تو لایا ہوں تمہاری سیوا کرنے کے لیے۔ وہ تمہاری کیا برابری کرے گی؟"

دوسری بیوی یہ بات سُن لیتی ہے اور مُنھ پھلا کر چلی جاتی ہے۔

دوسرے منظر میں ٹھاکر چارپائی پر لیٹے ہیں اور چھوٹی بیوی مُنھ پھیرے ہوئے زمین پر بیٹھی ہے۔ ٹھاکر بار بار اس کا مُنھ اپنی طرف کرنے کی بیکار کوشش کرتے ہوئے کہتے ہیں: "مجھ سے کیوں روٹھی ہو میری لاڈلی!"

"تمہاری لاڈلی جہاں ہو وہاں جاؤ میں تو باندی ہوں، دوسروں کی سیوا ٹہل کرنے کے لیے آئی ہوں!"

"تم میری رانی ہو۔ تمہاری سیوا ٹہل کرنے کے لیے تو وہ بڑھیا ہے۔"

پہلی ٹھکرائن سُن لیتی ہے اور جھاڑو لے کر گھر میں گھستی ہے اور کئی جھاڑو انھیں رسید کرتی ہے۔ ٹھاکر جان بچا کر بھاگتے ہیں...

پھر دوسری نقل ہوتی جس میں ٹھاکر نے دس روپیے کا تمسک لکھا کر پانچ روپیے دیے، بقیہ نذرانہ، تحریرانہ، دستوری اور سود میں کاٹ لیے۔

کسان آکر اور ٹھاکر کے پیروں پر گر کر رونے لگتا ہے۔ بڑی مشکل سے ٹھاکر روپیے دینے پر راضی ہوتے ہیں۔ جب کاغذ لکھ جاتا ہے اور اسامی کے ہاتھ میں پانچ روپیے رکھ دیے جاتے ہیں تو وہ چکرا کر پوچھتا ہے "یہ تو پانچ ہی ہیں، مالک!"

"پانچ نہیں دس ہیں، گھر جا کر گننا!"

"نہیں سرکار، پانچ ہیں۔"

"ایک روپیہ نجرانے کا ہوا کہ نہیں؟"

"ہاں، سرکار!"

"ایک لکھائی کا؟"

"ہاں، سرکار!"

"ایک کاگد (کاغذ) کا؟"

"ہاں، سرکار!"

"ایک دستوری کا؟"

"ہاں، سرکار!"

"ایک سود کا؟"

"ہاں، سرکار!"

"پانچ نگد، دس ہوئے کہ نہیں؟"

"ہاں، سرکار! اب یہ پانچوں بھی میری طرف سے رکھ لیجئے!"

"کیسا پاگل ہے؟"

"نہیں سرکار۔ ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کا نجرانہ ہے اور ایک بڑی ٹھکرائن کا ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کے پان کھانے کو اور ایک روپیہ بڑی ٹھکرائن کے پان کھانے کو۔ رہا ایک روپیہ، سو وہ آپ کی کِرپا کرم کے لئے!"

اسی طرح نو لکھے رام اپنے شعور کی داد دیتے ہوئے سب کی باری باری سے خبر لی گئی۔ اور بھبتیوں میں نہ کوئی جدت نہ تھی اور نقلیں چاہے پرانی ہوں مگر گم دھر کا ڈھنگ ایسا ہنسانے والا تھا اور دیکھنے والے اتنے سادہ دل تھے کہ وہ بے بات کی بات میں بھی ہنس پڑتے تھے۔ ساری رات یہ نقلیں ہوتی رہیں اور سنتے ہوئے دل اس خیالی ہنسی سے خوش ہوتے رہے۔ آخری نقل ختم ہوئی تو کوے بول رہے تھے۔

سویرا ہوتے ہی جسے دیکھو اُسی کی زبان پر وہی رات کے گانے، وہی نقل وہی فقرے، گاؤں کے نکھٹّے تماشا بن گئے۔ جدھر نکلتے ہیں اُدھر ہی دو چار لڑکے پیچھے لگ جاتے ہیں اور وہی فقرے کستے ہیں۔ جھینگری سنگھ تو دل لگی باز آدمی تھے، اسے محض مذاق سمجھے۔ مگر پٹیشوری میں چڑھنے کی بُری عادت تھی اور پنڈت داتا دین تو اتنے نیک مزاج تھے کہ ذرا سی بات میں فوراً لڑنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ وہ سب سے آدر پانے کے عادی تھے۔ کارندے کی تو بات ہی کیا، رائے صاحب انھیں دیکھتے ہی سر جھکا دیتے تھے۔ اُن کی ایسی ہنسی اُڑائی جائے اور اسی گاؤں میں یہ اُن کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اگر ان میں "برہمہ تیج" برہمی جلال) ہوتا تو ان دشٹوں کو بھسم کر دیتے، ایسا شراپ دیتے کہ سب کے سب وہیں بھسم ہو جاتے مگر اس کلجگ میں تو شراپ کا اثر ہی جاتا رہا۔ بس اُنھوں نے بھی کلجگ ہی والا ہتھیار نکالا۔ ہوری کے دروازے پر گئے اور آنکھیں نکال کر بولے "کیا آج بھی تم کام کرنے نہ چلو گے۔ ہوری؟ اب تو تم اچھے ہو گئے۔ میرا کتنا نقصان ہو گیا، یہ تم نہیں سوچتے!"

گوبر دیر میں سویا تھا۔ ابھی ابھی اُٹھا تھا اور آنکھیں ملتا ہوا باہر آ رہا تھا کہ داتا دین کی آواز کان میں پڑی۔ پالاگن کرنا تو دور رہا اُلٹے اور ہیکڑی دکھا کر بولا "اب وہ تمہاری نہ کریں گے۔ ہمیں اپنی اوکھ بھی تو بونا ہے!"

داتا دین نے تمباکو پھانکتے ہوئے کہا "کام کیسے نہیں کریں گے؟ سال کے بیچ میں کام نہیں چھوڑ سکتے۔ جیٹھ میں چھوڑنا ہو تو چھوڑ دیں۔ کرنا ہو تو کریں۔ جس کے پہلے نہیں چھوڑ سکتے!"

گوبر نے جماہی لیتے ہوئے کہا "انھوں نے تمہاری غلامی نہیں لکھی ہے۔ جب تک مَن تھا کام کیا اب مَن نہیں ہے، نہیں کریں گے اس میں کوئی جبردستی نہیں کر سکتا!"

"تو مجوری کام نہیں کریں گے؟"

"نا!"

"تو ہمارے روپئے سود سمیت دیدو۔ تین سال کا سود ہوتا ہے سو روپیہ اصل ملا کر دو سو ہوتے ہیں۔ ہم نے سمجھا تھا کہ تین روپیہ مہینہ سود میں کٹتے جائیں گے پر تمہارا منشا نہیں ہے تو مت کرو۔ میرے روپئے دیدو۔ دھنّیا سیٹھ بنتے ہو تو دھنّیا سیٹھ کا کام کرو۔"

ہوری نے عاجزی سے کہا "تمہاری ہی چاکری سے میں کب انکار کرتا ہوں مہراج؟ پر ہماری اوکھ بھی تو پیرنے کو پڑی ہے۔"

گوبر نے باپ کو ڈانٹا "کیسی چاکری اور کس کی چاکری؟ یہاں کوئی کسی کا چاکر نہیں، سبھی برابر ہیں۔ اچھی دل لگی ہے! کسی کو سو روپئے ادھار دیئے اور سود میں عمر بھر کام لیتے رہے! اصل جیوں کا تیوں! یہ مہاجنی نہیں ہے کھون چوسنا ہے!"

"تو روپئے دیدو بھیا۔ لڑائی کاہے کی ہے؟ میں آنہ روپیہ بیاج لیتا ہوں، تمہیں گاؤں گھر کا سمجھ کر آدھ آنے روپیہ کر دیا تھا!"

"ہم تو روپیہ سیکڑہ دیں گے، ایک کوڑی بیسی نہیں۔ تمہیں لینا ہو تو لو، نہیں عدالت سے لینا۔ ایک روپیہ سیکڑا بیاج کم نہیں ہوتا۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ روپئے کی گرمی ہو گئی ہے۔"

"گرمی انھیں ہوتی ہے جو ایک کا دس لیتے ہیں۔ ہم تو مجور ہیں، ہماری گرمی پسینے کی راہ بہہ جاتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے بیل کے لئے تیس روپئے دیئے تھے اس کے سو ہوئے۔ اور اب سو کے دو سو ہو گئے۔ اسی طرح تم لوگوں نے کسانوں کو لوٹ لوٹ کر مجور بنا ڈالا اور آپ ان کی جمین کے مالک بن بیٹھے۔ تیس کے دو سو! کچھ ٹھکانا ہے! کتنے دن ہوئے ہوں گے دادا؟"

ہوری نے غمگین لہجے میں کہا "یہی آٹھ نو سال ہوئے ہوں گے!"

گوبر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا "نو سال میں تیس روپئے کے دو سو۔ ایک روپئے کے حساب سے کتنا ہوتا ہے؟" اس نے زمین پر ایک ٹھیکرے سے حساب لگاکر کہا "دس سال میں چھتیس روپئے ہوتے ہیں۔ اصل ملاکر چھیاسٹھ۔ اسکے ستر روپئے لے لو۔ اس سے بیسی میں ایک کوڑی نہ دونگا۔"

داتا دین نے ہوری کو بیچ میں ڈال کر کہا "سنتے ہو ہوری! گوبر کا نیاؤ۔ میں اپنے دو سو روپئے چھوڑ کے ستر لے لوں، نہیں عدالت کروں۔ اسطرح کا برتاؤ ہوا تو سنسار کے دن چلے گا؟ اور تم بیٹھے سن رہے ہو! مگر یہ سمجھ لو کہ میں براہمن ہوں، میرے روپئے ہضم کر کے تم چین نہ پاؤ گے۔ میں نے یہ ستر روپئے بھی چھوڑے اور عدالت بھی نہ جاؤں گا۔ جاؤ۔ اگر میں براہمن ہوں تو اپنے پورے دو سو روپئے لیکر دکھا دونگا اور تم میرے دوارے پر جاؤ گے اور ہاتھ جوڑ کر دے آؤ گے۔"

داتا دین جھلاتے ہوئے لوٹ پڑے۔ گوبر اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مگر ہوری کے پیٹ میں دھرم کی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اگر ٹھاکر یا بنئے کے روپئے ہوتے تو اسے زیادہ فکر نہ ہوتی، مگر برہمن کے روپئے! اسکی ایک پائی بھی دب گئی تو ہڈی توڑ کر نکلے گی۔ ایشور نہ کرے کہ برہمن کا گُصّہ کسی پر گرے۔ گھرانے میں کوئی چلو بھر پانی دینے والا۔ گھر میں دیا جلانے والا بھی نہیں رہ جاتا۔ اس کا مذہب پرست دل دہل اٹھا۔ اس نے دوڑ کر پنڈت جی کے پیر پکڑ لئے اور درد بھری آواز میں بولا "مہاراج جب تک میں جیتا ہوں میں تمہاری ایک ایک پائی چکاؤں گا۔ لڑکوں کی باتوں پر مت جاؤ۔ معاملہ تو ہمارے تمہارے بیچ میں ہوا ہے وہ کون ہوتا ہے؟"

داتا دین ذرا نرم پڑے "ذرا اس کی زبردستی تو دیکھو، کہتا ہے کہ دو سو روپئے

کے ستر روپئے لو یا عدالت جاؤ۔ ابھی عدالت کی ہوا نہیں کھائی، تبھی۔ ایکبار کسی کے پالے پڑ جائیں گے تو پھر یہ تاؤ نہ رہے گا۔ چار دن شہر میں کیا رہے تانا شاہ ہو گئے۔"

"میں تو کہتا ہوں مہراج کہ میں تمہاری ایک ایک پائی چکاؤں گا۔"

"تو کل سے ہمارے یہاں کام کرنے آنا پڑے گا۔"

"اپنی اوکھ بونا ہے مہراج، نہیں تو تمہارا ہی کام کرتا۔"

داتا دین چلے گئے تو گوبر نے حقارت سے دیکھ کر کہا "گئے تھے دیوتا کو منانے! تمہیں لوگوں نے تو ان سب کا مزاج بگاڑ دیا ہے۔ تیس روپئے دیئے۔ اب دو سو لے گا، اور ڈانٹ اوپر سے بتاوے گا اور تم سے مجوری کراوے گا اور کام کراتے کراتے مار ڈالے گا۔"

ہوری نے اپنے خیال سے سچائی کا پہلو لیکر کہا "دھرم نہ چھوڑنا چاہئے بیٹا، اپنی اپنی کرنی اپنے ساتھ ہے۔ ہم نے جس بیاج پر روپئے لئے وہ تو دینے ہی پڑیں گے۔ پھر باہمن ٹھہرے، ان کا پیسہ ہمیں پچے گا؟ ایسا مال تو ان ہی لوگوں کو پچتا ہے۔"

گوبر نے تیوریاں چڑھائیں "دھرم چھوڑنے کو کون کہہ رہا ہے اور کون کہہ رہا ہے کہ باہمن کے پیسے دبا لو؟ میں تو یہی کہتا ہوں کہ اتنا بیاج ہم نہیں دیں گے۔ بنک والے بارہ آنے بیاج لیتے ہیں۔ تم ایک روپیہ لے لو، اور کیا کسی کو لوٹ لو گے؟"

"ان کا رویاں جو دُکھی ہو گا۔"

"ہوا کرے۔"

"بیٹا، جب تک میں جیتا ہوں، مجھے اپنے رستے چلنے دو۔ جب میں مرجاؤں تو

تمہارے جی میں جو آئے وہ کرنا۔"

"تو پھر تمہیں دینا۔ میں تو اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں میں کلہاڑی نہ ماروں گا۔ میرا گدھا پن تھا کہ تمہارے بیچ میں بولا۔ تم نے کھایا ہے تو بھرو۔ میں کیوں اپنی جان دوں؟"

یہ کہتا ہوا گوبر اندر چلا گیا۔ جھنیا نے پوچھا "آج سبیرے سبیرے دادا سے کیوں اُلجھ پڑے؟"

گوبر نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور آخر میں بولا "ان کے اوپر رِن کا بوجھ اسی طرح بڑھتا جائے گا۔ میں کہاں تک بھروں گا؟ اُنھوں نے کما کما کر دوسروں کا گھر بھرا ہے۔ میں کیوں اُن کی کھودی ہوئی کھائیں میں پڑوں؟ اُنھوں نے مجھ سے تو پوچھ کر رِن نہیں لیا اور نہ میرے واسطے لیا۔ میں اس کا دین دار نہیں ہوں۔"

اُدھر مکھیوں میں گوبر کو نیچا دکھانے کی سازش ہو رہی تھی۔ یہ لونڈا شکنجے میں کسا گیا تو گاؤں میں اُدھم مچا دے گا۔ پیادے سے فرزیں ہو گیا ہے نا، ٹیڑھے تو چلے ہی گا۔ نہ جانے کہاں سے اتنا قانون سیکھ آیا ہے، کہتا ہے کہ روپیہ سیکڑہ سود سے بیسی نہ دوں گا۔ لینا ہو تو لو نہیں عدالت جاؤ۔ رات اس نے سارے گاؤں کے لونڈوں کو اکٹھا کر کے کتنا اتھ کر دیا۔ مگر مکھیوں میں بھی حسد کی کمی نہ تھی۔ سبھی اپنے برادری والوں کے مضحکے پر خوش تھے۔ پٹیشوری اور نوکھے رام میں باتیں ہو رہی تھیں۔ پٹیشوری نے کہا "مگر سبھوں کو گھر گھر کا رتی رتی حال معلوم ہے جھنگری سنگھ کو تو سبوں نے ایسا رگڑا کہ کچھ نہ پوچھو۔ دونوں ٹھکرائنوں کی باتیں سن سن کر لوگ ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔"

نوکھے رام نے قہقہہ لگا کر کہا "مگر نقل سچی تھی۔ میں نے کئی بار اُن کی چھوٹی بیگم کو دروازے پر کھڑے ہوئے لونڈوں سے ہنسی کرتے دیکھا ہے۔"

"اور بڑی رانی جی کا جل اور سیندور اور چہادر لگا کہ جوان بنی رہتی ہیں۔"

"دونوں میں رات دِن چھڑی رہتی ہے! جھنگری پکا بے حیا ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو پاگل ہو جاتا۔"

"سُنا کہ تمہاری بڑی بھدّی نکلی کی۔ چماری کے گھر میں بند کرا کے پٹوایا۔"

"میں تو بچّہ پر لگان کا دعویٰ کر کے ٹھیک کر دوں گا۔ وہ بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی سے پالا پڑا تھا!"

"لگان تو اس نے چکا دیا ہے نا؟"

"پر رسید تو میں نے نہیں دی۔ ثبوت کیا ہے کہ لگان چکا دیا؟ اور یہاں کون حساب کتاب دیکھتا ہے؟ آج ہی پیادہ بھیج کر بلاتا ہوں۔"

ہوری اور گوبر دونوں ایکھ بونے کے لئے کھیت سینچ رہے تھے۔ اب کے ایکھ کی کھیتی ہونے کی اُمید تو تھی نہیں اس لئے کھیت پرتی پڑا ہوا تھا۔ اب بیل آ گئے ہیں تو ایکھ کیوں نہ بوئی جائے۔

مگر دونوں گویا چھتیس کا ہندسی عدد (۳۶) بنے ہوئے تھے۔ نہ بولتے تھے نہ تاکتے تھے۔ ہوری بیلوں کو ہانک رہا تھا اور گوبر مُونہہ لے رہا تھا۔ سونا اور روپا کھیت میں پانی دوڑا رہی تھیں کہ ان میں جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑا یہ تھا کہ جھنگری سنگھ کی چھوٹی ٹھکرائن پہلے خود کھا کر تب ٹھاکر کو کھلاتی ہیں یا ٹھاکر کو کھلا کر تب خود کھاتی ہیں۔ سونا کہتی تھی کہ پہلے وہ کھاتی ہیں۔ روپا کی رائے اس کے خلاف تھی۔

روپا نے حرج کی "اگر وہ آپ پہلے کھاتی ہیں تو کیوں موٹی نہیں ہیں؟ ٹھاکر کیوں موٹے ہیں؟ اگر ٹھاکر اُن پر گر پڑیں تو وہ پس جائیں۔"

سونا نے اختلاف کیا "تو سمجھتی ہے کہ اچھا کھانے سے لوگ موٹے ہو جاتے

ہیں۔ اچھا کھانے سے لوگ بلوان ہوتے ہیں، موٹے نہیں ہوتے۔ موٹے ہوتے ہیں ساگ پات کھانے سے۔"

"تو ٹھکرائن ٹھاکر سے بلوان ہیں؟"

"اور کیا؟ ابھی اُس دن دونوں میں لڑائی ہوئی تو ٹھکرائن نے ٹھاکر کو ایسا ڈھکیلا کہ گھٹنے پھوٹ گئے۔"

"تو تو پہلے آپ کھا کر تب بیجا کو کھلائے گی؟"

"اور کیا؟"

"اماں تو پہلے دادا کو کھلاتی ہیں۔"

"تبھی تو جب دیکھو تب دادا ڈانٹ دیتے ہیں۔ میں بلوان ہو کر اپنے آدمی کو بس میں رکھوں گی۔ تیرا آدمی تجھے پیٹے گا۔ تیری ہڈی توڑ کر رکھ دے گا۔"

روپا رونی صورت بنا کر بولی "کیوں پیٹے گا؟ میں مار کھانے کا کام ہی نہ کروں گی۔"

"وہ کچھ نہ سنے گا۔ تو نے ذرا بھی کچھ کہا اور وہ مار چلے گا۔ مارتے مارتے تیری کھال اُدھیڑ دے گا۔"

روپا نے بگڑ کر سونا کی ساڑی کو دانتوں سے پھاڑنے کی کوشش کی اور ایسا نہ کر سکنے پر چٹکیاں کاٹنے لگی۔ سونا نے اور چڑھایا "وہ تیری ناک بھی کاٹ لے گا۔"

اس پر روپا نے بہن کو دانت سے کاٹ لیا۔ سونا کا بازو لہولہان ہو گیا اس نے روپا کو زور سے ڈھکیل دیا۔ وہ گر پڑی اور اُٹھ کر رونے لگی۔ سونا بھی دانتوں کے نشان دیکھ کر رو پڑی۔

اُن دونوں کا چلانا سن کر گوبر غصے میں بھرا ہوا آیا اور دونوں کو دو دو گھونسے

لگا دیئے۔ دونوں روتی ہوئی کھیت سے نکل کر گھر چلی وہیں سینچائی کا کام رُک گیا۔
اس پر باپ بیٹے میں ایک جھڑپ ہو گئی۔ ہوری نے کہا "پانی کون چلائے گا؟
دَوڑے دَوڑے گئے اور دونوں کو بھگا آئے۔ اب جا کر مناکیوں نہیں لاتے؟"

"تم ہی نے ان سب کو بگاڑ رکھا ہے"

"اس طرح مارنے سے اور بھی بے شرم ہو جائیں گی"

"دو جون کھانا بند کر دو، آپ ٹھیک ہو جائیں گی"

"میں ان کا باپ ہوں کسائی نہیں ہوں"

پیر میں ایک بار ٹھوکر لگ جانے کے بعد کسی سبب سے بار بار ٹھوکر لگتی ہے اور کبھی کبھی انگوٹھا پک جاتا ہے اور مہینوں تکلیف دیتا ہے۔ باپ بیٹے کے باہمی خلوص کو آج اسی طرح کی چوٹ لگ گئی تھی اور اب اس پر یہ تیسری چوٹ پڑی۔

گوبر نے گھر جا کر کھیت میں پانی دینے کے لئے جھنیا کو ساتھ لیا۔ جھنیا بچے کو لیکر کھیت میں گئی۔ دھنیا اور اس کی دونوں لڑکیاں بیٹھی تاکتی رہیں۔ ماں کو بھی گوبر کی یہ حرکت بُری لگی تھی۔ روپا کو مارتا تو بُرا نہ مانتی، مگر جوان لڑکی کو مارنا، یہ اس کی برداشت کے باہر تھا۔

آج ہی رات کو گوبر نے لکھنؤ لوٹ جانے کا تہیہ کر لیا۔ یہاں اب وہ نہیں رہ سکتا۔ جب گھر میں اُس کی کوئی پوچھ نہیں تو وہ کیوں رہے۔ وہ لین دین کے معاملے میں بول نہیں سکتا۔ لڑکیوں کو ذرا مار دیا تو لوگ ایسے جامے سے باہر ہو گئے جیسے وہ باہر کا آدمی ہے۔ تب وہ اس گھر میں نہ رہے گا۔

دونوں کھانا کھا کر باہر آئے تھے کہ نوکھے رام کے پیادے نے آکر کہا

"چلو، کارندے صاحب نے بلایا ہے"

ہوری نے گھمنڈ سے کہا "رات کو کیوں بلاتے ہیں، میں تو لگان دے چکا

ہول۔"

پیادہ بولا" مجھے تو تمہیں بلا لانے کا حکم ملا ہے اور جو کچھ کہنا ہو، وہیں چل کر کہنا۔"

ہوری کا جی نہ چاہتا تھا مگر جانا پڑا۔ گوبر بے تعلقی سے بیٹھا رہا۔ آدھ گھنٹے میں ہوری لوٹا اور چلم بھر کر پینے۔ اب گوبر سے نہ رہا گیا پوچھا "کس مطلب سے بلایا تھا ہ"

ہوری نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں نے پائی پائی لگان چکا دیا اور وہ کہتے ہیں کہ تمہارے اوپر دو سال کی باقی ہے۔ ابھی جس دن میں نے اوکھ بیچی تو پچیس روپے انھیں وہیں دے دیئے اور آج وہ دو سال کی باقی نکالتے ہیں میں نے کہہ دیا کہ میں ایک دھیلا نہ دوں گا۔"

گوبر نے پوچھا "تمہارے پاس رسید تو ہو گی ؟"

"رسید کہاں دیتے ہیں۔"

"تو تم بنا رسید لئے روپے کیوں دیتے ہو ؟"

"میں کیا جانتا تھا کہ یہ لوگ بے ایمانی کریں گے۔ یہ سب تمہاری کرنی کا پھل ہے۔ تم نے رات کو اُن کی ہنسی کی، یہ اُسی کا ڈنڈ ہے۔ پانی میں رہ کر مگر سے بَیر نہیں کیا جاتا۔ سود لگا کر ستّر روپے باقی نکال دیئے۔ یہ کس کے گھر سے آویں ؟"

گوبر نے اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا "تم نے رسید لے لی ہوتی تو میں لاکھ اُن کی ہنسی اُڑاتا، پر وہ تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لین دین میں تم کیوں کسی سے کیوں کام نہیں لیتے۔ یوں رسید نہیں دیتے تو روپیہ ڈاک سے بھیجو۔ یہی تو ہو گا کہ ایک آدھ روپیہ محصول پڑ جائے گا۔ پر اس طرح کی دھاندلی تو نہ ہو گی۔"

"تم نے یہ آگ نہ لگائی ہوتی تو کچھ نہ ہوتا۔ اب تو سب ہی مکھیا بگڑے ہوئے ہیں۔ بیدکھلی کی دھمکی دے رہے ہیں۔ رام جانے کیسے بیڑا پار لگے گا۔"

"میں جا کر اُن سے پوچھتا ہوں!"

"تم جا کر اور آگ لگا دو گے!"

"اگر آگ لگانی پڑے گی تو آگ بھی لگا دوں گا۔ وہ بیدکھلی کرتے ہیں تو کریں۔ میں اُنکے ہاتھ میں گنگا جلی رکھ کر عدالت میں قسم کھلاؤں گا۔ تم دُم دبا کر بیٹھے رہو۔ میں اس کے پیچھے جان لڑا دوں گا۔ میں کسی کا ایک پیسہ دبانا نہیں چاہتا، نہ اپنا ایک پیسہ کھونا چاہتا ہوں!"

وہ اُسی وقت اُٹھا اور نوکھے رام کی چوپال میں جا پہنچا۔ دیکھا تو سبھی لیڈروں کی مجلس لگی ہوئی ہے۔ گوبر کو دیکھ کر سب کے سب ہوشیار ہو گئے۔ فضا میں سازش کی سی بو بھری ہوئی تھی۔

گوبر نے پوچھا یہ کیا بات ہے کارندہ صاحب کہ آپ کو دادا نے حال تک کا لگان چکا دیا اور آپ دو سال کی باقی نکال رہے ہیں۔ یہ کیسا گول مال ہے؟"

نوکھے رام نے مسند پر لیٹ کر رُعب دکھاتے ہوئے کہا "جب تک ہوری ہے، میں تم سے لین دین کی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا!"

گوبر نے چوٹ کھائی ہوئی آواز میں کہا "تو میں گھر میں کچھ نہیں ہوں؟"

"تم اپنے گھر میں سب کچھ ہو گے، مگر یہاں تم کچھ بھی نہیں ہو!"

"اچھی بات ہے، آپ بیدکھلی کیجئے، اب میں عدالت میں تم سے گنگا جلی اُٹھوا کر روپئے دوں گا۔ اسی گاؤں سے ایک سو گواہی دلا کر ثابت کر دوں گا کہ تم رسید نہیں دیتے۔ سیدھے سادھے کسان ہیں۔ کچھ بولتے نہیں، تو تم نے سمجھ لیا کہ سب کا ٹھ کے اُلّو ہیں۔ رائے صاحب وہیں رہتے ہیں جہاں میں رہتا ہوں۔ گاؤں کے سب

لوگ انھیں جو اب سمجھتے ہونگے، میں نہیں سمجھتا۔ رتی رتی حال کہوں گا اور دیکھوں گا کہ تم کیسے مجھ سے دوبارہ روپئے وصول کئے لیتے ہو۔“

اس کی بات میں سچائی کا بل تھا۔ بزدل لوگوں میں سچائی بھی گونگی ہو جاتی ہے۔ وہی سیمنٹ جو اینٹ پر چڑھ کر پتھر بن جاتا ہے اگر مٹی پر چڑھا دیا جائے تو مٹی ہو جائے گا۔ گوبر کی بے باکانہ صاف گوئی نے وہ بدنیتی کی زرہ توڑ ڈالی جسے پہن کر نوکھے رام کا کمزور دل خود کو طاقتور سمجھ رہا تھا۔

نوکھے رام نے جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر کے کہا ”تم اتنا گرم کیوں ہو رہے ہو؟ اس میں گرم ہونے کی کون بات ہے؟ اگر ہوری نے روپئے دیئے ہیں تو کہیں نہ کہیں تو لکھ لئے گئے ہوں گے۔ میں کل کاغذ نکال کر دیکھوں گا۔ اب مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے کہ شاید ہوری نے روپئے دیئے تھے۔ تم خاطر جمع رکھو۔ اگر روپئے یہاں آ گئے ہیں تو کہیں جا نہیں سکتے۔ تم تھوڑے سے روپیوں کے لئے جھوٹ تھوڑے ہی بولو گے اور نہ میں ہی اتنے روپیوں سے امیر ہو جاؤں گا۔“

گوبر نے چوپال سے آ کر ہوری کو ایسا لتاڑا کہ بیچارا بوڑھا آبدیدہ ہو گیا ”تم تو بچوں سے بھی گئے بیتے ہو جو بلی کی میاؤں سن کر رو پڑتے ہیں۔ میں کہاں کہاں تمہیں بچاتا پھروں گا؟ میں تمہیں ستر روپئے دیئے جاتا ہوں۔ داتا دین لیں تو دے کر پورے کی رسید لکھا لینا۔ اس کے اوپر تم نے ایک پیسہ بھی دیا تو مجھ سے ایک پیسہ بھی نہ پاؤ گے۔ میں پردیس میں اس لئے نہیں پڑا ہوں کہ تم اپنے کو لٹواتے رہو اور میں کما کما کر بھرتا رہوں۔ میں کل چلا جاؤں گا۔ پر اتنا کہے دیتا ہوں کہ اب کسی سے ایک پیسہ ادھار نہ لینا اور نہ کسی کو کچھ دینا۔ منگرو، دلاری، داتا دین سبھی سے ایک روپیہ سیکڑا سود کرانا ہو گا۔“

دھنیا بھی کھانا کھا کر باہر نکل آئی تھی۔ بولی ”ابھی کیوں جاتے ہو بیٹا، دو چار

دن اور رہ کر اوکھ کی بوائی کرا لو اور کچھ لین دین کا حساب بھی ٹھیک کر لو تب جانا۔"

گوبر نے شان جماتے ہوئے کہا۔ "میرا دو تین روپئے روج کا گھاٹا ہو رہا ہے یہ بھی سمجھتی ہو؟ یہاں میں بہت بہت کر کے چلا آنے کی مجبوری ہی تو کہتا ہوں! اور اب کی میں جھنیا کو بھی لیتا جاؤں گا۔ وہاں مجھے کھانے پینے کی بڑی تکلیف ہوتی ہے۔"

دھنیا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "جیسی تمہاری اِچھّا، مگر وہاں وہ کیسے اکیلے گھر سنبھالے گی۔ کیسے بچّے کی دیکھ بھال کرے گی؟"

"اب بچّے کو دیکھوں کہ اپنا سُبھیتا دیکھوں۔ مجھ سے چولھا نہیں پھونکا جاتا۔"

"لے جانے کو میں نہیں روکتی، مگر پردیس میں بال بچّوں کو لے کر، نہ کوئی آگے نہ پیچھے، سوچو کتنا جھنجھٹ ہے۔"

"پردیس میں بھی ساتھی نکل ہی آتے ہیں امّاں! اور یہ تو مطلب کی دنیا ہے۔ جس کے ساتھ چار پیسے گم کھاؤ وہی اپنا۔ کھالی ہاتھ تو ماں باپ بھی نہیں پوچھتے۔"

دھنیا اس جملے کو سمجھ گئی۔ وہ سر سے پاؤں تک جل اُٹھی۔ بولی۔ "ماں باپ کو بھی تم نے انھیں پیسے کے یاروں میں سمجھ لیا۔"

"ہاں آنکھوں دیکھ رہا ہوں۔"

"نہیں، دیکھ رہے ہو، ماں باپ کا دل اتنا کٹھور نہیں ہوتا، ہاں لڑکے ضرور جہاں چار پیسے کمانے لگے کہ ماں باپ سے آنکھیں پھیر لیں۔ اسی گاؤں میں ایک دو نہیں دس بیس کو دکھا دوں۔ ماں باپ ادھار لیتے ہیں تو کس کے لئے؟ لڑکوں لڑکیوں ہی کے لئے کہ اپنے آرام میں اڑانے کے لئے؟"

"کیا جانے تم نے کس کے لئے اُدھار لیا۔ میں نے تو ایک پیسہ بھی نہیں جانا۔"

"بنا پالے ہی اتنے بڑے ہو گئے؟"

"پالنے میں تمہارا لگا ہی کیا؟ جب تک بچہ تھا دودھ پلا دیا۔ پھر لاوارث کی طرح چھوڑ دیا۔ جو سب نے کھایا وہی میں نے کھایا۔ میرے لئے دودھ نہیں آتا تھا، مکھن نہیں آتا تھا۔ اور اب تم بھی چاہتی ہو اور دادا بھی چاہتے ہیں کہ میں سارا دِن چکاؤں، لگان دوں اور لڑکیوں کا بیاہ کروں۔ جیسے میری جندگی تمہارا دینا بھرنے کے لئے ہے۔ میرے بھی تو بال بچے ہیں۔"

دھنیا سنّاٹے میں آگئی۔ ایک ہی لمحے میں اس کی زندگی کا میٹھا سپنا ٹوٹ سا گیا۔ اب تک وہ دل میں خوش تھی کہ اب اس کا دُکھ دلدّر سب دور ہو گیا۔ جب سے گوبر گھر آیا اس کے چہرے پر ہنسی کچھ کھیلتی سی رہتی تھی۔ اُس کے کلام میں مٹھاس اور برتاؤ میں فراخ دلی آگئی تھی۔ بھگوان نے اُس پر دیا کی تھی تو اُسے سر جُھکا کر چلنا چاہیئے۔ اندر کا سکون باہر کی شرافت بن گیا تھا۔ یہ الفاظ جلتے ہوئے بان کی طرح دل پر پڑے۔ اور پیسے کی طرح سارے ارمان جھلس گئے۔ اس کا سارا گھمنڈ چور چور ہو گیا۔ اتنا کُچھ سہنے کے بعد اب زندگی میں کیا لُطف رہ گیا جس کشتی پر بیٹھ کر زندگی کے سمندر کو پار کرنا چاہتی تھی، جب وہی ٹوٹ گئی تو کس سُکھ کے لئے جئے؟

لیکن نہیں، اس کا گوبر اتنا مطلبی نہیں ہے اُس نے کبھی ماں کی بات کا جواب نہیں دیا، کبھی کسی بات کے لئے ہٹ نہیں کی۔ جو رکھا سو کھا لیا گیا وہی کھا لیتا تھا۔ وہی بھولا بھالا پریم کا پتلا آج کیوں ایسی دل توڑنے والی باتیں کہہ رہا ہے۔ اس کی طبیعت کے خلاف تو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ماں باپ دونوں ہی اس کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ اُس نے آپ ہی لین دین کی بات چلائی، ورنہ

اس سے کون کہتا ہے کہ تو ماں باپ کا قرض ادا کر۔ ماں باپ کے لئے یہی کیا کم سکھ ہے کہ وہ عزت آبرو کے ساتھ بھلے لوگوں کی طرح کماتا کھاتا ہے۔ اس سے کچھ ہو سکے تو ماں باپ کی مدد کر۔ نہیں ہو سکتا تو ماں باپ اس کا گلا نہ دبائیں گے۔ جھنیا کو لے جانا چاہتا ہے تو خوشی سے لے جائے۔ دھنیا نے تو صرف اس کی بھلائی کے خیال سے کہا تھا کہ جھنیا کو وہاں لے جانے میں اُسے جتنا آرام ملے گا، اُس سے کہیں زیادہ جھنجھٹ بڑھ جائے گا۔ اسمیں ایسی کون سی لگنے والی بات تھی کہ وہ اتنا بگڑ اُٹھا۔ ہو نہ ہو یہ آگ جھنیا نے لگائی ہے۔ وہی بیٹھے بیٹھے اسے یہ منتر پڑھا رہی ہے۔ یہاں بناؤ سنگار کرنے کو نہیں ملتا، گھر کا کچھ نہ کچھ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ وہاں روپئے پیسے ہاتھ میں آئیں گے تو آرام سے اچھا کھائے گی، اچھا پہنے گی، اور پاؤں پھیلا کر سوئے گی۔ دو آدمیوں کی روٹی پکانے میں کیا لگتا ہے، وہاں تو پیسہ چاہئے۔ سُنا ہے کہ ہاٹ میں پکی پکائی روٹیاں مل جاتی ہیں۔ یہ سارا بکھیڑا اسی نے کھڑا کیا ہے۔ سہر میں کچھ دنوں تو رہ بھی چکی ہے۔ وہاں کا دانہ پانی مُنہ لگا ہوا ہے۔ یہاں کوئی پوچھتا نہ تھا۔ یہ بھونرا مل گیا تو اسے پھنسا لیا۔ جب یہاں پانچ مہینے کا پیٹ لے کر آئی تھی تب کیسا میاؤں میاؤں کرتی تھی۔ تب یہاں ٹھکانا نہ ملا ہوتا تو آج کہیں بھیک مانگتی پھرتی! یہ اسی نیکی کا بدلہ ہے! اسی چڑیل کے پیچھے ڈنڈ دینا پڑا! برادری میں بدنامی ہوئی، کھیتی ٹوٹی، ساری دُرگت ہو گئی! اور آج یہ چڑیل جس پتل میں کھاتی ہے، اُسی میں چھید کر رہی ہے۔ پیسے دیکھے تو آنکھ ہو گئی۔ تبھی اینٹھی اینٹھی پھرتی ہے، مجاج نہیں ملتا۔ آج لڑکا چار پیسے کمانے لگا ہے نا۔ اتنے دنوں بات نہیں پوچھی تو ساس کے پاؤں دبانے کے لئے تیل لئے دوڑتی پھرتی تھی۔ ڈائن، اس کی جندگی کی پونجی کو اس کے ہاتھ سے چھین لینا چاہتی ہے۔

دُکھ بھری آواز میں بولی "یہ منتر تمہیں کون دے رہا ہے بیٹا؟ تم تو ایسے نہ تھے۔ ماں باپ تمہارے ہی ہیں، بہنیں تمہاری ہی ہیں، گھر تمہارا ہی ہے۔ یہاں باہر کا کون ہے؟ اور ہم کیا بہت دن بیٹھے رہیں گے؟ گھر کی آبرو بنائے رہو گے تو تم ہی کو سُکھ ہوگا۔ آدمی گھر والوں ہی کے لئے پیسہ کماتا ہے کہ اور کسی کے لئے۔ اپنا پیٹ تو سُور بھی پال لیتا ہے۔ میں نہ جانتی تھی کہ جھنیا ناگن بن کر ہمیں کو ڈسے گی۔"

گوبر نے بگڑ کر کہا "اماں! میں نادان نہیں ہوں کہ جھنیا مجھے منتر پڑھائے۔ تم اسے ناحق کوس رہی ہو۔ تمہاری گرہستی کا سارا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا تمہاری مدد کر دوں گا۔ پر اپنے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ڈال سکتا۔"

جھنیا بھی کوٹھری سے نکل کر بولی "اماں، جُلاہے کا غصہ داڑھی پر نہ اُتارو۔ کوئی بچہ نہیں ہے کہ میں پھسلا لوں گی۔ اپنا بُرا بھلا سب سمجھتے ہیں۔ آدمی اس لئے جنم نہیں لیتا کہ عمر بھر تپسیا کرتا رہے اور ایک دن خالی ہاتھ مرجائے۔ سب جینے کا کچھ سُکھ چاہتے ہیں۔ سب کا جی چاہتا ہے کہ ہاتھ میں چار پیسے ہوں۔"

دھنیا نے دانت پیس کر کہا "بہت گیان نہ بگھار۔ آج تو بھی اپنا بھلا بُرا سوچنے لائق ہو گئی ہے۔ یہاں آکر میرے پاؤں پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔ تب اپنا بھلا بُرا نہیں سوجھا تھا؟ اس گھڑی ہم بھی اپنا بھلا بُرا سوچنے لگتے۔ تو آج تیرا کہیں پتہ نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد جنگ چھڑ گئی۔ طعنے مہنے، گالی گلوچ، تھکا فضیحت، کوئی بات نہ بچی۔ گوبر بھی بیچ بیچ میں ڈنک مارتا جاتا تھا۔ ہوری برآمدے میں بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ سونا اور روپا آنگن میں سر جھکائے کھڑی تھیں۔ دلاری، پنیا اور کئی عورتیں بیچ بچاؤ کرنے آ پہنچی تھیں۔ گرج کے درمیان میں کبھی کبھی بوندیں بھی پڑ جاتی تھیں۔ دونوں ہی اپنے اپنے بھاگ کو رو رہی تھیں۔ دونوں ہی ایشور کو کوس رہی تھیں اور دونوں

ہی اپنا اپنا بے قصور ہونا ثابت کر رہی تھیں۔ جھنیا گڑے مُردے اکھاڑ رہی تھی۔ آج اُسے ہیرا اور سوبھا سے خاص ہمدردی ہو گئی تھی جنھیں دھنیا نے کبھی کا نہ رکھا تھا۔ دھنیا کی آج تک کسی سے نہیں پٹی تو جھنیا سے کیسے پٹ سکتی ہے؟ دھنیا اپنی صفائی دینے کی کوشش کر رہی تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ لوگوں کی رائے جھنیا کی طرف تھی۔ شاید اسلئے کہ جھنیا ضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی اور دھنیا آپے سے باہر تھی، شاید اس لئے بھی کہ جھنیا اب کمانے والے مرد کی بیوی تھی اور اُسے خوش رکھنا زیادہ قرین مصلحت تھا۔

تب ہوری نے آنگن میں آکر کہا "میں تیرے پاؤں پڑتا ہوں دھنیا، چُپ رہ! میرے مُنہ میں کالکھ نہ لگا۔ ہاں ابھی جی نہ بھرا ہو تو اور سُن۔"

دھنیا پھنکارتی ہوئی ادھر دوڑی "تم بھی موٹی ڈال پکڑنے چلے۔ میں ہی دُکھی ہوں، وہ تو میرے اوپر پھول برسا رہی ہے!"

جنگ کا میدان بدل گیا۔

"جو چھوٹوں کے منہ لگے وہ چھوٹا!"

دھنیا کس دلیل سے جھنیا کو چھوٹا مان لے۔

ہوری نے رنجیدگی سے کہا "اچھا وہ چھوٹی نہیں بڑی سہی۔ جو آدمی نہیں رہنا چاہتا تو کیا اُسے باندھ کر رکھے گی؟ ماں باپ کا دھرم ہے لڑکے کو پال پوس کر بڑا کر دینا۔ وہ ہم کر چکے۔ اُن کے ہاتھ پاؤں ہو گئے۔ اب تو کیا چاہتی ہے کہ وہ دانہ چارہ لاکر تجھے کھلا دیں؟ ماں باپ کا دھرم سولہوں آنے لڑکوں کے ساتھ ہے، لڑکوں کا ماں باپ کے ساتھ ایک آنہ بھی دھرم نہیں ہے۔ جو جاتا ہے آسے اسیس دے کر بدا کر دے۔ ہمارا بھگوان مالک ہے۔ جو کچھ بھوگنا ہے بھوگیں گے چالیس سات، سینتالیس اسی طرح رونے دھونے کٹ گئے، دس پانچ سال

ہیں سو وہ بھی یوں ہی کٹ جائیں گے"۔

اُدھر گوبر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اب اس گھر کا پانی بھی اُس کے لئے حرام ہے۔ ماں ہو کر جب اُسے ایسی ایسی باتیں کہے تو اب وہ اُس کا مُنہ بھی نہ دیکھے گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا بستر بندھ گیا۔ جھنیا نے بھی چُندری پہن لی مُنو بھی ٹوپا اور فراک پہن کر راجا بن گیا۔

ہوری نے بھرے گلے سے کہا "بیٹا، تم سے کچھ کہنے کا مُنہ تو نہیں ہے، پر جی نہیں مانتا۔ کیا ذرا جا کر اپنی ابھاگنی ماتا کے پاؤں چھو لو گے تو کچھ بُرا ہو گا؟ جس ماتا کی کوکھ سے جنم لیا اور جس کا دودھ پی کر پلے ہو کیا اُس کے ساتھ اتنا بھی نہیں کر سکتے؟"

گوبر نے مُنہ پھیر کر کہا "میں اُسے اپنی ماتا نہیں سمجھتا!"

ہوری نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "جیسی تمہاری اچھا۔ جہاں رہو سُکھی رہو!"

جھنیا نے ساس کے پاس جا کر اُس کے پیروں کو آنچل سے چھوا۔ دھنیہ کے مُنہ سے دُعا کا ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اُس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔ گوبر بچے کو گود میں لئے آگے آگے تھا اور جھنیا بستر بغل میں دبائے پیچھے پیچھے۔ ایک چمار کا لڑکا صندوق لئے ہوئے تھا۔ گاؤں کے کئی عورت مرد گوبر کو پہنچانے گاؤں کے باہر تک گئے۔

اور دھنیا بیٹھی رو رہی تھی، جیسے کوئی اس کے دل کو آرے سے چیر رہا ہو۔ اس کی ممتا اُس گھر کے مانند ہو رہی تھی جس میں آگ لگ گئی ہو اور سب کچھ جل کر خاک ہو گیا ہو۔ بیٹھ کر رونے کے لئے بھی جگہ نہ بچی ہو۔

(۲۲)

ادھر کچھ دنوں سے رائے صاحب کی لڑکی کے بیاہ کی بات چیت ہو رہی تھی۔ چنانچہ کبھی سر پر آ پہنچا تھا مگر ان سب سے زیادہ ضروری انھیں دیوانی کا ایک مقدمہ دائر کرنا تھا۔ جس کی کورٹ فیس ہی پچاس ہزار ہوتی تھی اور دیگر خرچ الگ۔ رائے صاحب کے سالے جو اپنی ریاست کے واحد مالک تھے عین شباب میں موٹر کے لڑ جانے سے فوت ہو گئے تھے۔ اور رائے صاحب اپنے کنوارے لڑکے کی طرف سے اس ریاست پر قبضہ پانے کیلئے قانون کی پناہ لینا چاہتے تھے۔ انکے چچا زاد اور سالیوں نے ریاست پر قبضہ کر رکھا تھا اور رائے صاحب کو اسمیں سے کوئی حصہ دینے پر تیار نہ تھے۔ رائے صاحب نے بہت چاہا کہ باہمی مفاہمت و مصالحت ہو جائے اور ان کے چچا زاد سالے معقول گزارہ لیکر ہٹ جائیں، حتیٰ کہ وہ ریاست کی نصف آمدنی چھوڑنے پر راضی تھے۔ مگر ان کے سالوں نے کسی طرح کا سمجھوتہ منظور نہ کیا اور صرف طاقت کے زور سے ریاست میں تحصیل وصول شروع کر دی۔ رائے صاحب کو عدالت جانیکے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ مقدمے میں لاکھوں کا خرچ تھا مگر ریاست بھی بیس لاکھ سے کم مالیت کی نہ تھی۔ وکلا نے یقینی طور سے کہہ دیا تھا کہ آپ کی شرطیہ ڈگری ہو گی۔ ایسا موقع کون چھوڑ سکتا تھا؟ مشکل یہی تھی کہ یہ تینوں کام ایک ساتھ آ پڑے تھے اور انھیں کسی طرح ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ برس کی ہو گئی تھی اور صرف ہاتھ میں روپیہ نہ رہنے کے سبب اسکا بیاہ ٹلتا جاتا تھا۔ خرچ کا اندازہ ایک لاکھ تھا جسکے پاس جاتے وہی بڑا سا منہ کھولتا۔ مگر حال میں ایک بڑا اچھا موقع ہاتھ آگیا تھا۔ کنور دگ وجے سنگھ کی بیوی تپ دق کی نذر ہو چکی تھی اور کنور صاحب اپنے اجڑے گھر کو جلد سے جلد آباد کر لینا چاہتے تھے۔ سودا بھی کفایت سے طے ہو

گیا۔ اور کبھی شکار ہاتھ سے نکل نہ جائے اسی لئے اسی لگن میں بیاہ ہونا نہایت ضروری تھا۔ کنور صاحب نفس پرستیوں کے غلام تھے۔ شراب، گانجا، افیون، مدک، چرس ایسا کوئی نشہ نہ تھا جسکے عادی نہ ہوں اور عیاشی تو رئیس کی زینت ہی ہے۔ وہ رئیس ہی کیا جو عیاش نہ ہو؟ روپیہ اور خرچ ہی کیسے کیا جائے؟ مگر ان سب بُری عادتوں کے ہوتے ہوئے بھی اُن میں وہ قابلیت تھی کہ بڑے بڑے علماء اُنکا لوہا مانتے تھے۔ موسیقی، ناٹک، ہاتھ دیکھنا، جوتش، لاٹھی، کشتی، نشانہ بازی وغیرہ فنون میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ اسکے ساتھ ہی بڑے دبدبے والے اور بے خوف تھے۔ قومی تحریکوں میں دل کھول کر مدد دیتے تھے مگر پوشیدہ طریقے پر۔ حکام سے یہ بات چھپی نہ تھی پھر بھی ان کی بڑی عزت تھی اور سال میں دو ایک بار گورنر صاحب بھی ان کے مہمان ہوتے تھے۔ عمر تیس بتیس سال سے زیادہ نہ تھی اور صحت تو ایسی تھی کہ تنہا ایک بکرا کھا کر ہضم کر ڈالتے تھے۔ رائے صاحب نے سمجھا کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ابھی کنور صاحب سولہواں وغیرہ سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ رائے صاحب نے گفتگو شروع کر دی۔ کنور صاحب کیلئے بیاہ صرف اپنا اثر اور زور بڑھانے کا ذریعہ تھا۔ رائے صاحب کونسل کے ممبر تھے ہی، یوں بھی با اثر تھے۔ قومی جنگ میں اپنا تیاگ دکھا کر عقیدت عامہ کے مستحق بھی بن چکے تھے۔ بیاہ طے ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو سکتی تھی اور وہ طے بھی ہو گیا۔

رہا چناؤ، وہ سونے کی کٹار تھی جسے نہ اُگلتے بنتا تھا نہ نگلتے۔ اب تک وہ دو مرتبہ جیت چکے تھے اور دونوں ہی مرتبہ ایک ایک لاکھ کی چپت پڑ چکی تھی۔ مگر اب کے ایک راجا صاحب اسی علاقے سے کھڑے ہو گئے تھے اور ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر دیا تھا کہ چاہے ایک ایک ووٹر کو ایک ایک ہزار ہی کیوں نہ دینا پڑے اور چاہے پچاس لاکھ کی ریاست برد ہو جائے مگر رائے امرپال سنگھ کو کونسل میں

نہ جانے دونگا اور اِن سے حکّام نے اپنی امداد کا وعدہ بھی کر رکھا تھا۔ رائے صاحب فہیم تھے، چالاک تھے اور اپنا نفع نقصان سمجھتے تھے۔ مگر راجپوت تھے اور رئیس تھے۔ یہ چیلنج پاکر میدان سے کیسے ہٹ جائیں؟ یوں اِن راجا سورج پرتاپ سنگھ نے آکر کہا ہوتا کہ بھائی صاحب آپ تو دو بار کونسل میں جا چکے، اب کے مجھے جانے دیجئے تو شاید رائے صاحب نے انکا خیر مقدم کیا ہوتا۔ کونسل کا لالچ اب انھیں نہ تھا مگر اس چیلنج کے سامنے خم ٹھوکنے کے سوا اور کوئی چارا نہ تھا۔ ایک مصلحت اور بھی۔ مسٹر تنکھا نے انھیں یقین دلایا تھا کہ آپ کھڑے ہو جائیں پھر بعد کو راجا صاحب سے ایک لاکھ کی تھیلی لے کر بیٹھ جائیگا۔ اُنھوں نے یہاں تک کہا تھا کہ راجا صاحب بڑی خوشی سے ایک لاکھ دیدیں گے، میری اُن سے بات چیت ہو چکی ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ راجا صاحب رائے صاحب کو ہرانے کا افتخار نہیں چھوڑنا چاہتے اور اسکا خاص سبب تھا رائے صاحب کی لڑکی کی شادی کا کنور صاحب سے طے ہونا۔ دو با اثر گھرانوں کا میل، وہ اپنی شان کیلئے مضر سمجھتے تھے۔ ادھر رائے صاحب کو سسرالی جائداد ملنے کی قوی اُمید تھی۔ راجا صاحب کے پہلو میں یہ کانٹا بھی بُری طرح کھٹک رہا تھا۔ کہیں وہ جائداد انھیں ملگئی۔ اور قانون رائے صاحب کیطرف تھا ہی، تب تو راجا صاحب کا ایک مدِ مقابل کھڑا ہو جائیگا۔ بس انکا یہ فرض تھا کہ وہ رائے صاحب کو کچل ڈالیں اور انکی عزّت خاک میں ملادیں۔

بیچارے رائے صاحب بڑی مشکل میں پڑگئے تھے انھیں یہ شک ہونے لگا تھا کہ مسٹر تنکھا نے صرف اپنا مطلب نکالنے کیلئے انھیں دھوکا دیا۔ یہ خبر بھی ملی تھی کہ اب وہ راجا صاحب کے پیرو کار ہو گئے ہیں۔ یہ رائے صاحب کے زخم پر نمک تھا۔ اُنھوں نے کئی بار تنکھا کو بلایا تھا مگر وہ یا تو گھر پر ملتے ہی نہ تھے یا آنے کا وعدہ کرکے بھول جاتے تھے۔ آخر آج وہ خود ان سے ملنے کا ارادہ کرکے انکے یہاں

جا پہنچے۔ اتفاق سے ٹنخا گھر پر مل گئے، مگر رائے صاحب کو پورے گھنٹہ بھر تک ان کا انتظار کرنا پڑا۔ یہ وہی ٹنخا ہیں جو رائے صاحب کے دروازے پر روزانہ ایک بار حاضری دیا کرتے تھے۔ آج اتنا مزاج ہو گیا ہے، جلے بیٹھے تھے۔ جیوں ہی مسٹر ٹنخا آراستہ پیراستہ ہو کر منہ میں سگار دبائے ہوئے کمرے میں آئے اور ہاتھ بڑھایا کہ رائے صاحب نے بم چھوڑ دیا: "میں گھنٹہ بھر سے یہاں بیٹھا ہوا ہوں اور آپ نکلتے نکلتے اب نکلے ہیں، میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں!"

ٹنخا نے ایک صوفے پر بیٹھ کر بے پروائی سے دھواں اڑاتے ہوئے کہا "مجھے اس کا افسوس ہے۔ میں ایک ضروری کام میں لگا ہوا تھا۔ آپ کو فون کر کے مجھ سے وقت طے کر لینا چاہیئے تھا!"

آگ میں گھی پڑ گیا، مگر رائے صاحب نے غصہ کو ضبط کیا۔ وہ لڑنے نہ آئے تھے۔ اس توہین کو پی جانے ہی کا موقع تھا، بولے "ہاں یہ غلطی ہوئی آج کل آپ کو بہت کم فرصت رہتی ہے شاید؟"

"جی ہاں بہت کم، ورنہ میں ضرور آتا!"

"میں اسی معاملے کے بارے میں آپ سے پوچھنے آیا تھا۔ سمجھوتے کی تو کوئی امید نہیں معلوم ہوتی۔ ادھر تو لڑائی کی تیاریاں بہت زوروں سے ہو رہی ہیں!"

"راجا صاحب کو تو آپ جانتے ہیں جھگڑالو آدمی ہیں۔ پورے سنکی! کوئی نہ کوئی دھن سوار رہتی ہے۔ آج کل یہی دھن ہے کہ رائے صاحب کو نیچا دکھا کر رہیں گے اور انہیں جب ایک دھن سوار ہو جاتی ہے تو پھر کسی کی نہیں سنتے، خواہ کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے۔ کوئی چالیس لاکھ کا بار سر پر ہے پھر بھی وہی دم خم ہے۔ وہی اناپ شناپ خرچ ہے۔ پیسے کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ نوکروں کی تنخواہ چھ چھ

مہینے سے پڑی ہوئی ہے۔ مگر بہیرا محل بن رہا ہے۔ سنگ مرمر کا تو فرش ہے۔ پچی کاری ایسی ہوئی ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ افسروں نے پاس وزڈالیاں جاتی رہتی ہیں۔ سُنا ہے کہ کوئی انگریز میجر رکھنے والے ہیں۔"

"پھر آپ نے کیسے کہہ دیا تھا کہ آپ کوئی سمجھوتہ کرا دیں گے؟"

"مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ میں نے کیا۔ اس کے سوا میں اور کیا کر سکتا تھا؟ اگر کوئی شخص اپنے دو چار لاکھ روپئے میں نکلنے ہی پر تُلا ہوا ہے تو میرا کیا بس ہے؟"

رائے صاحب اب غصّے کو ضبط نہ کر سکے، بولے "خسرو صاحب اُس دو چار لاکھ میں سے دس بیس ہزار آپ کے ہاتھ چڑھنے کی بھی اُمید ہو۔"

تنخا اب کیوں دبتے؟ بولے "رائے صاحب! اب صاف صاف نہ کہلائیے۔ یہاں نہ میں سنیاسی ہوں نہ آپ۔ ہم سبھی کچھ نہ کچھ کمانے نکلے ہیں۔ آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کی تلاش آپ کو بھی اتنی ہی ہے جتنی مجھے۔ آپ سے میں نے کھڑے ہونے کو کہا۔ آپ ایک لاکھ کے لالچ سے کھڑے ہو گئے۔ اگر گوٹی لال ہو جاتی تو آج آپ ایک لاکھ کے مالک ہوتے اور بلا ایک پائی قرض لئے کنور صاحب سے رشتہ بھی قائم ہو جاتا اور مقدمہ بھی دائر ہو جاتا۔ مگر آپ کی بدقسمتی سے وہ چال پٹ پڑ گئی۔ جب وہی یوں رہ گئے تو مجھے کیا ملتا؟ آخر میں نے جھک مار کر اُن کی دُم پکڑی۔ کسی نہ کسی طرح اس بیترنی کو تو پار کرنا ہی ہے۔"

رائے صاحب کو ایسا غصّہ آ رہا تھا کہ اس بدمعاش کو گولی مار دیں اسی نے سبز باغ دکھا کر کھڑا کیا اور اب اپنی صفائی دے رہا ہے، البتہ میں دھول بھی نہیں لگنے دیتا! مگر اب موقع و محل دیکھ کر زبان بند کئے ہوئے تھے۔

"تو اب آپ کے کئے کچھ نہیں ہو سکتا؟"

"ایسا ہی سمجھئے!"

"میں پچاس ہزار پر بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں۔"

"راجا صاحب کس طرح نہ مانیں گے۔"

"پچیس ہزار پر تو مان جائیں گے۔"

"کوئی امید نہیں۔ وہ صاف کہہ چکے ہیں۔"

"وہ کہہ رہے ہیں یا آپ کہہ رہے ہیں؟"

"آپ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں؟"

رائے صاحب نے انکسار سے کہا "میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا، مگر اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ آپ چاہتے تو معاملہ ہو جاتا۔"

"تو آپ کا خیال ہے کہ میں نے معاملہ نہیں ہونے دیا۔"

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ آپ چاہتے تو کام ہو جاتا اور میں اس پریشانی میں نہ پڑتا۔"

تنخا نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تو رائے صاحب اگر آپ صاف بھلانا چاہتے ہیں تو سنئے۔ اگر آپ نے دس ہزار کا چک میرے ہاتھ میں رکھ دیا ہوتا آج یقیناً ایک لاکھ کے مالک ہوتے۔ آپ شاید چاہتے ہوں گے کہ جب آپ کو راجا صاحب سے روپے مل جاتے تو آپ مجھے ہزار دو ہزار دے دیتے۔ تو میں ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ آپ راجا صاحب سے روپے لے کر سیف میں رکھتے اور مجھے انگوٹھا دکھا دیتے۔ پھر میں آپ کا کیا بنا لیتا، بتلائیے؟ کہیں نالش فریاد بھی تو نہ کر سکتا تھا۔"

رائے صاحب نے جیسے چوٹ کھائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ "آپ مجھے اتنا بے ایمان سمجھتے ہیں؟"

تنخا نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "اسے بے ایمانی کون سمجھتا ہے۔ آج کل

یہی چالاکی ہے کہ کیسے دوسروں کو اُلّو بنایا جائے۔ یہی کامیاب طریقہ ہے اور آپ اسکے اُستادِ کامل ہیں!"

رائے صاحب نے مٹھی باندھ کر کہا "وہ کیں؟"

"جی ہاں، آپ پہلے چُناؤ میں مَیں نے دل و جان سے آپ کی پیروی کی تو آپ نے بڑی مشکل سے رو دھو کر پانچ سو روپئے دیئے۔ پھر دوسرے چُناؤ میں آپ نے ایک سٹرا گلا، ٹوٹا پھوٹا، موٹر دے کر اپنا گلا چھڑا لیا۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے!"

وہ کمرے سے نکل گئے اور موٹر لانے کا حکم دیا۔

رائے صاحب کا خون کھول رہا تھا۔ اس بد تہذیبی کی بھی کوئی حد ہے۔ ایک تو گھنٹہ بھر انتظار کرایا اور اب اتنی بے مروتی سے پیش آکر انھیں جبراً گھر سے نکال رہا ہے۔ اگر انھیں یقین ہوتا کہ وہ مسٹر تنخا کو پیٹ سکتے ہیں تو کبھی نہ چوکتے۔ مگر تنخا قد و قامت میں اُن سے سوا گُنا تھے۔ جب تنخا نے ہارن بجایا تو یہ بھی آکر اپنے موٹر میں بیٹھے اور سیدھے مسٹر کھنّا کے پاس پہنچے۔

نو بج رہے تھے مگر کھنّا صاحب خوابِ شیریں کے مزے لے رہے تھے۔ وہ دو بجے رات کے پہلے کبھی نہ سوتے تھے اور پھر قدرتاً نو بجے دن تک سوتے رہتے تھے۔ یہاں بھی رائے صاحب کو آدھ گھنٹہ بیٹھنا پڑا۔ اسلئے جب کوئی ساڑھے نو بجے مسٹر کھنّا مسکراتے ہوئے نکلے تو رائے صاحب نے ڈانٹ بتائی "اچھا۔ اب سرکار کی آنکھ کھلی ہے۔ ساڑھے نو بجے! روپئے جمع کر لئے ہیں نا، جبھی یہ بے فکری ہے۔ میری طرح تعلقدار ہوتے تو اب تک آپ بھی کسی کے دروازے پر کھڑے ہوتے بیٹھے بیٹھے سر میں چکر آجاتا!"

کھنّا نے سگریٹ کیس اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "رات سونے میں بڑی

دیر ہو گئی۔ اس وقت کدھر سے آرہے ہیں؟"

رائے صاحب نے تھوڑے لفظوں میں اپنی ساری مشکلیں بیان کر دیں۔ دل میں کھنّا کو گالیاں دیتے تھے جو اُن کا ہم سبق ہو کر بھی ہمیشہ اُنھیں ٹھگنے کی فکر میں رہا کرتا تھا، مگر سامنے اُس کی خوشامد کرتے تھے۔

کھنّا نے ایسی شکل بنائی گویا اُنھیں بڑی تشویش ہو گئی۔ بولے "میری تو صلاح ہے کہ آپ چُناؤ کو گولی ماریں اور اپنے سالوں پر مقدمہ دائر کر دیں۔ رہا بیاہ، وہ تو تین دن کا تماشا ہے۔ جس کے لئے زیر بار ہونا مناسب نہیں۔ کنور صاحب میرے دوستوں میں ہیں۔ بس لینے دینے کا کوئی سوال نہ اُٹھنے پائے گا!"

رائے صاحب نے طنز سے کہا "آپ یہ بھولے جاتے ہیں مسٹر کھنّا، میں بنیا نہیں تعلقدار ہوں۔ کنور صاحب جہیز نہیں مانگتے، انھیں ایشور نے سب کچھ دیا ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ میری اکیلی لڑکی ہے اور اسکی ماں مر چکی ہے۔ وہ آج زندہ ہوتی تو شاید سارا گھر لٹا کر بھی اسکا جی نہ بھرتا۔ اس وقت میں شاید اُسے ہاتھ روک کر خرچ کرنے کا حکم دیتا۔ لیکن اب تو میں ماں بھی ہوں، باپ بھی ہوں۔ اور اگر مجھے اپنے دل کا خون بھی نکال کر دینا پڑے تو میں خوشی سے دے دوں گا۔ اس مجرّد زندگی میں میں نے اولاد کی محبت ہی میں اپنے دل کی پیاس بجھائی ہے۔ دونوں بچوں کے پیار ہی میں میں نے متوفیہ کے متعلق اپنی وفاشعاری کو نبھایا ہے۔ میرے لئے ناممکن ہے کہ اس مبارک موقع پر اپنے دل کے ارمان نہ نکالوں۔ میں اپنے دل کو تو سمجھا سکتا ہوں مگر جسے میں متوفیہ کا حکم سمجھتا ہوں اُسے نہیں ٹال سکتا۔ اور چُناؤ کے میدان سے بھاگنا بھی میرے لئے ناممکن ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہار دوں گا، راجا صاحب سے میرا کوئی مقابلہ نہیں ہے، پھر راجا صاحب کو اتنا ضرور دکھا دینا چاہتا ہوں کہ امرپال سنگھ کوئی ملائم چارہ نہیں ہے!"

"اور مقدمہ دائر کرنا تو ضروری ہی ہے؟"

"اسی پر تو سارا دارومدار ہے۔ اب آپ بتائیے کہ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

"میرے ڈائرکٹروں کا اس بارے میں جو حکم ہے، آپ جانتے ہی ہیں۔ اور راجا صاحب بھی ہمارے ڈائرکٹر ہیں، یہ بھی آپ کو معلوم ہی ہے۔ پچھلا روپیہ وصول کرنے کیلئے بار بار تاکید ہو رہی ہے، کوئی نیا معاملہ تو شاید ہی ہو سکے!"

رائے صاحب نے اداس ہو کر کہا "آپ تو میری ناؤ ہی ڈبائے دیتے ہیں۔ مسٹر کھنّا!"

"میرے پاس جو کچھ اپنا ہے وہ آپ کا ہے، مگر بینک کے معاملے میں تو مجھے مالکوں کا حکم ہی ماننا پڑے گا!"

"اگر یہ جائداد ہاتھ آ گئی، جس کی مجھے پوری امید ہے تو میں پائی پائی ادا کر دوں گا!"

"آپ بتلا سکتے ہیں اس وقت آپ پر کتنا قرض ہے؟"

رائے صاحب نے جھکتے ہوئے کہا "پانچ لاکھ سمجھئے، کچھ کم ہی ہوگا!"

کھنّا نے بے اعتباری سے کہا "یا تو آپ کو یاد نہیں یا آپ چھپا رہے ہیں!"

رائے صاحب نے زور دے کر کہا "جی نہیں، میں نہ بھولا ہوں اور نہ چھپا رہا ہوں۔ میری جائداد اس وقت کم از کم پچاس لاکھ کی ہے اور سسرال کی جائداد بھی اس سے کم نہیں ہے۔ اتنی جائداد پر دس پانچ لاکھ کا بار کچھ نہ ہونے کے برابر ہے!"

"مگر یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ سسرال والی جائداد پر قرض نہیں ہے؟"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ بالکل بے داغ ہے!!"

"اور مجھے خبر ملی ہے کہ اس پر دس لاکھ سے کم کا بار نہیں ہے۔ اُس جائداد پر تو اب کچھ ملنے سے رہا اور آپ کی جائداد پر بھی میرے خیال میں دس لاکھ سے کم قرض نہیں ہے۔ اور وہ جائداد اب پچاس لاکھ کی نہیں بلکہ مشکل سے چالیس لاکھ کی ہے۔ ایسی حالت میں کوئی بینک آپ کو قرض نہیں دے سکتا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ ایک ہلکی سی ٹھوکر آپ کو تحت الثریٰ میں پہنچا سکتی ہے آپ کو اس وقت بہت سنبھل کر چلنا چاہئے"!

رائے صاحب نے ان کا ہاتھ اپنی طرف کھینچ کر کہا "میرے دوست! یہ سب میں خوب سمجھتا ہوں! مگر زندگی کی ٹریجیڈی اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ کا دل جو کام نہیں کرنا چاہتا وہ آپ کو کرنا پڑے۔ آپ کو اس موقع پر میرے لئے کم سے کم دو لاکھ کا بندوبست کرنا پڑیگا!!"

کھنّا نے لمبا سانس لیکر کہا "مائی گاڈ، دو لاکھ! غیر ممکن، بالکل غیر ممکن!"

"میں تمہارے دروازے پر سر پٹک کر جان دیدوں گا۔ کھنّا، اتنا سمجھ لو، میں نے تمہارے بھروسے یہ سارے منصوبے باندھے ہیں۔ اگر تم نے مایوس کر دیا تو شاید مجھے زہر کھا لینا پڑے۔ میں سورج پرتاپ سنگھ کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیک سکتا۔ لڑکی کا بیاہ ابھی دو چار مہینے ٹل سکتا ہے۔ مقدمہ دائر کرنے کیلئے بھی ابھی کافی وقت ہے، مگر چناؤ سر پر آ گیا ہے اور مجھے سب سے بڑی فکر یہی ہے"!!

کھنّا نے حیرت سے کہا "تو آپ چناؤ میں دو لاکھ لگا دیں گے؟"

"چناؤ کا سوال نہیں ہے بھئی، یہ عزت کا سوال ہے۔ کیا آپ کی رائے میں میری عزت دو لاکھ کی بھی نہیں؟ میری ساری ریاست بک جائے تو اسکا غم نہیں، مگر سورج پرتاپ سنگھ کو میں آسانی سے جیتنے نہ دونگا"!

کھنّا نے ایک منٹ تک دُھواں اُڑانے کے بعد کہا "بینک کی جو حالت ہے وہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دی۔ بینک نے ایک طرح سے لین دین کا کام بند کر دیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کے ساتھ خاص رعایت کی جائے، مگر کاروبار تو کاروبار ہی ہے، یہ آپ کو معلوم ہے۔ میرا کمیشن کیا رہے گا؟ مجھے آپ کے لئے خاص طور پر سفارش کرنی پڑے گی۔ راجا صاحب کا دوسرے ڈائرکٹروں پر کتنا اثر ہے۔ یہ بھی آپ جانتے ہیں۔ مجھے اُن کے خلاف پارٹی بندی کرنی پڑے گی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ میری ذمہ داری ہی پر معاملہ ہوگا۔"

رائے صاحب کا چہرہ اُتر گیا۔ کھنّا ان کے خاص دوستوں میں تھے۔ ساتھ کے پڑھے ہوئے، ساتھ کے بیٹھنے والے، اور وہ اُن سے کمیشن کی اُمید رکھتے ہیں۔ اتنی بے مُروّتی! آخر وہ جو اتنے دنوں سے کھنّا کی خوشامد کرتے آتے ہیں۔ تو کس دن کے لئے؟ باغ میں پھل ہوں۔ ترکاریاں ہوں، سب سے پہلے کھنّا کے یہاں بھیجتے ہیں۔ کوئی جشن ہو، کوئی جلسہ ہو، سب سے پہلے کھنّا کو مدعو کرتے ہیں۔ اس کا یہ جواب ہے!

اُداس ہو کر بولے "آپ کی جو مرضی ہو، مگر میں آپ کو اپنا بھائی سمجھتا تھا۔"

کھنّا نے ممنونیت کے لہجے سے کہا "یہ آپ کی مہربانی ہے۔ میں نے بھی ہمیشہ آپ کو اپنا بڑا بھائی سمجھا ہے اور اب بھی سمجھتا ہوں۔ کبھی آپ سے کوئی پردہ نہیں رکھا، مگر کاروباری فضا ایک اور ہی فضا ہے۔ جہاں کوئی کسی کا دوست نہیں، کوئی کسی کا بھائی نہیں۔ جس طرح میں بھائی کے ناتے آپ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے دو مرد سے زیادہ قیمتی دیجئے۔ اُسی طرح آپ کو بھی میرے کمیشن میں رعایت کے لئے اصرار نہ کرنا چاہیئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں جتنی رعایت آپ کے ساتھ کر سکتا ہوں اتنی کر دوں گا۔ آپ دفتر کے وقت آئیں اور لکھا پڑھی کر دیں۔ بس معاملہ

ختم! آپ نے کچھ اور سنا؟ مہتا صاحب آج کل مالتی پر بے طرح ریجھے ہوئے ہیں۔ ساری فلاسفری نکل گئی۔ دن میں ایک دو بار ضروری حاضری دے آتے ہیں۔ اور شام کو اکثر دونوں ساتھ ساتھ گھومنے نکلتے ہیں۔ یہ تو میری ہی شان تھی کہ کبھی مالتی کے دروازے پر سلام کرنے نہ گیا۔ شاید اب اسی کی کسر نکال رہی ہے۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ جو کچھ ہیں مسٹر کھنا ہیں۔ کوئی کام ہوتا تو کھنا کے پاس دوڑی آتیں۔ جب روپیوں کی ضرورت پڑتی تو کھنا کے نام رقعہ آتا۔ اور کہاں اب مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہیں۔ میں نے خاص انھیں کے لئے فرانس سے ایک گھڑی منگوائی تھی۔ بڑے شوق سے لیکر گیا۔ مگر نہیں لی۔ ابھی کل میووں کی ڈالی بھیجی تھی۔ کشمیر سے منگوائے تھے۔ واپس کر دی۔ مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ آدمی اتنی جلدی کیسے بدل جاتا ہے۔"

رائے صاحب دل میں تو اُن کی بے قدری پر خوش ہوئے مگر ہمدردی دکھا کر بولے "اگر یہ بھی مان لیں کہ مہتا سے انھیں محبت ہو گئی ہے تو قطع مراسم کی تو کوئی وجہ نہیں ہے۔"

کھنا نے افسوس سے کہا "یہی تو رنج ہے۔ بھائی صاحب! یہ تو میں شروع ہی سے جانتا تھا کہ وہ میرے ہاتھ نہیں آسکتیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں کبھی اس کے دھوکے میں نہیں پڑا کہ مالتی کو مجھ سے محبت ہے۔ محبت جیسی چیز اُن سے مل سکتی ہے! اس کی میں نے کبھی امید ہی نہیں کی۔ میں تو صرف اُن کے روپ کا پجاری ہوں۔ سانپ میں زہر ہے، یہ جانتے ہوئے بھی ہم اسے دودھ پلاتے ہیں طوطے سے زیادہ بے مروت جانور اور کون ہوگا! لیکن صرف اس کی شکل اور آواز پر گرویدہ ہو کر لوگ اسے پالتے ہیں اور سونے کے پنجڑے میں رکھتے ہیں۔ میرے لئے بھی مالتی اسی طوطے کی طرح تھی۔ افسوس یہی ہے کہ میں پہلے کیوں نہ ہوشیار ہو گیا۔ اس کے لئے میں نے ہزاروں روپے برباد کر دیئے۔ بھائی صاحب۔ جب

اس کا پُرزہ پہنچا میں نے فوراً روپیے بھیجے۔ میرا موٹر آج بھی اس کی سواری میں ہے اس کے پیچھے میں نے اپنا گھر چوپٹ کر دیا۔ بھائی صاحب دل میں جتنا رس تھا وہ اُدھر کی طرف اتنی زور سے بہا کہ دوسری طرف کا باغ بالکل خشک ہی رہ گیا۔ برسوں ہو گئے کہ میں نے گو بندی سے دل کھول کر بات بھی نہیں کی۔ اُس کی خدمت اور محبّت اور قربانی سے مجھے اُسی طرح بدمزگی ہو گئی تھی جیسے بدہضمی کے مریض کو حلوے سے ہو جاتی ہے۔ مالتی مجھے اُسی طرح نچاتی تھی۔ جیسے مداری بندر کو نچاتا ہے، اور میں خوشی سے ناچتا تھا۔ وہ میری توہین کرتی تھی اور میں خوش ہو کر ہنستا تھا۔ وہ مجھ پر حکومت کرتی تھی اور میں سر جھکاتا تھا۔ اُس نے کبھی مجھے مُنہ نہیں لگایا۔ یہ میں مانتا ہوں، اس نے کبھی میری حوصلہ افزائی نہیں کی، یہ بھی سچ ہے۔ پھر بھی میں پتنگے کی طرح اسکے چہرے کی چمک پر جان دیتا تھا۔ اور اب وہ مجھ سے اخلاق کا برتاؤ بھی کر سکتی! لیکن صاحب، میں کہے دیتا ہوں کہ کھنّا چپ بیٹھنے والا آدمی نہیں ہے۔ اُس کے رُقعے میرے پاس محفوظ ہیں۔ میں اُس سے ایک ایک پائی وصول کر لوں گا۔ اور ڈاکٹر مہتا کو تو میں لکھنؤ سے نکال کر دم لوں گا اُن کا یہاں رہنا ناممکن کر دوں گا ......"

اُسی وقت ہارون کی آواز آئی اور ایک لمحے میں مسٹر مہتا آ کر کھڑے ہو گئے۔ گورا چٹا رنگ، صحت کی سرخی گالوں پر جھلکتی ہوئی، لمبی اچکن، چوڑی دار پاجامہ اور سنہری عینک، شرافت کے اقدار سے معلوم ہوتے تھے۔ کھنّا نے اُٹھ کر ہاتھ ملایا "آئیے مسٹر مہتا، آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔"

مہتا نے دونوں صاحبوں سے ہاتھ ملا کر کہا "بڑی اچھی ساعت گھر سے چلا تھا کہ آپ دونوں صاحبوں سے ایک ہی جگہ ملاقات ہو گئی۔ آپ نے اخباروں میں دیکھا ہو گا کہ یہاں عورتوں کے لئے ایک ورزش گاہ بنانے کی تجویز ہو رہی ہے۔

مس مالتی اُس کمیٹی کی صدر ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کی تعمیر میں دو لاکھ روپئے لگیں گے۔ شہر میں اب اس کی کتنی ضرورت ہے، یہ آپ لوگ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ چندہ دینے والوں میں آپ دونوں صاحبوں کا نام سب سے اوپر ہو۔ مس مالتی خود آنے والی تھیں، مگر آج اُن کے والد کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اس لئے نہیں آسکیں۔"

اُنھوں نے چندے کی فہرست رائے صاحب کے ہاتھ میں رکھدی۔ پہلا نام راجہ سورج پرتاپ سنگھ کا تھا۔ سامنے پانچ ہزار روپیے کی رقم درج تھی۔ اُس کے بعد کنور دگ وجے سنگھ کے تین ہزار روپئے تھے۔ اس کے بعد اور کئی رقمیں اتنی ہی یا کچھ کم تھیں۔ مالتی نے پانچ سو روپئے دیئے تھے۔ اور ڈاکٹر مہتا نے ایک ہزار۔

رائے صاحب نے شرما کر کہا: "کوئی چالیس ہزار تو آپ لوگوں نے کر ہی لئے۔"

مہتا فخر سے بولے "یہ سب آپ لوگوں کی مہربانی ہے، اور یہ صرف تین گھنٹے کی محنت کا نتیجہ ہے۔ راجہ سورج پرتاپ سنگھ نے شاید ہی کسی رفاہ کے کام میں حصّہ لیا ہو۔ مگر آج تو اُنھوں نے بلا کہے سُنے چیک لکھ دیا۔ ملک میں بیداری ہے۔ پبلک کسی بھی نیک کام میں مدد دینے کو تیار ہے۔ صرف اُسے یقین ہونا چاہئے کہ اسکی خیرات کا جائز استعمال ہوگا۔ آپ سے مجھے بڑی امید ہے مسٹر کھنّا۔"

کھنّا نے بےپروائی سے کہا "میں ایسے فضول کاموں میں نہیں پڑتا۔ نہ جانے آپ لوگ مغرب کی غلامی میں کہاں تک بڑھتے جائیں گے۔ یوں ہی عورتوں کو خانہ داری سے نفرت ہوری ہے، ورزش کی دُھن سوار ہوگئی تو وہ اور بھی کہیں کی نہ رہیں گی۔ جو عورت گھر کا کام کرتی ہے۔ اُس کے لئے ورزش کی ضرورت نہیں، اور جو گھر کا کام

کام نہیں کرتی اور صرف عیش و آرام میں محو ہے۔ اس کی ورزش کیلئے چندہ دینا میں ادھرم سمجھتا ہوں۔"

کھنا ذرا بھی بے دل نہیں ہوئے "ایسی حالت میں آپ سے کچھ مانگوں گا بھی نہیں جس تجویز میں ہمارا یقین نہ ہو اسمیں کسی طرح کی امداد دینا واقعی ادہرم ہے۔ آپ تو مسٹر کھنا سے متفق نہیں ہیں۔ رائے صاحب؟"

رائے صاحب بڑے سوچ میں پڑے ہوئے تھے۔ سورج پرتاپ کے پانچ ہزار ان کا حوصلہ پست کئے ڈالتے تھے۔ چونک کر بولے "آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"

"میں نے کہا آپ تو اس کام میں امداد دینا اَدھرم نہیں سمجھتے ہ؟"

"جس کام میں آپ شریک ہیں وہ دھرم ہے یا اَدھرم اس کی میں پروا نہیں کرتا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ خود غور کریں اور اگر آپ اس تجویز کو سماج کے لئے مُفید سمجھیں تو اس میں مدد دیں۔"

"مسٹر کھنا کا طرزِ عمل مجھے بہت پسند آیا۔"

کھنا بولے "میں تو صاف کہتا ہوں اسی لئے بدنام ہوں۔"

رائے صاحب نے کمزور مُسکراہٹ کے ساتھ کہا "مجھ میں تو سوچنے کی سکت نہیں ہے۔ شرفا کی تقلید کرنا ہی میں اپنا دھرم سمجھتا ہوں۔"

"تو لکھئے کوئی اچھی رقم۔"

"جو کہئے وہ لکھ دوں۔"

"جو آپ کی خوشی۔"

"آپ جو کہئے وہ لکھ دوں۔"

"تو دو ہزار سے کم کیا لکھئے گا۔"

رائے صاحب نے مجروح لہجے میں کہا " تو آپ کی نگاہ میں میری یہی حیثیت ہے ؟"

انھوں نے قلم اٹھایا اور اپنا نام لکھ کر اس کے آگے پانچ ہزار لکھ دیئے۔

مہتا نے فہرست ان کے ہاتھ سے لے لی ۔ مگر انھیں اتنا رنج ہوا کہ رائے صاحب کا شکریہ بھی ادا کرنا بھول گئے۔ رائے صاحب کو چیارے کی فہرست دکھا کر انھوں نے برا کیا ، یہ سوچ کر انھیں افسوس ہوا۔

مسٹر کھنا نے انھیں ترحمانہ نظر سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں کتنے بہرے گدھے ہو تم !"

دفعتاً مہتا ، رائے صاحب کے گلے سے لپٹ گئے۔ اور زور سے بولے " رائے صاحب کے لئے تالیاں ! ہپ ہپ ہرا !"

کھنا نے کھسیا کر کہا " یہ لوگ راجے مہاراجے ٹھہرے ، یہی ان کاموں میں دان نہ دیں تو کون دے ؟"

مہتا بولے " میں تو آپ کو راجاؤں کا راجا سمجھتا ہوں ۔ آپ ان پر حکومت کرتے ہیں ۔ ان کی چوٹی آپ کے ہاتھ میں ہے ۔"

رائے صاحب خوش ہو گئے " یہ آپ نے بڑے معرکے کی بات کہی مہتا جی ، اصلی راجا تو ہمارے بنک لوگ ہیں "

مہتا نے کھنا کی خوشامد کا پہلو اختیار کیا " مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے ، کھنا جی ۔ آپ ابھی اس کام میں نہیں شریک ہونا چاہتے تو نہ سہی ، لیکن کبھی نہ کبھی آپ ضرور شرکت کریں گے ۔ امیروں کی بدولت ہی ہماری بڑی بڑی تحریکیں چل رہی ہیں ۔ قومی تحریک کو دو تین سال تک اس دھوم دھام سے کس نے چلایا ؟ اتنے دھرم شالے اور پاٹھ شالے کون بنوا رہا ہے ؟ آج دنیا کی حکومت کی باگ ڈور

بینکروں کے ہاتھ میں ہے۔ سرکار بھی اُن کے ہاتھ کا کھلونا ہے۔ میں ابھی آپ سے نااُمید نہیں ہوں۔ جو شخص قوم کے لئے جیل جاسکتا ہے اُس کے لئے دو چار ہزار خرچ کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم نے طے کیا ہے کہ اس عمارت کا بنیادی پتھر گوبندی دیوی کے ہاتھوں رکھا جائے۔ ہم دونوں جلد ہی گورنر صاحب سے بھی ملیں گے اور مجھے یقین ہے کہ ہمیں اُن کی مدد مل جائے گی۔ لیڈی ولسن کو نسوانی تحریکوں سے کتنی ہمدردی ہے! یہ آپ جانتے ہیں راجا صاحب اور دیگر اصحاب کی بھی رائے تھی کہ لیڈی ولسن ہی سے سنگِ بنیاد رکھایا جائے مگر بالآخر یہی طے ہوا کہ یہ شبھ کام کسی اپنی ہی بہن کے ہاتھوں ہونا چاہئے۔ آپ کم از کم اس موقع پر تشریف لائیں گے ضرور؟"

کھنّا نے ضحکہ اُڑایا "ہاں جب لارڈ ولسن آئیں گے تو میرا آنا بھی لازمی ہی ہے۔ اس طرح آپ بہت سے رئیسوں کو پھنسا لیں گے۔ آپ لوگوں کو ٹھگنے بھی خوب سوجھتے ہیں۔ اور ہمارے رئیس بھی اسی لائق۔ انھیں اُلّو بنا کر مونڈا جاسکتا ہے!"

"جب روپیہ ضرورت سے زیادہ ہو جاتا ہے تو اپنے لئے نکلنے کا راستہ تلاش کرتا ہے۔ یوں نہ نکل پائے گا تو قماربازی میں جائے گا۔ گھوڑ دوڑ میں جائے گا۔ اینٹ پتھر میں جائے گا یا عیّاشی میں جائے گا!"

گیارہ بجنے کو تھے۔ کھنّا صاحب کے دفتر کا وقت آگیا۔ مہتا چلے گئے۔ رائے صاحب بھی اُٹھے کہ کھنّا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ "نہیں آپ ذرا بیٹھیے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مہتا نے مجھے اس بری طرح پھانسا ہے کہ نکلنے کی کوئی سبیل ہی نہیں رہی۔ گوبندی سے سنگِ بنیاد رکھائیں گے۔ ایسی حالت میں میرا الگ رہنا مضحکہ انگیز ہے یا نہیں؟ گوبندی کیسے رضامند ہو گئی، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا،

اور مالتی نے اسے کیسے برداشت کر لیا یہ سمجھنا اور بھی مشکل ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ اس میں کوئی راز ہے یا نہیں؟"

رائے صاحب نے اپنا ادا جتایا "ایسے معاملوں میں عورت کو ہمیشہ خاوند سے صلاح لے لینی چاہیے۔"

کھنّا نے رائے صاحب کو تنفّرانہ نگاہوں سے دیکھا "ان ہی باتوں پر گوبندی سے میرا جی جلتا ہے اور اس پر لوگ مجھی کو برا کہتے ہیں۔ آپ ہی سوچیے کہ مجھے ان جھگڑوں سے کیا واسطہ؟ ان میں تو وہ پڑے جس کے پاس فالتو روپیہ ہو، فالتو وقت ہو، اور نام و نمود کی ہوس ہو۔ ہونا یہی ہے کہ وہ چار لوگ سکریٹری اور انڈر سکریٹری اور پریسیڈنٹ اور وائس پریسیڈنٹ بن کر افسروں کو دعوتیں دیں گے، ان کے منظورِ نظر بنیں گے۔ اور یونیورسٹی کی چھوکریوں کو جمع کر کے گلچھرے اڑائیں گے۔ ورزش تو صرف دکھانے کے دانت ہیں۔ ایسی تحریکوں میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے اور یہی ہوگا، اور الّو بنیں گے ہم اور ہمارے بھائی جو دولتمند کہلاتے ہیں، اور یہ سب گوبندی کے سبب۔"

وہ ایک بار کرسی سے اٹھے۔ پھر بیٹھ گئے۔ گوبندی پر ان کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر کہا "میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

رائے صاحب نے ہاں میں ہاں ملائی "کچھ نہیں، آپ گوبندی دیوی سے صاف کہہ دیں کہ تم مہتا کو انکار کا خط لکھ دو۔ چلو چھٹی ہوئی۔ میں تو لاگ ڈانٹ میں پھنس گیا، آپ کیوں پھنسیں؟"

کھنّا نے لمحہ بھر اس تجویز پر غور کر کے کہا "لیکن سوچیے تو کہ کتنا مشکل کام ہے۔ لیڈی ولسن سے اس کا ذکر آچکا ہوگا۔ سارے شہر میں خبر پھیل گئی ہوگی اور شاید آج

اخباروں میں بھی نکل جائے۔ یہ سب مالتی کی شرارت ہے۔ اُسی نے مجھے زِچ کرنے کا یہ ڈھنگ نکالا ہے۔"

"ہاں معلوم تو یہی ہوتا ہے۔"

"وہ مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہے۔"

"آپ بُنیاد رکھنے کے ایک روز قبل باہر چلے جائیے گا۔"

"مشکل ہے، رائے صاحب۔ کہیں مُنہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی۔ اس دن تو مجھے ہیضہ بھی ہو جائے تو وہاں جانا پڑے گا۔"

رائے صاحب آس باندھے ہوئے کل آنے کا وعدہ کر کے جیوں ہی باہر نکلے کہ کھنّا نے اندر جا کر گوبندی کو آڑے ہاتھوں لیا "تم نے اس ورزش گاہ کی بُنیاد رکھنا کیوں منظور کیا۔"

گوبندی کیسے کہے کہ یہ وقار پا کر وہ دل میں کتنا خوش ہو رہی تھی، اس موقع کے لئے کتنی توجہ سے اپنی تقریر لکھ رہی تھی اور ایک جوشیلی نظم بھی تیار کی تھی۔ اس نے دل میں سمجھا تھا کہ یہ تجویز منظور کر کے وہ کھنّا کو خوش کر دے گی۔ اس کی توقیر تو اس کے شوہر ہی کی توقیر ہے۔ کھنّا کو اس میں کوئی اعتراض ہو سکتا ہے، اس کا اُسے سان گمان بھی نہ تھا۔ اِدھر کئی دنوں سے شوہر کو کچھ مہربان دیکھ کر اُس کا حوصلہ بڑھنے لگا تھا۔ وہ اپنی تقریر سے اور اپنی نظم سے لوگوں کو محو بنا دینے کا خواب دیکھ رہی تھی۔

یہ سوال سُنا اور کھنّا کی صورت دیکھی تو اسکا دل دھڑک اُٹھا خطاوار کی طرح بولی "ڈاکٹر مہتا نے اصرار کیا تو میں نے منظور کر لیا۔"

"ڈاکٹر مہتا تمہیں کنوئیں میں گرنے کو کہیں تو شاید اتنی خوشی سے نہ تیار ہوگی۔"

گوبندی کی زبان بند!

"تمہیں جب ایشور نے عقل نہیں دی تو کیوں مجھ سے نہیں پوچھ لیا؟ مہتا اور مالتی دونوں یہ چال چل کر تجھ سے دو چار ہزار اینٹھنے کی فکر میں ہیں، اور میں نے ٹھان لی ہے کہ ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔ تم آج ہی مہتا کو انکار کا خط لکھ دو۔"

گوبندی نے ایک لمحہ سوچ کر کہا "تمہیں لکھ دو نا!"

"میں کیوں لکھوں؟ بات کی تم نے، اور لکھوں میں!"

"ڈاکٹر صاحب سبب پوچھیں گے تو کیا بتاؤں گی؟"

"بتانا اپنا سر اور کیا! میں اس عشرت گاہ کو ایک کوڑی بھی نہیں دینا چاہتا۔"

"تو تمہیں کچھ دینے کو کون کہتا ہے؟"

کھنا نے ہونٹ چبا کر کہا "کیسی بیوقوفوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ تم وہاں بُنیاد رکھو گی اور کچھ دو گی نہیں تو دُنیا کیا کہے گی؟"

گوبندی نے جیسے سنگین کی نوک پر کہا "اچھی بات ہے لکھ دوں گی۔"

"آج ہی لکھنا ہو گا۔"

"کہہ تو دیا لکھ دوں گی۔"

کھنا باہر آئے اور ڈاک دیکھنے لگے۔ اُنہیں دفتر جانے میں دیر ہو جاتی تھی تو چپراسی گھر ہی پر ڈاک دے جاتا تھا۔ شکر گراں ہو گئی ہے۔ کھنا کا چہرہ کھل اُٹھا۔ دوسرا خط کھولا۔ اکھ کا نرخ مقرر کرنے کیلئے جو کمیٹی بنی تھی اس نے طے کر دیا کہ ایسی بندش نہیں کی جا سکتی۔ وَھت تیری کی! وہ پہلے ہی یہی بات کہہ رہے تھے مگر اس اگنیہوتری نے غل مچا کر جبراً کمیٹی بنائی۔ آخر نتیجہ کے منہ پر تھپڑ لگا۔ یہ مل والوں اور کسانوں کے درمیان کا معاملہ ہے، سرکار اس میں دخل دینے والی کون؟

دفعتاً مس مالتی موٹر سے اُتری، کنول کی طرح شگفتہ، چراغ کی طرح روشن، زندہ دلی، اور خوشی کی مورت سی، بے خوف، بے فکر، گویا اُسے یقین ہے کہ دُنیا میں اس کیلئے عزت و راحت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ کھنّا نے برآمدے میں آکر خیر مقدم کیا۔

مالتی نے پوچھا "کیا یہاں مہتا آئے تھے؟"

"ہاں آئے تو تھے۔"

"کچھ کہا، کہاں جا رہے ہیں؟"

"یہ تو کچھ نہیں کہا۔"

"جانے کہاں غوطہ لگا گئے۔ میں چاروں طرف گھوم آئی۔ آپ نے ورزش گاہ کے لیئے کتنا دیا؟"

"کھنّا نے خطاوارانہ کہا "میں نے ابھی اس معاملے کو سمجھا ہی نہیں۔"

"مالتی نے بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف تیز تیز دیکھا گویا سوچ رہی تھی کہ اُن پر رحم کرے یا غصہ۔ بولی "اس میں سمجھنے کی کیا بات تھی؟ اور سمجھ لیتے تو آگے پیچھے، اس وقت تو کچھ دینے کی بات تھی۔ میں نے مہتا کو جبراً یہاں بھیجا، بیچارے ڈر رہے تھے کہ آپ نہ جانے کیا جواب دیں۔ آپ کے اس بخل کا کیا نتیجہ ہوگا۔ آپ جانتے ہیں؟ یہاں کی تجارت پیشہ جماعت سے کچھ نہ ملے گا۔ آپ نے شاید مجھے ذلیل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ سب کی رائے تھی کہ لیڈی ولسن بنیادی پتھر رکھیں۔ میں نے گوبندی دیوی کی جانبداری کی اور لڑ کر سب کو راضی کیا۔ اب آپ فرماتے ہیں کہ آپ نے اس معاملے کو سمجھا ہی نہیں! آپ بنک کی پیچیدگیاں سمجھتے ہیں مگر اتنی موٹی بات آپ کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آپ مجھے شرمندہ کرنا چاہتے ہیں۔ اچھی بات ہے، یہی سہی!"

مالتی کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ کھنّا گھبرا گئے۔ ساری اکڑ جاتی رہی مگر اس کے ساتھ اُنھیں یہ بھی معلوم ہُوا کہ اگر وہ کانٹوں میں اُلجھ گئے ہیں تو مالتی دَلدَل میں پھنس گئی، اگر ان کی تھیلیوں پر سنکٹ آپڑا ہے تو مالتی کی عزت پر، جو تھیلیوں سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ تب ان کا دل مالتی کی اس دُرگت پر کیوں نہ خوش ہو؟ اُنھوں نے مالتی کو اَدَب میں ڈال دیا تھا۔ اور اگرچہ وہ اُسے ناراض کر دینے کی ہمّت کھو چکے تھے۔ مگر دو چار کھری باتیں کہہ سُنانے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتے تھے۔ یہ بھی دکھا دینا چاہتے تھے کہ میں بالکل احمق نہیں ہوں۔ اس کا راستہ روک کر بولے "تم مجھ پر اتنی مہربان ہو گئی ہو اس پر مجھے حیرت ہو رہی ہے، مالتی!"

مالتی نے ابروؤں کو سُکیڑ کر کہا "میں اس کا مطلب نہیں سمجھی"۔

"کیا اب میرے ساتھ تمہارا وہی برتاؤ ہے جو کچھ دنوں پہلے تھا"

"میں تو اس میں کوئی فرق نہیں دیکھتی"۔

"لیکن میں تو زمین آسمان کا فرق دیکھ رہا ہوں"۔

"اچھا مان لو کہ تمہارا قیاس ٹھیک ہے تو پھر؟ میں تم سے ایک نیک کام میں مدد مانگنے آئی ہوں۔ اپنے سلوک کی آزمائش کے لئے نہیں اور اگر تم سمجھتے ہو کہ کچھ چندہ دے کر تم نیک نامی اور شکریے کے سوا کچھ اور پا سکتے ہو تو یہ تمہاری خام خیالی ہے"۔

کھنّا ہار گئے۔ وہ ایسے تنگ گوشے میں پھنس گئے تھے۔ جہاں اِدھر اُدھر ہلنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ کیا وہ اس سے یہ کہنے کی جُرأت رکھتے ہیں کہ میں نے اب تک تمہارے اوپر ہزاروں روپے لُٹا دیئے تو کیا اس کا یہی صلہ ہے؟ شرم سے اُن کا مُنہ ذرا سا نکل آیا جیسے سکڑ گیا ہو۔ جھینپتے ہوئے بولے "میرا مطلب یہ نہ تھا، مالتی! تم بالکل غلط سمجھیں"۔

مالتی نے ہنستے ہوئے کہا: "خدا کرے میں نے غلط سمجھا ہو۔ کیونکہ اگر میں اسے سچ سمجھوں گی تو تمہارے سائے سے بھی بھاگوں گی۔ میں خوبصورت ہوں تم بھی میرے بہت سے چاہنے والوں میں ایک ہو۔ میری مہربانی تھی کہ جہاں میں اوروں کے تحفے لوٹا دیتی تھی وہاں تمہاری معمولی سے معمولی چیزیں بھی شکریے کے ساتھ قبول کر لیتی تھی، اور ضرورت پڑنے پر تم سے روپئے بھی مانگ لیتی تھی۔ اگر تم نے اپنے روپئے کے نشے میں اس کا کوئی دوسرا مطلب نکال لیا تو میں تمہیں معاف کر دوں گی، یہ مردوں کی سرشت ہے اور تم اس سے مستثنیٰ نہیں ہو۔ مگر یہ سمجھ لو کہ روپئے نے آج تک کسی عورت کے دل پر فتح نہیں پائی اور نہ کبھی پائے گا۔"

کھنّا ایک ایک لفظ پر گویا گز گز نیچے دھنستے جا رہے تھے، اب اور زیادہ چوٹ سہنے کی اُن میں سکت نہ رہی۔ شرمندہ ہو کر بولے "مالتی میں تمہارے پیروں پڑتا ہوں، اب اور ذلیل نہ کرو۔ اور نہ سہی تو دوستانہ برتاؤ تو قائم رہنے دو۔"

یہ کہتے ہوئے انھوں نے دراز سے چیکوں کی کتاب نکالی اور ایک ہزار کا چیک لکھ کر ڈرتے ڈرتے مالتی کی طرف بڑھا دیا۔

مالتی نے چیک لے کر بے دردانہ طنز سے کہا "یہ میرے سلوک کی قیمت ہے یا ورزش گاہ کا چندہ ہے؟"

کھنّا آبدیدہ ہو کر بولے "اب میری جان بخشو، مالتی! کیوں میرے منہ میں کالکھ لگا رہی ہو!"

مالتی نے زور کا قہقہہ لگایا "دیکھا، ڈانٹ بھی بتائی اور ایک ہزار روپیے بھی وصول کیے! اب تم کبھی شرارت نہ کرو گے؟"

"کبھی نہیں، جیتے جی کبھی نہیں!"

"کان پکڑو!"

"کان پکڑتا ہوں۔ مگر اب تم مجھ پر رحم کر کے چلی جاؤ اور مجھے تخلیے میں بیٹھ کر سوچنے اور رونے دو۔ تم نے آج میری زندگی کی ساری خوشی۔۔۔۔"

مالتی اور زور سے ہنسی۔ "دیکھو کھنّا، تم میری بڑی توہین کر رہے ہو اور تم جانتے ہو کہ حسن توہین نہیں سہہ سکتا۔ میں نے تو تمہارے ساتھ نیکی کی اور تم اسے بدی سمجھ رہے ہو۔"

کھنّا احتجاج کی نگاہوں سے دیکھ کر بولے "تم نے میرے ساتھ نیکی کی ہے یا اُلٹی چھری سے میرا گلا کاٹا ہے؟"

"کیوں؟ میں تمہیں لوٹ لوٹ کر اپنا گھر بھر رہی تھی۔ تم اس لوٹ سے بچ گئے۔"

"کیوں زخم پر نمک چھڑک رہی ہو مالتی؟ میں بھی آدمی ہوں۔"

لتی نے اس طرح کھنّا کی طرف دیکھا، گویا یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہ آدمی ہیں یا نہیں؟ بولی "ابھی تو مجھے اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔"

"تم بالکل معمّا ہو، آج یہ ثابت ہو گیا۔"

"ہاں تمہارے لیے معمّا ہوں، اور معمّا ہی رہوں گی۔"

یہ کہتی ہوئی وہ چڑیا کی طرح ایک دم اڑ گئی اور کھنّا سر پر ہاتھ دھر کر سوچنے لگے کہ یہ صرف دکھاوا ہے یا اس کا سچّا روپ!

(۲۳)

گوبر اور جھنیا کے چلے جانے پر گھر سُنسان رہنے لگا۔ دھنیا کو بار بار مُنّو کی یاد آتی رہتی ہے۔ بچے کی ماں تو جھنیا تھی مگر اس کی پرورش دھنیا ہی کرتی تھی۔ وہی اسے اُبٹن ملتی، کاجل لگاتی، سُلاتی اور جب کام کاج سے فرصت ملتی تو پیار کرتی۔

محبت کا یہ نشہ ہی اس کی تکلیفوں کو بھلاتا رہتا تھا۔ اُسی کا بھولا بھالا مکھن سا چہرہ دیکھ کر وہ اپنی ساری فکر بھول جاتی اور محبت بھرے گھمنڈ سے اس کا دل پھول اٹھتا۔ وہ زندگی کا سہارا اب نہ تھا۔ اُس کا سونا کھٹولا دیکھ کر وہ رو اٹھتی۔ وہ تعویذ جو تمام پریشانیوں اور نا امیدیوں سے اُسے بچاتا تھا، اُس سے چھن گیا تھا۔ وہ بار بار سوچتی کہ اُس نے جھنیا کے ساتھ ایسی کون سی بُرائی کی تھی جس کی اس نے یہ سزا دی۔ ڈائن نے آکر اس کا سونے کا سا گھر مٹی میں ملا دیا۔ گوبر نے تو کبھی اس کی بات کا جواب بھی نہ دیا تھا۔ اسی رانڈ نے اسے پھوڑا اور اب وہاں لے جاکر نہ جانے کون کون سا ناچ نچائے گی۔ یہیں وہ بچے کی کون بہت پرواہ کرتی تھی۔ اُسے تو اپنے مسی کاجل اور مانگ چوٹی ہی سے فرصت نہ ملتی تھی، بچے کی دیکھ بھال کیا کرے گی؟ بیچارا اکیلا دھرتی پر پڑا روتا ہوگا۔ بیچارا ایک دن بھی تو سکھ سے نہیں رہنے پاتا۔ کبھی کھانسی، کبھی دست، کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ یہ سوچ سوچ کر اُسے جھنیا پر غصہ آتا۔ گوبر کے لئے اب بھی اُس کے دل میں وہی ممتا تھی۔ اِس چڑیل نے اُسے کچھ کھلا پلا کر اپنے بس میں کر لیا۔ ایسی جادو ٹونا جاننے والی نہ ہوتی تو یہ ٹونا ہی کیسے کرتی؟ کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ بھوجائیوں کی لاتیں کھاتی تھی۔ یہ بُدھو مل گیا تو آج رانی ہو گئی۔

ہوری نے چڑھ کر کہا "جب دیکھو تب جھنیا ہی کو دوکھ دیتی رہتی ہے۔ یہ نہیں سمجھتی کہ اپنا سونا کھوٹا تو سنار کا کیا دوکھ؟ گوبر اُسے نہ لے جاتا تو کیا آپ سے آپ چلی جاتی؟ شہر کا دانہ پانی لگنے سے لونڈے کی آنکھ بدل گئی۔ ایسا کیوں نہیں سمجھ لیتی!"

دھنیا گرج اُٹھی "اچھا چپ رہو۔ تم ہی نے رانڈ کو سر پہ چڑھا رکھا تھا۔ نہیں میں پہلے ہی دن جھاڑو مار کر نکال دیتی!"

کھلیان میں لٹا ہوا اناج جمع ہو گیا تھا۔ ہوری بیلوں کو لئے اُسے مانڈنے جا رہا تھا۔ مُنہ پھیر کر بولا "مان لے کہ بھولے نے گوبر کو چھوڑ ہی لیا تو تو اتنا کُڑھتی کیوں ہے؟ جو ساری دُنیا کرتی ہے وہی گوبر نے بھی کیا۔ اب اس کے بال بچے ہوئے، تو میرے بال بچوں کے لئے کیوں اپنی جان آفت میں ڈالے؟ کیوں ہمارے سر کا بوجھ اپنے سر پر اُٹھائے؟"

"تمھیں مارے بکھیڑے کی جڑ ہو!"

"تو مجھے نکال دے۔ لے جا بیلوں کو، اناج مانڈ۔ میں حُقہ پیتا ہوں!"

"تم چل کر چکی پیسو میں اناج مانڈوں!"

مذاق میں غم دور ہو گیا۔ یہی اس کی دوا ہے۔ دھنیا خوش ہو کر رو پا کے بال گوندھنے بیٹھ گئی جو بالکل اُلجھ کر رہ گئے تھے اور ہوری کھلیان چلا۔ کیف آفریں بسنت نکہت، فرحت اور جاں بخشی کا سرمایہ لُٹا رہی تھی دونوں ہاتھوں سے دل کھول کر۔ کوئل آم کی ڈالیوں میں چھُپی اپنی رسیلی، میٹھی اور دل پر اثر ڈالنے والی آواز سے سوئی ہوئی امیدوں کو جگاتی پھر رہی تھی۔ مہوے کی ڈالیوں پر مینوں کی برات سی سجی بیٹھی تھی۔ نیم اور سیرسا اور کروندے اپنی خوشبو میں نشہ سا گھول رہے تھے۔ ہوری آموں کے باغ میں پہنچا تو پیڑوں کے نیچے تارے کھلے تھے۔ اس کا رنج و مایوسی سے بھرا ہوا دل بھی اس عالمگیر رونق اور رنگینی میں جیسے ڈوب سا گیا۔ وہ ترنگ میں آ کر گانے لگا:-

"جیا جرت رہت دن رین
آم کی ڈریا کوئل بولے تنک نہ آوت چین"

سامنے سے دُلاری گلابی ساڑی پہنے چلی آ رہی تھی۔ پاؤں میں موٹے نقرئی کڑے گلے میں موٹی طلائی ہنسلی۔ چہرہ خشک، مگر دل میں تازگی۔ ایک وقت تھا

جب ہوری کھیت کھلیان میں اُسے چھیڑا کرتا تھا۔ وہ بھابی تھی، اور ہوری دیور تھا۔ اس ناتے سے دونوں میں مذاق ہوتا رہتا تھا۔ جب سیٹھ جی مر گئے دُلاری نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ سارے دن دکان پر بیٹھی رہتی اور وہیں سے سارے گاؤں کی خبر لیتی رہتی تھی۔ کہیں آپس میں جھگڑا ہو جائے، تو سیٹھانی وہاں بیچ بچاؤ کرنے کے لئے ضرور پہنچے گی۔ ایک آنہ روپیہ سود سے کم پر قرض نہ دیتی تھی اور اگرچہ سود کے لالچ میں اصل بھی ہاتھ نہ آتا تھا مگر اُس کے سود کی شرح جیوں کی تیوں بنی ہوئی تھی۔ بیچاری کیسے وصول کرے؟ نالش فریاد کرنے سے رہی، تھانہ پولیس کرنے سے رہی، صرف زبان کا زور تھا! مگر جیوں جیوں عمر کے ساتھ زبان کی تیزی بڑھتی جاتی تھی، تیوں تیوں اُس کی کاٹ گھٹتی جاتی تھی۔ اب اس کی گالی پر لوگ ہنس دیتے تھے اور مذاق میں کہتے "کیا کرے گی، روپئے لے کر کا کی؟ ساتھ تو ایک کوڑی بھی نہ لے جائیگی۔ غریبوں کو کھلا پلا کر جتنی اسیس مل سکے، لے لے۔ یہی پرلوک میں کام آئے گا" اور دُلاری پرلوک کے نام سے جلتی تھی۔

ہوری نے چھیڑا "آج تو بھابی تم سچ مچ جوان لگتی ہو"۔

سیٹھانی مگن ہو کر بولی "آج منگل کا دن ہے، ڈیٹھ نہ لگا دینا۔ اسی سے میں کچھ پہنتی اوڑھتی نہیں۔ گھر سے نکلو تو سبھی گھورنے لگتے ہیں، جیسے کبھی کوئی مہریا دیکھی ہی نہ ہو۔ پنڈت شوری لالا کی پرانی بان ابھی تک نہیں چھوٹی"۔

ہوری رُک گیا۔ بڑی دلکش بحث چھڑ گئی تھی، بیل آگے نکل گئے تھے بولا "وہ تو آج کل بڑے بھگت ہو گئے ہیں!"

"دیکھتی نہیں ہو کہ ہر پورنما کو ست نرائن کی کتھا سنتے ہیں اور دونوں جون مندر میں درشن کرنے جاتے ہیں"۔

"ایسے بدچلن جتنے ہوتے ہیں، وہ سبھی بوڑھے ہو کر بھگت بن جاتے ہیں، مگر

کا پہلا سہت تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ پوچھو، میں اب بڑھیا ہوئی، مجھ سے ہنسی کیسی؟"

"تم ابھی بڑھیا کیسے ہو گئیں، بھابی؟ مجھے تو اب بھی ......"

"اچھا چپ ہی رہنا، نہیں تو ڈیڑھ سو گالی دوں گی۔ لڑکا پردیس کمانے لگا اور ایک دن نیوتا بھی نہ کھلایا، سینت میت میں بھابی بنانے کو تیار!"

"مجھ سے سوگند لے لو بھابی، جو میں نے اُس کی کمائی کا ایک پیسہ بھی چھوا ہو۔ نہ جانے کیا لایا، کہاں اُٹھایا۔ مجھے کچھ بھی پتہ نہیں۔ بس ایک جوڑا دھوتی اور ایک منڈاسا میرے ہاتھ لگا!"

"اچھا کمانے تو لگا، آج نہیں تو کل گھر سنبھالے ہی گا۔ بھگوان اُسے سُکھی رکھیں۔ ہمارے روپئے بھی تھوڑا تھوڑا دیتے چلو، سود ہی تو بڑھ رہا ہے!"

"تمہاری ایک ایک پائی دوں گا بھابی، ہاتھ میں پیسے آنے دو، اور کھا ہی جائیں گے تو کوئی باہر کے تو نہیں ہیں، ابھی تو تمہارے ہی!"

سیٹھانی ایسی لماقیہ خوشامد سے نہتی سی ہو جاتی تھی، مسکراتی ہوئی اپنی راہ چلی گئی۔ ہوری لپک کر بیلوں کے پاس پہنچ گیا اور اناج ماندنے لگا۔ سارے گاؤں کا یہی ایک کھلیان تھا۔ کہیں اناج مانڈا جا رہا تھا، کہیں اُسایا جا رہا تھا اور کوئی تول رہا تھا۔ نائی باری، بڑھئی، لوہار، پروہت، بھاٹ، بھکاری سبھی اپنے "جیورے" لینے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ ایک برگد کے نیچے جھنگری سنگھ کھاٹ پر بیٹھے اپنی "سُدائی" وصول کر رہے تھے۔ کئی بنئے کھڑے ہوئے اناج کا مول تول کر رہے تھے۔ سارے کھلیان میں منڈی کی سی رونق تھی۔ ایک کھٹکن بیر اور مکوے بیچ رہی تھی اور ایک خوانچہ والا تیل کا سیو اور جلیبیاں لئے گھوم رہا تھا۔ پنڈت داتادین بھی ہوری سے اناج تلوانے کے لئے آ پہنچے تھے اور جھنگری سنگھ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

داتادین نے تمباکو ملتے ہوئے کہا "کچھ سنا، سرکار بھی مہاجنوں سے کہہ رہی ہے کہ بیاج کی در گھٹا دو، نہیں ڈگری نہ ملے گی۔"

جھنگری ہی تمباکو پھانک کر بولے "پنڈت، میں تو ایک بات جانتا ہوں۔ تمہیں گرج پڑے گی تو سو بار ہم سے روپے ادھار لینے آؤ گے اور ہم جو بیاج چاہیں گے، لیں گے۔ سرکار اگر اسامیوں کو روپے ادھار دینے کا کوئی بندوبست کرتی تو ہمیں اس کانون سے کچھ نہ ہوگا۔ ہم در کم لکھا دیں گے، مگر سیکڑے میں پچیس پہلے ہی کاٹ لیں گے۔ اس میں سرکار کیا کر سکتی ہے؟"

"یہ تو ٹھیک ہے، پر سرکار بھی ان باتوں کو خوب سمجھتی ہے۔ وہ اس کی بھی کوئی روک نکالے گی، دیکھ لینا۔"

"اس کی روک ہو ہی نہیں سکتی۔"

"اچھا، اگر وہ کہہ دے کہ جب تک اسٹامپ پر گاؤں کے مکھیا یا کارندے کی گواہی نہ ہو، وہ پکا نہ ہوگا۔ تب کیا کرو گے؟"

"اسامی کو سو بار گرج ہوگی تو مکھیا کو ہاتھ پاؤں جوڑ کے لاوے گا اور گواہی کرا دے گا۔ ہم تو ایک چوتھائی کاٹ ہی لیں گے۔"

"اور جو پھنس جاؤ؟ جعلی حساب لکھا اور گئے چودہ سال کو۔"

جھنگری سنگھ زور سے ہنسے "تم کیا کہتے ہو پنڈت؟ کیا تب سنسار بدل جائے گا؟ کانون اور نیاؤ اس کا ہے جس کے پاس پیسہ ہے۔ کانون تو ہے کہ مہاجن کسی اسامی سے کڑائی نہ کرے، کوئی جمیندار کسی کاشتکار کے ساتھ کڑائی نہ کرے، پر ہوتا کیا ہے، یہ تو نت ہی دیکھتے ہو۔ جمیندار مشکیں بندھوا کر پٹواتا ہے اور مہاجن لات جوتے سے بات کرتا ہے۔ ہاں جو کسان ہے اس سے نہ جمیندار بولتا ہے نہ مہاجن۔ ایسے کسانوں سے ہم مل جاتے ہیں۔ اور ان کی مدد سے دوسروں

کی گردن دباتے ہیں۔ تمہارے ہی اوپدھائے صاحب کے پانچ سو روپئے نکلتے ہیں، پھر تو مجھے رام میں ہے اتنی ہمت کہ تم سے کچھ بولیں؟ وہ جانتے ہیں کہ تم سے میل ہی کرنے میں ان کی بھلائی ہے، کس اسامی میں اتنا بوتا ہے کہ نت عدالت دوڑے؟ سب کاروبار اسی طرح چلا جائے گا۔ جیسے چل رہا ہے۔ کچہری، عدالت اُسی کے ساتھ ہے۔ جس کے پاس پیسہ ہے۔ ہم لوگوں کے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے کھلیان کا ایک چکر لگایا اور پھر آکر کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے بولے "ہاں، متئی کے بیاہ کا کیا ہوا؟ ہماری صلاح تو یہ ہے کہ اس کا بیاہ کر ڈالو۔ اب تو بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔"

داتا دین کو جیسے بھڑ نے کاٹ کھایا۔ اس کہنے کا کیا مطلب تھا، وہ خوب سمجھتے تھے۔ گرم ہو کر بولے "بیٹھے بیٹھے آدمی جو چاہے بکے، ہمارے منہ پر کوئی کچھ کہے تو اس کی مونچھیں اُکھاڑ لوں۔ کوئی ہماری طرح نیمی بن تو لے۔ کتنوں کو جانتا ہوں جو کبھی سندھیا پوجا نہیں کرتے۔ نہ انھیں دھرم سے مطلب، نہ کرم سے۔ نہ کتھا سے مطلب نہ پران سے۔ وہ بھی اپنے کو براہمن کہتے ہیں۔ ہمارے اوپر کیا ہنسے گا کوئی، جس نے اپنی عمر میں ایکادسی کبھی نہیں چھوڑی، کبھی بنا اسنان دھیان کیے منہ میں پانی نہیں ڈالا۔ نیم کا نباہنا کٹھن ہے۔ کہ بتا دے کہ ہم نے ہاٹ کی کوئی چیز کھائی ہو یا کسی دوسرے کے ہاتھ کا پانی پیا ہو، تو اس کی ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔ سلیا ہماری چوکھٹ نہیں نانگھنے پاتی، برتن بھانڈے چھونا تو بڑی بات ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ متئی کوئی بہت اچھا کام کر رہا ہے، پر جب ایک بار ایک بات ہو گئی تو یہ دھرم کا کام ہے کہ عورت کو چھوڑ دے، میں تو کھلم کھلا کہتا ہوں، اس میں چھپانے کی کوئی بات نہیں۔ استری جات پوتر ہے۔"

داتا دین خود اپنی جوانی میں بڑے عیاش رہ چکے تھے مگر اپنے "نیم دھرم" سے

کبھی نہیں چوکے۔ داتا دین بھی لائق لڑکے کی طرح اُن ہی کے نقشِ قدم پہ چل رہا تھا۔ دھرم کا اصلی جُزو ہے پوجا پاٹ، کتھا برت اور چَوکا چولھا، جب باپ بیٹے دونوں ہی اصلیت کو پکڑے ہوئے ہیں، تو کس کی مجال ہے کہ اُنہیں ادھرمی کہہ سکے؟"

جھنگری سنگھ نے قائل ہو کر کہا "میں نے تو جو سُنا تھا، وہ تم سے کہہ دیا؟"

داتا دین نے مہابھارت اور پرانوں سے اُن برہمنوں کی ایک لمبی فہرست پیش کر دی، جنہوں نے دوسری ذات کی لڑکیوں سے تعلق پیدا کر لیا تھا، اور ساتھ ہی یہ ثابت کر دیا کہ اُن سے جو اولاد ہوئی وہ برہمن کہلائی اور آج کل کے جو براہمن ہیں وہ اسی اولاد کی اولاد ہیں۔ یہ رواج شروع ہی سے چلا آ رہا ہے اور اس میں کوئی شرم کی بات نہیں۔

جھنگری سنگھ نے اُن کی قابلیت پہ خوش ہو کر کہا "تب کیوں آج کل لوگ باجپئی اور شکل بنے پھرتے ہیں؟"

"سمے سمے کا رواج ہے اور کیا؟ کسی میں اتنا تیج تو ہو۔ بس کھا کر اُسے پچانا تو چاہیے۔ وہ ست جُگ کی بات تھی، ست جُگ کے ساتھ گئی۔ اب تو اپنا بیاہ برادری کے ساتھ مل کر رہنے میں ہے۔ مگر کیوں کیا، کوئی لڑکی والا آتا ہی نہیں تم سے بھی کہا اُن سے بھی کہا، پر جب کوئی نہیں سُنتا تو کیا میں لڑکی بناؤں؟"

جھنگری سنگھ نے ڈانٹا "جھوٹ مت بولو پنڈت! میں دو آدمیوں کو پھانس کر لایا، پر تم منہ پھیلانے لگے تو دونوں کان کھڑے کر کے نکل بھاگے۔ آخر کس برتے پہ ہزار پانچ سو مانگتے ہو تم؟ دس بیگھے اور بھیک کے سوا تمہارے پاس اور کیا ہے؟"

داتا دین کے گھمنڈ کی چوٹ لگی۔ داڑھی پہ ہاتھ پھیر کر بولے "میرے پاس کچھ نہ سہی، میں ہی بھیک مانگتا ہوں پر میں نے اپنی لڑکیوں کے بیاہ میں پانچ

پانچ سو دیئے ہیں۔ پھر لڑکے کے لئے پانچ سو کیوں نہ مانگتا؟ کسی نے سینت میں میری لڑکی بیاہ لی ہوتی تو میں بھی سینت میں اپنا لڑکا بیاہ لیتا۔ رہی حیثیت کی بات، سو تم ججمانی کو بھیک سمجھو، پر میں تو اسے جمینداری سمجھتا ہوں، بنک گھر! جمینداری مٹ جائے، بنک گھر ٹوٹ جائے، پر ججمانی تو اننت تک بنی رہے گی۔ جب تک ہندو جات رہے گی تب تک باہمن بھی رہیں گے اور ججمانی بھی رہے گی۔ سہاگ میں آرام سے گھر بیٹھے سو دو سو پھٹکار لیتے ہیں۔ کبھی بھاگ لڑ گیا تو چار پانچ سو مار لئے۔ کپڑے، برتن، کھانا اوپر سے کہیں نہ کہیں نت ہی کام بنا رہتا ہے۔ کچھ نہ ملے تب بھی ایک دو تھال اور دو چار آنے دچھنا کے مل جاتے ہیں۔ ایسا چین نہ جمینداری ہی میں ہے نہ مہاجنی میں۔ اور پھر میرا تو سلیا سے جتنا کام نکلتا ہے اتنا باہمن کی کنیا سے کیا ہوگا۔ وہ تو بہو بنی بیٹھی رہے گی۔ بہت ہوگا تو روٹی بنا دے گی۔ یہاں سلیا اکیلی تین آدمیوں کا کام کرتی ہے اور میں اسے روٹی کے سوا اور کیا دیتا ہوں؟ بہت ہوا تو سال میں ایک دھوتی دے دی!"

دوسرے پیڑ کے نیچے داتا دین کا نجی "پیرا" تھا۔ چار بیلوں سے منڈائی ہو رہی تھی۔ دھنّا چاروں بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ سلیا پیرے سے اناج نکال نکال کر اسارہی تھی اور ماتا دین دوسری طرف بیٹھا ہوا اپنی لاٹھی پر تیل مل رہا تھا۔

سلیا سانولی، سلونی اور چھریری لڑکی تھی جو شکیل نہ ہونے پر بھی دلکش تھی۔ اس کی ہنسی میں، چتون میں، اس کی حرکتوں میں مسرت کا جنون تھا جس سے اس کا عضو عضو ناچتا رہتا تھا۔ سر سے پیر تک بھس کے ذروں سے آلودہ، پسینے سے تر سر کے بال آدھے کھلے، دوڑ دوڑ کر اناج اسارہی تھی، گویا دل وجان سے کسی کھیل میں مصروف تھی۔

ماتا دین نے کہا "آج سانجھ تک اناج باقی نہ رہے۔ سلیا تو تھک گئی ہو تو

میں آؤں۔"

سیلیا خوش ہو کر بولی "تم کاہے کو آؤ گے پنڈت، میں سانجھ تک سب اُسا ڈالوں گی۔"

"اچھا تو میں اناج ڈھو ڈھو کر رکھ آؤں، تو اکیلی کیا کیا کر لے گی؟"

"تو تم گھبراتے کیوں ہو؟ میں اُسا بھی دوں گی اور ڈھو کر رکھ بھی آؤں گی۔ پہر رات تک یہاں ایک دانہ بھی نہ رہے گا۔"

دُلاری آج اپنی باقی وصول کر رہی تھی۔ سیلیا اس کی دوکان سے ہولی کے دن دو پیسے کا گلابی رنگ لائی تھی اور ابھی تک پیسے نہیں دیئے تھے۔ وہ سیلیا کے پاس جا کر بولی "کیوں ری سیلیا، مہینہ بھر رنگ لائے ہو گیا اور ابھی تک پیسے نہیں دیئے۔ مانگتی ہوں تو مٹک کر چلی جاتی ہے۔ آج میں بنا پیسے لئے نہ جاؤں گی۔"

ماتا دین چپکے سے کھسک گیا۔ سیلیا کا سب کچھ لے کر بھی وہ بدلے میں کچھ نہ دینا چاہتا تھا۔ سیلیا اب اس کی نگاہ میں صرف کام کرنے کی مشین تھی اور بس۔ اسکی محبت کو وہ بڑی چالاکی سے بچاتا رہتا تھا۔

سیلیا نے آنکھ اٹھا کر دیکھا ماتا دین وہاں نہ تھا۔ بولی "چلاؤ مت سیٹھانی۔ پیسے دو کی جگہ چار پیسے کا اناج لے لو۔ اب کیا جان لو گی؟ میں مری تھوڑے ہی جاتی تھی۔"

اُس نے اندازہ سے کوئی سیر بھر اناج ڈھیر میں سے نکال کر سیٹھانی کے پھیلے ہوئے آنچل میں ڈال دیا۔ اُسی وقت ماتا دین پیڑ کی آڑ سے جھلایا ہوا نکلا اور دُلاری کا آنچل پکڑ کر بولا "اناج سیدھے سے رکھ دو سیٹھانی، لوٹ نہیں ہے۔"

پھر اُسنے سُرخ سُرخ آنکھوں سے سِلیا کو دیکھ کر ڈانٹا "تونے اَناج کیوں دیا؟ کس سے پوچھ کر دیا؟ تو کون ہوتی ہے میرا اَناج دینے والی؟"

سیٹھانی نے اَناج ڈھیر میں ڈال دیا اور سِلیا متحیر ہو کر ماتا دین کا مُنہ تاکنے لگی۔ ایسا معلوم ہوُا کہ جس ڈال پر وہ بے فکری سے بیٹھی ہوئی تھی وہ ٹوٹ گئی ہے اور اب وہ بلا سہارے کے نیچے گِری جارہی ہے۔ کھسیلئے ہوئے مُنہ سے آنسو بھر کر رُلاری سے بولی "تمہارے پیسے میں بھر دوں گی، سیٹھانی جی! آج مجھ پر دیا کرو!"

سیٹھانی نے اُسے رحم کی نگاہوں سے دیکھا اور ماتا دین کو ملامت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ تب سِلیا نے اَناج اُٹھاتے ہوئے چوٹ کھاتے ہوئے گھمنڈ سے پوچھا "تمہاری چیج پر میرا کچھ اَختیار نہیں ہے؟"

ماتا دین آنکھیں نکال کر بولا "نہیں، تیرا کوئی اَختیار نہیں ہے، کام کرتی ہے کھاتی ہے جو تو چاہے کھا بھی اور لُٹا بھی تو یہ نہ ہوگا۔ اگر تجھے یہاں پرتہ نہ پڑتا ہو تو کہیں اور جا کر کام کر۔ مجھ روں کی کمی نہیں ہے۔ سینت میں کام نہیں لیتے، کھانا کپڑا دیتے ہیں!"

سِلیا نے اُس چِڑیا کی طرح جسے مالک نے پر کاٹ کر پنجرے سے نکال دیا ہو، ماتا دین کی طرف دیکھا۔ اس کی چتون میں درد زیادہ تھا یا غصہ، یہ کہنا مشکل ہے۔ مگر اُسی چڑیا کی طرح اُس کا دل پھڑ پھڑا رہا تھا اور اونچی ڈال پر اس آزاد فضا میں، اُڑنے کی سکت نہ پاکر اُسی پنجرے میں جا بیٹھنا چاہتی تھی، خواہ اُسے بے آب و دانہ رہ کر پنجرے کی تیلیوں سے سر ٹکراتے ہوئے مر ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ سِلیا سوچ رہی تھی کہ اب اس کے لئے دوسری کون سی جگہ ہے۔ وہ بیاہتا نہ ہو کر بھی فطرتاً اور عملاً بیاہتا تھی اور اب ماتا دین چاہے اسے مارے یا کاٹے اُسے دوسرا

سہارا نہیں ہے۔ اُسے وہ دن یاد آئے اور ابھی دو سال بھی تو نہیں ہوئے، جب یہی ماتا دین اس کے تلوے چاٹتا تھا۔ جب اس نے جنیؤ ہاتھ میں لے کر کہا تھا "سِلیا! جب تک دم میں دم ہے۔ تجھے بیاہتا کی طرح رکھوں گا" جب وہ بے قرار ہو کر جنگل اور باغ میں اور ندی کے کنارے اس کے پیچھے پیچھے دیوانوں کی طرح پھرا کرتا تھا اور آج اس کا یہ بے دردانہ سلوک! مٹھی بھر اناج کے لئے اُس کا پانی اُتار لیا!

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ حلق میں نمک کی ایک ڈلی سی محسوس کرتی ہوئی زخمی دل اور شکستہ ہاتھوں سے پھر کام کرنے لگی۔

اسی وقت اُس کے ماں باپ، دونوں بھائی اور چماروں نے نہ جانے کدھر سے آکر ماتا دین کو گھیر لیا۔ سِلیا کی ماں نے آتے ہی اس کے ہاتھ سے اناج کی ٹوکری چھین کر پھینک دی اور گالی دے کر بولی "رانڈ جب تجھے مجوری ہی کرنی تھی تو گھر کی مجوری چھوڑ کر یہاں کیوں مرنے آئی؟ جب باہمن کے ساتھ رہنی ہے تو باہمن کی طرح رہ۔ ساری برادری کی ناک کٹوا کر بھی چمارن بننا تھا تو یہاں کیا گھی کا لوندا لینے آئی تھی؟ چلّو بھر پانی میں ڈوب نہیں مرتی۔"

جھنگری سنگھ اور ماتا دین دونوں دوڑے اور چماروں کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر اُنھیں مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جھنگری نے سِلیا کے باپ سے پوچھا۔ "کیا بات ہے چودھری؟ کس بات کا جھگڑا ہے؟"

سِلیا کا باپ ہرکھو ساٹھ سال کا بوڑھا تھا، کالا، دُبلا اور سوکھی مرچ کی طرح چپکا ہوا۔ مگر اتنا ہی تلخ و تیز! بولا "جھگڑا کچھ نہیں ہے ٹھاکر، ہم آج یا تو ماتا دین کو چمار بنا کر چھوڑیں گے یا اُن کا اور اپنا رَکت ایک کر دیں گے۔ سِلیا کنیا جات ہے، کسی نہ کسی کے گھر تو جائے گی ہی، اس پر ہمیں کچھ نہیں کہنا۔ پر اُسے جو

کوئی بھی پوچھے وہ ہمارا ہو کر رہے۔ تم ہمیں بامھن نہیں بنا سکتے مگر ہم تمہیں چمار بنا سکتے ہیں۔ ہمیں بامھن بنا دو، ہماری ساری برادری بننے کو تیار ہے۔ جب یہ سامرتھ نہیں تو تم بھی چمار بنو، ہمارے ساتھ کھاؤ پیو، ہمارے ساتھ اٹھو بیٹھو۔ ہماری اجت لیتے ہو تو اپنا دھرم ہمیں دو۔"

داتادین نے لاٹھی گھما کر کہا "منہ سنبھال کے باتیں کر ہرکھوا! تیری لڑکی وہ کھڑی ہے، لے جا، جہاں چاہے۔ ہم نے اُسے باندھ نہیں رکھا ہے۔ کام کرتی تھی مجوری لیتی تھی۔ یہاں مجوروں کی کمی نہیں ہے۔"

سلیا کی ماں اُنگلی مٹکا کر بولی "واہ واہ پنڈت، اچھا نیاؤ کرتے ہو۔ تمہاری لڑکی کسی چمار کے ساتھ نکل گئی ہوتی اور تم اس طرح کی باتیں کرتے تو دیکھتی۔ ہم چمار ہیں اس لئے ہماری کوئی اجت نہیں! ہم سلیا کو اکیلی نہ لے جائیں گے، اس کے ساتھ ماتادین کو بھی لے جائیں گے جس نے اس کی اجت بگاڑی ہے۔ تم بڑے نیمی دھرمی ہو۔ اُس کے ساتھ سوؤ گے، پر اُس کے ہاتھ کا پانی نہ پیو گے! وہی چڑیل ہے کہ یہ سب سہتی ہے۔ میں تو ایسے آدمی کو سنکھیا دے دیتی۔"

ہرکھو نے اپنے ساتھیوں کو للکارا "سن لی ان لوگوں کی باتیں کہ نہیں؟ اب کیا کھڑے منہ تاکتے ہو؟"

اتنا سننا تھا کہ دو چماروں نے لپک کر ماتادین کے ہاتھ پکڑ لیے اور تیسرے نے جھپٹ کر اُس کا جنیؤ توڑ ڈالا اور اس کے قبل کہ داتادین اور جھنگری سنگھ اپنی اپنی لاٹھیاں سنبھال سکیں، دو چماروں نے ماتادین کے منہ میں ایک بڑی سی ہڈی کا ٹکڑا ڈال دیا۔ ماتادین نے دانت جکڑ لیے پھر بھی وہ گھن کی چیز اُس کے ہونٹوں میں تو لگ ہی گئی، اُنھیں متلی ہوئی اور منہ خود بخود کھل گیا۔ اور ہڈی حلق تک جا پہنچی۔ اتنے میں کھلیان کے سب آدمی جمع ہو گئے مگر تعجب تو یہ ہے

کہ کوئی ان دھرم کے لٹیروں سے مزاحم نہ ہوا۔ ماتا دین کا برتاؤ سبھی کو ناپسند تھا۔ وہ گاؤں کی بہو بیٹیوں کو تاکا کرتا تھا۔ پس دل میں سبھی اُس کی دُرگت پر خوش تھے۔ ہاں ظاہرا لوگ چماروں پر رعب جما رہے تھے۔

ہوری نے کہا "اچھا اب بہت ہوا ہرکھوا، بھلا چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔"

ہرکھو نے بے خوفی سے جواب دیا "تمہارے گھر میں بھی لڑکیاں ہیں ہوری مہتو! اتنا سمجھ لو۔ اس طرح گاؤں کی مرجاد بگڑنے لگی تو کسی کی آبرو نہ بچے گی۔"

ایک لمحے میں دشمن پر پوری فتح پاکر حملہ آوروں نے وہاں سے ٹل جانا ہی مناسب سمجھا۔ لوگوں کی رائے بدلتے دیر نہیں لگتی، اُس سے بچے رہنا ہی اچھا ہے۔ ماتا دین قے کر رہا تھا۔ داتا دین نے اُس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا "ایک ایک کو پانچ پانچ سال کے لئے بڑے گھر نہ بھجوایا تو کہنا۔ پانچ پانچ سال تک چکی پسواؤں گا۔"

ہرکھو نے ہیکڑی سے جواب دیا "اس کا یہاں کوئی غم نہیں ہے کون تمہاری طرح بیٹھے موج کرتے ہیں؟ جہاں کام کریں گے وہیں آدھا پیٹ دانہ بھی مل جائے گا۔"

ماتا دین قے کر چکنے کے بعد مردہ سا زمین پر پڑ رہا گویا کمر ٹوٹ گئی ہو، گویا ڈوب مرنے کے لئے چلو بھر پانی کی تلاش ہو۔ جس عزت کے بل بوتے پر اس کی رنگین مزاجی اور رعونت اور مردیت اکڑتی پھرتی تھی وہ مٹ چکی تھی۔

اس ہڈی کے ٹکڑے نے صرف اُس کے منہ کو نہیں بلکہ اُس کی روح کو بھی

ناپاک کر دیا تھا۔ اس کا دھرم اسی کھانے پینے اور چھوت اچھوت کے سمجھنے پر قائم تھا۔ آج اُس دھرم کی جڑ کٹ گئی۔ اب وہ لاکھ پراشچت کرے، لاکھ گوبر کھائے اور گنگا جل پئے، لاکھ دان پن اور تیرتھ برت کرے، اُس کا مرا ہوا دھرم جی نہیں سکتا۔ اگر تنہائی کی بات ہوتی تو چھپائی جاتی مگر یہاں تو سب کے سامنے اُس کا دھرم لٹا۔ اب اُس کا سر ہمیشہ کے لئے نیچا ہو گیا۔ آج سے وہ اپنے ہی گھر میں اچھوت سمجھا جائے گا۔ اُس کی ممتا بھری ماں بھی اُس سے گھن کرے گی۔ اور سنسار سے دھرم ایسا اُٹھ گیا کہ اتنے آدمی کھڑے سبھی تماشا دیکھتے رہے۔ کسی نے چوں تک نہ کی۔ ایک لمحہ پہلے جو لوگ اُسے دیکھتے ہی پالاگن کرتے تھے اب اُسے دیکھ کر منہ پھیر لیں گے۔ وہ کسی مندر میں بھی نہ جا سکے گا، نہ کسی کے برتن چھو سکے گا۔ اور یہ سب اس ابھاگنی سلیا کے کارن۔

سلیا جہاں اناج اُسار رہی تھی وہیں سر جھکائے کھڑی تھی جیسے یہ اُسی کی دُرگت ہو رہی ہو۔ یکایک اُس کی ماں نے آ کر ڈانٹا "کھڑی تاک رہی کیا ہے؟ چل سیدھے گھر، نہیں تو بوٹی بوٹی کاٹ ڈالوں گی۔ باپ دادا کا نام تو خوب اُجاگر کر چکی۔ اب اور کیا کرنے پر لگی ہے؟"

سلیا بُت بنی کھڑی رہی۔ ماں باپ اور بھائیوں پر اُسے غصّہ آ رہا تھا۔ یہ لوگ کیوں اس کے بیچ میں بولتے ہیں؟ وہ جیسے چاہتی رہتی ہے، دوسروں سے کیا مطلب؟ کہتے ہیں کہ یہاں تیری ہتک ہوتی ہے۔ تب کیا کوئی باہمن اس کا پکایا کھائے گا یا اُس کے ہاتھ کا پانی پی لے گا؟ ابھی ذرا دیر پہلے اُس کا دل ماتا دین کے برتاؤ سے بے زار ہو رہا تھا، مگر اپنے گھر والوں اور برادری کی اس زیادتی نے اُس نفرت کو گہری رغبت میں تبدیل کر دیا۔ احتجاج کے لہجے سے بولی "میں کہیں نہ جاؤں گی۔ تو کیا یہاں بھی مجھے جینے نہ دے گی؟"

بڑھیا نے کڑی آواز میں کہا "تو نہ چلے گی؟"

"نہیں"

"چل سیدھے سے"

"نہیں جاتی"

فوراً دونوں بھائیوں نے اُس کے ہاتھ پکڑ لیئے اور اُسے گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ سلیا زمین پر بیٹھ گئی۔ بھائیوں نے اس پر بھی نہ چھوڑا، گھسیٹتے ہی رہے اُس کی ساڑی پھٹ گئی۔ پیٹھ اور کمر کی کھال چھل گئی، پھر بھی وہ جانے پر راضی نہ ہوئی۔

تب ہرکھو نے لڑکوں سے کہا "اچھا اب اسے چھوڑ دو، سمجھ لیں گے کہ مر گئی۔ مگر اب جو کبھی میرے دوارے پر آئی تو لہو پی جاؤں گا"

سلیا جان پر کھیل کر بولی "ہاں جب تمہارے دوارے پر جاؤں تو پی لینا"

بڑھیا نے غصے کے جنون میں سلیا کو کئی لاتیں جمائیں اور ہرکھو نے اُسے ہٹا نہ دیا ہوتا تو شاید جان ہی لے کر چھوڑتی۔

بڑھیا پھر جھپٹی تو ہرکھو نے اُسے دھکے دیکر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا "تو بڑی ہتیارنی ہے، کلیا! کیا اُسے مار ہی ڈالے گی؟"

سلیا باپ کے پیروں سے لپٹ کر بولی "مار ڈالو دادا، سب لوگ مل کر مار ڈالو!۔ ہائے امّاں۔ تم اتنی بے درد ہو، اسی لئے دودھ پلا کر پالا تھا؟ پیدا ہوتے ہی کیوں نہ گلا گھونٹ دیا؟ ہاں میرے پیچھے پنڈت کو بھی تم نے برشٹ کر دیا۔ اُس کا دھرم لے کر تمہیں کیا ملا؟ اب تو وہ نہ پوچھے گا، مگر پوچھے یا نہ پوچھے رہوں گی تو اُسی کے ساتھ، وہ مجھے چاہے بھوکوں رکھے چاہے مار ڈالے پر

اس کا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ اُن کی اتنی درگت کرا کے کیسے چھوڑوں؟ مر جاؤں گی، پھر جائی نہ بنوں گی۔ ایک بار جس نے بانہہ پکڑ لی اُسی کی رہوں گی۔"

کلیا نے ہونٹ چبا کر کہا "جانے دو، رانڈ کو سمجھتی ہے کہ وہ اس کو نباہ کرے گا، گھر کا ہی مار کر بھگا نہ دے تو منہ نہ دکھاؤں۔"

بھائیوں کو بھی رحم آگیا سِلیا کو وہیں چھوڑ کر سب چلے گئے، تب وہ آہستہ سے اٹھ کر لنگڑاتی اور کراہتی ہوئی کھلیان میں جا کر بیٹھ گئی اور آنچل سے منہ ڈھانک کر رونے لگی۔

داتا دین نے جلاہے کا غصہ داڑھی پر اتارا "اُن کے ساتھ چلی کیوں نہیں گئی سِلیا؟ اب کیا کرانے پر لگی ہوئی ہے؟ میرا ستیاناس کرا کے بھی پیٹ نہیں بھرا؟"

سِلیا نے آنسو بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اُن میں نور کی جھلک تھی بولی۔ "اُن کے ساتھ کیوں جاؤں؟ جس نے بانہہ پکڑی اُسی کے ساتھ رہوں گی۔"

پنڈت جی نے دھمکایا "میرے گھر میں پاؤں رکھا تو لاتوں سے بات کروں گا۔"

سِلیا نے بھی گستاخانہ کہا "مجھے جہاں وہ رکھیں گے وہاں رہوں گی پیڑ تلے رکھیں چاہے محل میں رکھیں۔"

ماتا دین بدحواس سا بیٹھا تھا۔ دوپہر ہونے کو تھی۔ دھوپ پتیوں سے چھن چھن کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، ماتھے سے پسینہ ٹپک رہا تھا مگر وہ خاموش بلا حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

دفعتاً جیسے اس نے ہوش میں آکر کہا "میرے لئے اب کیا کہتے ہو دادا؟"

داتا دین نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر ڈھارس دیتے ہوئے کہا "تمہارے لئے ابھی میں کیا کہوں بیٹیا؟ چل کر نہاؤ، کھاؤ، پھر پنڈتوں کی جیسی رائے ہوگی کیا جائے گا۔ ہاں ایک بات ہے، سِلیا کو اب چھوڑ پڑے گا۔"

ماتا دین نے سِلیا کی طرف خون بھری آنکھوں سے دیکھا۔ "میں اب کبھی اس کا مُنہ نہ دیکھوں گا مگر پراسچت ہو جانے پہ پھر تو کوئی دوکھ نہ رہے گا؟"

"پراسچت ہو جاتے پہ کوئی دوکھ پاپ نہیں رہتا۔"

"تو آج ہی پنڈتوں کے پاس جاؤ۔"

"آج ہی جاؤں گا بیٹیا!"

"مگر پنڈت کہیں کہ اس کا پراسچت نہیں ہو سکتا تب؟"

"وہ جو کچھ کہیں۔"

"تو تم مجھے گھر سے نکال دو گے؟"

داتا دین نے پدرانہ محبت سے بے قرار ہو کر کہا "ایسا کہیں ہو سکتا ہے بیٹیا؟ دھن جائے، دھرم جائے، مرجاد جائے، مگر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔"

ماتا دین نے لاٹھی اُٹھائی اور باپ کے پیچھے پیچھے گھر چلا۔ سِلیا بھی اُٹھی اور لنگڑاتی ہوئی اُس کے پیچھے ہولی۔ ماتا دین نے پیچھے پھر کر بے دردی سے کہا "تو میرے ساتھ مت آ۔ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ اتنی دُرگت کروا کے بھی تیرا پیٹ نہیں بھرا؟"

سِلیا نے گستاخانہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "واسطہ کیسے نہیں ہے؟ اسی گاؤں میں تم سے دھنی، تم سے سُندر، تم سے اِجّت دار لوگ ہیں، میں اُن کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑتی؟ تمہاری یہ دُرگت آج کیوں ہوئی؟ جو رسی تمہارے گلے میں پڑ گئی ہے اُسے تم لاکھ چاہو پہ توڑ نہیں سکتے اور نہ میں تمہیں چھوڑ کر کہیں جاؤں گی۔ مجوری

کروں گی، بھیک مانگوں گی، پر تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے ماتادین کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر کھلیان میں جا کر اناج اُسانے لگی۔ ہوری ابھی تک وہاں غلّہ مانڈ رہا تھا۔ دھنیا اُسے کھانا کھانے کو بُلانے آئی تھی۔ ہوری نے بیلوں کو پَیرے سے باہر نکال کر ایک درخت سے باندھ دیا۔ اور سلیا سے بولا "تو بھی جا، کھا پی آ، سلیا۔" دھنیا یہاں بیٹھی ہے تیری پیٹھ پر کی ساڑی تو لہو سے رنگ گئی ہے رے! کہیں گھاؤ پک نہ جائے۔ تیرے گھر والے بڑے کسائی ہیں۔"

سلیا نے اُن کی طرف غمگین آنکھوں سے دیکھا "یہاں کسائی کون نہیں ہے دادا؟ میں نے تو کسی کو دَیا وان نہیں پایا۔"

"کیا کہا پنڈت نے؟"

"کہتے ہیں کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔"

"اچھا ایسا کہتے ہیں!"

"سمجھتے ہوں گے کہ اس طرح اپنے مُنہ کی لالی رکھ لیں گے، پر جس بات کو دُنیا جانتی ہے اُسے کیسے چھپا لیں گے؟"

"میری روٹیاں بھاری ہیں تو نہ دیں۔ میرے لئے کیا؟ مجوری اب بھی کرتی ہوں، تب بھی کروں گی۔ سونے کو ہاتھ بھر جگہ تمہی سے مانگوں گی تو کیا تم نہ دو گے؟"

دھنیا ترس کھا کر بولی "جگہ کی کون کمی ہے بیٹی؟ تو چل، میرے گھر رہ!"

ہوری نے آزردگی سے کہا "بُلاتی تو ہے مگر پنڈت کو جانتی نہیں؟"

دھنیا نے بے خوفی سے کہا "بگڑیں گے تو ایک روٹی بیسی کھا لیں گے، اور کیا کریں گے؟ کوئی اُن کی دَبیل ہوں؟ اُس کی آبرو لی، برادری سے نکلوایا اور اب

کہتے ہیں کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ آدمی ہے کہ کسائی؟ یہ اُسی نیتی کا آج پھل ملا ہے۔ پہلے نہیں سوچ لیا تھا۔ تب تو موج اُڑاتے رہے۔ اب کہتے ہیں کہ مجھ سے کوئی واسطہ نہیں،،

ہوری کے خیال سے دھنیا غلطی کر رہی تھی۔ "سِلیا کے گھر والوں نے متئی کو کتنا بے دھرم کر دیا۔ یہ کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ سِلیا کو چاہتے مار کے لے جاتے، چاہے دُلار کر کے لے جاتے وہ اُن کی لڑکی ہے۔ متئی کو کیوں بے دھرم کیا؟،،

دھنیا نے ڈانٹ بتائی "اچھا رہنے دو، بڑے نیائی بنے ہو! مرد مرد سب ایک ہوتے ہیں۔ اس کو متئی نے بھرشٹ کیا تب تو کسی کو بُرا نہ لگا اور اب جو متئی بے دھرم ہو گئے تو کیوں بُرا لگتا ہے؟ کیا سِلیا دھرم دھرم نہیں ہے؟ رکھنے کو تو چمارن، اس پہ بڑے نیم دھرم والے بنتے ہیں! بڑا اچھا کیا ہر کھو چودھری نے۔ ایسے گنڈوں کی یہی دوا ہے۔ تو چل سِلیا میرے گھر، نہ جانے کیسے بے درد ماں باپ ہیں کہ بے چاری کی ساری مٹی پلید کر دی۔ تم جا کے سونا کو بھیج دو۔ میں اسے لیکر آتی ہوں"

ہوری گھر چلا اور سِلیا دھنیا کے پیروں پر گر کر رونے لگی۔

(۲۴)

سونا سترھویں سال میں تھی۔ اور اس سال اُس کا بیاہ کرنا ضروری تھا۔ ہوری تو دو سال سے اسی فکر میں تھا مگر ہاتھ خالی ہونے سے کوئی قابو نہ چلتا تھا مگر اس سال جیسے بھی ہو اس کا بیاہ کر ہی دینا چاہئے۔ چاہے قرض لینا پڑے چاہے کھیت رہن رکھنے پڑیں اور تنہا ہوری کی بات چلتی تو دو سال پہلے ہی بیاہ ہو گیا ہوتا۔ وہ کفایت سے کام کرنا چاہتا مگر دھنیا کہتی تھی کہ چاہے کتنا ہی ہاتھ باندھ کر خرچ کرو، دو

ڈھائی سو تو لگ ہی جائیں گے۔ جھنیا کے آجانے سے برادری میں ان لوگوں کا درجہ کچھ گر گیا تھا اور سو دو سو دیئے بغیر کوئی اچھا لڑکا نہ مل سکتا تھا۔ پچھلے سال چیت کی فصل میں کچھ نہ ملا تھا تو پنڈت داتا دین سے آدھے کا ساجھا، مگر پنڈت جی نے بیج اور مزدوری کی کچھ ایسی تفصیل بتائی کہ ہوری کے ہاتھ ایک چوتھائی سے زیادہ اناج نہ لگا۔ اور لگان دینا پڑ گیا پورا۔ ایکھ اور سن کی فصل برباد ہو گئی۔ سن تو بارش زیادہ ہونے اور ایکھ دیمک لگ جانے سے۔ ہاں اس سال کی فصل اچھی تھی، اور ایکھ بھی خوب لگی ہوئی تھی۔ بیاہ کے لئے اناج تو موجود ہی تھا، دو سو روپئے بھی ہاتھ آجائیں تو وہ لڑکی کے قرض سے سبکدوش ہو جائے۔ اگر گوبر سو روپئے کی مدد کرے تو بقیہ سو روپئے ہوری کو آسانی سے مل جائیں گے۔ جھنگری سنگھ اور منگرو ساہ دونوں ہی اب کچھ نرم پڑ گئے تھے۔ جب گوبر پردیس میں کما رہا ہے تو اُن کے روپئے مارے نہ پڑ سکتے تھے۔

ایک دن ہوری نے گوبر کے پاس دو تین دن کے لئے جانے کی تجویز کی۔ مگر دھنیا ابھی تک گوبر کے وہ سخت الفاظ نہ بھولی تھی۔ وہ گوبر سے ایک پیسہ بھی نہ لینا چاہتی تھی، کسی طرح نہیں!

ہوری نے جھنجھلا کر کہا "پھر کام کیسے چلے گا یہ بتا؟"

دھنیا سر ہلا کر بولی "مان لو کہ گوبر پردیس نہ گیا ہوتا تب تم کیا کرتے؟ وہی اب کرو۔"

ہوری کی زبان بند ہو گئی۔ لمحہ بھر بعد بولا "میں تو تجھ سے پوچھتا ہوں۔"

دھنیا نے جان بچائی "یہ سوچنا مردوں کا کام ہے۔"

ہوری کے پاس جواب تیار تھا "مان لے کہ میں نہ ہوتا اور تو ہی اکیلی ہوتی تب تو کیا کرتی؟ وہی کر۔"

نہ بھنیا نے حقارت سے دیکھا "وہ تب بھی کُسا کنیا بھی دے دیتی تو کوئی ہنسنے والا نہ تھا۔"

ایسا تو ہوری بھی کہہ سکتا تھا۔ اسی میں اس کی خیر بھی تھی۔ مگر گھر کی مرجاد کیسے چھوڑ دے؟ اس کی بہنوں کے بیاہ میں تین تین سو براتی دروازے پر آئے تھے۔ جہیز بھی اچھا دیا گیا تھا، ناچ، تماشا، باجے گاجے، ہاتھی گھوڑے سبھی تھے۔ آج بھی برادری میں اس کا نام ہے۔ دس گاؤں کے لوگوں سے اس کا میل جول ہے۔ کُسا کنیا دے کر وہ کیسے منہ دکھائے گا؟ اس سے تو مر جانا اچھا ہے اور وہ کیسے کُسا کنیا دے؟ درخت ہیں، زمین ہے اور کچھ ساکھ بھی ہے۔ اگر وہ ایک بیگھہ بھی بیچ دے تو دو سو مل جائیں، مگر کسان کے لئے زمین جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ خاندانی وقار سے بھی زیادہ عزیز ہے! اور کُل تین ہی بیگھے اُس کے پاس ہیں۔ اگر ایک بیگھہ بیچ دے تو پھر کھیتی کیسے کرے گا؟

اِسی حیص بیص میں کئی دن گذر گئے۔ اور ہوری کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

دسہرہ کی چھٹیوں کے دن تھے۔ جھنگری، پٹیشوری اور نوکھے رام تینوں کے لڑکے تعطیل میں گھر آئے تھے۔ تینوں انگریزی پڑھتے تھے اور اگرچہ تینوں بیس بیس برس کے ہو گئے تھے مگر ابھی تک یونیورسٹی میں جانے کا نام نہ لیتے تھے۔ ایک ایک درجے میں دو دو تین تین سال پڑے رہتے۔ تینوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ پٹیشوری کے سپوت بندیشوری تو ایک لڑکے کے باپ بھی ہو چکے تھے۔ بندو دن بھر تاش کھیلتے، بھنگ پیتے اور چھیلا بنے گھومتے پھرتے تھے اور دن میں کئی کئی بار ہوری کے دروازے کی طرف تاکتے ہوئے نکلتے اور کچھ ایسا اتفاق تھا کہ جس وقت وہ نکلتے اُس وقت سونا بھی کسی نہ کسی کام سے دروازے پر آ کھڑی ہوتی۔ ان دنوں وہ وہی ساڑی پہنتی تھی جو گوبر اُس کے لئے لایا تھا۔ یہ سب تماشا دیکھ

دیکھ کر ہوری کا خون خشک ہوا جاتا تھا گویا اس کی کھیتی چوپٹ کرنے کے لئے آسمان پر اولے والے زرد بادل اُمڈے چلے آتے ہوں۔

ایک دن تینوں اُسی کنوئیں پر نہانے جا پہنچے، جہاں ہوری ایکھ سینچنے کے لئے پُر چلا رہا تھا۔ سونا پُر لے رہی تھی۔ ہوری کا خون آج کھول اُٹھا۔

اُسی شام کو وہ دُلاری کے پاس گیا۔ سوچا کہ عورتوں میں رحم ہوتا ہے، شاید اس کا دل پسیج جائے اور کم سود پر روپیہ دے دے۔ مگر دُلاری اپنا ہی رونا لے بیٹھی۔ گاؤں میں ایسا کوئی گھر نہ تھا جس پر اُس کے کچھ روپئے نہ آتے ہوں، حتیٰ کہ جھنگری سنگھ پر اُس کے بیس روپئے آتے تھے۔ لیکن کوئی دینے کا نام نہیں لیتا تھا۔ بے چاری کہاں سے روپئے لائے؟

ہوری نے گڑگڑا کر کہا۔ "بھابی بڑا اپکار ہوگا۔ تم روپئے نہ دو گی، یہ میرے گلے کی پھانسی کھول دو گی۔ جھنگری! ورپٹیشوری میرے کھیتوں پر دانت لگائے ہوئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ باپ دادوں کی یہی تو نشانی ہے۔ یہ نکل گئی تو جاؤں گا کہاں؟ ایک سپوت وہ ہوتا ہے کہ گھر کی سمپت بڑھاتا ہے۔ میں ایسا کپوت ہو جاؤں کہ باپ دادوں کی کمائی پر جھاڑو پھیر دوں!"

دُلاری نے قسم کھائی۔ "ہوری! میں ٹھاکر جی کے چرن چھو کر کہتی ہوں کہ اس سمے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ جس نے لیا وہ دیتا نہیں تو میں کیا کروں؟ تم اپنے ہی ہو۔ سونا بھی اپنی ہی لڑکی ہے، پر تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ تمہارے بھائی ہیرا نے بیل کے لئے پچاس روپئے لئے۔ اس کا تو کہیں پتا ٹھکانا نہیں۔ اس کی گھر والی سے مانگو تو لڑنے کو تیار ہے۔ سوبھا بھی دیکھنے میں بڑا سیدھا ہے مگر پیسہ دینا نہیں جانتا۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ کسی کے پاس ہے ہی نہیں۔ دے کہاں سے؟ سب کی دَشا دیکھتی ہوں، اسی مارے صبر کر جاتی ہوں۔ لوگ کس طرح جیتے

پال رہے ہیں اور کیا کھیتی باڑی سینچنے کی میں صلاح نہ دوں گی۔ کچھ نہیں ہے مرجاد تو ہے۔"

پھر سرگوشی کرتی ہوئی بولی "پٹیشری لالا کا لونڈا تمہارے گھر کی طرف بہت چکر لگایا کرتا ہے۔ تینوں کا وہی حال ہے۔ اِن سے چوکنا رہنا یہ شہر کے ہو گئے۔ گاؤں کا بھائی چارہ کیا سمجھیں؟ لڑکے گاؤں میں بھی ہیں۔ مگر اُن میں کچھ شرم ہے، کچھ ادب ہے اور کچھ ڈر ہے۔ یہ سب تو چھوٹے سانڈ ہیں۔ میری گوہر کیا سسرال سے آئی تھی مگر میں نے اُن سبھوں کے ڈھنگ دیکھ کر اُس کے سسر کو بُلا کر بِدا کر دیا۔ کوئی کہاں تک پہرا دے؟"

ہوری کو مسکراتا دیکھ کر اُس نے میٹھے شکوے کے لہجے میں کہا "ہنسو گے ہوری، تو میں بھی کچھ کہہ دوں گی۔ تم کیا کسی سے کم نٹ کھٹ تھے؟ دن میں پچاسوں بار کسی نہ کسی بہانے سے میری دُکان پر آیا کرتے تھے، پر میں نے کبھی تاکا تک نہیں۔"

ہوری نے نرم احتجاج کے ساتھ کہا "یہ تو تم جھوٹ بولتی ہو بھابی! میں بنا کچھ رس پائے تھوڑا ہی آتا تھا۔ چڑیا ایک بار دانہ پا جاتی ہے تبھی دوسری بار آنگن میں آتی ہے۔"

"چل جھوٹے!"

"آنکھوں سے نہ تاکتی رہی ہو، پر تمہارا مَن تو تاکتا ہی تھا، بلکہ بُلاتا تھا۔"

"اچھا رہنے دو، بڑے آئے ہو تپسی بن کے! تمہیں بار بار منڈلاتے دیکھ کے مجھے دیا آجاتی تھی، نہیں تم ایسے کوئی بانکے جوان نہ تھے۔"

حسینی ایک پیسے کا نمک لینے آگیا اور یہ مذاق بند ہو گیا۔ حسینی نمک لے کر

چلا گیا تو دُلاری نے پھر کہا "گوبر کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے ؟ دیکھتے بھی آؤ گے اور سہایت کچھ مل بھی جائے۔"

ہوری مایوسی سے بولا "وہ کچھ نہ دے گا۔ لڑکے جب پیسے کمانے لگتے ہیں تو آنکھ بدل جاتی ہے۔ میں تو بے حیائی کرنے کو تیار تھا پر دھنیا نہیں مانتی۔ اُس کے بنا کہے چلا جاؤں تو گھر میں رہنا دو بھر کر دے اُس کا سبھاؤ تو جانتی "

دُلاری نے طنزیہ کہا "تم تو مہریا کے جیسے گلام ہو گئے "

"تم نے پوچھا ہی نہیں تو کیا کرتا ؟ "

"میری گلامی کرنے کہتے تو میں نے لکھا لیا ہوتا، سچ "

"تو اب سے کیا بگڑا ہے ؟ لکھا لونا ! دو سو میں لکھتا ہوں، ان داموں مہنگا نہیں ہوں "

"تب دھنیا سے تو نہ بولو گے ؟"

"نہیں، کہو قسم کھالوں "

اور جو بولے ؟"

"تو میری جیبھ کاٹ لینا "

"اچھا تو جاؤ، لڑکا ٹھیک ٹھاک کرو، میں روپئے دے دوں گی "

ہوری نے آنسو بہاتے ہوئے دُلاری کے پیر پکڑ لئے۔ رِقت سے زبان بند ہو گئی۔

سیٹھانی نے پاؤں کھینچ کر کہا "اب یہی سرارت تو مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں سال بھر کے اندر اپنے روپئے سود سمیت کان پکڑ کر لے لوں گی۔ تم تو بیوہار کے ایسے سچے نہیں ہو مگر دھنیا پر مجھے بسواس ہے۔ سُنا کہ پنڈت تم سے بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اسے گاؤں سے نکال کر نہ چھوڑا تو باہمن نہیں۔ تم سِلیا کو

نکال باہر کیوں نہیں کرتے؟ بیٹھے بٹھائے جھگڑا مول لے لیا۔"

"دھنیا اُسے رکھے ہوئے ہے، میں کیا کروں؟"

"سنا ہے کہ پنڈت کاسی گئے تھے۔ وہاں ایک بڑا نامی پنڈت ہے۔ وہ پانچ سو مانگتا ہے تب پرائسچت کرے گا۔ بھلا پوچھو، ایسا اندھیر کہیں ہوا ہے۔ جب دھرم چلا گیا تو ایک نہیں ہزار پرائسچت کرو تو کیا ہوتا ہے۔ تمہارے ہاتھ کا چھوا پانی کوئی نہ پئے گا، چاہے جتنا پرائسچت کرو۔"

ہوری یہاں سے گھر چلا تو اُس کا دل اُچھل رہا تھا۔ زندگی میں ایسا سکھ دینے والا تجربہ اُسے کبھی نہ ہوا تھا۔ راستے میں سوبھا کے گھر گیا اور سگائی لے کر چلنے کے لئے نیوتہ دیا آیا۔ پھر دونوں داتا دین کے پاس سگائی کی ساعت پوچھنے گئے۔ وہاں سے آکر دروازے پر سگائی کی تیاریوں کا مشورہ کرنے لگے۔

دھنیا نے باہر نکل کر کہا "پہر رات گئی، ابھی روٹی کھانے کی بیرا نہیں آئی؟ کھا کر بیٹھو۔ باتیں کرنے کو تو ساری رات پڑی ہے۔"

ہوری نے اُس سے بھی مشورے میں شریک ہونے کا اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"اسی سہالگ میں لگن ٹھیک ہوئی ہے۔ بتا کیا کیا سامان لانا چاہئے۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔"

"جب کچھ معلوم ہی نہیں تو صلاح کرنے کیا بیٹھے ہو؟ کچھ روپئے پیسے کا ٹھیک بھی ہوا ہے کہ من کی مٹھائی کھا رہے ہو؟"

ہوری نے شان سے کہا "تجھے اس سے کیا مطلب؟ تو اتنا بتا دے کہ کیا کیا سامان لانا ہوگا؟"

"تو میں ایسی من کی مٹھائی نہیں کھاتی۔"

"تو اتنا بتا دے کہ ہماری بہنوں کے بیاہ میں کیا کیا سامان آیا تھا؟"

"پہلے یہ بتا دو کہ روپے مل گئے"

"ہاں مل گئے اور نہیں تو کیا بھنگ کھائی ہے"

"تو پہلے چل کر کھا لو، پھر صلاح کریں گے"

مگر جب اُس نے سُنا کہ دُلاری سے بات چیت ہوتی ہے تو ناک سکوڑ کر بولی "اُس سے روپے لے کر آج تک اُرن ہوا ہے؟ چڑیل کتنا کس کر سود لیتی ہے"

"لیکن کرتا کیا؟ دوسرا دیتا کون ہے؟"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ اسی بہانے دو گالی ہنسنے بولنے گیا تھا۔ بوڑھے ہو گئے پر وہ بان نہ گئی"

"تو تو دھنیا بچوں کی سی باتیں کرنے لگتی ہے۔ میرے جیسے پھٹے حالوں سے وہ ہنسے بولے گی؟ سیدھے مُنہ بات تو کرتی نہیں"

"تم جیسوں کو چھوڑ کر اُس کے پاس اور جائے ہی گا کون؟"

"اُس کے دوار پر اچھے اچھے ناک رگڑتے ہیں۔ دھنیا! تو کیا جانے؟ اُس کے پاس لچھمی ہے"

"اُس نے ذرا سی حامی بھر دی تو تم سب جگہ گاتے پھرنے لگے"

"حامی نہیں بھر دی، پکا وعدہ کیا ہے"

ہوری روٹی کھانے گیا اور سوبھا اپنے گھر چلا گیا تو سونا سِلیا کے ساتھ باہر نکلی۔ وہ دروازے پر کھڑی ساری باتیں سُن رہی تھی۔ اُس کی سگائی کے لئے دو سو روپے دُلاری سے اُدھار لئے جا رہے ہیں، یہ بات اُس کے پیٹ میں ایسی کھلبلی مچا رہی تھی جیسے تازہ چونا پانی میں پڑ گیا ہو۔ دروازے پر ایک کُپّی جل رہی تھی جس سے طاق کے اوپر کی دیوار سیاہ ہو گئی تھی۔ دونوں بیل ناند میں سانی کھا رہے تھے

اور ایک کُتّا زمین پر ٹکڑے کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ دونوں بیلوں کی چری کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔

سونا بولی "تو نے کچھ سُنا؟ دادا سیٹھانی سے میری سگائی کے لئے دو سو روپئے اُدھار لے رہے ہیں۔"

رُپیا گھر کا ذرا ذرا حال جانتی تھی بولی "گھر میں پیسہ نہیں ہے تو کیا کریں؟"

سونا نے سامنے کے سیاہ درختوں کی طرف تاکتے ہوئے کہا "میں ایسا بیاہ نہیں کرنا چاہتی جس میں ماں باپ کو اُدھار لینا پڑے۔ کہاں سے دیں گے بے چارے؟ بتا! پہلے ہی رِن کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں، دو سو اور لیں گے تو بوجھ اور بھاری ہو جائے گا کہ نہیں؟"

"بنا دہیج لئے بڑے آدمیوں کا کہیں بیاہ ہوتا ہے پگلی؟ دہیج کے بنا تو کوئی بوڑھا باڑھا ہی ملے گا۔ جائے گی بوڑھے ساتھ؟"

"بوڑھے کے ساتھ کیوں جاؤں؟ بھیّا بوڑھے تھے جو جھنیا کو لے آئے؟ اُنھیں کس نے دہیج میں کَے پیسے دیئے تھے؟"

"اس میں باپ دادا کا نام ڈوبتا ہے۔"

"میں تو سُنّاری والوں سے کہہ دوں گی کہ اگر تم نے ایک پیسہ بھی دہیج لیا تو میں تم سے بیاہ نہ کروں گی۔"

سونا کا بیاہ سُنّاری کے ایک مالدار کسان کے لڑکے سے طے ہوا تھا۔

"اور جو وہ کہہ دے کہ میں کیا کروں، تمہارے باپ دیتے ہیں اور میرے باپ لیتے ہیں، تو اس میں میرا کیا بس؟"

سونا نے جس ہتھیار کو بہت کارگر سمجھا تھا، اب معلوم ہوا کہ وہ بالکل کُند ہے۔

مایوس ہو کر بولی "میں ایک بار اُس سے کہہ کے دیکھ لینا چاہتی ہوں۔ اگر اُس نے کہہ دیا کہ میرا کوئی بس نہیں تو کیا گومتی یہاں سے بہت دُور ہے؟ جا کر ڈوب مروں گی۔ ماں باپ نے مر مر کے پالا پوسا تو اُس کا بدلہ کیا یہی ہے کہ ان کے گھر سے جانے لگوں تو اُنہیں کرجے سے اور لادتی جاؤں؟ ماں باپ کو بھگوان نے دیا ہو تو بیشر خوشی سے جائیں آدھے لڑکی کو دیں، میں منع نہیں کرتی۔ لیکن جب وہ پیسے پیسے کو ہو رہے ہیں، تو کنیا کا دھرم یہی ہے کہ ڈوب مرے۔ گھر کی جمین، جگہ اور جائداد تو بچ جائے گی، روٹی کا سہارا تو رہ جائے گا۔ ماں باپ چار دن میرے نام کو رو کر صبر کر لیں گے، یہ تو نہ ہو گا کہ میرا بیاہ کر کے اُنھیں جنم بھر رونا پڑے۔ تین چار سال میں دو سو کے دو نے ہو جائیں گے۔ دادا کہاں سے لا کر دیں گے؟"

سلیا کو معلوم ہُوا کہ جیسے اُس کی آنکھوں میں نئی چمک آگئی ہے۔ جوش میں سونا کو سینے سے لگا کر بولی "تو نے اتنا گیان کہاں سے سیکھ لیا سونا؟ دیکھنے میں تو بڑی بھولی بھالی ہے۔"

"اس میں گیان کی کون بات ہے؟ کیا میرے آنکھ نہیں ہے؟ کہ میں پاگل ہوں؟ دو سو میرے بیاہ میں لیں۔ تین سال میں دونا ہو جائے۔ تب روپیا کی سگائی میں دو سو اور لیں۔ اور جو کچھ کھیتی باڑی ہے سب لیلام ہو جائے اور دُوارے دُوارے بھیک مانگتے پھریں، یہی نا؟ اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ میں اپنی ہی جان دے دوں۔ تو مُنہ اندھیرے سُنار ہی چلی جانا اور اُسے بُلا لانا۔ مگر نہیں بُلانے کا کام نہیں ہے۔ مجھے اُس بولتے لاج آئے گی۔ تو ہی میرا یہ سندیسہ کہہ دینا۔ دیکھیں کیا جواب ملتا ہے۔ کون دور ہے؟ ندّی کے اُس پار ہی تو ہے۔ کبھی کبھی ڈھور لے کر اِدھر آ جاتا ہے۔ ایک بار اُس کی بھینس میرے کھیت میں گھس گئی تھی تو میں نے اُسے بہت گالیاں دی تھیں۔ ہاتھ جوڑنے لگا۔ ہاں یہ تو بتا کہ اِدھر مٹی سے

تیری بھلینٹ ہو گی ؟ سُنا کہ باہمن اُنھیں برادری میں نہیں لے رہے ہیں ''
سلیا نے حقارت سے کہا '' برادری میں کیوں نہ لیں گے ، ہاں وہ بوڑھا روپیہ نہیں کھرچ کرنا چاہتا ۔ اُس کو پیسہ مِل جائے تو جھوٹی گنگا اُٹھا لے ۔ لڑکا آج کل ماہر کی دالان میں ٹکّر لگاتا ہے ''
'' تو اُسے چھوڑ کیوں نہیں دیتی ؟ اپنی برادری میں کسی کے یہاں بیٹھ جا اور آرام سے رہ ۔ وہ تیری ہتک تو نہ کرے گا ؟ ''
'' ہاں ری ، کیوں نہیں ۔ میرے پیچھے اُس کی اتنی دُرگت ہوئی تو اب میں اُسے چھوڑ دوں ؟ اب وہ چاہے پنڈت بن جائے ، چاہے دیوتا بن جائے پر میرے لئے تو وہی متئی ہے جو میرے پیروں پر ماتھا رگڑا کرتا تھا ۔ اور باہمن بھی ہو جائے اور باھمنی سے بیاہ بھی کر لے تو بھی جتنی اُس کی سیوا میں نے کی ہے وہ کوئی باھمنی کیا کرے گی ۔ ابھی مرجاد کے موہ میں وہ چاہے مجھے چھوڑ دے پر دیکھ لینا کہ پھر دَوڑا آئے گا ''
'' آ چکا اب ! تجھے پائے تو کچّا ہی کھا جائے ''
'' تو اُسے بُلانے ہی کون جاتا ہے ؟ اپنا اپنا دھرم اپنے اپنے ساتھ ہے ۔ وہ اپنا دھرم توڑ رہا ہے تو میں اپنا دھرم کیوں توڑوں ؟ ''
بڑے سویرے سلیا شُناری کی طرف چلی مگر ہوری نے روک لیا ۔ دھنیا کے سر میں درد تھا ۔ اُس کی جگہ کیاریوں کو بَرانا تھا سلیا انکار نہ کر سکی ۔ یہاں سے جب دوپہر کو چھٹی ملی تو وہ شُناری چلی ۔ اِدھر تیسرے پہر ہوری پھر کنوئیں پر چلا تو سلیا کا پتہ نہ تھا ، بگڑ کر بولا '' سلیا کہاں اُڑ گئی ؟ رہتی ہے ۔ رہتی ہے نہ جانے کدھر چل دیتی ہے ۔ جیسے کسی کام میں من ہی نہیں لگتا ۔ تو جانتی ہے سونا کہاں گئی ہے ؟ ''

سونا نے حیلہ کیا "مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔ کہتی تھی کہ دھوبن کے گھر کپڑے لینے جانا ہے، وہیں چلی گئی ہوگی!"

دھنیا نے چارپائی سے اُٹھ کر کہا "چلو میں کیا رہی برائے دیتی ہوں۔ کون اُسے مجوری دیتے ہو جو بگڑ رہے ہو؟"

"ہمارے گھر میں رہتی نہیں ہے؟ اُس کے پیچھے سارے گاؤں میں بدنامی نہیں ہو رہی ہے؟"

اچھا رہنے دو۔ ایک کونے میں پڑی ہوئی ہے تو اس سے کرایہ لوگے؟"

"ایک کونے میں نہیں پڑی ہوئی ہے، ایک پوری کوٹھری لئے ہوئے ہے!"

"تو اس کوٹھری کا کرایہ ہوگا کوئی پانچ روپیہ مہینہ؟"

"اس کا کرایہ ایک پیسہ سہی! ہمارے گھر میں رہتی ہے، تو جہاں جائے پوچھ کر جائے، آج آتی ہے تو خبر لیتا ہوں!"

بڑھ چلنے لگا۔ دھنیا کو ہوری نے نہ آنے دیا۔ روپا کیا رہی بڑاتی تھی اور سونا پڑھ لے رہی تھی۔ روپا گیلی مٹی کے چولھے اور برتن بنا رہی تھی اور سونا یاس و اُمید بھری آنکھوں سے سُنار ہی کی طرف تاک رہی تھی۔ اُمید کم تھی، یاس زیادہ۔ سوچتی تھی کہ اُن لوگوں کو روپئے مل رہے ہیں تو کیوں چھوڑنے لگے؟ جن کے پاس پیسہ ہے وہ تو پیسے پر اور جان دیتے ہیں۔ پھر گوری مہتو تو ایک ہی لالچی ہیں۔ منتھرا ایسی دیا ہے دھرم ہے مگر باپ کی اچھا جو ہوگی وہی اُسے ماننی پڑے گی مگر سونا بھی بچہ کو ایسا پھٹکارے گی کہ یاد کریں گے۔ وہ کھلم کھلا کہہ دے گی کہ جا کر کسی امیر کی لڑکی سے بیاہ کرو، مجھ جیسے مرد کے ساتھ میرا نباہ نہ ہوگا۔ کہیں گوری مہتو مان گئے تو وہ اُن کے چرن دھو دھو کر پئے گی۔ اِن کی ایسی سیوا کرے گی جیسی اپنے باپ کی بھی نہ کی ہوگی۔

اور سلیا کو بھر پیٹ مٹھائی کھلا دے گی۔ گو بر نے جو روپیہ اُسے دیا اُسے وہ ابھی تک رکھے ہوئے تھی۔ اس شیریں تصور سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور زرد رخساروں پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔

مگر سلیا ابھی تک آئی کیوں نہیں؟ کون بڑی دور ہے؟ نہ آنے دیا ہوگا اُن لوگوں نے۔ آہا، وہ آ رہی ہے، لیکن بہت دھیرے دھیرے آتی ہے۔ سونا کا دل بیٹھ گیا۔ ابھاگے نہیں مانے۔ سایت، نہیں تو سلیا دوڑتی آتی۔ تو سونا سے ہو چکا بیاہ منہ دھو رکھو۔

سلیا آئی ضرور، مگر کنوئیں پر نہ جا کر کھیت میں کیاری برابر کرنے لگی۔ ڈر رہی تھی کہ اگر سور پی پوچھیں گے کہ کہاں تھی اب تک، تو کیا جواب دے گی۔ سونا کے یہ دو گھنٹے بڑی مشکل سے گزرے۔ پر بند ہوتے ہی وہ دوڑی ہوئی سلیا کے پاس گئی۔

”وہاں جا کر تو مر گئی تھی کیا؟ تاکتے تاکتے آنکھیں پھوٹ گئیں۔“

سلیا کو برا لگا ”تو کیا میں وہاں سوتی تھی؟ اس طرح کی بات چیت راہ چلتے تھوڑے ہی ہو جاتی ہے۔ موقع دیکھنا پڑتا ہے۔ متھرا ندی پر ڈھور چرانے گیا تھا۔ کھوجتی کھوجتی اُس کے پاس گئی اور تیرا سندیسہ کہا۔“

”ایسا غصہ ہوا کہ تجھ سے کیا کہوں۔ میرے پاؤں پر گر پڑا اور بولا میں نے تو جب سے سنا ہے کہ سونا میرے گھر آ رہی ہے تب سے آنکھوں کی نیند ہر گئی ہے۔ اس کی وہ گالیاں مجھے پھل گئیں۔ پر کاکا کو کیا کروں، وہ کسی کی نہیں سنتے۔“

سونا نے ٹوکا ”تو نہ سنیں سونا بھی ہٹیلی ہے۔ جو کہا ہے وہ کر کے دکھائے گی۔ پھر ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔“

"بس اُسی چھن ڈھوروں کو وہیں چھوڑ کے مجھے لئے ہوئے گوری مہتو کے پاس گیا۔ مہتو کے چار ہَر چلتے ہیں۔ گئیواں بھی اُن کا ہے۔ دس بیگھے اوکھ ہے۔ مہتو کو دیکھ کے مجھے ہنسی آگئی جیسے کوئی گھسیارا ہو۔ ہاں بھاگ اچھے ہیں۔ باپ بیٹے میں بڑی کہا سُنی ہوئی۔ گوری مہتو کہتے تھے کہ تجھ سے کیا مطلب میں چاہے کچھ لوں یا نہ لوں تو کون ہوتا ہے بولنے والا؟ متھرا کہتا تھا کہ تم کو لینا دینا ہے تو میرا بیاہ مت کرو، میں اپنا بیاہ جیسے چاہوں گا کرلوں گا۔ بات بڑھ گئی اور گوری نے پنہیں اُٹھا متھرا کو خوب پیٹا۔ کوئی دوسرا لڑکا اتنی مار کھا کے بگڑ کھڑا ہوتا۔ متھرا ایک گھونسہ بھی جما دیتا تو مہتو پھر نہ اُٹھتے۔ مگر بے چارا پنہیں کھا کے بھی کچھ نہ بولا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے میرا مُنہ تاکتا ہوا چلا گیا۔ تب مہتو مجھ پر بگڑنے لگے۔ سیکڑوں گالیاں دیں۔ مگر میں کیوں سُننے لگی؟ مجھے اُن کا کیا ڈر تھا؟ میں نے صاف کہہ دیا کہ مہتو، دو تین سو کوئی بڑی بھاری رقم نہیں ہے اور نہ ہوری مہتو اتنے میں بک نہ جائیں گے اور نہ تم ہی امیر ہو جاؤ گے، یہ وہ سب دھن ناچ تماشے ہی میں اُڑ جائے گا۔ ہاں ایسی بہو نہ پاؤ گے۔"

سونا نے آنسو بھر کر پوچھا "تو مہتو اتنی ہی بات پر اُسے مارنے لگے؟"

سلیا نے بات چھپا رکھی تھی، ایسی ذلیل بات سونا کے کانوں میں نہ ڈالنا چاہتی تھی مگر یہ سوال سُن کر ضبط نہ کر سکی اور بولی وہی گوبر بھیّا والی بات تھی۔ مہتو نے کہا کہ آدمی جوٹھا تو تبھی کھاتا ہے جب میٹھا ہو، اور کلنک چاندی ہی سے دھلتا ہے۔ اس پر متھرا بولا کہ کاکا کون گھر کلنک سے بچا ہے؟ ہاں کسی کا کھُل گیا اور کسی کا چھپا ہوا ہے۔ گوری مہتو بھی پہلے ایک چمارن سے پھنسے تھے اور اس سے دو لڑکے بھی ہیں۔ متھرا کے مُنہ سے اتنا نکلنا تھا کہ بڈھے پر جیسے بھوت چڑھ گیا۔ جتنا لالچی ہے، اتنا گسیل بھی ہے۔ بنا لئے نہ مانے گا۔"

دونوں گھر چلیں۔ سونا کے سر پر پڑا ہار ستا اور بوٹے کا بھاری بوجھ تھا۔ مگر اس وقت تو وہ اُسے پھول سے بھی ہلکا لگ رہا تھا۔ اس کے دل میں جیسے خوشی اور زندہ دلی کا سوتا کھل گیا تھا۔ متھرا کی وہ مردانہ مورت سامنے کھڑی تھی اور وہ گویا اسے اپنے دل میں بٹھا کر اس کے پیروں کو آنسوؤں سے دھو رہی تھی۔ جیسے آسمانی روحیں اُسے گود میں اُٹھائے آسمان میں پھیلی ہوئی سرخی میں لئے چلی جا رہی تھیں!۔

اُسی رات سونا کو شدت کا بخار ہو آیا۔

تیسرے دن گوری مہتو نے نائی کے ہاتھ یہ خط بھیجا:۔

"سری سری سرب اُپماجوگ سری ہوری مہتو کو گوری رام کا رام رام بانچنا۔ آگے جو ہم لوگوں میں دہیج کی بات چیت ہوئی تھی۔ اُس پر ہم نے من سے بچار کیا تو سمجھ میں آیا کہ لین دین سے بر اور کنیا دونوں ہی کے گھر والے جیر بار ہوتے ہیں۔ جب ہمارا تمہارا ناتا ہو گیا تو ہمیں ایسا برتاؤ کرنا چاہئے کہ کسی کو نہ اکھرے۔ تم دہیج کی کوئی چنتا مت کرنا۔ ہم تم کو سوگند دیتے ہیں۔ جو کچھ موٹا جھین ہو سکے، براتیوں کو کھلا دینا۔ ہم تو وہ بھی نہ مانگیں گے۔ رسد کا بندوبست ہم نے کر لیا ہے۔ ہاں، تم خوشی سے جو ہماری کھاطر کرو گے وہ سر جھکا کر منجور کریں گے۔"

ہوری نے خط پڑھا اور دوڑتے ہوئے اندر جا کر دھنیا کو سنایا۔ خوشی کے مارے اُچھلا پڑتا تھا۔ مگر دھنیا کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی بیٹھی رہی۔ ایک لمحہ بعد بولی "یہ گوری مہتو کی بھلمنسی ہے پر ہمیں بھی تو اپنی مرجاد کا نباہ کرنا ہے۔ سنسار کیا کہے گا؟ روپیہ ہاتھوں کا میل ہے۔ اس کے لئے گھر کی مرجاد نہیں چھوڑی جا سکتی۔ جو کچھ ہم سے ہو سکے گا ہم دیں گے اور گوری مہتو کو لینا پڑے گا۔ تم یہی جواب لکھ دو۔ ماں باپ کی کمائی میں کیا لڑکی کا کوئی حصّہ نہیں ہے؟ نہیں، لکھنا کیا ہے۔ چلو میں نائی سے سندیسہ کہلائے دیتی ہوں۔"

ہوری بدحواس سا آنگن میں کھڑا تھا اور دھنیا اس فیاضی کے جواب میں جو گوری نے کی تھی، اپنا سندیسہ کہہ رہی تھی۔ پھر اُس نے نائی کو شربت پلایا اور رُخصتانہ دے کر رُخصت کیا۔

وہ چلا گیا تو ہوری نے کہا "یہ تو نے کیا کر ڈالا دھنیا؟ تیرا سُبھاؤ آج تک میری سمجھ میں نہ آیا۔ تو آگے بھی چلتی ہے، پیچھے بھی چلتی ہے۔ پہلے تو اس بات پر لڑ رہی تھی کہ کسی سے ایک پیسہ اُدھار مت لو، کچھ دینے دلانے کا کام نہیں ہے اور جب بھگوان نے گوری کے دل میں بیٹھ کے یہ چٹھی لکھوائی تو تو نے گھرانے کی مرجاد کا راگ چھیڑ دیا۔ تیرا بھید بھگوان ہی جانیں۔"

دھنیا بولی "منہ دیکھ کر بیڑا دیا جاتا ہے، جانتے ہو کہ نہیں؟ تب گوری اپنی سان دکھاتے تھے، اب وہ بھلمنسی دکھاتے۔ اینٹ کا جواب چاہے پتھر ہو مگر پیار کا جواب تو گالی نہیں ہے۔"

ہوری نے ناک سکیڑ کر کہا "تو دکھا اپنی بھلمنسی! دیکھوں کہ کہاں سے روپئے لاتی ہے۔"

دھنیا آنکھیں مٹکا کر بولی "روپیہ لانا میرا کام نہیں ہے، تمہارا کام ہے۔"

"میں تو دُلاری ہی سے لوں گا۔"

"لے لو اُسی سے۔ سود تو سبھی لیں گے۔ جب ڈوبنا ہی ہے تو کیا گڑھی اور کیا گنگا۔"

ہوری باہر جا کر حقّہ پینے لگا۔ کتنے مزے سے گلا چھوٹا جاتا تھا۔ مگر دھنیا جب جان چھوڑے تب تو۔ جب دیکھو اُلٹا ہی چلتی ہے۔ اسے جیسے کوئی بھوت سوار ہو جاتا ہے گھر کی دُردسا دیکھ کر بھی اس کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔

(۲۵)

بھولا اُدھر دوسری سگائی کر لائے تھے۔ عورت کے بغیر اُن کی زندگی بے کیف تھی۔ جب تک جھنیا تھی اُنھیں حقّہ پانی دے دیتی تھی اور وقت پر کھانے کو بلا لے جاتی تھی۔ اب بے چارے بے بس سے ہو گئے تھے۔ بہوؤں کو گھر کے کام کاج ہی سے چھٹی نہ ملتی تھی۔ اُن کی خدمت کیا کرتیں؟ اس لئے اب سگائی بہت ضروری ہو گئی تھی۔ اتفاق سے ایک جوان بیوہ مل گئی جس کے شوہر کو مرے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ ایک لڑکا بھی تھا۔ بھولا کی رال ٹپک پڑی اور جھٹ پٹ نسکار مار لائے۔ جب تک سگائی نہ ہوئی اس کا گھر کھود ڈالا۔

ابھی تک اُن کے گھر میں جو کچھ تھا وہ بہوؤں کا تھا۔ جو چاہتی تھیں کرتی تھیں، جیسے چاہتی تھیں رہتی تھیں۔ جنگی جب سے اپنی عورت کو لے کر لکھنؤ چلا گیا تھا اُس وقت سے کامتا ہی کی عورت گھر کی مالکہ تھی۔ پانچ چھ مہینے ہی میں اُس نے تیس چالیس روپئے اپنے ہاتھ میں کر لئے تھے۔ سیر آدھ سیر دودھ ہی چُرا کر بیچ لیتی تھی۔ اب مالکہ ہوئی اُس کی سوتیلی ساس۔ اُس کی حکومت بہو کو بُری لگتی تھی۔ آئے دن دونوں میں جھگڑا ہوتا رہتا تھا، حتّٰی کہ عورتوں کے پیچھے بھولا اور کامتا میں بھی کہا سُنی ہو گئی۔ جھگڑا اتنا بڑھا کہ الگاوے کی نوبت آ گئی اور یہ ریت سدا سے چلی آئی ہے کہ الگاوے کے وقت مار پیٹ بھی ضرور ہوتی ہے یہاں بھی اُسی قاعدے پر عمل کیا گیا۔ کامتا جوان آدمی تھا۔ بھولا کا اس پر جو کچھ دباؤ تھا وہ باپ کے ناتے، مگر نئی عورت لا کر بیٹھے سے عزّت پانے کا اب اُسے کوئی حق نہ رہا۔ کم از کم کامتا اسے تسلیم نہ کرتا تھا اُس نے بھولا کو ٹھیک کر کے لاتیں لگائیں اور گھر سے نکال باہر کر دیا۔ گھر کی چیزیں چھونے بھی نہ دیں۔ گاؤں والوں میں

بھی کسی نے بھولا کی حمایت نہ کی۔ نئے بیاہ نے انھیں نکو بنا دیا تھا۔ رات تو انھوں نے کسی طرح ایک پیڑ کے نیچے کاٹی، مگر صبح ہوتے ہی نوکھے رام کے یہاں جا پہنچے اور فریاد کی۔ بھولا کا گاؤں بھی انھیں کے حلقے میں تھا اور حلقے بھر کے مالک مکھیا جو کچھ تھے وہی تھے۔ نوکھے رام کو بھولا پر تو کیا رحم آتا، مگر ان کے ساتھ ایک رنگیلی چھبیلی عورت دیکھی تو فوراً جگہ دینے پر راضی ہو گئے۔ جہاں ان کی گائیں بندھتی تھیں، وہیں ایک کوٹھری رہنے کو دے دی۔ اپنے جانوروں کی دیکھ بھال، سانی پانی کے لئے انھیں یکایک ایک واقف کار آدمی کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ بھولا کو تین روپے ماہوار اور ایک سیر روزانہ اناج پر رکھ لیا۔

نوکھے رام ناٹے، موٹے، چندرے، لمبی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے آدمی تھے۔ بڑا سا پگڑ باندھتے، اونچا کرتہ پہنتے اور جاڑوں میں لحاف اوڑھ کر باہر آتے جاتے تھے۔ انھیں تیل کی مالش کرانے میں بڑا مزا آتا تھا۔ پس ان کے کپڑے ہمیشہ میلے چکٹے رہتے تھے۔ ان کا کنبہ بہت بڑا تھا۔ سات بھائی اور ان کے بال بچے سبھی تو ان کے سہارے تھے۔ خود ان کا لڑکا نویں درجے میں انگریزی پڑھتا تھا اور اس کے بابو پن کا ٹھاٹ باٹ نبھانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ رائے صاحب سے انھیں صرف بارہ روپے تنخواہ ملتی تھی مگر خرچ سو دو سو سے کوڑی کم نہ تھا۔ اس لئے اسامی کسی طرح ان کے چنگل میں پھنس جاتے تو اسے خوب چوسے بغیر نہ چھوڑتے تھے۔ پہلے جب دس روپے تنخواہ ملتی تھی، تب اسامیوں سے اتنی نوچ کھسوٹ نہ کرتے تھے مگر جب سے بارہ روپے ہو گئے تھے اس وقت سے ان کی ہوس اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس لئے رائے صاحب ان کی ترقی نہ کرتے تھے۔

گاؤں میں اور تو سبھی کسی نہ کسی صورت میں ان کا دباؤ مانتے تھے، یہی کہ داتادین اور جھنگری سنگھ بھی ان کی خوشامد کرتے تھے۔ صرف پٹیشوری ان سے خم ٹھونکنے کو ہمیشہ

تیار رہتے تھے۔ نوکھے رام کو اگر یہ زعم تھا کہ ہم برہمن ہیں اور کایستھوں کو انگلی پر نچاتے ہیں تو پٹیشوری کو گھمنڈ تھا کہ ہم کایستھ ہیں۔ قلم کے بادشاہ۔ اس میدان میں کوئی دوسرا ہم سے کیا بازی لے جائے گا۔ پھر وہ زمیندار کے نوکر نہیں بلکہ ایسی سرکار کے نوکر ہیں جس کے راج میں آفتاب کبھی نہیں غروب ہوتا۔ نوکھے رام اگر ایکادشی کو برت رکھتے ہیں اور پانچ برہمنوں کو کھلاتے ہیں تو پٹیشوری ہر پورنماشی کو ستنارائن کی کتھا سنیں گے اور دس برہمنوں کو کھلائیں گے۔ جب سے ان کا بڑا لڑکا پٹرول ہو گیا تھا، نوکھے رام اس تاک میں رہتے تھے کہ ان کا لڑکا بھی کسی طرح دسواں درجہ پاس کر لے تو اُسے بھی کہیں نقل نویسی دلا دیں۔ اسی لئے حُکام کے پاس فصلی تحفے لے کر برابر سلام کرنے جایا کرتے تھے۔ پٹیشوری ایک اور بات میں بھی اُن سے بڑھے ہوئے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا وہ اپنی بیوہ کہارن کو رکھے ہوئے ہیں تو اب نوکھے رام کو بھی اپنی شان میں یہ کسر پوری کرنے کا موقع ملتا ہوا معلوم ہوا۔

بھولا کو ڈھارس دیتے ہوئے بولے "تم یہاں آرام سے رہو بھولا کسی بات کا کھٹکا نہیں۔ جو ضرورت ہو ہم سے آ کر کہو۔ تمہاری گھر والی ہے سو اُس کے لئے بھی کوئی نہ کوئی کام نکل آوے گا۔ بکھاروں میں اناج رکھنا، نکالنا، پچھوڑنا، پھٹکنا، کیا یہ سب تھوڑا کام ہے؟"

بھولا نے عرض کیا "ایک بار کامتا کو بُلا کر پوچھ لو کہ کیا باپ کے ساتھ بیٹے کا یہی برتاؤ ہونا چاہئے۔ گھر ہم نے بنوایا، گائے بھینسیں ہم نے لیں، اب اس نے سب کچھ سنبھال لیا ہے اور ہمیں نکال باہر کر دیا ہے۔ یہ انیاؤ نہیں تو کیا ہے؟ ہمارے مالک تو تم ہی ہو۔ تمہارے دربار سے اس کا نیاؤ ہونا چاہئے۔"

نوکھے رام نے سمجھایا "بھولا، تم اس سے لڑ کر جیت نہ پاؤ گے۔ اُس نے جیسا کیا ہے اُس کا ڈنڈ اُسے بھگوان دیں گے۔ بے ایمانی کر کے کوئی آج تک پھلا پھولا نہیں۔

دنیا میں بے ایمانی نہ ہوتی ہو تو اسے نرک کیوں کہا جاتا؟ یہاں نیائے اور دھرم کو کون پوچھتا ہے؟ بھگوان سب دیکھتے ہیں سنسار کا رتی رتی حال جانتے ہیں۔ تمہارے من میں اس سمے کیا بات ہے، یہ اُن سے کیا چھپا ہے؟ اسی سے تو انتر جامی کہلاتے ہیں۔ اُن سے بچ کر کوئی کہاں جائے گا؟ تم چپکے ہو کے بیٹھو۔ بھگوان کی اِچھا ہوئی تو یہاں تم اُس سے بُرے نہ رہو گے۔"

یہاں سے اُٹھ کر بھولا نے ہوری کے پاس جا کر اپنا دکھڑا رو دیا۔ ہوری نے اپنی بیتی سنائی "لڑکوں کی آج کل کچھ نہ پوچھو، بھولا بھائی! جنم کے پالو پوسو اور جوان ہوں تو بیری بن جائیں۔ میرے ہی گوبر کو دیکھو، ماں سے لڑ کر گیا اور برسوں ہو گئے، نہ چٹھی نہ پتری۔ اس کے لیکھے تو ماں باپ مر گئے۔ لڑکی کا بیاہ سر پر ہے پر اُس سے کوئی مطلب نہیں۔ کھیت رہن رکھ کر دو سو روپے لئے ہیں۔ اِجّت آبرو کا نباہ تو کرنا ہی ہوگا۔"

کامتا نے باپ کو نکال باہر تو کر دیا مگر اُسے معلوم ہونے لگا کہ بوڑھا کتنے کام کا آدمی تھا۔ سویرے اُٹھ کر سانی پانی کرنا، دودھ دوہنا، پھر دودھ لے کر بازار جانا، پھر وہاں سے آکر سانی پانی کرنا، پھر دودھ دوہنا، کوئی پندرہ روز میں اُس کا حلیہ بگڑ گیا۔ مرد عورت میں لڑائی ہوئی۔ عورت نے کہا کہ میں جان دینے کے لئے تمہارے گھر نہیں آئی ہوں، اگر میری روٹی تمہیں بھاری ہے تو میں اپنے گھر چلی جاؤں۔ کامتا ڈرا کہ یہ کہیں چلی جائے تو روٹی کا بھی ٹھکانا نہ رہے، اپنے ہی ہاتھ سے ٹھوکنا پڑے۔ آخر ایک نوکر رکھا مگر اُس سے کام نہ چلا۔ نوکر کھلی بھوسہ چُرا چُرا کر بیچنے لگا تو اسے الگ کیا۔ پھر عورت مرد میں لڑائی ہوئی۔ عورت روٹھ کر میکے چلی گئی۔ کامتا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہار کر بھولا کے پاس اور خوشامد کرنے لگا۔

"دادا مجھ سے جو کچھ بھول چوک ہوئی چھما کرو۔ اب چل کر گھر سنبھالو۔ جیسے تم

رکھو گے ویسے ہی رہوں گا۔"

بھولا کو یہاں مزدوروں کی طرح رہنا کھل رہا تھا۔ پہلے مہینے دو مہینے اُن کی جو خاطر ہوتی وہ اب نہ تھی۔ نوکھے رام کبھی کبھی اُن سے چلم بھرنے چارپائی بچھانے کو بھی کہتے تھے، اُس وقت بے چارہ بھولا زہر کا گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔ اپنے گھر میں لڑائی جھگڑا بھی ہو تو کسی کی سیوا ٹہل تو نہ کرنی پڑے گی۔

اُس کی عورت نُہرا نے یہ تجویز سُنی تو اینٹھ کر بولی "جہاں سے لات کھا کر آئے وہیں پھر جاؤ گے؟ تمھیں لاج بھی نہیں آتی!"

بھولا نے کہا "تو یہیں کون سنگھاسن پر بیٹھا ہوا ہوں۔"

نُہرا نے مٹک کر کہا "تمہیں جانا ہو تو جاؤ، میں نہیں جاتی۔"

بھولا جانتا تھا کہ نُہرا مخالفت کرے گی۔ اس کا سبب بھی وہ کچھ کچھ سمجھتا تھا اور کچھ کچھ دیکھتا بھی تھا۔ اُس کے یہاں سے بھاگنے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ یہاں اس کی تو کوئی بات نہ پوچھتا تھا مگر نُہرا کی بڑی خاطر ہوتی تھی۔ پیادے اور لشکرے تک اُس کا دباؤ مانتے تھے۔ اُس کا جواب سُن کر بھولا کو غصّہ آیا مگر کرتا کیا؟ نُہرا کو چھوڑ کر جانے کی ہمّت اُس میں ہوتی تو نُہرا ابھی جھک مار کر اُس کے پیچھے پیچھے چلی جاتی۔ اُسے یہاں تنہا رکھنے کی ہمّت نوکھے رام میں نہ تھی، وہ ٹٹی کی آڑ سے شکار کھیلنے والے آدمی تھے مگر نُہرا بھولا کے مزاج سے واقف ہو چلی تھی۔

بھولا منّت کر کے بولا "دیکھ نُہری! تنگ مت کر، اب تو وہاں ہو دیں بھی نہیں ہیں، تیرے ہی ہاتھ میں سب کچھ رہے گا۔ یہاں مجوری کرنے سے برادری میں کتنی بدنامی ہو رہی ہے، یہ سوچ!"

نُہرا نے انگوٹھا دکھا کر کہا "تمہیں جانا ہو جاؤ، میں تمہیں روک تو نہیں رہی

ہوں۔ تمہیں بیٹے کی لائیں پیاری لگتی ہوں۔ مجھے تو نہیں لگتیں۔ میں اپنی مجبوری میں لگن ہوں!"

بھولا کو رہنا پڑا اور کامتا اپنی عورت کی خوشامد کر کے اُسے منا لایا۔ اِدھر نہرا کے بارے میں بھی سرگوشیاں ہوتی رہیں۔

"نہرا نے آج گلابی ساڑی پہنی ہے۔ اب کیا پوچھنا ہے۔ چاہیے نت نئی ساڑی پہنے۔ سیّاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا؟ بھولا کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کیا؟"

سوبھا بڑا پُر مذاق تھا۔ سارے گاؤں کا مسخرا بلکہ نارد۔ ہر بات کی ٹوہ لگاتا رہتا تھا۔ ایک دن نہری اُسے گھر میں مل گئی۔ کچھ ہنسی کر بیٹھا۔ نہری نے نوکھے رام سے بجڑ دیا۔ سوبھا کی چوپال میں طلبی ہوئی اور ایسی ڈانٹ پڑی کہ عمر بھر نہ بھولے گا۔

ایک دن لالا ایشوری پرشاد کی شامت آگئی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ لالا باغیچے میں توڑوا رہے تھے۔ نہرا اپنی بھٹی اُدھر سے نکلی۔ لالا نے پکارا "او نہرا رانی! اِدھر آؤ، تھوڑے سے آم لیتی جاؤ، بڑے میٹھے ہیں!"

نہرا کو شک ہوا کہ لالا میرا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ اُسے اب گھمنڈ ہونے لگا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ لوگ اُسے زمیندارنی سمجھیں اور اُس کی عزت کریں۔ مغرور شخص عموماً شکّی ہوا کرتا ہے اور جب دل میں چور ہو تو یہ شک اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر کیوں ہنسا؟ سب لوگ مجھے دیکھ کر جلتے کیوں ہیں؟ میں کسی سے کچھ مانگنے نہیں جاتی۔ کون بڑی ستونتی ہے؟ تنک میرے سامنے آئے تو دیکھوں!

اتنے دنوں میں نہری گاؤں کے بھیدوں سے واقف ہو چکی تھی۔ یہی لالا کہارن کو رکھے ہوئے ہیں اور مجھے ہنستے ہیں! انھیں کوئی کچھ نہیں کہتا، بڑے آدمی ہیں نا۔ نہری غریب ہے، کم ذات کی ہے اسی لئے سبھی اُس کی ہنسی اُڑاتے ہیں اور جیسا

باپ ہے ویسا ہی بیٹیا۔ انہیں کا دمیسوری تو سلیا کے پیچھے پاگل بنا پھرتا ہے۔ چماریوں پہ تو گِدھ کی طرح ٹوٹتے ہیں، اس پہ دعویٰ ہے کہ ہم اونچے ہیں۔

اُس نے وہیں کھڑے ہو کر کہا "تم ایسے دانی کب سے ہو گئیں لالا؟ پاؤ تو دوسروں کے تھالی کی روٹی اُڑا جاؤ۔ آج بڑے آم والے ہوئے ہیں۔ مجھ سے چھیڑ کھانی کی تو اچھا نہ ہو گا، کہے دیتی ہوں!"

اوہو، اس اہیرن کا اتنا مزاج! لوکھے رام کو کیا پھانس لیا، سمجھتی ہے کہ ساری دنیا پر اسی کا راج ہے۔" بولے "تو تو ایسی چَہک رہی ہے نُہری جیسے اب کسی کو گاؤں میں نہ رہنے دے گی۔ ذرا جبان سنبھال کر بات کیا کر۔ اتنی جلدی اپنے کو بھول نہ جا۔"

"تو کیا تمہارے دُوارے پر کبھی بھیک مانگنے آئی تھی!"

"نوکھے رام نے چھا نہہ دھری ہوتی تو بھیک بھی مانگتی!"

نُہری کو لال مرچ سی لگ گئی۔ جو کچھ مُنہ میں آیا بکا "داری جار، مُنہ جھونسا" وغیرہ نہ جانے کیا کیا کہا اور اسی غصے میں بھری ہوئی اپنی کوٹھری میں گئی اور اپنا سامان نکال نکال باہر رکھنے لگی۔

لوکھے رام نے سُنا تو گھبرائے ہوئے آئے اور پوچھا "یہ کیا کر رہی ہو نُہری! کپڑے لتے کیوں نکال رہی ہو؟ کسی سے کچھ کہا کیا؟"

نُہرا مردوں کے نچانے کی حکمت جانتی تھی۔ اپنی لونا۔ گی میں اس نے یہی فن سیکھا تھا۔ نوکھے رام لکھے پڑھے آدمی تھے، قانون بھی جانتے تھے اور با بھی کتابیں بھی بہت پڑھی تھیں۔ بڑے بڑے وکیلوں بیرسٹروں کی جوتیاں سیدھی کی تھیں مگر اس گنوار نُہری کے ہاتھ کھلونا بنے ہوئے تھے۔ بھوئیں سکیڑ کر بولی "دوکا پھیر ہے کہ یہاں آ گئی پر اپنی آبرو نہ گنواؤں گی!"

براہمن آپے میں آ گیا۔ مونچھیں کھڑی کر کے بولا "تیری طرح جو تاکے اس کی آنکھیں نکال لوں!"

نہری نے لوہے کو گرم کر کے گھن جمایا "لالا ٹپیشوری جب دیکھو مجھ سے بے بات کی بات کیا کرتے ہیں۔ میں ہرجائی تھوڑے ہی ہوں کہ کوئی مجھے پیسے دکھائے؟ گاؤں بھر میں سبھی عورتیں تو ہیں پر کوئی اُن سے نہیں بولتا۔ جسے دیکھو وہ مجھی کو چھیڑتا ہے!"

لکھے رام پر بھوت سوار ہو گیا۔ اپنا موٹا ڈنڈا اُٹھایا اور آندھی کی طرح ہرہراتے ہوئے باغ میں پہنچ کر لگے للکارنے "آ جا بڑا مرد ہے تو! مونچھیں اکھاڑ لوں گا، کھود کر گاڑ دوں گا! نکل آ سامنے! اگر پھر کبھی نہری کو چھیڑا تو کھوپڑی چبا جاؤں گا۔ ساری پٹواریگری نکال دوں گا۔ جیسا آپ ہے ویسا ہی اوروں کو بھی سمجھتا ہے۔ تو ہے کس گھمنڈ میں!"

لالا ٹپیشوری سر جھکائے اور سانس روکے ہوئے بُت کی طرح کھڑے تھے۔ ذرا بھی زبان کھولی اور شامت آئی۔ اُن کی اتنی توہین زندگی میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ لوگوں نے انہیں تالاب کے کنارے رات کو گھیر کر خوب پیٹا تھا مگر گاؤں میں کسی کو خبر نہ ہوئی تھی۔ کسی کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ مگر آج تو سارے گاؤں کے سامنے اُن کا پانی اُتر گیا۔ کل جو عورت گاؤں میں ٹھکانا کھوجتی آئی تھی، آج سارے گاؤں پر اس کا دبدبہ تھا۔ اب کسی کی ہمت ہے جو اُسے چھیڑ سکے؟ جب ٹپیشوری کچھ نہ کر سکے تو دوسروں کی بساط ہی کیا ہے؟

اب نہری گاؤں کی رانی تھی۔ اُسے آتا دیکھ کر کسان لوگ اُس کے راستے سے ہٹ جاتے تھے۔ یہ کھلا ہوا راز تھا۔ اُس کی تھوڑی سی پوجا کر کے لکھے رام سے بہت کام نکل سکتا ہے۔ کسی کو بٹوارا کرانا ہو، لگان کے لئے مہلت مانگنی ہو، مکان بنانے کے لئے زمین کی ضرورت ہو، نہری کی پوجا کئے بغیر اس کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ کبھی

کبھی وہ اچھے اچھے اسامیوں کو ڈانٹ بتا دیتی تھی۔ اسامی ہی نہیں اب وہ کارکن صاحب پر بھی رُعب جمانے لگی تھی۔

بھولا اُس کے محتاج بن کر نہ رہنا چاہتے تھے۔ عورت کی کمائی کھانے سے زیادہ بُرا اُن کی نظر میں دوسرا کام نہ تھا۔ اُنھیں کُل تین روپئے ماہوار ملتے تھے اور وہ اُن کے ہاتھ نہ لگتے تھے۔ نہری اوپر ہی اوپر اُٹھا دیتی تھی۔ اُنھیں تمباکو پینے کو ایک کوڑی کوڑی میسّر نہیں اور نہری دو آنے کے روزانہ پان کھا جاتی تھی۔ جسے دیکھو وہی ان پر رُعب جماتا تھا۔ پیادے اُن سے چلم بھرواتے اور لکڑی کٹواتے۔ بیچارہ دن بھر کا تھکا ماندا آتا اور حدوانے پر پیڑ کے نیچے ایک جھلنگی چارپائی پر پڑ رہتا۔ کوئی ایک لوٹا پانی دینے والا بھی نہیں۔ دوپہر کی باسی روٹیاں رات کو کھانی پڑتیں اور وہ بھی پانی اور نمک کے ساتھ۔

آخر تنگ ہو کر اُس نے گھر میں کامتا کے ساتھ رہنے کا ارادہ کیا۔ کچھ نہ ہوگا، ایک ٹکڑا روٹی تو مل ہی جائے گی۔ اپنا گھر تو ہے۔

نہری بولی "میں وہاں کسی کی گلامی کرنے نہ جاؤں گی"۔

بھولا نے جی کڑا کر کے کہا "تمہیں جانے کو تو میں نہیں کہتا۔ میں تو اپنے جانے کو کہتا ہوں"۔

تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤگے؟ کہتے لاج نہیں آتی؟"

"لاج تو گھول کر پی گیا"۔

"لیکن میں نے تو اپنی لاج نہیں پی۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے"۔

"تو اپنے من کی ہے، تو میں تیری گلامی کیوں کروں؟"

"پنچایت کر کے منھ میں کالکھ لگاؤں گی، اتنا سمجھ لینا"۔

"کیا ابھی کچھ کم کالکھ لگی ہے؟ کیا اب بھی مجھے دھوکے میں رکھنا چاہتی

ہے؟"

"تم تو ایسا تاؤ دکھا رہے ہو جیسے مجھے روج گہنے ہی تو گڑھواتے ہو۔ تو یہاں نہری کسی کا تاؤ سہنے والی نہیں ہے"۔

بھولا بھلا کر اُٹھے اور سرہانے سے لکڑی اُٹھا کر چلے کہ نہری نے لپک کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے طاقت ور پنجے سے نکلنا بھولا کیلئے مشکل تھا۔ چپکے سے قیدی کی طرح بیٹھ گئے۔ ایک وقت تھا جب عورتوں کو وہ انگلیوں پر نچایا کرتے تھے۔ آج وہ ایک عورت کے پنجے میں پھنسے ہوئے ہیں اور کسی طرح نکل نہیں سکتے۔ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر کے وہ پردہ فاش نہیں کرنا چاہتے، اپنی طاقت کا اندازہ اُنہیں ہو گیا ہے۔ مگر وہ کیوں اُس سے نڈر ہو کر نہیں کہہ دیتے کہ تو میرے کام کی نہیں ہے اور میں تجھے چھوڑتا ہوں۔ پنچایت کی دھمکی دیتی ہے تو کیا پنچایت کوئی ہوا ہے۔ اگر تجھے پنچایت کا ڈر نہیں تو میں کیوں پنچایت سے ڈروں؟۔

لیکن یہ خیال لفظوں میں آنے کی ہمت نہ کر سکتا تھا۔ نہری نے جیسے اُن پر کوئی جادو کر دیا تھا۔

(۲۹)

لالہ پٹیشوری پٹواریانہ اوصاف کے مجسمہ تھے۔ وہ یہ نہ دیکھ سکتے تھے کہ کوئی اسامی اپنے دوسرے بھائی کی اِنچ بھر بھی زمین دبالے اور نہ وہ یہی دیکھ سکتے تھے کہ اسامی کسی مہاجن کے روپے دبالے۔ گاؤں کے سبھی لوگوں کے فوائد کی حفاظت کرنا ان کا اوّلین فرض تھا۔ سمجھوتہ یا میل جول پر ان کا اعتقاد نہ تھا۔ یہ تو مُردہ دلی کی علامتیں ہیں۔ وہ کشمکش کے قائل تھے جو زندگی کی علامت ہے۔ آئے دن اس زندگی کو اُبھارنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ایک نہ ایک شگوفہ چھوڑتے رہتے

تھے۔ منگرو ساہ پران دنوں اُن کی خاص مہربانی تھی۔ وہ گاؤں کا سب سے زیادہ دولتمند آدمی تھا۔ مگر مقامی سیاسیات میں بالکل حصّہ نہ لیتا تھا۔ رُعب یا اقتدار کا لالچ اُسے نہ تھا۔ مکان بھی اس کا گاؤں کے باہر تھا جہاں اُس نے ایک باغ اور ایک کنواں اور ایک چھوٹا سا شوالہ بنوا لیا تھا۔ بال بچّہ کوئی نہ تھا اس لئے لین دین بھی کم کر دیا تھا اور زیادہ تر پوجا پاٹ ہی میں لگا رہتا تھا۔ کتنے ہی اسامیوں نے اس کے روپئے ہضم کر لئے تھے مگر اُس نے کسی پر نالش نہیں کی۔ ہوری پر بھی اس کے سود سمیت تقریباً ڈیڑھ سو ہو گئے تھے مگر نہ ہوری کو قرض ادا کرنے کی کوئی فکر تھی اور نہ منگرو کو اُسے وصول کرنے کی۔ دو چار بار تقاضا کیا۔ ڈانٹ بھی بتائی، مگر ہوری کی عادت دیکھ کر چُپ ہو بیٹھا۔ ایکے اتفاق سے ہوری کی ایکھ گاؤں بھر کے اوپر تھی۔ کچھ نہیں تو اس کے دو ڈھائی سو سیدھے ہو جائیں گے، لوگوں کو ایسا اندازہ تھا۔ پٹیشوری نے منگرو کو سمجھایا کہ اگر اس وقت ہوری پر دعویٰ کر دیا جائے تو سب روپئے وصول ہو جائیں۔ منگرو اتنا رحیم نہیں جتنا کاہل تھا۔ جھنجھٹ میں نہ پڑنا چاہتا تھا۔ مگر جب پٹیشوری نے ذمّہ لیا کہ اسے ایک دن بھی کچہری نہ جانا پڑے گا، نہ کوئی اور تکلیف ہوگی، بیٹھے بٹھائے اس کی ڈگری ہو جائے گی، تو وہ نالش کرنے پر راضی ہو گیا اور عدالتی صرفہ کے لئے روپئے بھی دے دیئے۔ ہوری کو پتہ بھی نہ تھا کہ یہاں کھچڑی پک رہی ہے۔ کب دعویٰ دائر ہوا اور کب ڈگری ہوئی، اسے بالکل معلوم نہ ہوا۔ جب قرق امین اُس کی ایکھ نیلام کرنے آیا تب اُسے خبر ہوئی۔ سارا گاؤں کھیت کے کنارے جمع ہو گیا۔ ہوری منگرو ساہ کے پاس دوڑا اور دھنیا پٹیشوری کو گالیاں دینے لگی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ سب کام پٹیشوری ہی کا ہے۔ مگر منگرو ساہ پوجا پر تھے، مل نہ سکے اور دھنیا گالیوں کی برکھا کر کے بھی پٹیشوری کا کچھ بگاڑ نہ سکی۔ اُدھر ایکھ ڈیڑھ سو روپئے میں نیلام ہو گئی اور بولی بھی منگرو ہی کے نام پر ختم ہوئی۔ کوئی دوسرا آدمی نہ

بول سکا۔ دانا دین میں بھی دھنیا کی گالیاں سننے کی ہمت نہ تھی۔

دھنیا نے ہوری کو اکسا کر کہا "بیٹھے کیا ہو، جا کر پٹواری سے پوچھتے کیوں نہیں کہ یہی دھرم ہے تمہارا گاؤں گھر کے لوگوں کے ساتھ؟"

ہوری نے عاجزانہ کہا "پوچھنے کے لئے تم نے منہ بھی رکھا ہو۔ تیری گالیاں کیا انھوں نے نہ سنی ہوں گی؟"

"جو گالی سننے کا کام کرے گا اسے گالی ملے گی ہی"

"تو گالیاں بھی دے گی اور بھائی چارہ بھی نباہے گی؟"

"دیکھوں گی کہ میرے کھیت کے پاس کون آتا ہے؟"

"بل والے آکر کاٹ لے جائیں گے۔ تو تو کیا کرے گی اور میں کیا کروں گا؟ گالیاں دے کر اپنی جیبھ کی کھجلی چاہے مٹا لے"

"میرے جیتے میرا کھیت کوئی کاٹ لے جائے گا؟"

"ہاں ہاں، تیرے اور میرے جیتے۔ سارا گاؤں مل کر بھی اسے نہیں روک سکتا۔ اب وہ چیز میری نہیں، منگرو ساہ کی ہے"

"منگرو ساہ نے مر مر کر جیٹھ کی دوپہری میں سنچائی اور گوڑائی کی تھی؟"

"وہ سب تو نے کیا، مگر اب وہ چیز منگرو ساہ کی ہے ہم ان کے کرج دار نہیں ہیں؟"

ایکھ تو گئی مگر اس کے ساتھ ایک نیا مسئلہ آپڑا۔ دلاری اسی ایکھ پر روپے دینے کو تیار ہوئی تھی۔ اب وہ کس ضمانت پر روپے دے؟ ابھی اس کے پہلے ہی کے دو سو پڑے ہوئے تھے۔ سوچا تھا کہ ایکھ کے پرانے روپے مل جائیں گے تو نیا حساب چلنے لگے گا۔ اس کی نظر میں ہوری کی ساکھ دو سو تک کی تھی۔ اس سے زیادہ دینا جوکھم تھا۔ سہاگ سر پہ تھا۔ تاریخ طے ہو چکی تھی۔ گوری مہتو نے ساری تیاریاں

کر لی ہوں گی۔ اب بیاہ کا ٹلنا ناممکن تھا۔ ہوری کو ایسا غصہ آتا تھا کہ جا کر دُلاری کا گلا گھونٹ دے۔ جتنی منت سماجت ہو سکتی تھی وہ کر چکا، مگر وہ پتھر کی دیوی ذرا بھی نہ پسیجی۔ اُس نے چلتے چلتے ہاتھ جوڑ کر کہا "دُلاری! میں تمہارے روپئے لے کر بھاگ نہ جاؤں گا۔ ابھی جلد مرا ہی جاتا ہوں۔ کھیت ہیں، پیڑ ہیں، گھر ہے، جوان لڑکا ہے، تمہارے روپئے مارے نہ جائیں گے۔ میری مرجاد جا رہی ہے، اِسے سنبھالو!" مگر دُلاری نے کاروبار میں رحم کی شمولیت منظور نہ کی۔ اگر کاروبار کو وہ رحم کی صورت دے سکتی تو اُسے کوئی اعتراض نہ ہوتا، مگر رحم کو کاروباری صورت دینا اس نے نہ سیکھا تھا۔

ہوری نے گھر آ کر دھنیا سے کہا "اب؟"

دھنیا نے اسی پر دل کا غبار نکالا "یہی تو چاہتے تھے!"

ہوری نے زخمی آنکھوں سے دیکھا "میرا ہی دوش ہے؟"

"کسی کا دوش ہو، پر ہوئی تو تمہارے من کی!"

"تیری اِچھا ہے کہ جمین رہن رکھ دوں؟"

"جمین رہن رکھ دو گے تو کرو گے کیا؟"

"مجوری!"

مگر زمین دونوں کو یکساں عزیز تھی۔ اُسی پر تو ان کی عزت اور آبرو قائم تھی جس کے پاس زمین نہیں وہ گرہست نہیں، مزدور ہے۔

ہوری نے کچھ جواب نہ پا کر پوچھا، "تو کیا کہتی ہے؟"

دھنیا نے زخمی گلے سے کہا "کہنا کیا ہے۔ گدھ بھات کھانے آئیں گے تو ایک جون کھلا کر سبیرے لڑکی بدا کر دینا۔ دُنیا ہنسے گی تو ہنس لے۔ بھگوان کی یہی اچھا ہے کہ ہماری ناک کٹے اور ہمارے منہ میں کالکھ لگے تو ہم کیا کریں گے؟"

دفعتاً ہری چونری پہنے سامنے سے جاتی ہوئی نظر پڑی۔ ہوری کو دیکھتے

ہی اُس نے ذرا سا گھونگھٹ نکال لیا۔ اس سے سمدھی کا ناتا مانتی تھی۔

دھنیا سے اس کی شناسائی ہو چکی تھی۔ اُس نے پکارا ”آج کدھر چلیں سمدھن؟ آؤ، بیٹھو۔“

نہری نے فتح پائی تھی اور اب رائے عامہ کو اپنی موافقت میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آکر کھڑی ہو گئی۔

دھنیا نے اسے سر سے پیر تک نقادانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا ”آج ادھر کیسے بھول پڑیں؟“

نہری نے انکسار سے کہا ”ایسے ہی تم لوگوں سے ملنے چلی آئی۔ لڑکی کا بیاہ کب تک ہے؟“

دھنیا شبہ سے بولی ”بھگوان مالک ہیں، جب ہو جائے۔“

”میں نے تو سُنا کہ اسی لگن میں ہوگا۔ ساعت ٹھیک ہو گئی ہے؟“

”ہاں، ساعت تو ٹھیک ہو گئی ہے۔“

”مجھے بھی نیوتہ دینا۔“

”تمہاری تو لڑکی ہے، نیوتہ کیسا؟“

”دہیج کا سامان تو منگوا لیا ہوگا۔ جرا ہمیں بھی دکھاؤ۔“

دھنیا شش و پنج میں پڑی، کیا کہے؟ ہوری نے اُسے سنبھالا ”ابھی تو کوئی سامان نہیں منگایا ہے اور سامان کیا کرنا ہے، کُسا کنّیا تو دینا ہے۔“

نہری نے بے اعتباری سے دیکھا ”کُسا کنّیا کیوں دو گے مہتو؟ پہلی لڑکی ہے دل کھول کر کرو۔“

ہوری ہنسا، گویا کہہ رہا تھا کہ تمہیں تو چاروں طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہوگا مگر یہاں تو سوکھا ہی پڑا ہوا ہے۔ ”روپے پیسے کی تنگی ہے، کیا دل کھول کر کروں؟

تم سے کون پردہ ہے۔"

"لڑکا کماتا ہے۔ تم کماتے ہو، پھر بھی روپے پیسے کی تنگی؟ کیسے بِسوا اس آئے گا؟"

"بیٹا لایک ہوتا تو پھر کاہے کا رونا تھا؟ چھٹی پتری تک بھیجتا نہیں، تو روپے کیا بھیجے گا؟ یہ دوسرا سال ہے، ایک بھی چٹھی نہیں آئی۔"

اتنے میں سونا بیلوں کے واسطے سبز چارے کا ایک گٹھا سر پہ لئے ہوئے اور اپنے شباب کو آنچل سے چھپاتی ہوئی، معصومانہ رفتار سے آئی اور گٹھا وہیں ٹپک کر اندر چلی گئی۔

جھوری نے کہا "لڑکی تو سیانی ہو گئی ہے۔"

دھنیا بولی "لڑکی کی باڑھ تو رینڈ کی باڑھ ہے، نہیں ہے ابھی کتنے دن کی۔"

"بَر تو ٹھیک ہو گیا ہے نا؟"

"ہاں بَر تو ٹھیک ہے روپے کا بندوبست ہو گیا تو اسی مہینے میں بیاہ کر دیں گے۔"

جھوری اوچھی طبیعت کی تھی۔ ادھر اس نے جو تھوڑے روپے جمع کئے تھے وہ اس کے پیٹ میں اچھل رہے تھے۔ اگر وہ سونا کے بیاہ میں کچھ روپے دے دے تو کتنا نام رہے گا۔ سارے گاؤں میں اس کا چرچا ہو جائے گا۔ لوگ تعجب سے کہیں گے کہ جھوری نے اتنے روپے دے دیئے۔ بڑی دیوی ہے۔ ہوری اور دھنیا دونوں گھر گھر اس کا احسان گاتے پھریں گے۔ گاؤں میں اس کی مرجاد کتنی بڑھ جائے گی۔ وہ انگلی دکھانے والوں کا منہ سی دے گی۔ پھر کس کی ہمت ہے جو اس پر ہنسے یا بولیاں بولے؟ ابھی گاؤں بھر اس کا بیری ہے پھر گاؤں بھر اس کا ہمنوا ہو جائے گا۔

اس خیال سے اُس کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ بولی "تھوڑے بہت سے کام چلتا ہو تو مجھ سے لے لو، جب ہاتھ میں روپے آ جائیں تو لے دینا۔"

ہوری اور دھنیا نے اُس کی طرف دیکھا نہیں، نُہری مذاق نہیں کر رہی ہے۔ دونوں کی آنکھوں میں حیرت تھی، ممنونیت تھی، شک تھا اور شرم تھی۔ نُہری اتنی بُری نہیں ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔

نُہری نے پھر کہا "تمہاری اور ہماری آبرو ایک ہے۔ تمہاری ہنسی ہو تو کیا میری ہنسی نہ ہوگی؟ کیسے ہی ہو، پر اب تو تم ہمارے سمدھی ہو۔"

ہوری نے شرماتے ہوئے کہا "تمہارے روپے تو گھر ہی میں ہیں، جب کام پڑے گا لے لیں گے۔ آدمی اپنوں ہی کا بھروسہ کرتا ہے مگر اوپر سے بندوبست ہو جائے تو گھر کے روپے کیوں چھوئیں؟"

دھنیا نے تائید کی "ہاں اور کیا۔"

نُہری نے اپنا دا بچایا "جب گھر میں روپے ہیں تو باہر والوں کے سامنے ہاتھ کیوں پھیلاؤ؟ بیاج بھی دینا پڑے گا، اس پر اسٹام لکھو، گواہی کراؤ، دستوری دو اور خوشامد کرو۔ ہاں میرے روپے میں چھوت لگی ہو تو دوسری بات ہے۔"

ہوری نے سنبھالا "نہیں نہیں، جب گھر میں کام چل جائے گا تو باہر کیوں ہاتھ پھیلائیں گے؟ پر آپس والی بات ہے، کھیتی باڑی کا بھروسہ نہیں، تمہیں جلدی کوئی کام پڑا اور ہم روپے نہ دے سکے تو تمہیں بھی بُرا لگے گا اور ہماری جان بھی سنکٹ میں پڑے گی۔ اسی سے کہتا تھا، نہیں لڑکی تو تمہاری ہی ہے۔"

"مجھے ابھی روپے کی ایسی جلدی نہیں ہے۔"

"تو تم ہی سے لے لیں گے۔ کنیا دان کا پھل بھی کیوں باہر جائے؟"

"کتنے روپئے چاہیئے؟"

"تم کتنے دے سکو گی؟"

"سو میں کام چل جائے گا؟"

ہوری کو لالچ آیا بھگوان نے چھپر پھاڑ کر روپئے دیئے ہیں تو جتنا لے سکے کیوں نہ لے۔

"سو میں بھی چل جائے گا، پانسو میں بھی چل جائے گا، جیسا حوصلہ ہو!"

"میرے پاس کل دو سو روپئے ہیں۔ سو میں دے دوں گی!"

"تو اتنے میں بہت اچھی طرح کام چل جائے گا۔ آناج گھر میں ہے۔ مگر ٹھکرائن آج تم سے کہتا ہوں کہ میں تمہیں ایسی کبھی نہ سمجھتا تھا۔ آج کل کون کسی کی مدد کرتا ہے اور کس کے پاس ہے؟ تم نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا!"

چراغ جلنے کا وقت آ گیا تھا۔ ٹھنڈک پڑنے لگی تھی۔ زمین نے نیلی چادر اوڑھ لی تھی۔ دھنیا اندر جا کر انگیٹھی لائی اور سب تاپنے لگے۔ پوال کی روشنی میں چپیلی، رنگیلی، بدچلن نوہری ان کے سامنے برداں کی طرح بیٹھی تھی۔ اس وقت اسکی آنکھوں میں کتنی ہمدردی تھی، گالوں پر کتنی حیا اور ہونٹوں پر کتنی راست کلامی! کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کر کے نوہری اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی گھر چلی "اب دیر ہو رہی ہے۔ کل تم آ کر روپئے لے لینا مہتو!"

"چلو میں تمہیں پہنچا دوں۔"

"نہیں نہیں، تم بیٹھو، میں چلی جاؤں گی!"

"جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں کندھے پر بٹھا کر پہنچا آؤں۔"

نوکھے رام کی چوپال گاؤں کے دوسرے سرے پر تھی اور باہر باہر جانے کا راستہ صاف تھا۔ دونوں اسی راستے سے چلے اب چاروں طرف سناٹا تھا۔

نوہری نے کہا "تم انھیں سمجھا نہیں دیتے؟ رات دن کو کیوں سب سے لڑائی کیا کرتے ہیں۔ جب ان ہی لوگوں کے بیچ میں رہنا ہے تو ایسا رہنا چاہئے نا کہ چار آدمی اپنے ہو جائیں اور ان کا حال یہ ہے کہ سب سے لڑائی، سب سے جھگڑا۔ جب تم مجھے پردے میں نہیں رکھ سکتے اور مجھے دوسروں کی مجوری کرنی پڑتی ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں نہ کسی سے ہنسوں نہ بولوں اور نہ کوئی میری طرف تاکے نہ ہنسے؟ یہ سب تو پردے ہی میں ہو سکتا ہے۔ پوچھو، کوئی مجھے تاکتا ہے یا گھورتا ہے تو میں کیا کروں؟ اس کی آنکھیں تو نہیں پھوڑ سکتی۔ پھر میل محبت سے آدمی کے سو کام نکلتے ہیں۔ جیسا سمے دیکھو ویسا ہو جایا کرو۔ تمہارے گھر ہاتھی جھومتا تھا تو اب وہ تمہارے کس کام کا؟ اب تو تم تین روپے کے مجور ہو۔ میرے گھر سو بھینسیں لگتی تھیں پر اب تو مجور ہوں۔ مگر ان کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہیں۔ کبھی لڑکوں کے ساتھ رہنے کی سوچتے ہیں اور کبھی لکھنؤ جا کر رہنے کی سوچتے ہیں۔ میری ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

ہوری نے چاپلوسی کی "یہ بھولا کی سراسر نادانی ہے۔ بوڑھے ہوئے، اب تو انھیں سمجھ آنی چاہئے۔ میں سمجھا دوں گا۔"

"تو سویرے آجانا، میں روپے دے دوں گی۔"

"کچھ لکھا پڑھی ......"

"تم میرے روپے کھا نہ جاؤ گے، یہ میں جانتی ہوں۔"

اس کا گھر آگیا تھا۔ وہ اندر چلی گئی۔ ہوری گھر لوٹا۔

(۲۷)

گوبر کو شہر آنے پر معلوم ہوا کہ جس جگہ وہ اپنا خوانچہ لے کر بیٹھا تھا وہاں ایک دوسرا خوانچہ والا بیٹھنے لگا ہے اور گاہک اب گوبر کو بھول گئے ہیں۔ وہ بھی اب اسے

پنجرا سا لگتا تھا۔ جھنیا اب اس میں تنہا بیٹھی ہوئی رویا کرتی۔ لڑکا دن بھر آنگن میں یا دروازے کا عادی تھا۔ وہاں اس کے کھیلنے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ کہاں جائے؟ دروازے پر مشکل سے گز بھر کا راستہ تھا جہاں عفونت پھیل رہی تھی۔ گرمی میں کہیں باہر لیٹنے بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ لڑکا ماں کو ایک لمحہ کے لئے چھوڑتا نہ تھا۔ اور جب کچھ کھیلنے کو نہ ہو تو کچھ کھانے اور دودھ پینے کے علاوہ اور کیا کرے؟ گھر پر کبھی دھنیا کھلاتی، کبھی روپا، کبھی ہوری، کبھی پُنیا۔ یہاں تنہا، جھنیا تھی اور اُسے گھر کا سارا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔

اور گوبر شراب کے نشے میں بدمست تھا۔ اس کی آسودہ نہ ہونے والی خواہشیں نفس پرستیوں کے سمندر میں غرق ہو جانا چاہتی تھیں۔ کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔ خوانچہ لے کر جاتا تو گھنٹے ہی بھر میں لوٹ آتا۔ دلچسپی کا کوئی دوسرا سامان نہ تھا۔ پڑوس کے مزدور اور یکّے والے رات رات بھر تاش اور جُوا کھیلتے تھے۔ پہلے وہ بھی خوب کھیلتا تھا، مگر اب اس کے لئے صرف ایک ہی دلچسپ مشغلہ تھا اور وہ تھا جھنیا کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا۔ تھوڑے ہی دنوں میں جھنیا اس زندگی سے اُکتا گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ کہیں تخلیہ میں جاکر بیٹھے اور خوب بے فکری سے لیٹے، سوئے، مگر وہ تخلیہ کہیں نہ ملتا تھا۔ اُسے اب گوبر پر غصّہ آ رہا تھا۔ اُس نے شہری زندگی کی کتنی دلکش تصویر کھینچی تھی اور یہاں اس کال کوٹھری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بچّے پر بھی اُسے چڑھ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس کو مار کر باہر نکال دیتی اور اندر سے کواڑ بند کر لیتی۔ بچّہ روتے روتے بےدم ہو جاتا۔

اُس پر مصیبت یہ کہ اس کے دوسرا بچّہ ہونے والا تھا، اور کوئی آگے نہ پیچھے۔ اکثر سر میں درد ہوا کرتا۔ کھانے سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ ایسی سُستی تھی کہ گوشے میں خاموش پڑی رہے اور کوئی اس سے نہ بولے چالے۔ مگر یہاں گوبر کی بیدردانہ محبّت اپنے خیرمقدم کے لئے ہمیشہ دروازہ کھٹکھٹاتی رہتی تھی۔ اگرچہ دودھ نام کو بھی نہیں تھا پھر بھی تو سینے پر سوار رہتا۔ جسم کے ساتھ اُس کا دل بھی کمزور ہو گیا تھا۔ وہ جو ارادہ کرتی اُسے ذرا سے

اصرار پر فسخ کر دیتی۔ وہ لیٹی ہوتی اور للّو آ کر جبراً اُس کے سینے پر بیٹھ جاتا اور دودھ پینے کی کوشش کرتا۔ وہ اب دو سال کا ہو گیا تھا۔ بڑے تیز دانت نکل آئے تھے مُنہ میں دودھ نہ جاتا تھا تو وہ غصّے میں آ کر دانتوں سے کاٹ لیتا۔ مگر جھنیا میں اب اتنی سکت بھی نہ تھی کہ اُسے اپنے اوپر سے ڈھکیل دے اُسے ہر وقت موت سامنے کھڑی نظر آتی۔ شوہر اور بچہ کسی سے بھی اُسے رغبت نہ تھی سبھی اپنے مطلب کے یار ہیں۔ برسات کے دنوں میں جب للّو کو دست آنے لگے اور اُس نے دودھ پینا چھوڑ دیا تو جھنیا کو اپنے سر سے ایک بلا کے ٹل جانے کا سا احساس ہوا۔ مگر جب ایک ہفتے کے بعد لڑکا مر گیا تو اُس کی یاد مہر مادری سے زندہ ہو کر اُسے رُلانے لگی۔

جھنیا کو اب للّو کی یاد للّو سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ للّو جب تک سامنے تھا وہ اس سے جتنا سُکھ پاتی تھی اب اُس سے کہیں زیادہ سُکھ پاتی ہے۔ اب للّو اس کے دل میں آ بیٹھا تھا۔ مطمئن، ساکت، محبت سے معمور اور ہنستا ہوا! اُس کے تصور میں اب ایک پُر المناک سرور تھا۔ جس میں ظہور کا سیاہ سایہ نہ تھا۔ باہر والا للّو اس کے اندر والے للّو کا محض عکس تھا۔ وہ عکس سامنے نہ تھا جو باطل اور ناپائیدار تھا۔ حقیقی مجسمہ تو اُس کے اندر تھا جو اُس کی تمناؤں اور خیراندیشیوں سے زندہ ہو رہا تھا۔ دودھ کے بجائے وہ اُسے اپنا خون پلا پلا کر پال رہی تھی۔ اُسے اب وہ بند کوٹھری اور وہ بدبودار ہوا اور وہ دونوں وقت آگ کے سامنے جلنا، ان باتوں کا گویا احساس ہی نہ رہ گیا تھا۔ وہ میٹھی یاد دلنشیں ہو کر گویا اُسے قوت دے رہی تھی۔ جیتے جی جو اس کی زندگی کا بار تھا وہ مر کر اُس کی رُوح میں سما گیا تھا۔ اُس کی ساری ماہتا اندر کی طرف جا کر باہر کی جانب سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ گوبر دیر میں آتا ہے یا جلد، رغبت سے کھانا کھاتا ہے یا نہیں، خوش ہے یا رنجیدہ، ان باتوں کی اب اُسے بالکل فکر نہ تھی۔ گوبر کیا کماتا ہے اور کیسے خرچ کرتا ہے، اس کی بھی اسے پروا نہ تھی۔ اُس کی زندگی جو کچھ تھی اندر تھی،

باہر تو صرف ایک بے جان مشین تھی!

اس کے غم میں شریک ہوکر، اس کی اندرونی زندگی میں داخل ہوکر، گوبر اس کے پاس جا سکتا تھا اور اس کی زندگی کا جزو بن سکتا تھا۔ مگر وہ اس بیرونی زندگی کے خشک ساحل پر جاکر ہی پیاسا لوٹ آتا تھا!

ایک دن اس نے رُکھائی سے کہا "تو للو کے نام کو کب تک روئے جائے گی؟ چار پانچ مہینے تو ہو گئے!"

جھنیا نے سرد آہ بھر کر کہا "تم میرا دُکھ نہیں سمجھ سکتے۔ اپنا کام دیکھو۔ میں جیسی ہوں ویسی پڑی رہنے دو!"

"تیرے رونے دھونے سے للو لوٹ آوے گا؟"

جھنیا کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اٹھ کر دیگچی میں کچالو کے لئے آلو ابالنے لگی۔ اس نے گوبر کو ایسا سنگدل نہ سمجھا تھا۔

اس بیدردی نے للو کو اس کے دل میں اور بھی متحرک کر دیا۔ للو اسی کا ہے، اس میں کسی کا ساجھا نہیں، کسی کا حصہ نہیں۔ ابھی تک للو کچھ نہ کچھ اس کے دل کے باہر بھی تھا، گوبر کے دل میں بھی اس کا شائبہ تھا، مگر اب وہ پورے طور پر اسی کا تھا۔

گوبر نے خوانچے سے اداس ہوکر شکر مل میں نوکری کر لی تھی۔ مسٹر کھنا نے پہلے مل سے حوصلہ پاکر حال ہی میں یہ دوسرا مل کھول دیا تھا۔ گوبر کو وہاں بڑے سویرے جانا پڑتا اور دن بھر کے بعد جب وہ چراغ جلتے گھر واپس آتا تو اس کے بدن میں ذرا بھی جان نہ رہ جاتی۔ پہلے گھر پر بھی اسے کچھ کم محنت کرنی پڑتی تھی۔ مگر وہاں اسے ذرا بھی تکان نہ ہوتا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ ہنس بول بھی لیا کرتا تھا پھر اس کھلے میدان میں، کھلے آسمان کے نیچے گویا اس کی کمی بھی پوری ہو جاتی تھی۔

وہاں اس کا جسم چاہے جتنا کام کرے دل آنادہ رہتا تھا۔ آپ یہاں اتنی جسمانی محنت نہ ہونے پر بھی جلسے اُس طوفانی شور اور ہلچل کا اس پر بوجھ سا لدا رہتا تھا۔ یہ اندیشہ بھی لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب ڈانٹ پڑ جائے۔ سبھی مزدوروں کی یہی حالت تھی، سبھی تاڑی یا شراب میں اپنے جسمانی اور دماغی تکان کو ڈبویا کرتے تھے۔ گوبر کو بھی شراب کا چسکا پڑا۔ گھر آتا تو نشہ میں چور اور پہر رات گئے۔ اور آکر کوئی نہ کوئی بہانہ کھوج کر جھنیا کو گالیاں دیتا۔ گھر سے نکالنے لگتا۔ اور کبھی کبھی مار بھی دیتا۔

جھنیا کو اب یہ اندیشہ ہونے لگا کہ وہ داشتہ ہے۔ اسی لئے اس کی یہ ذلت ہو رہی ہے۔ منکوحہ ہوتی تو گوبر کی مجال نہ تھی کہ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا۔ برادری اُسے سزا دیتی، حقہ پانی بند کر دیتی۔ اُس نے کتنی بڑی غلطی کی کہ اس بے وفا کے ساتھ گھر سے نکل بھاگی۔ ساری دُنیا میں ہنسی بھی ہوئی اور ہاتھ کچھ نہ آیا۔ وہ گوبر کو اپنا دشمن سمجھنے لگی۔ نہ اس کے کھانے پینے کی پرواہ کرتی اور نہ اپنے کھانے پینے کی۔ جب گوبر اسے مارتا تو اُسے ایسا غصہ آتا کہ اس کا گلا چھرے سے کاٹ ڈالے۔ زچگی کا زمانہ بھی جیوں جیوں قریب آتا جاتا ہے، اُس کی تشویش بڑھتی جاتی ہے۔ اس گھر میں تو اس کا مرن ہو جائے گا کون اس کی دیکھ بھال کرے گا؟ کون اُسے سنبھالے گا؟ اور جو گوبر اسی طرح مارتا پیٹتا رہا تو اس کا جینا اور بھی کٹھن ہوگا۔

ایک روز وہ نل پر پانی بھرنے گئی تو پڑوس کی ایک عورت نے پوچھا "کے مہینے کا ہے رے؟"

جھنیا نے لجا کر کہا "کیا جانے دیدی، میں نے تو گنا ہی نہیں!"

دوہرے بدن کی، سیاہ فام، پستہ قد، بدصورت عورت تھی۔ اُس کا شوہر یکہ ہانکتا تھا اور وہ خود لکڑی کی دوکان کرتی تھی۔ جھنیا کئی بار اس کے یہاں سے لکڑی لائی تھی۔ اسی قدر تعارف تھا۔

مسکرا کر بولی "مجھے تو جان پڑتا ہے کہ دن پورے ہو گئے ہیں۔ آج ہی کل میں ہو گا کوئی دائی ٹھیک کر لی ہے؟"

جھنیا نے ڈری ہوئی آواز میں کہا "میں تو یہاں کسی کو نہیں جانتی!"

"تیرا مرد کیسا ہے جو کان میں تیل ڈالے بیٹھا ہے؟"

"انھیں میری کیا فکر!"

"ہاں دیکھ تو رہی ہوں۔ تم تو سوبر (زچہ خانہ) میں بیٹھو گی کوئی کرنے دھرنے والا چاہئے کہ نہیں؟ ساس نند، دیورانی، جٹھانی ہے کہ نہیں؟ کسی کو بلا لینا تھا!"

"میرے لئے سب مر گئے!"

وہ پانی لا کر جھوٹے برتن مانجنے لگی تو زچگی کے اندیشے سے دل دھڑکنے لگا۔ سوچنے لگی "کیسے کیا ہو گا بھگوان؟"

"اونہہ! یہی تو ہو گا کہ مر جاؤں گی، اچھا ہے جنجال سے چھوٹ جاؤں گی!"

شام کو اس کے پیٹ میں درد شروع ہوا۔ سمجھ گئی کہ بپتا کی گھڑی آ پہنچی۔ پیٹ کو ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے اور پسینے سے بھیگی ہوئی۔ اس نے چولھا جلایا۔ کھچڑی ڈالی اور درد سے بیتاب ہو کر وہیں زمین پر پڑ رہی۔ کوئی دس بجے رات کو گوبر آیا۔ تاڑی کی بدبو اڑاتا ہوا لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے اوٹ پٹانگ بک رہا تھا۔ "مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ جس کے بال بچے ہو رہے ہیں چلا جائے، میں کسی کا تاؤ نہیں سہہ سکتا۔ اپنے ماں باپ کا تاؤ نہیں سہا جس نے جنم دیا، تب دوسروں کا تاؤ کیوں سہوں؟ جمعدار آنکھیں دکھاتا ہے تو یہاں کسی کی دھونس سہنے والے نہیں ہیں۔ لوگوں نے پکڑ نہ لیا ہوتا تو خون پی جاتا خون! کل دیکھوں گا بچہ کو۔ پھانسی ہی تو ہو گی۔ دکھا دوں گا کہ مرد لوگ کیسے مرتے ہیں ہنستا ہوا اکڑتا ہوا

اور مونچھوں پر تاؤ دیتا ہُوا پھانسی پر چڑھ جاؤں تو سہی۔ عورت کی جات! کتنی مطلبی ہوتی ہے۔ کھچڑی ڈال دی اور پاؤں پسار کر سو رہی۔ کوئی کھائے چاہے نہ کھائے، اُس کے ٹھینگے سے! آپ مزے میں پھلکے اُڑاتی ہے اور میرے لئے کھچڑی۔ اچھا ستا لے جتنا ستانا بنے، تجھے بھگوان ستائیں گے۔“

اُس نے جھنیا کو جگایا نہیں۔ کچھ بولا بھی نہیں، چُپکے سے کھچڑی تھالی میں نکالی اور دو چار لقمے نگل کر برامدے میں لیٹ رہا۔ پچھلے پہر اسے سردی لگی۔ کوٹھری میں کمبل لینے گیا تو جھنیا کے کراہنے کی آواز سُنی۔ نشہ اُتر چکا تھا۔

پوچھا ”کیسا جی ہے جھنیا؟ کہیں درد ہے کیا؟“

”ہاں پیٹ میں بڑا درد ہو رہا ہے۔“

”تو نے پہلے کیوں نہیں کہا؟ اب اس بکھت کہاں جاؤں؟“

”کس سے کہتی؟“

”میں کیا مر گیا تھا؟“

”تمہیں میرے مرنے جینے کی کیا چنتا؟“

گوبر گھبرایا۔ کہاں دائی کھوجنے جائے؟ اس وقت وہ آنے ہی کیوں لگی۔ گھر میں کچھ ہے بھی تو نہیں، اچڑیل نے پہلے بتا دیا ہوتا تو کسی سے دو چار روپئے مانگ لاتا۔ اِن ہی ہاتھوں میں سَو پچاس روپئے ہر دم پڑے رہتے تھے، چار آدمی کھسامد کرتے تھے۔ اس کلچھنی کے یہاں آتے ہی جیسے لچھمی روٹھ گئی۔ ٹکے کو محتاج ہو گیا۔

دفعتاً کسی نے پکارا ”یہ کیا تمہاری گھر والی کراہ رہی ہے؟ درد تو نہیں ہو رہا ہے؟“

یہ وہی موٹی کالی عورت تھی جس سے آج جھنیا کی بات چیت ہوئی تھی۔ گھوڑے کو دانہ کھلانے اُٹھی تھی اور جھنیا کا کراہنا سُن کر پوچھنے آ گئی تھی۔

گوبر نے برآمدے میں جاکر کہا "پیٹ میں درد ہے چھٹ پٹا رہی ہے۔ یہاں کوئی دائی ملے گی؟"

"وہ تو میں آج اسے دیکھ گئی تھی۔ دائی کچی سرائے میں رہتی ہے۔ لپک کر بلا لاؤ۔ تب تک میں یہیں بیٹھی ہوں۔"

"میں نے کچی سرائے نہیں دیکھی، کدھر ہے؟"

"اچھا تم اسے پنکھا جھلتے رہو، میں بلائے لاتی ہوں۔ یہی کہتے ہیں کہ اناڑی آدمی کسی کام کا نہیں۔ پورا پیٹ اور دائی کی کھوج نہیں۔"

یہ کہتی ہوئی وہ چل دی۔ اس کے منہ پر تو لوگ اسے چوہیا کہتے تھے لیکن غیبت میں مٹیلی کہا کرتے تھے۔ کسی کو مٹیلی کہتے سن لیتی تھی تو اس کے سات پرکھوں تک چڑھ جاتی تھی۔

گوبر کو بیٹھے دس منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ وہ لوٹ آئی اور بولی "اب ایسا میں گریبوں کا کیسے نباہ ہوگا۔ رانڈ کہتی ہے کہ پانچ روپئے لوں گی، تب چلوں گی اور آٹھ آنے روز اور بارھویں دن ایک ساڑی۔ میں نے کہا تیرا منہ جھلس دوں! تو جا جو لکھے میں! میں دیکھ لوں گی۔ بارہ بچوں کی ماں یوں ہی نہیں ہو گئی ہوں۔ تم باہر آ جاؤ گوبردھن! میں سب کر لوں گی۔ بکھت پڑے پہ آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ چار بچے جنا لئے تو دائی بن بیٹھی!"

وہ جھنیا کے پاس جا بیٹھی اور اس کا سر اپنی جانگھ پر رکھ کر اس کا پیٹ سہلاتی ہوئی بولی "میں تو آج تجھے دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی۔ سچ پوچھو تو آج اسی دھڑکے میں مجھے نیند نہیں آئی۔ یہاں تیرا کون سگا بیٹھا ہے؟"

جھنیا نے درد سے دانت جما کر سی سی کرتے ہوئے کہا "اب نہ بچوں گی ویدی! میں تو بھگوان سے مانگنے نہ گئی تھی۔ ایک کو پالا پوسا، اسے تم نے چھین لیا تو پھر اس کا

کون کام تھا؟ میں مر جاؤں ماتا، تو اس بچے پر دیا کرنا، اسے پال پوس لینا بھگوان تمہارا بھلا کریں گے!"

چوہیا محبت سے اُسکے بال سلجھاتی ہوئی بولی "دھیرج دھر بیٹی، دھیرج دھر! ابھی چھن بھر میں کشٹ کٹا جاتا ہے۔ تو نے بھی تو جیسے چپّی سادھ لی تھی۔ اس میں کس بات کی لاج؟ مجھ سے بتا دیا ہوتا تو میں مولوی صاحب کے پاس سے گنڈا لا دیتی، وہی مرجا جی جو اس حاطے میں رہتے ہیں!"

اِس کے بعد جھنیا کو کچھ ہوش نہ رہا۔ نو بجے صبح اُسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ چوہیا بچے کو لئے بیٹھی ہے اور وہ صاف ساڑی پہنے ہوئے لیٹی ہے۔ ایسی کمزوری تھی گویا بدن میں خون کا نام نہ ہو۔

چوہیا روزانہ صبح آکر جھنیا کے لئے حریرہ اور حلوا پکا جاتی اور دن میں بھی کئی بار آکر بچے کو اُبٹن ملتی اور اوپر کا دودھ پلا جاتی۔ آج چوتھا دن تھا مگر جھنیا کے دودھ نہ اُترا تھا۔ بچہ رو رو کر گلا پھاڑے لیتا تھا کیونکہ اوپر کا دودھ اُسے ہضم نہ ہوتا تھا۔ ایک لمحہ بھی چُپ نہ رہتا۔ چوہیا اپنا دودھ اسکے منہ میں دیتی۔ بچہ ایک منٹ چوستا مگر جب دودھ نہ نکلتا تو چیخنے لگتا۔ جب چوتھی شام تک بھی جھنیا کے دودھ نہ اُترا تو چوہیا گھبرائی۔ بچہ سوکھتا چلا جاتا تھا۔ نخاس پر ایک پنشنر ڈاکٹر رہتے تھے وہ انہیں لے آئی ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا "اسکے بدن میں خون تو ہے ہی نہیں، پھر دودھ کہاں سے آئے؟ معاملہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ بدن میں خون لانے کیلئے مہینوں مقوّی دوائیں کھانی پڑیں گی تب کہیں دودھ اُترے گا۔ اس وقت تک تو اس گوشت کے لوتھڑے کا کام ہی تمام ہو جائے گا!"

پھر رات ہو گئی تھی۔ گوبر تاڑی پئے ہوئے دالان میں پڑا تھا۔ چوہیا بچے کو چُپ کرانے کیلئے اس کے مُنہ میں اپنا دودھ ڈالے ہوئے تھی۔ یکایک اُسے معلوم

ہؤا کہ اُس کے تھن دمیں دودھ اُتر آیا ہے۔ خوش ہو کر بولی۔
"رے جھنیا اب تیرا بچہ جی جائے گا، میرے دودھ آ گیا"
جھنیا نے تعجب سے کہا "تمہارے دودھ آ گیا!"
"نہیں ری، سچ!"
"میں تو نہیں بسواس کرتی"
"دیکھ لے"
اس نے اپنا دودھ دبا کر دکھایا۔ دھار پھوٹ نکلی۔
جھنیا نے پوچھا "تمہاری چھوٹی لڑکی تو آٹھ سال سے کم نہیں ہے؟"
"ہاں آٹھواں برس ہے، پر میرے دودھ بہت ہوتا تھا"
"ادھر تو تمہیں کوئی بال بچہ نہیں ہؤا؟"
"وہی لڑکی پیٹ پوچھنی تھی۔ چھاتی بالکل سوکھ گئی تھی مگر بھگوان کی لیلا ہے اور کیا"

اب سے چوہیا چار پانچ بار آ کر بچے کو دودھ پلا جاتی۔ بچہ پیدا تو ہوا تھا کمزور مگر چوہیا کا صحت بخش دودھ پی کر موٹا ہوتا جاتا تھا۔ ایک روز چوہیا ندی نہانے چلی گئی۔ بچہ بھوک سے چھٹ پٹانے لگا۔ چوہیا دس بجے لوٹی۔ تو جھنیا بچے کو کندھے سے لگائے جھلا رہی تھی اور وہ روئے جاتا تھا۔ چوہیا نے بچے کو اس کی گود سے لے کر دودھ پلا دینا چاہا مگر جھنیا نے اسے جھڑک کر کہا "رہنے دو۔ ابھاگا مر جائے یہی اچھا۔ کسی کا احسان تو نہ لینا پڑے"

چوہیا گڑگڑانے لگی۔ جھنیا نے بڑے مناؤں کے بعد بچے کو اس کی گود میں دیا۔

لیکن جھنیا اور گوبر میں اب بھی نہ بنتی تھی۔ جھنیا کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ یہ

پکا مطلبی اور بے درد آدمی ہے، مجھے صرف اپنے شوق و آرام کی چیز سمجھتا ہے چاہے مروں یا جیوں۔ اس کی اچھا پوری ہوتی جائے!" اُسے بالکل رنج نہیں۔ سوچتا ہوگا کہ یہ مر جائے گی تو دوسری لاؤں گا۔ مگر مُنہ دھو رکھیں، بچی ہی ایسی الھڑ تھی کہ اُس کے بہلاوے میں آ گئی۔ تب تو پاؤں پڑتا رہتا تھا، اب یہاں آتے ہی نہ جانے کیوں جیسے اس کا سبھاؤ ہی بگڑ گیا۔ جاڑا آ گیا۔ مگر نہ اوڑھنے کو تھا نہ بچھانے کو۔ روٹی دال سے جو دو چار روپے بچتے وہ تاڑی میں اُڑ جاتے تھے۔ ایک پرانا لحاف تھا دونوں اُسی میں سوتے تھے۔ پھر بھی ان میں سو کوس کا فاصلہ تھا۔ دونوں ایک ہی کروٹ میں رات کاٹ دیتے تھے۔

گوبر کا جی بچے کو گود میں لے کر کھلانے کے لئے ترس کر رہ جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ رات کو اُٹھ کر اس کا پیارا مکھڑا دیکھ لیا کرتا، مگر جھنیا کی جانب سے اس کے دل میں کشیدگی نہ تھی۔ جھنیا بھی اس سے بات نہ کرتی، نہ اس کی کچھ خدمت ہی کرتی۔ دونوں کے درمیان میں یہ کدورت، وقت کے ساتھ لوہے میں زنگ کی طرح گہری، مضبوط اور سخت ہوتی جاتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی باتوں کا اُلٹا ہی مطلب نکالتے، وہی جس سے باہمی منافرت میں زیادتی ہو اور کئی دن تک ایک ایک بات کو دل میں رکھے رہتے اور اُسے اپنا خون پلا پلا کر ایک دوسرے پر جھپٹ پڑنے کے لئے تیار کرتے رہتے، گویا شکاری کتے ہوں۔

اُدھر گوبر کے کارخانے میں بھی آئے دن ایک نہ ایک ہنگامہ برپا رہتا تھا۔ اب کے بجٹ میں شکر پر ٹیکس لگ گیا تھا۔ مل کے مالکوں کو اُجرت گھٹانے کا اچھا بہانہ مل گیا۔ ٹیکس سے اگر پانچ کا نقصان تھا تو اُجرت گھٹا دینے سے دس کا منافع تھا۔ اِدھر مہینوں سے اس مل میں بھی یہی مسئلہ چھڑا ہوا تھا۔ مزدور جماعت ہڑتال کرنے کو تیار بیٹھی تھی۔ اِدھر مزدوری گھٹی اور اُدھر ہڑتال ہو گئی۔ مزدوروں کی دھیلے کی

کمی بھی منظور نہ تھی۔ جب اس مہنگی کے وقتوں میں ایک دھیلا بھی اُجرت نہ بڑھی تو اب وہ گھاٹے میں کیوں ساتھ دے؟ مرزا خورشید مزدور سبھا کے پریسیڈنٹ اور پنڈت اونکارناتھ ایڈیٹر "بجلی"، اس کے سکریٹری تھے۔ دونوں ایسی ہڑتال کرانے پر تُلے ہوئے تھے کہ مِل کے مالکوں کو کچھ دن یاد رہے۔ مزدوروں کو بھی ہڑتال سے نقصان پہنچے گا حتیٰ کہ ہزاروں آدمیوں کو روٹی کے لالے پڑ جائیں گے، اس پہلو پر ان کی نگاہ بالکل نہ تھی۔ گوبر ہڑتالیوں میں سب سے آگے تھا۔ اکھڑ سُبھاؤ کا تھا ہی للکارنے کی ضرورت تھی، پھر تو وہ مرنے مارنے سے نہ ڈرتا تھا۔ ایک دن جھنیا نے اُسے جی کڑا کر کے سمجھایا بھی کہ تم بال بچے والے آدمی ہو، تمہارا اس طرح آگ میں کودنا اچھا نہیں، مگر گوبر بگڑ اُٹھا "تو کون ہوتی ہے میرے بیچ میں بولنے والی؟ میں تجھ سے صلاح نہیں پوچھتا" بات بڑھ گئی اور گوبر نے جھنیا کو خوب پیٹا۔ چوہیا نے آکر جھنیا کو چھڑایا اور گوبر کو ڈانٹنے لگی۔ گوبر کے سر پر شیطان سوار تھا۔ سرخ سرخ آنکھیں نکال کر بولا "تم میرے گھر میں مت آیا کرو چوہیا، تمہارے آنے کا کچھ کام نہیں!"

چوہیا نے طنز سے کہا۔ "تمہارے گھر میں نہ آئیں گی تو میری روٹیاں کیسے چلیں گی؟ یہیں سے مانگ کر لے جاتی ہوں تب توا گرم ہوتا ہے۔ میں نہ ہوتی لالہ، تو یہ بی بی آج تمہاری لاتیں کھانے کے لئے بیٹھی نہ ہوتی!"

گوبر گھونسہ تان کر بولا "میں نے کہہ دیا کہ میرے گھر میں نہ آیا کرو۔ تم ہی نے اس چڑیل کا مجاج آسمان پر چڑھا دیا ہے!"

چوہیا وہیں جمی ہوئی بے خوف کھڑی رہی۔ "اچھا اب چُپ رہنا گوبر۔ بچاری ادھ مری عورت کو مار کر تم نے کوئی بڑی بہادری کا کام نہیں کیا ہے۔ تم اس کے لئے کیا کرتے ہو کہ تمہاری مار سہے؟ ایک روٹی کھلا دیتے ہو اسی لئے؟ اپنا بھاگ

سراہو کہ ایسی گئو عورت پاگئے ہو۔ دوسری ہوتی تو تمہارے مُنہ پر جھاڑو مار کر نکل گئی ہوتی"!

محلّے کے لوگ جمع ہوگئے اور چاروں طرف سے گوبر پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ وہی لوگ جو اپنے گھروں میں اپنی عورتوں کو روز پیٹتے تھے اس وقت رحم و انصاف کے پُتلے بنے ہوئے تھے۔ چوہیا اور شیر ہوگئی اور فریاد کرنے لگی۔ "ذرا اس کی جھار کہتا ہے کہ میرے گھر نہ آیا کرو۔ بی بی بچّہ رکھنے چلا ہے۔ پر یہ نہیں جانتا کہ بی بی بچوں کا پالنا بڑے گُردے کا کام ہے۔ اس سے پوچھو میں نہ ہوتی تو آج یہ بچّہ جو بچھڑے کی طرح کلیلیں کر رہا ہے، کہاں ہوتا؟ عورت کو مار کر جوانی دکھاتا ہے۔ میں نہ ہوتی تیری بی بی، نہیں تو یہی جوتی اُٹھا کر تیرے مُنہ پر تڑاتڑ جماتی اور کوٹھری میں ڈھکیل کر باہر سے کنڈی بند کر دیتی۔ دانے دانے کو ترس جاتے"!

گوبر جھلّایا ہوا اپنے کام پر چلا گیا۔ چوہیا مرد ہوتی تو مزا چکھا دیتا۔ عورت کے مُنہ کیا لگے؟۔

مِل میں بے چینی کے بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ مزدور "بجلی" کے پرچے جیب میں لئے پھرتے اور ذرا بھی موقع پاتے تو دو تین مزدور مل کر اسے پڑھنے لگتے اخبار کی بکری خوب بڑھ رہی تھی۔ مزدوروں کے لیڈر "بجلی" کے کارخانے میں آدھی رات تک بیٹھے ہڑتال کی تجویزیں سوچا کرتے اور صبح ہوتے جب اخبار میں یہ خبر جلی حروف میں نکلتی تو پبلک ٹوٹ پڑتی اور اخبار کی کاپیاں دو گُنے تگنے قیمت پر بک جاتیں۔ اُدھر کمپنی کے ڈائرکٹر بھی اپنی گھات میں بیٹھے تھے۔ ہڑتال ہو جانے ہی میں ان کا فائدہ تھا۔ آدمیوں کی کمی تو ہے نہیں۔ بے کاری بڑھی ہوئی ہے۔ اس کی نصف اُجرت پر ویسے ہی آدمی آسانی سے مل سکتے ہیں۔ مال کی تیاری میں ایک دم آدھی بچت ہو جائے گی۔ دس پانچ کام کا حرج ہوگا، کچھ پروا نہیں آخر یہ

طے ہو گیا کہ اُجرت میں کمی کا اعلان کر دیا جائے۔ دن اور وقت مقرر کر دیا گیا۔ پولیس کو اطلاع دے دی گئی۔ مزدوروں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہ اپنی گھات میں تھے۔ اُسی وقت ہڑتال کرنا چاہتے تھے جب گودام میں بہت تھوڑا مال رہ جائے اور مانگ کی زیادتی ہو۔

یکایک ایک روز جب مزدور شام کو چھٹی پا کر جانے لگے تو ڈائرکٹروں کا اعلان سُنا دیا گیا۔ اُسی وقت پولیس آ گئی۔ مزدوروں کو اپنی مرضی کے خلاف اُسی وقت ہڑتال کرنی پڑی جب گودام میں اتنا مال بھرا ہوا تھا کہ بہت زیادہ مانگ ہونے پر بھی چھ مہینے سے پہلے نہ اُٹھ سکتا تھا۔

مرزا خورشید نے یہ خبر سُنی تو مُسکرائے جیسے کوئی ہوشیار جنرل اپنے دشمن کے جنگی کمال پر خوش ہو گیا ہو۔ ایک لمحہ غور کرنے کے بعد بولے "اچھی بات ہے۔ اگر ڈائرکٹروں کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔ حالات ان کے موافق ہیں، لیکن ہمیں بھی حق و انصاف پر بھروسہ ہے۔ وہ لوگ نئے آدمی رکھ کر اپنا کام چلانا چاہتے ہیں۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ انہیں ایک بھی نیا آدمی نہ ملے۔ یہی ہماری فتح ہو گی۔"

بجلی کے دفتر میں اسی وقت خطرے کی میٹنگ ہوئی۔ کارکن کمیٹی بنائی گئی۔ عہدے داروں کا انتخاب ہوا اور آٹھ بجے رات کو مزدوروں کا لمبا جلوس نکلا۔ دس بجے رات کو اگلے دن کا سارا پروگرام طے کیا گیا اور یہ تاکید کر دی گئی کہ کسی طرح کا شر و فساد نہ ہونے پائے۔

مگر ساری کوشش بے کار ہوئی۔ ہڑتالیوں نے نئے مزدوروں کو کثیر تعداد میں کے پھاٹک پر کھڑے دیکھا تو ان کی مفسدانہ رغبت قابو سے باہر ہو گئی۔ سوچا تھا کہ سو سو پچاس پچاس آدمی روزانہ بھرتی کے لئے آئیں گے تو انہیں سمجھا بجھا کر یا دھمکا کر

بھگا دیں گے۔ ہڑتالیوں کی تعداد دیکھ کر آنے والے مزدور آپ ہی ڈر جائیں گے۔ مگر یہاں تو نقشہ ہی دیگرگوں تھا۔ اگر یہ کل آدمی بھرتی ہو گئے تو ہڑتالیوں کے لئے سمجھوتے کی کوئی اُمید ہی نہ تھی۔ طے ہُوا کہ نئے آدمیوں کو مل میں جانے ہی نہ دیا جائے۔ طاقت کے استعمال کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ نیا گروہ بھی مرنے مارنے پہ تیار تھا۔ اِن میں زیادہ تر بھوکے تھے جو اس موقع کو کسی طرح بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتے تھے۔ بھوکوں مر جانے یا اپنے بال بچّوں کو بھوکوں مرتے دیکھنے سے تو یہ کہیں بہتر تھا کہ حالات حاضرہ کا مقابلہ کرتے ہوئے مریں۔ دونوں جماعتوں میں فوجداری ہو گئی۔ ''بجلی'' کے ایڈیٹر تو بھاگ کھڑے ہوئے ہاں بیچارے مرزا جی پٹ گئے اور اُن کے بچانے میں گوبر بھی بُری طرح زخمی ہُوا۔ مرزا پہلوان آدمی تھے اور منجھے ہوئے پھینکیت۔ اپنے اوپر کوئی گہرا وار نہ پڑنے دیا۔ گوبر دیہقانی تھا، پورا لٹھ مار، مگر اپنی حفاظت کرنا نہ جانتا تھا۔ جو لڑائی میں سب سے زیادہ اہم بات ہے۔ اُس کے ایک ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی، سر پھٹ گیا۔ اور آخر کار وہیں ڈھیر ہو گیا۔ کندھوں پہ بے شمار لاٹھیاں پڑی تھیں جس سے اس کا ایک ایک عضو چور ہو گیا تھا۔ ہڑتالیوں نے اسے گرتے دیکھا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ صرف دس بارہ جنچے ہوئے آدمی مرزا کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ نئے آدمی فتح کا جھنڈا لہراتے ہوئے مل میں داخل ہوئے اور ہارے ہوئے ہڑتالی اپنے زخمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر اسپتال پہنچانے لگے۔ مگر اسپتال میں اتنے آدمیوں کے لئے جگہ نہ تھی۔ مرزا تو لے لئے گئے، گوبر کی مرہم پٹی کر کے اس کے گھر پہنچا دیا گیا۔

جھنیا نے گوبر کا وہ بے جان سا جسم دیکھا تو اس کی نسائیت بیدار ہو گئی۔ اب تک اُس نے اُسے طاقت کی شکل میں دیکھا تھا۔ جو اس پر حکومت کرتا تھا اور اُسے ڈانٹتا مارتا تھا۔ آج وہ ناکارہ بے کس اور قابلِ رحم تھا۔ جھنیا نے کھاٹ پر جھک کر آنسو بھری آنکھوں سے گوبر کو دیکھا اور گھر کی حالت کا خیال کر کے اسے گوبر پر شک آمیز غصہ آیا۔

گوبر جانتا تھا کہ گھر میں ایک پیسہ نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کہیں سے ایک پیسہ ملنے کی اُمید نہیں ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی اس کے بار بار سمجھانے پر بھی اس نے یہ آفت اوپر لی۔ اُس نے کتنی بار کہا تھا کہ تم اس جھگڑے میں نہ پڑو، آگ لگانے والے آگ لگا کر الگ ہو جائیں گے اور جائے گی غریبوں کے سر۔ لیکن وہ کب اس کی سُننے والا تھا۔ وہ تو اس کی بَیرن تھی۔ دوست تو وہ لوگ تھے جو مزے سے موٹروں میں گھوم رہے ہیں۔ اس غصّے میں ایک طرح کا اطمینان تھا جیسے ہم اُن بچّوں کو کرسی سے گرتے دیکھ کر جو بار بار منع کرنے پر بھی کھڑے ہونے سے باز نہ آتے، چلّا اُٹھتے ہیں "اچھا ہوا، بہت اچھا، تمہارا سر کیوں نہ پھٹ گیا!"

لیکن ایک ہی لمحے میں گوبر کا چلّانا سُن کر اس کے سارے ہوش و حواس ٹھکانے آ گئے۔ درد و تکلیف میں ڈوبے ہوئے اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے "ہائے ہائے! سارا بدن بھُرکس ہو گیا۔ سبھوں کو ذرا بھی دیا نہ آئی!"

وہ اسی طرح بڑی دیر تک گوبر کا منہ دیکھتی رہی۔ وہ بُجھتی ہوئی اُمید سے زندگی کی کوئی علامت پا لینا چاہتی تھی اور ہر لمحہ اُس کا صبر و استقلال غروب ہونے والے سورج کی طرح ڈوبا جاتا تھا اور مستقبل کی تاریکی اسے اپنے اندر سمیٹے لیتی تھی۔

دفعتاً چُہیا نے پکارا "گوبر کا کیا حال ہے بہو؟ میں نے تو ابھی سُنا، دوکان سے دوڑی آئی ہوں۔"

جھنیا کے رُکے ہوئے آنسو اُبل پڑے۔ کچھ بول نہ سکی۔ سہمی ہوئی آنکھوں سے چُہیا کی طرف دیکھا۔

چُہیا نے گوبر کا منہ دیکھا، اس کے سینے پر ہاتھ رکھا اور تسلّی دے کر بولی یہ چار دن میں اچھے ہو جائیں گے۔ گھبرا مت۔ کُشل ہوئی تیرا سہاگ بلوان تھا

کتنے آدمی اُسی دنگے میں مر گئے۔ گھر میں کچھ روپئے پیسے ہیں؟"

جھنیا نے شرم سے سر ہلا دیا۔

"میں لائے دیتی ہوں۔ تھوڑا سا دودھ لاکر گرم کر لے!"

جھنیا نے اس کے پیر پکڑ کر کہا "دیدی۔ تم ہی میری ماتا ہو۔ میرا دوسرا کوئی نہیں ہے!"

جاڑوں کی اُداس شام آج اور بھی اُداس لگ رہی تھی۔ جھنیا نے چولہا جلایا اور دودھ اُبالنے لگی۔

دھنیا برآمدے میں بچے کو لئے کھلا رہی تھی۔

دفعتاً جھنیا بھرے ہوئے گلے سے بولی "میں بڑی ابھاگنی ہوں دیدی! میرے جی میں ایسا آ رہا ہے جیسے میرے ہی کارن ان کی یہ گت ہوئی ہے۔ جی کڑھتا ہے تب دل دکھی ہوتا ہے۔ پھر گالیاں بھی نکلتی ہیں اور سراپ بھی نکلتا ہے۔ کون جانے میری گالیوں نے ۔ ۔ ۔"

اس کے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ آنسوؤں کے بہاؤ میں آواز بھی بہہ گئی۔

دھنیا نے آنچل سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "کیسی باتیں سوچتی ہے بیٹی؟ یہ تیرے سیندور کا بھاگ ہے کہ بچ گئے مگر ہاں اتنا ہے کہ آپس میں لڑائی ہو تو منہ سے چاہے جتنا بک لے پر من میں میل نہ رکھے۔ بیج اندر پڑا تو انکھوا نکلے بنا نہیں رہتا۔"

جھنیا نے تھرائی ہوئی آواز میں پوچھا "اب میں کیا کروں دیدی؟"

دھنیا نے ڈھارس دی "کچھ نہیں بیٹی۔ بھگوان کا نام لے۔ وہی غریبوں کی رچھا کرتے ہیں!"

اُسی وقت گوبر نے آنکھیں کھولیں اور جھنیا کو سامنے دیکھ کر التجا کے انداز

سے کمزور آواز میں بولا۔

"آج بہت چوٹ کھا گیا جھنیا! میں کسی سے کچھ نہیں بولا۔ سبوں نے ایک دم مجھے مارا۔ کہا سنا چھما کرنا! تجھے ستاتا تھا، اسی کا یہ پھل ملا۔ تھوڑی دیر کا اور مہمان ہوں۔ اب نہ بچوں گا۔ درد کے مارے سارا بدن پھٹا جاتا ہے!"

جھنیا نے اندر سا کہہ کہا "چپ چاپ پڑے رہو، بولو چالو نہیں۔ مرو گے نہیں اس کا میرا ذمہ!"

گوبر کے چہرے پر امید کی جھلک آگئی۔ بولا "سچ کہتی ہو، میں مروں گا نہیں؟"

"ہاں، نہیں مرو گے۔ تمہیں ہوا کیا ہے؟ ذرا سر میں چوٹ آگئی ہے اور ہاتھ کی ہڈی اتر گئی ہے۔ ایسی چوٹیں مردوں کو نت ہی لگا کرتی ہیں۔ ان سے کوئی نہیں مرتا!"

"اب میں جھنیا کو کبھی نہ ماروں گا!"

"ڈرتے ہو گے کہ کہیں جھنیا تمہیں نہ مارے!"

"وہ مارے گی بھی تو نہ بولوں گا!"

"اچھے ہو نے پر بھول جاؤ گے!"

"نہیں دیدی، کبھی نہ بھولوں گا!"

گوبر اس وقت بچوں کی سی باتیں کیا کرتا۔ دس پانچ منٹ غافل پڑا رہتا۔ اس کا جی نہ جانے کہاں کہاں اڑتا پھرتا۔ کبھی دیکھتا کہ وہ ندی میں ڈوبا جا رہا ہے اور جھنیا اسے بچانے کے لئے ندی میں چلی آرہی ہے۔ کبھی دیکھتا کہ کوئی دیو اس کے سینے پر سوار ہے اور جھنیا کی شکل کی کوئی دیوی اسے بچا رہی ہے۔ اور بار بار چونک کر پوچھتا "میں مر جاؤں گا تو نہیں، جھنیا؟"

تین دن اس کی یہی حالت رہی اور جھنیا نے رات کو جاگ کر اور دن کو پاس کھڑے رہ کر گوبر کو موت کے منہ سے اسے بچا لیا بچے کو چوہیا سنبھالے رہتی تھی۔

چوتھے دن جھنیا یکہ لائی اور سب نے اس پر لاد کر اسپتال پہنچایا۔ وہاں سے لوٹ کر گوبر کو معلوم ہوا کہ اب وہ سچ مچ بچ جائے گا۔ اُس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "مجھے چھما کر دو جھنیا!"

ان تین چار دن میں چوہیا کے تین چار روپے خرچ ہو گئے تھے اور اب جھنیا کو اس سے کچھ لینے میں تامل ہوتا تھا۔ وہ بھی کوئی مالدار تو تھی نہیں لکڑی کی بکری کے روپے جھنیا کو دے دیتی تھی۔ آخر جھنیا نے کچھ کام کرنے کا ارادہ کیا۔ ابھی گوبر کو اچھا ہوتے مہینوں لگیں گے۔ کھانے پینے کو بھی چاہیے، دوا دارو کو بھی چاہیے۔ وہ کچھ کام کر کے کھانے بھر کو تو لے ہی آئے گی۔ بچپن سے اس نے گایوں کا پالنا اور گھاس چھیلنا سیکھا تھا۔ یہاں گائیں تو تھیں نہیں، ہاں لوگ گھاس چھیلنے جاتے تھے اور آٹھ دس آنے کما لیتے تھے۔ وہ علی الصباح گوبر کا ہاتھ منہ دھلا کر اور بچے کو اسے سونپ کر گھاس چھیلنے چلی جاتی اور بھوکی پیاسی تیسرے پہر تک چھیلتی رہتی۔ پھر اُسے منڈی میں لے جا بیچتی اور شام کو گھر آتی۔ رات کو بھی وہ گوبر کی نیند سوتی اور گوبر کی نیند جاگتی۔ مگر اتنی سخت محنت کرنے پر بھی اس کا دل ایسا بشاش رہتا گویا جھولے پر بیٹھی گا رہی ہو۔ راستے بھر ہمراہی عورتوں مردوں سے ہنستی بولتی ہوئی چلی جاتی اور گھاس چھیلتے وقت بھی سب میں ویسی ہی باتیں ہوتی رہتیں نہ تقدیر کا شکوا، نہ تباہی کا گلا۔ زندگی کی معنویت میں، یگانوں کے لئے زبردست سے زبردست ایثار میں، اور آزادانہ خدمت میں جو خوشی ہے اس کی چمک اس کے ہر ہر عضو سے ظاہر تھی۔ بچہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر جیسے تالیاں بجا بجا کر خوش ہوتا ہے کچھ ویسی ہی خوشی وہ بھی محسوس کر رہی تھی۔ گویا اس کے دل میں خوشی کا کوئی چشمہ جاری ہو گیا ہو۔ اور جب دل بحال ہو تو پھر جسم کیوں ویسا ہی لاغر رہے؟ اسی ایک مہینے میں جیسے اس کی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ اس کے اعضا میں اب سستی نہیں بلکہ تیزی ہے، لچک ہے اور نزاکت ہے۔ چہرے

پر وہ زردی نہیں بلکہ خون کی گلابی رنگت ہے۔ اس کا شباب جو اس بند کوٹھری میں پڑے پڑے ذلت اور خانہ جنگی سے افسردہ ہو گیا تھا وہ گویا ہوا اور روشنی پاکر لہلہا اٹھا ہے۔ اب اسے کسی بات پر غصہ نہیں آتا۔ بچے کے ذرا سے رونے پر جو وہ جھنجھلا اٹھا کرتی تھی اب گویا اس کی برداشت اور محبت کی کوئی حد ہی نہ تھی۔

اس کے خلاف گوبر اچھا ہوتے جانے پر بھی کچھ اداس رہتا تھا جب ہم اپنے عزیزوں پر ظلم کرتے ہیں اور جب مصیبت آپڑنے سے ہم میں اتنی طاقت آجاتی ہے کہ اس کی شدید تکلیف کو خود محسوس کرسکیں تو اس سے ہمارا دل بیدار ہو جاتا ہے اور ہم اس بے جا سلوک کا کفارہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ گوبر اسی کفارے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ اب اس کی زندگی کا رویہ بالکل دوسرا ہو گا جس میں تلخی کی جگہ شیرینی ہوگی اور غرور کے بجائے انکسار۔ اسے اب معلوم ہوا کہ خدمت کرنے کا موقع بڑی خوش قسمتی سے ملتا ہے اور اب وہ اسے کبھی نہ بھولے گا۔

(۲۸)

مسٹر کھنا کو مزدوروں کی یہ ہڑتال بالکل بے جا معلوم ہوتی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ عوام کے ساتھ ملے رہنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خود کو عوام ہی کا آدمی سمجھتے تھے۔ سابق قومی تحریکیں میں انہوں نے بڑا حوصلہ دکھایا تھا۔ اس وقت ضلع کے خاص لیڈر تھے، دو بار جیل گئے تھے اور کئی ہزار کا نقصان اٹھایا تھا۔ اب بھی وہ مزدوروں کی شکایتیں سننے کے لئے تیار تھے۔ مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ مل کے حصے داروں کے فائدے کا خیال قطعی چھوڑ دیں۔ اپنا سوارتھ چھوڑ دینے کو وہ تیار ہو سکتے تھے بشرطیکہ ان کی بلند خیالی سے مس ہو۔ مگر حصے داروں کے اغراض کی حفاظت نہ کرنا، یہ تو ادھرم تھا یہ تو کاروبار ہے کوئی سدابرت نہیں کہ سب کچھ مزدوروں ہی کو

بانٹ دیا جائے۔ حصے داروں کو یہ یقین دلا کر روپیہ لیتے تھے کہ اس کام میں پندرہ بیس روپیہ سیکڑے کا منافع ہے اور اگر انہیں دس روپیہ سیکڑہ بھی نہ ملتے تو وہ ڈائرکٹر اور خصوصاً کھنّا کو دھوکہ باز ہی نہ سمجھیں گے۔ پھر اپنی تنخواہ وہ کیسے کم کر سکتے تھے؟ اور کمپنیوں کے دیکھتے انہوں نے اپنی تنخواہ بہت کم رکھی تھی۔ صرف ایک ہزار روپیہ ماہوار لیتے تھے۔ کچھ کمیشن بھی مل جاتا تھا۔ لیکن اگر وہ اتنا لیتے تھے تو مل کے چلانے کا سارا انتظام بھی تو اُن ہی کے ذمّے تھا۔ مزدور صرف ہاتھ سے کام کرتے ہیں۔ ڈائرکٹر اپنی عقل سے، اپنے علم سے اور اپنے اثر سے کام کرتا ہے۔ دونوں طاقتوں کی قیمت برابر تو نہیں ہو سکتی۔ مزدوروں کو یہ سوچ کر کیوں نہیں صبر ہوتا کہ کساد بازاری کا وقت ہے اور چاروں طرف بے کاری پھیلی ہونے کے سبب آدمی سستے ہو گئے ہیں۔ انہیں تو ایک کی جگہ پون بھی ملے تو مطمئن رہنا چاہئے تھا۔ سچ پوچھو تو وہ مطمئن ہی ہیں۔ ان کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو جاہل مطلق ہیں۔ شرارت تو اونکار ناتھ اور مرزا خورشید کی ہے۔ یہی لوگ ان غریبوں کو کٹھ پتلی کی طرح نچا رہے ہیں؛ صرف تھوڑے سے پیسے اور کچھ ناموری کے لالچ میں پڑ کر یہ نہیں سوچتے کہ ان کی اس حرکت سے کتنے گھر تباہ ہو جائیں گے۔ اونکار ناتھ کا اخبار نہیں چلتا تو بیچارے کیا کریں؟ اگر آج ان کے اخبار کے ایک لاکھ گاہک ہو جائیں جس سے انہیں پانچ لاکھ کا منافع ہونے لگے تو کیا وہ صرف اپنے گزر بسر کے لئے لے کر بقیہ رقم کام کرنے والوں کو تقسیم کر دیں گے؟ کہاں کی بات! اور یہ تیاگی مرزا بھی تو ایک دن لکھ پتی تھے اور ہزاروں مزدور ان کے یہاں کام کرتے تھے، تو کیا وہ اپنی ضرورت بھر کے لئے لے کر بقیہ رقم مزدوروں کو بانٹ دیتے تھے؟ کیا وہ اسی ضرورت بھر کی رقم میں یورپین چھوکریوں کے ساتھ عیش و عشرت کرتے تھے، بڑے بڑے افسروں کے ساتھ دعوتیں اُڑاتے تھے، ہزاروں روپیہ ماہوار کی شراب پی جاتے تھے

اور ہر سال فرانس اور سوئیزرلینڈ کی سیر کرتے تھے؟ آج مزدوروں کی حالت دیکھ کر ان کا کلیجہ پھٹتا ہے!۔

ان دونوں لیڈروں کی تو کھنّا کو پرواہ نہ تھی۔ ان کی نیت کی صفائی میں پورا شک تھا۔ نہ رائے صاحب ہی کی انھیں پرواہ تھی جو ہمیشہ کھنّا کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے اور ان کی ہر بات کی تائید کر دیا کرتے تھے۔ اپنے شناساؤں میں صرف ایک ہی ایسا شخص تھا جس کی غیر جانبداری پر کھنّا کو کامل اعتماد تھا۔ اور وہ تھے ڈاکٹر مہتا۔ جب سے انھوں نے مالتی سے اپنا تعلق بڑھانا شروع کیا تھا، کھنّا کی نظروں میں ان کی عزت بہت کم ہو گئی تھی۔ مالتی برسوں کھنّا کے دل کی مالکہ رہ چکی تھی مگر اس کو انہوں نے ہمیشہ کھلونا ہی سمجھا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کھلونا انہیں بہت پیارا تھا اور اس کے کھو جانے یا ٹوٹ جانے یا چھن جانے پر وہ روئے بھی تھے۔ مگر تھی وہ کھلونا ہی۔ انھیں کبھی مالتی پر بھروسہ نہ ہوا۔ وہ کبھی ان کے شوق کی باہری پوشاک میں تھا کہ ان کے دل تک نہ پہنچ سکی تھی۔ وہ اگر خود کھنّا سے بیاہ کیلئے کہتی تو وہ منظور نہ کرتے اور کسی نہ کسی حیلے سے ٹال دیتے۔ کتنے ہی اور انسانوں کی طرح کھنّا کی زندگی بھی دو رخ تھی۔ ایک طرف وہ تیاگ اور سیوا اور اُپکار کے پجاری تھے تو دوسری طرف خود غرضی، عیش پسندی اور اقتدار کے۔ ان کا اصلی رخ کون تھا یہ کہنا مشکل ہے شاید ان کی روح کا اعلیٰ نصف، خدمت اور ہمدردی کے اجزا سے بنا ہوا تھا اور ادنیٰ نصف خود غرضی اور عیش پسندی سے۔ مگر اس اعلیٰ اور ادنیٰ میں برابر مقابلہ ہوتا رہتا تھا اور ادنیٰ ہی اپنی زبردستی اور ہٹ کے سبب امن اور سکون سے بھرے ہوئے اعلیٰ پر غالب آ جاتا تھا۔ ادنیٰ مالتی کی طرف جھکتا تھا تو اعلیٰ مہتا کی طرف مگر وہ اب ادنیٰ میں شامل ہو گیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مہتا جیسا معیار پرست آدمی مالتی جیسی شوخ اور آرام پسند عورت پر کیسے فریفتہ ہو گیا۔ وہ بہت کوشش

کرنے پر بھی مہتا کو نفس پرستیوں کا شکار نہ قرار دے سکتے تھے اور کبھی کبھی انہیں یہ شک بھی ہونے لگتا تھا کہ مالتی کا کوئی ایسا دوسرا روپ بھی ہے جسے نہ تو وہ دیکھ سکے اور نہ جسے دیکھنے کے وہ اہل ہی تھے۔

موافق و مخالف سبھی پہلوؤں پر غور کر کے اُنہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس حالت میں ان کو مہتا ہی سے واجبی ہدایت مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر مہتا کو کام کرنے کا نشہ تھا۔ آدھی رات کو سوتے تھے اور پھر رات رہے جاگ پڑتے تھے۔ کیسا ہی کام ہو اس کے لئے وہ کہیں نہ کہیں سے وقت نکال لیتے تھے۔ ہاکی کھیلنا ہو یا یونیورسٹی کے مباحثے میں حصّہ لینا ہو، ”دیہات سدھار سنگٹھن“ ہو یا کسی شادی کا نیوتا سبھی کاموں کے لئے ان کے دل میں شوق تھا اور اُن کے پاس وقت تھا۔ وہ اخباروں میں مضامین بھی لکھتے تھے اور کئی سال سے فلسفہ کی ایک ضخیم کتاب بھی لکھ رہے تھے جو اب ختم ہونے والی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک سائنس کا کھیل ہی کھیل رہے تھے۔ اپنے باغیچے میں بیٹھے ہوئے پودوں پر برقی اثر کی آزمائش کر رہے تھے۔ اُنہوں نے حال میں ایک سائنس کی انجمن میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ فصلیں برقی طاقت سے بہت کم وقت میں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ ان کی پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے اور بے فصل کی چیزوں کی اُپج بھی کی جا سکتی ہے۔ آج کل صبح کے دو تین گھنٹے وہ ان ہی باتوں کی آزمائش میں صرف کرتے تھے۔

مسٹر کھنّا کی باتیں سُن کر اُنہوں نے ہمدردی سے ان کی طرف دیکھ کر کہا: ”کیا یہ ضروری تھا کہ ٹیکس لگ جانے سے مزدوروں کی اُجرت گھٹا دی جائے؟ آپ کو سرکار سے شکایت کرنی چاہیئے تھی۔ اگر سرکار نے نہیں سُنا تو اس کی سزا مزدوروں کو کیوں دی جائے؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ مزدوروں کو اتنی اُجرت دی جاتی ہے کہ اس میں ایک چوتھائی کی کمی سے انہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی؟ آپ کے مزدور بھوں

میں رہتے ہیں، گندے اور بدبودار بلوں میں، جہاں آپ ایک منٹ رہیں تو قے ہو جائے، جو کپڑے وہ پہنتے ہیں ان سے آپ اپنے جوتے بھی نہ صاف کریں گے۔ جو کھانا وہ کھاتے ہیں وہ آپ کا کتا بھی نہ کھائے گا۔ میں نے ان کی زندگی میں حصّہ لیا ہے۔ آپ ان کی روٹیاں چھین کر اپنے حصّہ داروں کا پیٹ بھرنا چاہتے ہیں . . . . ."

کھنّا نے بے صبری سے کہا "مگر ہمارے سبھی حصے دار تو امیر نہیں ہیں۔ کتنوں ہی نے اپنا سب کچھ اسی مِل کی نذر کر دیا ہے اور اس کے نفع کے سوا ان کی زندگی کا کوئی سہارا نہیں ہے۔"

مہتا نے اس انداز سے جواب دیا گویا اس دلیل کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ بولے "جو آدمی کسی کاروبار میں حصّہ لیتا ہے وہ اتنا مفلس نہیں ہوتا کہ اُسکے منافع ہی کو زندگی کا سہارا سمجھے۔ ہو سکتا ہے کہ نفع کم ملنے پر اُسے اپنا ایک نوکر کم کر دینا پڑے یا اس کے مکھن اور پھلوں کا بِل گھٹ جائے مگر وہ ننگا یا بھوکا نہ رہے گا۔ جو اپنی جان کھپاتے ہیں ان کا حق ان لوگوں سے زیادہ ہے جو صرف روپیہ لگاتے ہیں۔"

یہی بات پنڈت اونکار ناتھ نے کہی تھی، مرزا خورشید نے بھی یہی صلاح دی تھی، حتّٰی کہ گوبندی نے بھی مزدوروں ہی کی حمایت کی تھی۔ مگر کھنّا نے ان لوگوں کے کہنے کا خیال نہ کیا تھا۔ مگر مہتا کے مُنہ سے ویسا ہی سُنکر وہ متاثر ہو گئے۔ اونکار ناتھ کو وہ مطلبی سمجھتے تھے، مرزا کو غیر ذمہ دار اور گوبندی کو ناقابل۔ مہتا کی بات میں کردار، مطالعہ اور اخلاق کی طاقت تھی۔

دفعتًا مہتا نے پوچھا "آپ نے اپنی اہلیہ سے بھی اس بارہ میں رائے لی ہے؟"

کھنّا نے لجاتے ہوئے کہا "ہاں، پوچھا تھا۔"

"ان کی کیا رائے تھی ؟"

"وہی جو آپ کی رائے ہے!"

"مجھے یہی امید تھی۔ اور آپ اس قابلہ کو نا قابل سمجھتے ہیں!"

اُسی وقت مالتی آ پہنچی اور کھنّا کو دیکھ کر بولی "اچھا، آپ موجود ہیں! میں نے مہتاجی کی آج دعوت کی ہے سبھی چیزیں اپنے ہاتھوں تیار کی ہیں۔ آپ کو بھی نیوتا دیتی ہوں۔ گووندی دیوی سے آپ کا یہ قصور معاف کرا دوں گی!"

کھنّا کو تعجب ہوا۔ اب مالتی اپنے ہاتھوں سے کھانا پکانے لگی ہے! مالتی جو خود کبھی اپنے جوتے نہ پہنتی تھی، جو خود کبھی بجلی کا بٹن تک نہ دباتی تھی، عیش و آرام ہی جس کی زندگی تھی! مسکرا کر بولے "اگر آپ نے پکایا ہے تو ضرور کھاؤں گا۔ میں تو کبھی سوچ ہی نہ سکتا تھا کہ آپ اس فن میں بھی ماہر ہیں!"

مالتی نے بلا تامل کہا "انہوں نے مار مار کر حکیم بنا دیا ہے۔ ان کا حکم کیسے ٹال سکتی ہوں؟ مرد دیوتا جو ٹھہرے!"

کھنّا نے اس طنز سے لطف اٹھاتے ہوئے اور مہتا کی طرف آنکھیں مارتے ہوئے کہا "مرد تو آپ نگاہوں میں اتنے آدر کی چیز نہ تھے!"

مالتی شرماتی نہیں۔ اس اشارے کا مطلب سمجھ کر جوشیلے لہجے میں بولی—

"لیکن اب ہو گئے ہیں، اس لئے کہ میں نے مرد کو جو روپ اپنی جان پہچان والوں کے دائرے میں دیکھا تھا، اس سے یہ کہیں بہتر ہے۔ مرد اتنا بہتر، اتنا نرم دل ...."

مہتا نے مالتی کی طرف انکسار سے دیکھا اور کہا "نہیں مالتی، مجھ پر رحم کرو ورنہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا!"

ان دنوں جو بھی مالتی سے ملتا تو وہ اس سے مہتا کی تعریفوں کے پل باندھ دیتی،

جیسے کوئی نومُرید اپنے نئے عقائد کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرے۔ پسند کا بھی اسے خیال نہ رہتا۔ اور بے چارے مہتا دل میں کٹ کر رہ جاتے۔ وہ تلخ اور درشت تنقید کو بڑے شوق سے سُنتے تھے لیکن اپنی تعریف سُنکر گویا بے وقوف بن جاتے تھے اور مُنہ ذرا سا نکل آتا تھا۔ اور مالتی ان عورتوں میں تھی جو اندر رہ سکے، وہ باہر ہی رہ سکتی تھی۔ پہلے بھی، اب بھی، عمل میں اور خیال میں بھی دل میں کچھ رکھ چھوڑنا وہ نہ جانتی تھی جس طرح ایک عمدہ ساڑی پا کر وہ پہننے کے لئے بے چین ہو جاتی تھی اسی طرح دل میں کوئی اچھا خیال آئے تو وہ اسے ظاہر کئے بغیر کل نہ پاتی تھی۔

مالتی نے اور قریب جا کر اور ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر گویا ان کی حفاظت کرتے ہوئے کہا "اچھا بھاگو نہیں! اب میں کچھ نہ کہوں گی، معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اپنی ہجو زیادہ پسند ہے تو وہی سُنو" کھنّا جی! یہ حضرت مجھ پہ اپنی محبت کا جال......"

شکر مل کی چمنی یہاں سے صاف نظر آتی تھی۔ کھنّا نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ چمنی کھنّا کی نیک نامی کے ستون کی طرح آسمان میں سر اُٹھائے کھڑی تھی۔ کھنّا کی آنکھوں میں غرور چمک اُٹھا۔ اُسی وقت اُنھیں مل کے دفتر میں جانا ہے۔ وہاں ڈائرکٹروں کی ایک فوری اور ضروری میٹنگ کرنی ہوگی اور اس حالت کو ان کے ذہن نشین کرانا ہوگا اور ساتھ ہی اس مسئلے کے حل کی تدبیر بھی بتانی ہوگی۔

مگر چمنی کے پاس یہ دُھواں کہاں سے اُٹھ رہا ہے؟ دیکھتے دیکھتے سارا آسمان غبارے کی طرح دُھوئیں سے بھر گیا۔ سب نے خائف ہو کر ادھر دیکھا۔ کہیں آگ تو نہیں لگ گئی؟ آگ ہی معلوم ہوتی ہے۔

دفعتاً سامنے سڑک پہ ہزاروں آدمی مل کی طرف دوڑے جاتے ہوئے

نظر آئے۔ کھنّا نے کھڑے ہو کر زور سے پوچھا "تم لوگ کہاں دوڑے جا رہے ہو؟"
ایک آدمی نے رُک کر کہا "اجی شکر مِل میں آگ لگ گئی! آپ دیکھ نہیں رہے ہیں؟"

کھنّا نے مہتا کی طرف دیکھا اور مہتا نے کھنّا کی طرف۔ مالتی دوڑی ہوئی بنگلے میں گئی اور اپنے جوتے پہن آئی۔ افسوس اور شکایت کا موقع نہ تھا۔ کسی کے مُنہ سے ایک بات نہ نکلی۔ خطرے میں ہمارے ہوش و حواس کا رُخ اندر کی طرف ہو جاتا ہے۔ کھنّا کا موٹر کھڑا ہی تھا۔ تینوں آدمی گھبرائے ہوئے آ کر بیٹھے اور مِل کی طرف بھاگے۔ چوراہے پر پہونچے تو دیکھا کہ سارا شہر اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ آگ میں آدمیوں کے کھینچنے کا جادو ہے۔ موٹر آگے نہ بڑھ سکا۔

مہتا نے پوچھا "آگ کا بیمہ تو کرا لیا تھا؟"

کھنّا نے لمبا سانس کھینچ کر کہا "کہاں بھئی! ابھی تو لکھا پڑھی ہو رہی تھی۔ کیا جانتا تھا کہ آفت آنے والی ہے۔"

موٹر وہیں چھوڑ دیا گیا اور تینوں آدمی بھیڑ کو چیرتے ہوئے مِل کے سامنے جا پہنچے۔ دیکھا تو آگ کا ایک سمندر خلا میں اُمنڈ رہا تھا۔ آگ کی پاگل لہریں ایک ہو کر دانت پیستی تھیں اور زبانیں نکال رہی تھیں گویا آسمان کو بھی نگل جائیں گی۔ اس آگ کے سمندر کے نیچے ایسا دھواں چھایا ہوا تھا گویا ساون کی گھٹا کاجل میں نہا کر نیچے اُتر آئی ہو۔ اس کے اوپر گویا آگ کا کانپتا اور اُبلتا ہوا پہاڑ کھڑا تھا۔ احاطہ میں لاکھوں آدمیوں کی بھیڑ تھی، پولیس بھی تھی، فائر بریگیڈ بھی اور سیوا سمتی کے والنٹیر بھی، مگر سب کے سب آگ کی تیزی سے گویا سست ہو گئے تھے۔ فائر بریگیڈ کے چھینٹے اُس آتشیں سمندر میں پڑ کر جیسے بُجھ جاتے تھے۔ اینٹیں جل رہی تھیں، آہنی گرڈر جل رہے تھے اور پگھلی ہوئی شکر کے پرنالے چاروں طرف جاری

تھے اور توا اور زمین سے بھی شعلے نکل رہے تھے۔

دور سے تو مہتا اور کھنّا کو تعجب ہو رہا تھا کہ اتنے لوگ کھڑے تماشہ کیوں دیکھ رہے ہیں، آگ بجھانے میں مدد کیوں نہیں دیتے؟ مگر اب اُنہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ تماشا دیکھنے کے سوا اور کچھ کرنا بس کے باہر ہے۔ مِل کی دیواروں سے پچاس گز کے اندر جانا جان جوکھم تھا۔ اینٹ اور پتھر کے ٹکڑے تڑاق تڑاق ٹوٹتے ہوئے اُچھل رہے تھے۔ کبھی ہوا کا رُخ اِدھر ہو جاتا تو بھگدڑ پڑ جاتی تھی۔

یہ تینوں بھیڑ کے پیچھے کھڑے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ آخر آگ لگی کیسے، اور اتنی جلد پھیل کیسے گئی؟ کیا پہلے کسی نے دیکھا نہیں یا دیکھ کر بھی بجھانے کی کوشش نہیں کی؟ ایسے ہی سوال سبھی کے دل میں اُٹھ رہے تھے مگر وہاں پوچھیں کس سے؟ مِل میں کام کرنے والے ہوں گے تو ضرور مگر اس مجمع میں ان کا مِلنا مشکل تھا۔

دفعتاً ہوا کا اتنا تیز جھونکا آیا کہ آگ کی لپٹیں نیچی ہو کر اِدھر دوڑیں جیسے سمندر میں جوار آگیا ہو۔ لوگ سر پر پیر رکھ کر بھاگے، ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے، گویا کوئی شیر جھپٹا آتا ہو۔ شعلوں میں جیسے جان پڑ گئی تھی، جیسے حرکت آگئی تھی، جیسے ہزاروں پھن والے شیش ناگ اپنے مُنہ سے آگ اُگل رہے تھے! کتنے ہی آدمی تو دھکے میں کچل گئے۔ کھنّا مُنہ کے بل گر پڑے، مالتی کو مہتا صاحب دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھے ورنہ وہ ضرور کچل گئی ہوتی۔ تینوں آدمی احاطہ کی دیوار کے پاس ایک املی کے پیڑ کے نیچے آکر رُکے۔ کھنّا ایک طرح کی بے حس محویت کے ساتھ مِل کی چمنی کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑے ہوئے تھے۔

مہتا نے پوچھا "آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"

کھنّا نے کوئی جواب نہ دیا، اُسی طرف تاکتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں وہ

بے حسی تھی جو جنون کی علامت ہے۔

مہتا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پھر پوچھا "ہم لوگ یہاں بے کار کھڑے ہیں۔ مجھے خوف ہو رہا ہے کہ آپ کے چوٹ زیادہ آگئی ہے آیئے لوٹ چلیں!"

کھنّا نے ان کی طرف دیکھا اور جیسے اپنی سنک میں بولے "جس کی یہ حرکت ہے اُنہیں میں خوب جانتا ہوں۔ اگر اُن کو اسی میں اطمینان ملتا ہے تو ایشور ان کا بھلا کرے۔ مجھے کچھ پروا نہیں، کچھ پروا نہیں! آج چاہوں تو ایسی نئی مل کھڑی کر سکتا ہوں۔ جی ہاں، بالکل نئی مل کھڑی کر سکتا ہوں! یہ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ مل نے مجھے نہیں بنایا، میں نے مل کو بنایا ہے، اور میں پھر بنا سکتا ہوں۔ مگر جن کی یہ حرکت ہے انھیں خاک میں ملا دوں گا۔ مجھے سب معلوم ہے رتی رتی معلوم ہے!"

مہتا نے اُن کا چہرا اور ان کی حرکات کو دیکھا تو گھبرا کر بولے "چلئے آپ کو گھر پہنچا دوں۔ آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے!"

کھنّا نے قہقہہ لگا کر کہا "میری طبیعت اچھی نہیں ہے! اسلئے کہ یہ مل جل گئی؟ ایسی ملوں کو میں چٹکیوں میں کھڑی کر سکتا ہوں۔ میرا نام کھنّا ہے، چندر پرکاش کھنّا! میں نے اپنا سب کچھ اس مل میں لگا دیا ہے۔ پچھلی مل میں ہم نے بیس فیصدی منافع دیا۔ میں نے حوصلہ پاکر یہ مل کھولا، اس میں آدھے روپئے میرے ہیں۔ میں نے بنک سے دو لاکھ روپئے اس مل میں لگا دیئے۔ میں ایک گھنٹہ نہیں آدھ گھنٹہ پہلے دس لاکھ کا آدمی تھا۔ جی ہاں دس لاکھ! مگر اس وقت فاقہ مست ہوں نہیں دیوالیہ ہوں! مجھے بنک کا دو لاکھ دینا ہے جس مکان میں رہتا ہوں وہ اب میرا نہیں ہے جس برتن میں کھاتا ہوں وہ بھی اب میرا نہیں ہے۔ بنک سے میں نکال دیا جاؤں گا۔ جس کھنّا کو دیکھ کر لوگ جلتے تھے وہ کھنّا اب خاک میں

بل گیا ہے۔ سوسائٹی میں اب میرا کوئی درجہ نہیں ہے۔ میرے احباب اب مجھے اپنی عقیدت کا نہیں، بلکہ اپنے رحم کا مستحق سمجھیں گے۔ میرے دشمن مجھ سے جلیں گے نہیں، بلکہ مجھ پر ہنسیں گے۔ آپ نہیں جانتے مسٹر مہتا میں نے اپنے اصولوں کا کتنا خون کیا ہے۔ کتنی رشوتیں دی ہیں، کتنی رشوتیں لی ہیں۔ کسانوں کی اُکھ تولنے کے لئے کیسے آدمی رکھے، کیسے نقلی باٹ رکھے۔ کیا کیجئے گا یہ سب سُن کر؟ مگر کھنّا اپنی یہ درگت کرانے کے لئے کیوں زندہ رہے؟ جو کچھ ہونا ہے ہو، دنیا جتنا چاہے ہنسے، احباب جتنا چاہیں افسوس کریں، لوگ جتنی گالیاں دینا چاہیں دیں، کھنّا اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کانوں سے سُننے کے لئے زندہ نہ رہیگا۔ وہ بے حیا نہیں ہے، بے غیرت نہیں ہے!"

یہ کہتے کہتے کھنّا دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ کر زار و قطار رونے لگے۔

مہتا نے انھیں سینے سے لگا کر غمگین لہجے میں کہا "کھنّا جی، ذرا صبر سے کام لیجئے۔ آپ سمجھدار ہو کر دل اتنا چھوٹا کرتے ہیں۔ دولت سے آدمی کو جو وقار ملتا ہے وہ اس کا وقار نہیں بلکہ اس کی دولت کا وقار ہے۔ آپ مفلس رہ کر بھی دوستوں کی عقیدت کے مستحق رہ سکتے ہیں اور دشمنوں کی بھی، بلکہ تب کوئی آپ کا دشمن رہے گا ہی نہیں۔ آئیے گھر چلیں۔ ذرا آرام کر لینے سے آپ کا دل ٹھہر جائے گا!"

کھنّا نے کوئی جواب نہ دیا۔ تینوں آدمی چلتے ہوئے پہنچے۔ موٹر کھڑا تھا۔ دس منٹ میں کھنّا کی کوٹھی میں پہنچ گئے۔

کھنّا نے اُتر کر سکون کے لہجے میں کہا "موٹر آپ لے جائیں، اب مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

مالتی اور مہتا بھی اُتر پڑے۔ مالتی نے کہا "تم چل کر ذرا آرام سے لیٹو، ہم بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔ گھر جانے کی تو کوئی ایسی عجلت نہیں ہے۔"

کھنّا نے ممنونیت سے اُن کی طرف دیکھا اور بھرے ہوئے گلے سے بولے "مجھ سے جو خطائیں ہوئی ہیں اُنہیں بخش دینا، مالتی! تم اور جیتا بس اور دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم دونوں مجھے اپنی نظروں سے نہ گراؤ گے۔ شاید دس پانچ دن میں یہ کوٹھی بھی چھوڑنی پڑے۔ قسمت نے کیسی دغا کی!"

جیتا نے کہا "میں آپ سے سچ کہتا ہوں کھنّا جی کہ آج میری نظروں میں جو آپ کی وقعت ہے پہلے کبھی نہ تھی!"

تینوں آدمی کمرے میں گئے۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ پاتے ہی گوبندی اندر سے آکر بولی "کیا آپ لوگ وہیں سے آرہے ہیں؟ مہراج کو بڑی بُری خبر لایا ہے!"

کھنّا کے دل میں ایسا زبردست اور نہ رُکنے والا طوفانی جوش اُٹھا کہ وہ گوبندی کے پیروں میں گر پڑیں اور انہیں آنسوؤں سے تر کر دیں۔ بھرے گلے سے بولے "ہاں پیاری، ہم تباہ ہو گئے!"

ان کا بے حس، مایوس اور مجروح دل تسکین کے لئے بیقرار ہو رہا تھا۔ سچی اور محبت میں ڈوبی ہوئی تسکین کے لئے اُس مریض کی طرح جو زندگی کی قوت زائل ہو جانے پر بھی طبیب کے چہرے کی طرف آس بھری آنکھوں سے تاک رہا ہو، وہی گوبندی جس پر انھوں نے ہمیشہ ظلم کیا، جسے ہمیشہ ذلیل کیا، جس سے ہمیشہ بے وفائی کی، جسے ہمیشہ زندگی کا بار سمجھا، جس کی موت کے ہمیشہ خواہشمند رہے، وہی اس وقت گویا اپنے آنچل میں دعا اور شگون اور تحفظ لئے ہوئے ان پر نچھاور کر رہی تھی۔ گویا وہ اس کے قدموں میں ہی ان کی زندگی کی بہشت تھی، گویا وہ ان کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر ہی ان کی بے جان رگوں میں پھر خون کی گردش قائم کر دے گی۔ دل کی اس کمزور حالت میں اس بھاری مصیبت میں گویا وہ انھیں گلے سے لگا لینے کے لئے تیار

کھڑی ہوئی کشتی پر بیٹھ کر آبی سیر کا لطف اُٹھاتے ہوئے ہم جن چٹانوں کو خطرناک سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی انھیں کھود کر پھینک دے، ان ہی چٹانوں سے کشتی کے ٹوٹ جانے پر ہم بے اختیار لپٹ جاتے ہیں۔

گوبندی نے انہیں ایک صوفے پر بٹھا دیا اور محبت بھرے لہجے میں بولی

"تم تو اتنا دل کیوں چھوٹا کرتے ہو؟ دھن کے لئے جو سارے پاپوں کی جڑ ہے؟ اُس دھن سے ہمیں کیا سُکھ تھا؟ سویرے سے آدمی رات تک ایک نہ ایک جھنجھٹ، آفت کی تباہی اور بربادی! بچے تم سے بات کرنے کو ترس جاتے تھے، تمہیں خستہ حال لوگوں کو خط لکھنے تک کی فرصت نہ ملتی تھی۔ کیا بڑی عزت تھی؟ ہاں تھی، کیونکہ دُنیا آج کل دھن کی پوجا کرتی ہے اور سدا کرتی چلی آئی ہے۔ اس کو تم سے کوئی مطلب نہیں۔ جب تک تمہارے پاس لچھمی ہے، تمہارے سامنے دُم ہلائے گی اور پھر کل اتنی ہی بھگتی سے دوسروں کے دروازے پر ماتھا رگڑے گی، اور پھر تمہاری طرف تاکے گی بھی نہیں۔ سچا انسان دھن کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ تم کیا ہو۔ اگر تم میں سچائی ہے، انصاف ہے، تیاگ ہے اور مرجادگی ہے تو وہ تمہاری پوجا کرے گا۔ ورنہ تمہیں سماج کا لٹیرا سمجھ کر منہ پھیرے گا بلکہ تمہارا دشمن ہو جائے گا۔ میں جھوٹ تو نہیں کہتی مہتا جی؟"

مہتا نے گویا جنت کے خواب سے چونک کر کہا "جھوٹ؟ وہی کہہ رہی ہیں جو دُنیا کے عظیم لوگوں نے زندگی کا ٹھوس تجربہ کرنے کے بعد کہا ہے۔ زندگی کا سچا سہارا یہی ہے۔"

گوبندی نے مہتا کو مخاطب کر کے کہا "دھنی کون ہوتا ہے اس کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ وہی جو اپنی چالاکی سے دوسروں کو بیوقوف بنا سکتا ہے ..."

کھشانے بات کاٹ کر کہا "نہیں گوبندی! دھن کمانے کے لئے اپنے میں فطری جوہر چاہئے صرف چالاکی سے دھن نہیں ملتا۔ اس کے لئے بھی تیاگ اور تپسیا کرنا لازمی ہے۔ شاید اتنی ریاضت سے خدا بھی مل جائے۔ ہماری ساری جسمانی، روحانی اور عقلی طاقتوں کے توازن کا نام دولت ہے۔"

گوبندی نے مخالفت نہ کرتے ہوئے، ثالث کے لہجے میں کہا "میں مانتی ہوں کہ دھن کے لئے تھوڑی تپسیا نہیں کرنی پڑتی اگر پھر بھی ہم نے اسے زندگی میں جتنی اہم چیز سمجھ رکھا ہے اتنی وہ نہیں ہے۔ میں تو خوش ہوں کہ تمہارے سر سے یہ بوجھ ٹلا۔ اب تمہارے لڑکے انسان بنیں گے، خود غرضی اور غرور کے پتلے نہیں۔ زندگی کا سکھ دوسروں کو سکھی رکھنے میں ہے، انہیں لوٹنے میں نہیں۔ برا نہ ماننا اب تک تمہاری زندگی کا مطلب تھا خود پروری اور عیش کوشی۔ ایشور نے تمہیں ان ذرائع سے محروم کر کے تمہارے لئے زندہ بلند اور پاک زندگی کا راستہ کھول دیا ہے۔ اس کے حصول میں اگر کچھ تکلیف بھی ہو تو اس کا خیر مقدم کرو۔ تم اسے مصیبت سمجھتے ہی کیوں ہو؟ کیوں نہیں سمجھتے کہ تمہیں بے انصافیوں سے لڑنے کا موقع ملا ہے۔ میرے خیال میں تو ظالم ہونے سے مظلوم ہونا کہیں بہتر ہے۔ دھن کھو کر اگر ہم اپنی آتما کو پا سکیں تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔ انصاف کے سپاہی بن کر لڑنے میں جو عظمت اور راحت ہے کیا اسے اتنا جلد بھول گئے؟"

گوبندی کے زرد و خشک چہرے پر جلال کی ایسی چمک تھی گویا اس میں کوئی عجیب طاقت آگئی ہو، گویا اس کی ساری خاموش ریاضت میں گویائی آگئی ہو!

کھنا اس کی طرف عقیدت سے تاک رہے تھے، پھر جیسے کہ اسے خدائی الہام سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور مانتی دل میں نادم تھی گوبندی کے خیالات کتنے بلند، اس کا دل کتنا کشادہ اور اس کی زندگی کتنی روشن ہے!

(۲۹)

نہری اُن عورتوں میں نہ تھی جو نیکی کر کے دریا میں ڈال دیتی ہیں۔ اُس نے نیکی کی ہے تو اس کا خوب ڈھنڈورا پیٹے گی اور اس سے جتنی نیکنامی مل سکتی ہے اس سے کچھ زیادہ ہی پانے کے لئے ہاتھ پیر مارے گی۔ ایسے آدمی کو نیکنامی کے عوض بدنامی ہی ملتی ہے۔ نیکی نہ کرنا بدنامی کی بات نہیں۔ اپنی خواہش یا اپنے میں سکت نہیں ہے۔ اس کے لئے کوئی ہمیں برا نہیں کہہ سکتا۔ مگر جب ہم نیکی کر کے اس کا احسان جتاتے ہیں تو وہی شخص جس کے ساتھ ہم نے نیکی کی تھی، ہمارا دشمن ہو جاتا ہے اور ہمارے احسان کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ وہی نیکی اگر کرنے والے کے دل میں رہے تو نیکی ہے، اور باہر نکل آوے تو بدی ہے۔ نہری چاروں طرف کہتی پھرتی تھی "وہ بیچارا ہوری بڑی بپتا میں تھا، بیٹی کے بیاہ کے لئے کھیت رہن رکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی یہ دُردشا دیکھی تو مجھے دیا آ گئی۔ دھنیا سے تو جی جلتا تھا، وہ رانڈ تو مارے گھمنڈ کے دھرتی پہ پاؤں نہیں رکھتی۔ بیچارہ ہوری چنتا سے گھلا جاتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سنکٹ میں اس کی کچھ مدد کر دوں۔ آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ اور ہوری تو اب کوئی غیر نہیں ہے، مانو چاہے نہ مانو وہ تمہارے ناتے دار ہو چکے، روپے نکال کر دے دیئے۔ نہیں لڑکی اب تک بیٹھی ہی ہوتی!!"

دھنیا بھلا یہ ڈینگ کب سننے لگی "روپے گھیرات (خیرات) دیئے تھے! بڑی گھیرات دینے والی! بیاج مہاجن بھی لے گا اور تم بھی لو گی، پھر احسان کاہے کا؟ دوسروں کو دیتی تو بیاج کی جگہ اصل بھی چلا جاتا، ہم نے لیا ہے تو ہاتھ میں روپیا آتے ہی ناک پر رکھ دیں گے۔ ہمیں تھے کہ تمہارے گھر کا رس اُٹھا کے پی گئے۔ اور کبھی

مُنہ پر نہیں لائے۔ کوئی یہاں دُوارے پر کھڑا نہیں ہونے دیتا تھا، ہم نے تمہاری مرجاد بنا دی۔ تمہارے منہ کی لالی رکھ لی!"

رات کے دس بج گئے تھے۔ ساون کی اندھیری گھٹا چھائی تھی۔ سارے گاؤں میں اندھیرا تھا۔ ہوری نے کھانا کھا کر تمباکو پی اور سونے جا رہا تھا کہ بھولا آ کر کھڑا ہو گیا۔

ہوری نے پوچھا کہ "کیسے ہو بھولا مہتو؟ جب اسی گاؤں میں رہنا ہے تو الگ کیوں چھوٹا سا گھر نہیں بنا لیتے؟ گاؤں میں لوگ کیسی کیسی برائی کرتے ہیں، کیا تمہیں اچھا لگتا ہے؟ بُرا نہ ماننا، تم سے ناتا ہو گیا ہے اس لئے تمہاری بدنامی نہیں سُنی جاتی، نہیں تو مجھے کیا کرنا تھا!"

دھنیا اُسی وقت لوٹے میں پانی لے کر ہوری کے سرہانے رکھنے آئی تھی، سُن کر بولی "دوسرا مرد ہوتا تو ایسی عورت کا سر کاٹ لیتا!"

ہوری نے ڈانٹا "کیوں بے بات کی بات بکتی ہے؟ پانی رکھ دے اور جا سو۔ آج تو ہی بُری راہ چلنے لگے تو کیا میں تیرا سر کاٹ لوں گا؟ تو کاٹنے دے گی؟"

دھنیا اُسے پانی کا ایک چھینٹا مار کر بولی "بُری راہ چلے تمہاری بہن، میں کیوں چلنے لگی؟ بس تو دنیا کی بات کہتی ہوں اور مجھے گالی دینے لگے۔ اب مُنہ میٹھا ہو گیا ہو گا عورت چاہے جس راہ جائے مرد ٹکر ٹکر دیکھتا رہے! ایسے مرد کو میں مرد نہیں کہتی۔"

ہوری دل میں کٹا جاتا تھا۔ بھولا اس سے اپنا دکھ درد کہنے آیا ہو گا، یہ اسی پھوٹ پڑی۔ ذرا گرم ہو کر بولا "تو سارے دن اپنے ہی مَن کی کیا کرتی ہے تو میں تیرا کیا بگاڑ لیتا ہوں؟ کچھ کہتا ہوں تو کاٹنے دوڑتی ہے۔ یہی سوچ!"

دھنیا نے چاپلوسی کرنا نہ سیکھا تھا، بولی "عورت گھی کا گھڑا لڑھکا دے، گھر میں آگ لگا دے تو یہ سب مرد سہہ لے گا، مگر اس کا بدراہ چلنا کوئی مرد

نہ سہے گا!"

بھولا غمگین لہجے میں بولا "تو بہت ٹھیک کہتی ہے۔ دھنیا بیشک مجھے اس کا سر کاٹ لینا چاہیئے تھا۔ لیکن اب اُتنا بل تو نہیں رہا۔ تو چل کر سمجھا دے، میں تو سب کچھ کر کے ہار گیا!"

"جب عورت کو بس میں رکھنے کا بوتا نہ تھا تو سگائی کیوں کی تھی؟ اس چھچھا لیدر کے لیئے؟ کیا سوچتے تھے کہ وہ آ کر تمہارے پاؤں دبائے گی، تمہیں چلم بھر بھر کے پلائے گی اور جب تم بیمار پڑو گے تو تمہاری سیوا ٹہل کرے گی؟ تو ایسا وہی عورت کر سکتی ہے جس نے تمہارے ساتھ جوانی کا سکھ اٹھایا ہو۔ میری سمجھ میں یہی نہیں آتا کہ تم اُسے دیکھ کر لٹو کیسے ہو گئے۔ دیکھ تو لیا ہوتا کہ وہ کس سبھاؤ کی ہے، کس رنگ ڈھنگ کی ہے تم تو بھوکے سیار کی طرح ٹوٹ پڑے۔ اب تو تمہارا دھرم یہی ہے کہ گنڈاسے سے اس کا سر کاٹ لو۔ پھانسی ہی تو ہوگی۔ اس چھچھا لیدر سے پھانسی اچھی!"

بھولا کے خون میں کچھ گرمی آگئی بولا "تو تمہاری یہی صلاح ہے؟"

دھنیا بولی "ہاں میری یہی صلاح ہے اب سو پچاس برس تو جیو گے نہیں، سمجھ لینا کہ اتنی ہی عمر تھی!"

ہوری نے اسے زور سے جھڑکا "چپ رہ، بڑی آئی ہے وہاں سے تو پنچ بن کے! جبر دستی چڑیا تک تو پنجرے میں رہتی نہیں پھر آدمی کیا رہے گا؟ تم اُسے چھوڑ دو بھولا، اور سمجھ لو کہ مر گئی۔ جا کر اپنے بال بچوں میں آرام سے رہو۔ دو روٹی کھاؤ اور رام کا نام لو۔ جوانی کے سکھ اب گئے۔ وہ عورت چنچل ہے۔ بدنامی اور جلن کے سوا تم اس سے کوئی سکھ نہ پاؤ گے!"

بھولا ہوری کو چھوڑ دے یہ ناممکن! ہوری اس وقت بھی اس کی طرف غصہ بھری

آنکھوں سے تیز نیزہ دکھلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مگر نہیں، بھولا اب اُسے چھوڑ ہی نہیں گا، جیسا کر رہی ہے اُس کا پھل بھوگے!

آنکھوں میں آنسو آگئے بولا "ہوری بھیا! اس عورت کے پیچھے میری جتنی سانست ہوئی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اسی کے پیچھے کامتا سے لڑائی ہوئی۔ بڑھاپے میں یہ راگ بھی نگلنا تھا سو لگ گیا۔ مجھے روز طعنہ دیتی ہے کہ تمہاری تو لڑکی نکل گئی۔ میری لڑکی نکل گئی چاہے بھاگ گئی پر اپنے آدمی کے ساتھ پڑی تو ہے۔ اس کے دکھ سکھ کی ساتھی تو ہے۔ ایسی تو میں نے عورت ہی نہیں دیکھی دوسروں کے ساتھ تو ہنستی ہے اور مجھے دیکھ کر کُپّا سا مُنہ پھلا لیتی ہے۔ میں غریب آدمی ٹھہرا تین چار آنے روز کی مجوری کرتا ہوں تب دودھ دہی، مانس مچھلی، ربڑی ملائی کہاں سے لاؤں؟"

بھولا یہاں سے عہد کر کے اپنے گھر گئے۔ اب بیٹوں کے ساتھ رہیں گے۔ بہت دھکے کھا چکے۔ مگر دوسرے دن صبح ہوری نے دیکھا تو بھولا دُلاری سیٹھانی کی دکان سے تمباکو لئے چلے جا رہے تھے۔ ہوری نے پکارنا ٹھیک نہ سمجھا۔ عشق میں انسان کو خود پر قابو نہیں ہوتا۔ وہاں سے آکر دھنیا سے بولا "بھولا تو ابھی وہیں ہیں۔ نوہری نے سچ مچ ان پر کوئی جادو کر دیا ہے!"

دھنیا نے ناک سکوڑ کر کہا "جیسی بے حیا وہ ہے ویسا ہی بے حیا یہ ہے۔ ایسے مرد کو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہئے۔ اب وہ سیکھی (شیخی) نہ جانے کہاں گئی۔ جھنیا یہاں آئی تو اس کے لئے ڈنڈا لئے پھر رہے تھے۔ مرجاد چلی جاتی تھی۔ اب مرجاد نہیں جاتی!"

ہوری کو بھولا پر رحم آ رہا تھا۔ بے چارا اس ہرجائی کے پھیر میں پڑ کر اپنے کو برباد کئے ڈالتا ہے۔ چھوڑ کر جائے بھی تو کیسے؟ عورت کو اس طرح چھوڑ کر جاتا

کیا سہل ہے ؟ وہ چڑیل اُسے وہاں بھی تو نہیں رہنے دے گی۔ کہیں بھگا دے، کھانے کو گی، کہیں روٹی کپڑے کا دعویٰ کرے گی۔ ابھی تو گاؤں کے ہی لوگ جانتے ہیں، کسی کو کچھ کہتے سوچ ہوتا ہے۔ کانا پھوسی کر کے ہی رہ جاتے ہیں۔ تب تو دنیا بھی بھولا ہی کو بُرا کہے گی۔ لوگ یہی تو کہیں گے کہ جب مرد نے چھوڑ دیا تو بیچاری عورت کیا کرے؟ مرد بُرا ہو تو عورت کی گردن کاٹ لے گا، عورت بُری ہو تو مرد کے مُنہ میں کالکھ لگا دے گی !!

اس کے دو [illegible] ایک روز گاؤں میں یہ خبر پھیلی کہ نہری نے مارے جوتوں کے بھولا کی چاند گنجی کر دی۔ برسات ختم ہو گئی تھی اور ربیع بونے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہوری کی ابھی ایکھ نیلام ہو رہی تھی۔ بیج کے لئے اُسے روپئے نہ ملے اور ایکھ نہ بوئی جا سکی۔ اُدھر دہنا بیل بھی بیٹھان لینے کو تھا اور ایک دوسرے بیل کے بغیر کام نہ چل سکتا تھا۔ پنیا کا ایک بیل ناندھ ہی پر گر کر مر گیا تھا۔ اُس وقت سے اور بھی دقت بڑھ گئی تھی۔ ایک دن پنیا کے کھیت میں ہل جاتا تو ایک دن ہوری کے کھیت میں۔ کھیتوں کی جتائی جیسی ہونی چاہئے تھی نہ ہو پائی تھی۔

ہوری ہل لے کر کھیت میں گیا، مگر بھولا کی فکر لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی یہ نہ سُنا تھا کہ کسی عورت نے اپنے خاوند کو جوتوں سے مارا ہو۔ جوتوں سے کیا، تھپڑ یا گھونسے سے مارنے کا بھی کوئی واقعہ اسے یاد نہ آتا تھا۔ مگر آج نہری نے بھولا کو جوتوں سے پیٹا اور سب لوگوں نے تماشا دیکھا۔ اس عورت سے کیسے اُس ابھاگے کا گلا چھوٹے ؟ اب تو بھولا کو کہیں ڈوب ہی مرنا چاہئے۔ جب زندگی میں بدنامی اور درگت کے سوا کچھ نہ رہ گیا ہو تو آدمی کا مر جانا ہی اچھا۔ کون بھولا کے نام کو رونے والا بیٹھا ہے۔ بیٹے چاہے کریا کرم کر دیں، سو وہ بھی دنیا کی لاج کے کارن۔ آنسو کسی کی آنکھ میں نہ آئے گا۔ موہ کے بس میں پڑ کر آدمی اس

طرح اپنے کو چوپٹ کرتا ہے۔ جب کوئی رونے والا ہی نہیں تو پھر جلنے کا کیسا موہ اور مرنے سے کیسا ڈر؟

ایک یہ نہری ہے اور ایک یہ چمارن ہے سِلیا! دیکھنے سُننے میں اُس سے لکھ درجہ اچھی۔ چاہے تو دو کو کھِلا کر کھائے اور راُدھا بنی گھومے، لیکن مجوری کرتی ہے، بھوکوں مرتی ہے اور پتی کے نام پر بیٹھی ہے اور وہ بے دردبات بھی نہیں پوچھتا۔ کون جانے، دھنیا مر گئی ہوتی تو آج ہوری کی بھی یہی دشا ہوتی۔ اُس کی موت کے خیال ہی سے ہوری کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دھنیا کی خیالی شکل آنکھوں کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی، سیوا اور تیاگ کی دیوی زبان کی تیز مگر موم جیسا دل رکھنے والی۔ پیسے پیسے کے لئے جان دینے والی مگر آبرو بچانے کیلئے اپنا سب کچھ دے دینے کو تیار۔ جوانی میں وہ کم سُندر نہ تھی۔ نہری اس کے سامنے کیا ہے؟ چلتی تھی تو رانی سی لگتی تھی جو دیکھتا تھا دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ یہی پٹیشوری اور جھنگری تب جوان تھے۔ دونوں دھنیا کو دیکھ کر سینے پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ دروازے کے سَو سَو چکر لگاتے تھے۔ ہوری ان کی تاک میں رہتا تھا مگر چھیڑنے کا کوئی حیلہ نہ پاتا تھا۔ اُس وقت گھر میں کھانے پینے کی بڑی تکلیف تھی۔ پالا پڑ گیا تھا اور کھیتوں میں بھوسا تک نہ ہوا تھا لوگ جھڑبیریاں کھا کھا کر دن کاٹتے تھے۔ ہوری کو قحط کے کیمپ میں کام کرنے جانا پڑتا تھا۔ چھ پیسے روزانہ ملتے تھے۔ دھنیا گھر میں اکیلی رہتی تھی مگر کبھی کسی نے اُس کو کسی مرد کی طرف تاکتے نہیں دیکھا۔ پٹیشوری نے ایک بار کچھ چھیڑ چھاڑ کی تھی تو اُس کا ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ لالہ آج تک نہیں بھولے۔

دفعتاً اس نے ماتادین کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ کسائی کہیں کا! کیسا تلک لگائے ہوئے ہے جیسے بھگوان کا پورا بھگت ہے۔ رنگا سیار! ایسے باہمن کو پالاگن کون کرے؟

ماتادین نے قریب آکر کہا "تمہارا اپنا بیل تو بوڑھا ہو گیا، ہوری! اب کی سینچائی میں نہ ٹھہرے گا۔ اس کو لائے کوئی پانچ سال ہوئے ہوں گے؟"

ہوری نے بیل کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا "کیسا پانچواں؟ آٹھواں سال چل رہا ہے، بھائی! جی تو چاہتا ہے کہ اسے پنشن دے دوں، پر کسان کو اور کسان کے بیل، ان کو جمراج پنشن دے تو ملے۔ اس کی گردن پر جوا رکھتے میرا من سوستا ہے۔ بے چارا سوچتا ہو گا کہ اب بھی چھٹی نہیں، اب کیا میرا ہاڑ جوتے گا گیا؟ پر اپنا کوئی بس نہیں ہے۔ تم کیسے چلے؟ اب تو جی اچھا ہے؟"

ماتادین ادھر ایک مہینے سے فصلی بخار میں پڑا ہوا تھا۔ ایک دن تو اس کی نبض چھوٹ گئی تھی اور چارپائی سے نیچے اُتار دیا گیا تھا۔ اس وقت سے اس کے دل میں یہ تحریک ہوتی تھی کہ سلیا پر ظلم کرنے کی اُسے یہ سزا ملی ہے جب اُس نے سلیا کو گھر سے نکالا تب وہ حاملہ تھی۔ اُسے ذرا بھی رحم نہ آیا۔ پورے حمل کے ساتھ بھی وہ مزدوری کرتی رہی۔ اگر دھنیا نے اس پر ترس نہ کھایا ہوتا تو مر گئی ہوتی۔ کیسی کیسی مصیبتیں جھیل کر جی رہی ہے۔ مزدوری بھی تو اس حالت میں نہیں کر سکتی۔ اب نادم اور نرم ہو کر وہ سلیا کو ہوری کی معرفت دو روپے دینے آیا۔ اگر ہوری یہ روپے اُسے دے دے تو اس کا بڑا احسان مانے گا۔

ہوری نے کہا "تمہیں جا کر کیوں نہیں دے دیتے؟"

ماتادین نے عاجزی سے کہا "مجھے اس کے پاس نہ بھیجو ہوری بھیّا! کونسا منہ لے کر جاؤں؟ ڈر بھی لگ رہا ہے کہ مجھے دیکھ کر کہیں ڈانٹنے نہ لگے۔ تم مجھ پر اتنی مہربانی کرو۔ ابھی مجھ سے چلا نہیں جاتا مگر اسی روپے کیلئے ایک ججمان کے پاس کوس بھر دوڑا گیا تھا۔ اپنی کرنی کا پھل بہت بھوگ چکا۔ اس باہمن ہونے کا بوجھ اب نہیں اُٹھائے اُٹھتا۔ چھپ کر چاہے کُکرم کرو کوئی نہیں بولتا مگر کھل کر کچھ نہیں کر سکتے۔

نہیں تو کل ہی کلنک لگ جائے گا۔ تم اُسے سمجھا دینا، دادا! کہ پرا اکبر ادھر ادھر کیسے - یہ دھرم کا بندھن بہت کڑا ہوتا ہے۔ جس سماج میں پیدا ہوئے اور پلے اس کی مرجاد تو نبھانی ہی پڑتی ہے۔ اور کسی جات کا دھرم بگڑ جائے تو اس کا کچھ بگڑتا نہیں، مگر برہمن کا دھرم بگڑ جائے تو وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ اس کا دھرم ہی اس کے پُرکھوں کی کمائی ہے۔ اسی کی وہ روٹی کھاتا ہے۔ اس پرائچت کے پیچھے ہمارے تین سو روپئے لگ گئے۔ تو جب بے دھرم ہی ہو کر رہنا ہے تو پھر جو کچھ کرنا ہے وہ کھل کے کروں گا۔ سماج کے ناتے آدمی کا اگر کچھ دھرم ہے تو آدمی کے ناتے بھی تو اس کا کچھ دھرم ہے۔ سماج کا دھرم رکھنے سے سماج آدر کرتا ہے، مگر آدمی کا دھرم رکھنے سے تو ایشور پرسن ہوتا ہے!"

شام کو جب ہوری نے سلیا کو ڈرتے ڈرتے روپئے دیئے تو وہ جیسے اپنی ریاضت کا ثمرہ پا گئی۔ دکھ کا بوجھ تو وہ اکیلی اٹھا سکتی تھی مگر سکھ کا بوجھ تو تنہا نہیں اٹھتا۔ کیسے یہ خوشخبری سنائے؟ دھنیا سے وہ اپنے دل کی باتیں نہیں کہہ سکتی۔ گاؤں میں اور کوئی نہیں جس سے اس کا کافی ربط و ضبط ہو۔ اس کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ سونا ہی اُسکی سہیلی تھی۔ سلیا اُس سے ملنے کیلئے بے چین ہو گئی۔ رات بھر کیسے صبر کرے؟ دل میں ایک آندھی سی اُٹھ رہی تھی اب وہ بیکس نہیں ہے۔ ماتا دین نے اس کی بانہہ پکڑ لی ہے۔ زندگی کے راستے میں اس کے سامنے اب خوفناک منہ والی اندھیری خندق نہیں ہے، بلکہ لہلہاتا ہوا ہرا بھرا میدان ہے جس میں جھرنے اپنا سہانا نغمہ گاتے ہیں اور ہرن کلیلیں کر رہے ہیں۔ اس کی روٹھی ہوئی محبت آج سرمست ہو گئی ہے۔ ماتا دین کو اُسی نے دل میں کتنا پانی پی پی کر کوسا تھا۔ اب وہ اُن سے چھما مانگے گی۔ اُس سے سچ مچ بڑی بھول ہوئی کہ اُس نے سارے گاؤں کے آگے اُن کی ہتک کی۔ وہ تو چمارن ہے، جات کی کم،

اُس کا کیا بگڑا۔ آج دس بیس لگا کر برادری کو روٹی دے دے تو پھر برادری میں ہو جائے گی ان بیچارے کا تو ہمیشہ کے لئے دھرم ہی ناس ہو گیا۔ وہ پھر جا اب انہیں پھر نہیں مل سکتی۔ وہ اس سمے کتنی اندھی ہو گئی تھی کہ سب سے ان کے پریم کا ڈھنڈورا پیٹتی پھری۔ اُن کا تو دھرم بگڑ گیا تھا۔ اُنہیں تو رس تھا ہی، پر اس کے سر پر کیوں بھوت سوار ہو گیا؟ وہ اپنے ہی گھر چلی جاتی تو کون برائی ہو جاتی؟ گھر میں اُسے کوئی باندھ تو نہ لیتا؟ ماتادین کی سب اسی لئے تو پوجا کرتے ہیں کہ وہ نیم دھرم سے رہتے ہیں، تو وہی دھرم جب نہ رہ گیا تو وہ کیوں نہ اس کے لہو کے پیاسے ہو جاتے؟

ذرا دیر پہلے تک اس کی نگاہوں میں سارا قصور ماتادین کا تھا، اور اب سارا قصور اپنا تھا۔ ہمدردی نے ہمدردی پیدا کر دی تھی۔ اس نے بچے کو سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ اب اُسے دیکھ کر ندامت و پشیمانی نہ ہوتی۔ وہ اب صرف اس کے رحم کا مستحق نہیں اب اس کی پوری مادرانہ محبت کا مستحق ہے۔

کاتک کی روپہلی چاندنی ساری فضا پر کسی اَن دیکھے راگ کی طرح چھائی ہوئی تھی سلیا گھر سے نکلی۔ وہ سونا کے پاس جا کر اُسے یہ مژدہ سنائے گی اب اس سے نہیں رہا تھا۔ ابھی تو شام ہوئی ہے۔ ڈونگی اس پار تھی اور ملّاح کا کہیں پتہ نہیں۔ چاند گھل کر جیسے ندی میں بہا جا رہا ہے۔ وہ ایک لمحہ کھڑی سوچتی رہی پھر ندی میں گھس پڑی۔ ندی میں کچھ ایسا زیادہ پانی تو کیا ہوگا۔ اُس خوشی کے سمندر کے آگے ندی کیا چیز تھی۔ پانی پہلے تو گھٹنوں تک تھا پھر کمر تک آیا اور آخر گلے تک پہنچ گیا۔ سلیا ڈری کہ کہیں ڈوب نہ جائے۔ کہیں کوئی گڑھا نہ پڑ جائے مگر اس نے جان پر کھیل کر پیر آگے بڑھایا اب وہ منجدھار میں ہے موت اس کے سامنے ناچ رہی ہے۔ مگر وہ گھبرائی نہیں۔ اُسے تیرنا آتا ہے۔ لڑکپن میں وہ کتنے ہی بار اس

ندی میں تیر چکی ہے، اور کھڑے کھڑے ندی کو پار بھی کر چکی ہے۔ پھر اس کا دل دھڑک رہا ہے۔ مگر پانی کم ہونے لگا اب کوئی ڈر نہیں ہے اس نے جلد جلد ندی کو پار کیا اور کنارے پہونچ کر اپنے کپڑے نچوڑے اور ٹھنڈے کانپتی ہوئی آگے بڑھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ گیدڑوں کی آواز بھی نہ سنائی پڑتی تھی اور سونا سے ملنے کا خوش کن خیال اُسے اُڑائے لئے جاتا تھا۔

مگر اس گاؤں میں پہنچ کر اُسے سونا کے گھر جاتے ہوئے تامل ہونے لگا متھرا کیا کہے گا؟ اس کے گھر والے کیا کہیں گے؟ سونا بھی بگڑے گی کہ اتنی رات گئے تو کیوں آئی؟ دیہاتیوں میں دن بھر کے ماندے کسان سر شام ہی سو جاتے ہیں۔ سارے گاؤں میں سونا پڑ گیا تھا۔ متھرا کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ سلیا اُسے نہ کھلا سکی۔ لوگ اسے اس بھیس میں دیکھ کر کیا کہیں گے؟ وہیں دروازہ پر الاؤ میں ابھی آگ چمک رہی تھی۔ سلیا اپنے کپڑے سکھانے لگی۔ یکایک دروازہ کھلا اور متھرا نے باہر آکر پکارا "ارے کون بیٹھا ہے الاؤ کے پاس؟"

سلیا نے جلد ہی آنچل کو سر پر کھینچ لیا اور قریب جا کر بولی "میں ہوں سلیا۔"

"سلیا! اتنی رات گئے کیسے آئی؟ وہاں تو سب اچھا بھلا ہے؟"

"ہاں سب اچھا بھلا ہے۔ جی گھبرا رہا تھا، سوچا کہ سب سے بھینٹ کر آؤں، دن کو تو چھٹی ہی نہیں۔"

"تو کیا اکیلے آپ ندی پار کر کے آئی ہے؟"

"اور کیسے آتی؟ پانی؟ پانی کم تھا۔"

متھرا اُسے اندر لے گیا۔ بروٹھے میں اندھیرا تھا۔ اس نے سلیا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ سلیا نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور غصے سے بولی "دیکھو متھرا مجھے چھیڑو گے تو میں سونا سے کہہ دوں گی۔ تم میرے چھوٹے بہنوئی ہو یہ سمجھ لو،

جان پڑتا ہے کہ سونا سے من نہیں بھرتا"۔

متھرا نے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا "تم بڑی بے درد ہو سلّو! اس محبت کون دیکھتا ہے؟"

"کیا میں سونا سے سُندر ہوں؟ اپنا بھاگ نہیں سراہتے کہ ایسی اِندر کی پری پا گئے۔ اب بھونرا بننے کو من چلا ہے اُس سے کہدوں تو تمہارا مُنہ نہ دیکھے"۔

متھرا عیاش نہ تھا۔ سونا سے اُسے محبت بھی تھی۔ اس وقت تاریکی اور تخلیہ اور سلیا کا شباب دیکھ کر اُس کا جی ڈانواڈول ہوا تھا۔ یہ تنبیہہ پا کر ہوش میں آ گیا۔ سلیا کو چھوڑتا ہوا بولا "تمہارے پیروں پڑتا ہوں سلّو، اُس سے نہ کہنا۔ ابھی جو ڈنڈ چاہو لے لو"۔

سلّو کو اُس پر رحم آ گیا۔ آہستہ سے اُس کے مُنہ پر چپت جما کر بولی "اس کا ڈنڈ یہی ہے کہ پھر مجھ سے ایسی چھیڑ نہ کرنا اور نہ کسی اور سے کرنا، نہیں تو سونا تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی"۔

"میں قسم کھاتا ہوں سلّو! کہ اب کبھی ایسا نہ ہوگا"۔

اس کی آواز میں التجا تھی۔ سلّو کا جی بھی ڈانواڈول ہونے لگا۔ اس کا رحم پُرکیف ہو چلا۔

"اور جو کرو؟"

"تو تم جو چاہنا سو کرنا"۔

سلّو کا مُنہ اُس کے مُنہ کے پاس آ گیا تھا۔ اور دونوں کے سانس، جسم اور آواز میں لرزش ہو رہی تھی کہ دفعتاً سونا نے پکارا "کس سے باتیں کر رہے ہو دربان؟"

منتو پیچھے ہٹ گئی۔ متھرا آگے بڑھ کر آنگن میں آگیا اور بولا "بسلو تمہارے گاؤں سے آئی ہے"۔

بسلو بھی پیچھے پیچھے آ کر آنگن میں کھڑی ہو گئی۔ اُس نے دیکھا کہ سونا وہاں کتنے آرام سے رہتی ہے۔ دالان میں چارپائی ہے جس پر سوزنی کا نرم بستر بچھا ہوا ہے، بالکل ویسا ہی ماتا دین کی چارپائی پر بچھا رہتا ہے۔ تکیہ بھی ہے اور لحاف بھی۔ چارپائی کے نیچے لوٹے میں پانی رکھا ہوا ہے۔ صحن میں چاندنی نے آئینہ سا بچھا رکھا ہے۔ ایک طرف تُلسی کا چبوترا ہے اور دوسری طرف جُوار کے ڈنٹھلوں کے کئی بوجھ دیوار کے سہارے رکھے ہوئے ہیں اور بیچ میں پُوال کے گٹھے ہیں۔ پاس ہی اوکھلی ہے جس کے پاس کُٹا ہوا دھان پڑا ہے کھپریل پہ کدو کی بیل چڑھی ہوئی ہے اور کئی کدو بھی دکھائی پڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف کے دالان میں ایک گائے بندھی ہوئی ہے۔ اس حصے میں متھرا اور سونا سوتے ہیں۔ اور لوگ دوسرے حصے میں ہوں گے۔ بسلیا نے سوچا کہ سونا کی زندگی کتنے آرام کی زندگی ہے۔ سونا اُٹھ کر آنگن میں آ گئی تھی مگر بسلو سے بے اختیار گلے نہیں ملی۔ بسلو نے سمجھا کہ شاید متھرا کے کھڑے ہونے کی وجہ سے سونا سوچ کر رہی ہے۔ یا کون جانے اُسے اب گھمنڈ ہو گیا ہو۔ بسلو چمارن سے گلے ملنے میں اپنی ہتک سمجھتی ہو۔ اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس ملاقات سے خوشی کے بجائے حسد پیدا ہوئی۔ سونا کا رنگ کیسا کِھل گیا ہے اور بدن کیسا کنچن سا نکھر آیا ہے۔ گٹھن بھی سڈول ہو گئی ہے۔ چہرے پر گرہست پن کی رونق کے ساتھ شباب کی مستی ہوئی بہار ہے۔ بسلو ایک لمحہ کے لئے گویا مبہوت سی تاکتی ہوئی کھڑی رہ گئی۔ یہ وہی سونا ہے جو سوکھا سا بدن لئے، بال بکھرائے اِدھر اُدھر دوڑا کرتی تھی۔ مہینوں سر میں تیل نہ پڑتا تھا۔ پھٹے پرانے چیتھڑے لپیٹے پھرتی رہتی تھی۔ آج اپنے گھر کی رانی

ہے۔ گلے میں ہنسلی اور جھیل۔ کانوں میں کون پھول اور سونے کی بالیاں، ہاتھوں میں چاندی کے کڑے اور کنگن، آنکھوں میں کاجل اور مانگ میں سیندور، سلیا کی زندگی کا بہشت یہیں تھا اور سونا کو وہاں دیکھ کر وہ خوش نہ ہوئی۔ اسے کتنا گھمنڈ ہو گیا ہے۔ کہاں تو سلیا کے گلے میں بانہیں ڈالے گھاس چھیلنے جاتی تھی اور آج سامنے دیکھتی بھی نہیں۔ اُس نے سوچا تھا کہ سونا اُس کے گلے لگ کر خوب روئے گی، اُسے آدر سے بٹھائے گی، اسے کھانے بلائے گی، اس سے گاؤں گھر کی سیکڑوں باتیں پوچھے گی اور اس سے اپنی نئی زندگی کے تجربے، سہاگ رات کی کیفیت بیان کرے گی۔ اور یہاں سونا کے منہ میں دہی جما ہوا ہے۔ وہ تو یہاں آ کر پچھتائی۔

آخر سونا نے رکھائی سے پوچھا "اتنی رات گئے کیسے چلیں سلّو؟"

سلّو نے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا "تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا اتنے دن ہو گئے تو بھینٹ کرنے چلی آئی۔"

سونا کا لہجہ اور سخت ہوا "مگر آدمی کسی کے گھر آتا ہے تو دن کو کہ اتنی رات بیتے؟"

واقعی سونا کو اُس کا آنا بُرا لگ رہا تھا۔ یہ وقت اُس کے عیش و آرام اور ہنسنے بولنے کا تھا۔ سلّو نے اسی میں دخل دے کر گویا اس کے آگے سے پروسی ہوئی تھالی کھینچ لی تھی۔

سلّو ساکت سی بیٹھی ہوئی زمین کی طرف تاک رہی تھی۔ دھرتی کیوں نہیں پھٹ جاتی کہ وہ اس میں سما جائے اتنی ہتک! اُس نے اپنی اپنی سی زندگی میں بہت ہتک سہی، بڑی درگت دیکھی تھی مگر آج یہ کانٹا جس طرح اس کے دل میں چبھ گیا تھا ویسی کبھی کوئی اور بات نہ چبھی تھی۔ گڑ گھر کے اندر مٹکوں میں بند رکھا ہو تو کتنی ہی

موسلا دھار بارش ہو۔ پھر بھی کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ مگر جس وقت وہ دھوپ میں سوکھنے کے لئے باہر پھیلایا گیا ہو تب تو پانی کا ایک چھینٹا بھی اسے بالکل خراب کر دے گا۔ سلیا کے دل کے سارے نازک جذبات اس وقت منہ کھولے ہوئے تھے کہ آسمان سے امرت برسے گا مگر یہ ہوا کیا؟ امرت کی جگہ بِس، جو سلیا کے روئیں روئیں میں دوڑ گیا۔ مار گزیدہ کی طرح لہریں آئیں۔ گھر میں فاقے سے سو رہنا اور بات ہے مگر دعوت کی صف سے اٹھا دیا جانا تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ سلیا کو یہاں ایک لمحہ ٹھہرنا بھی برا معلوم ہوا، جیسے کوئی اس کا گلا دبائے ہوئے ہو۔ وہ کچھ نہ پوچھ سکی۔ سونا کے دل میں کیا ہے اس وقت وہ قیاس کر رہی تھی۔ بل میں بیٹھا ہوا سانپ کہیں باہر نہ نکل آئے، اس کے پہلے ہی وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ کیسے بھاگے؟ کیا بہانہ کرے؟ اس کی جان کیوں نہیں نکل جاتی؟۔

متھرا نے توشہ خانے کی کنجی اٹھا لی کہ سلیا کے ناشتہ کے لئے کچھ نکال لائے۔ مگر دم بخود سا کھڑا ہوا تھا۔ ادھر سلیا کا سانس معلق تھا، جیسے سر پر ننگی تلوار لٹک رہی ہو۔

سونا کی نظر میں سب سے بڑا گناہ کسی مرد کا دوسری عورت کو اور کسی عورت کا دوسرے مرد کو تاکنا تھا۔ اس خطا کے لئے اس کے پاس کوئی معافی نہ تھی۔ ڈاکہ قتل، جعل، کوئی جرم اتنا سنگین نہ تھا۔ ہنسی دل لگی کو وہ برا نہ سمجھتی تھی، اگر علانیہ ہو، مگر پوشیدہ مذاق کو بھی وہ قابل گرفت سمجھتی تھی۔ بچپن ہی سے وہ بہت سی رواجی باتیں جاننے اور سمجھنے لگی تھی۔ ہوری کو جب کبھی باہر سے گھر آنے میں دیر ہو جاتی تھی اور دھنیا کو پتہ لگ جاتا تھا کہ وہ دلاری کی دوکان پر گیا تھا۔ خواہ تمباکو ہی لینے کیوں نہ گیا ہو، تو وہ کئی کئی دن تک ہوری سے بولتی نہ تھی اور نہ گھر کا کوئی کام

کا ناچ کرتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اسی بات پر اپنے میکے بھاگ گئی تھی۔ وہی خیال سونا میں پھر تہہ تک گھر گیا تھا۔ جب تک اُس کا بیاہ نہ ہوا تھا وہ خیال اتنا زبردست نہ تھا۔ مگر بیاہ ہو جانے کے بعد تو اس میں کافی پختگی اور مضبوطی آ گئی تھی۔ ایسے عورتوں مردوں کی اگر کھال بھی کھینچ لی جائے تو اسے رحم نہ آتا۔ عشق کے لئے ازدواجی حلقے کے باہر اس کی نظر میں کوئی جگہ نہ تھی، عورت مرد کا ایک دوسرے کے متعلق جو عین فرض ہے اسی کو وہ عشق سمجھتی تھی۔ پھر سِلّو سے تو اس کا بہنا پا تھا۔ وہ سِلّو کو پیار کرتی تھی اور اس پر بھروسہ رکھتی تھی، وہی سِلّو آج اس سے بِسوا اس گھات کر رہی ہے۔ متھرا اور سِلّو میں ضرور ہی پہلے سے تعلق رہا ہوگا۔ متھرا اس سے ندی کے کنارے یا کھیتوں میں ملتا ہوگا اور آج وہ اتنی رات گئے ندی پار کر کے اسی لئے یہاں آئی ہے۔ اگر اس نے ان دونوں کی باتیں نہ سُن لی ہوتیں تو اُسے خبر تک نہ ہوتی۔ متھرا نے عشقیہ ملاقات کے لئے یہی موقع سب سے زیادہ مناسب سمجھا ہوگا۔ گھر میں سناٹا جو ہے! اس کا دل سب کچھ جاننے کے لئے بے چین ہو رہا تھا وہ سارا بھید جان لینا چاہتی تھی تاکہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچ سکے۔ اور یہ متھرا یہاں کیوں کھڑا ہے؟ کیا وہ اسے کچھ بولنے بھی نہ دے گا؟

اُس نے غصّے میں کہا "تم باہر کیوں نہیں جاتے، کیا یہیں پہرا دیتے رہو گے؟"

متھرا کچھ بولے بغیر باہر چلا گیا۔ اُس کا خون خشک ہو رہا تھا کہ کہیں سِلّو سب کچھ کہہ نہ ڈالے۔ اور سِلّو کی جان سوکھ رہی تھی کہ اب وہ لٹکتی ہوئی تلوار سر پر گرا ہی چاہتی ہے۔

تب سونا نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا "دیکھو سِلّو! سب ٹھیک ٹھیک بتا دو، نہیں میں تمہارے سامنے یہیں اپنی گردن پر گنڈاسا مار لوں گی۔ پھر

تم میری سوت بن کر راج کرنا۔ دیکھو گنڈاسا وہ سامنے پڑا ہے۔ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔"

اُس نے لپک کر گنڈاسا اٹھا لیا اور اُسے ہاتھ میں لے کر پھر بولی "یہ مت سمجھنا کہ میں تیری دھمکی دے رہی ہوں۔ اِس میں میں کیا کر بیٹھوں، نہیں کہہ سکتی۔ ٹھیک ٹھیک بتا دو۔"

سِلیا کانپ اُٹھی۔ اُس کے منہ سے ایک ایک لفظ اس طرح نکل پڑا جیسے گراموفون میں بھری ہوئی آواز ہو۔ وہ ایک بات بھی نہ چھپا سکی۔ سونا کے چہرے سے خوفناک ارادہ ظاہر ہو رہا تھا گویا اس پہ خون سوار ہو۔

سونا نے اس کی طرف برچھی سی چبھ جانے والی نگاہوں سے دیکھا اور گنڈاسا سے چوٹ کرتی ہوئی سی بولی "ٹھیک ٹھیک کہتی ہو؟"

"بالکل ٹھیک۔ اپنے بچے کی سوگند!"

"کچھ چھپایا تو نہیں!"

"اگر میں نے رتی بھر بھی چھپایا ہو تو میری آنکھیں پھوٹ جائیں!"

"تو نے اس پاپی کو لات کیوں نہیں ماری؟ اُسے دانت سے کاٹ کیوں نہیں لیا؟ اُس کا لہو کیوں نہ پی لیا۔ تو چلائی کیوں نہیں؟"

سلیا کیا جواب دے؟

سونا نے پاگل کی طرح انگاروں کی سی آنکھیں نکال کر کہا "بولتی کیوں نہیں؟ کیوں تو نے اس کی ناک دانتوں سے نہیں کاٹ لی؟ کیوں نہیں دونوں ہاتھوں سے اُس کا گلا دبا دیا؟ تب بھی تیرے چرنوں پہ سر جھکاتی۔ اب تو تو میری آنکھوں میں ہرجائی ہے، پوری بیسوا۔ اگر یہی کرنا تھا تو ماتا دین کے نام کو کیوں کلنک لگا رہی ہے؟ کیوں کسی کو لے کر بیٹھ نہیں جاتی؟ کیوں اپنے گھر نہیں چلی گئی؟ یہی تو تیرے گھر والے چاہتے

بھتے۔ تو اُپلے اور گھاس لے کر ہاٹ جاتی، وہاں سے پیسے لاتی اور تیرا باپ بیٹھا ہُوا اُس پیسے کی تاڑی پیتا۔ پھر کیوں اُس بامھن کی ہتک کرائی؟ کیوں اُسکی آبرو میں بٹہ لگایا؟ کیوں ستونتی بنی بیٹھی ہے؟ جب اکیلے نہیں رہا جاتا تو کیوں کسی سے سگائی نہیں کر لیتی؟ کیوں ندی تالاب میں ڈوب نہیں مرتی؟ کیوں دوسروں کی جندگی میں بس گھولتی ہے۔ آج میں تجھ سے کہے دیتی ہوں کہ اگر اس طرح کی بات پھر کبھی ہوئی اور مجھے پتہ چلا تو ہم تینوں میں سے ایک بھی جیتا نہ رہے گا۔ بس اب منہ میں کالکھ لگا کر چل دے۔ آج سے میرے اور تیرے بیچ میں کوئی ناتا نہیں ہے"۔

سِلّو چپکے سے اُٹھی اور سنبھل کر کھڑی ہوئی۔ معلوم ہُوا کہ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ ایک لمحہ تک ہمت کی فراہمی کی کوشش کرتی رہی مگر اپنی صفائی میں کچھ سوجھ نہ پڑا۔ آنکھوں میں اندھیرا تھا۔ سر میں چکر۔ گلا سوکھ رہا تھا اور سارا بدن بے حس تھا، جیسے مسامات سے جان نکل رہی ہو۔ ایک ایک قدم اس طرح رکھتی ہوئی جیسے سامنے کوئی گڑھا ہو، وہ باہر آئی اور ندی کی طرف چلی۔

دروازے پر متھرا کھڑا تھا۔ بولا "اس بکھت کہاں جاتی ہے، سِلّو"!

سِلّو نے کچھ جواب نہ دیا۔ متھرا نے بھی پھر کچھ نہ پوچھا۔

وہی روپہلی چاندنی اب بھی چھائی ہوئی تھی۔ ندی کی لہریں اب بھی چاندنی میں نہا رہی تھیں اور وہ دیوانگی کی سی حالت میں خواب کے سائے کی طرح ندی میں چلی جا رہی تھی۔

(۳۰)

مزدوروں کی ہڑتال جاری ہے مگر اب اس سے مل کے مالکوں کا کوئی خاص نقصان نہیں ہے۔ نئے آدمی کم اُجرت پر مل گئے ہیں اور بان توڑ کر کام کرتے ہیں،

کیونکہ ان میں بھی ایسے ہیں جو بیکاری کی تکلیف اُٹھا چکے ہیں اور اب اپنی عمر بھر کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے جس سے رزق میں خلل پڑے۔ چاہے جتنا کام لو اور چاہے جتنی کم چھٹیاں دو، انہیں کوئی شکایت نہیں۔ سر جھکائے ہوئے بیلوں کی طرح کام میں لگے رہتے ہیں۔ گھڑ کیوں، گالیوں، یہاں تک کہ ڈنڈوں کی مار سے بھی انہیں شکایت نہیں ہوتی۔ اور اب خدا نے مزدوروں کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا کہ وہ اس گھٹی ہوئی مزدوری پر کام کرنے آئیں اور کھنّا صاحب کی خوشامد کریں۔ نئے لوگ اونکا زنا تھر پر تو انہیں ذرا بھی اعتبار نہیں ہے۔ انہیں وہ اب تنہا پائیں تو شاید بری طرح خبر لیں۔ مگر نجابت جی بہت بچے ہوئے رہتے ہیں۔ چراغ جلنے کے بعد اپنے دفتر سے باہر نہیں نکلتے۔ اور افسروں کی خوشامد میں بھی لگے رہتے ہیں۔ مرزا خورشید کی دھاک اب بھی جیوں کی تیوں ہے۔ لیکن مرزا ان غریبوں کی تکلیف اور اس سے دور کرنے کی کوئی سبیل نہ دیکھ کر دل سے چاہتے ہیں کہ سب کے سب بحال کر دیئے جائیں، مگر اس کے ساتھ ہی نئے آدمیوں کی تکلیف کا خیال کر کے پوچھنے والوں سے یہی کہہ دیا کرتے ہیں کہ جیسی مرضی ہو ویسا کریں۔

مسٹر کھنّا نے پرانے آدمیوں کو پھر نوکری کرنے کا خواہش مند دیکھا تو اور بھی اکڑ گئے، حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اس اُجرت پر پرانے آدمی نئے لوگوں سے کہیں بہتر ہیں۔ پرانے آدمیوں میں زیادہ تر تو بچپن ہی سے مل میں کام کرنے کے عادی تھے اور خوب مشتاق تھے۔ نئے آدمیوں میں زیادہ تر دیہاتوں کے دکھی کسان جنہیں کھلی ہوا اور میدان میں پرانے زمانے کے چوبی اوزاروں سے کام کرنے کی عادت تھی مل کے اندر ان کا دم گھٹتا تھا اور مشینری کے تیز چلنے والے پرزوں سے انہیں ڈر لگتا تھا۔ آخر جب پرانے آدمی خوب پست ہو گئے تب کھنّا انہیں بحال

کرنے پر راضی ہوئے مگر نئے آدمی اس سے کم اُجرت پر کام کرنے کو تیار تھے اور اب ڈائرکٹروں کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ پُرانے لوگوں کو بحال کریں یا نئے آدمیوں کو ہی رہنے دیں۔ ڈائرکٹروں میں نصف تو نئے آدمیوں کی اُجرت گھٹا کر رکھنے کے حق میں تھے اور بقیہ نصف کی یہ رائے تھی کہ پُرانے ہی آدمیوں کو موجودہ اُجرت پر رکھ لیا جائے۔ کچھ روپئے زیادہ خرچ ہوں گے ضرور، مگر کام اب سے کہیں زیادہ ہوگا۔ کھنّا مل کی روحِ رواں تھے اور ڈائرکٹر تو اُن کے ہاتھ کی کٹھ پتلیاں تھے۔ فیصلہ کھنّا ہی کے ہاتھوں میں تھا اور وہ اپنے دوستوں ہی سے نہیں بلکہ دشمنوں سے بھی اس بارے میں رائے لے رہے تھے۔ سب سے پہلے تو اُنھوں نے گووندی کی رائے لی۔ جب سے مالتی کی طرف سے اُنھیں مایوسی ہو گئی تھی اور گووندی کو معلوم ہو گیا تھا کہ مہتا جیسا عالم، تجربہ کار اور دانا شخص میری بڑی عزت کرتا ہے اور مجھ سے کسی قسم کی رفاقت کی اُمید رکھتا ہے، تب سے زن و شوہر میں پھر محبت پیدا ہو گئی تھی۔ محبت نہ سہی تو باہمی ربط و ضبط تو تھا ہی۔ آپس میں وہ جلن اور بے چینی نہ تھی۔ درمیانی دیوار ٹوٹ گئی تھی۔

مالتی کے رنگ ڈھنگ کی بھی کایا پلٹ ہو رہی تھی۔ مہتا کی زندگی اب تک مطالعہ اور غور و خوض میں گذری تھی۔ سب کچھ پڑھ چکنے اور دینداری و کفر کو خوب پرکھ لینے کے بعد وہ اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ تعلق و بے تعلقی دونوں کے بیچ کا جو خدمتی راستہ ہے وہی زندگی کو بامعنی، اور ہستی کو بلند و پاکیزہ بنا سکتا ہے۔ کسی ہمہ داں خدا پر اُن کا اعتقاد نہ تھا۔ اگرچہ وہ اپنی دہریت کو ظاہر نہ کرتے تھے، اس لئے کہ اس کے متعلق قطعی طور سے کوئی رائے قائم نہ کرنا وہ اپنے لئے ناممکن سمجھتے تھے، مگر یہ خیال اُن کے دل میں مضبوطی سے قائم ہو گیا تھا کہ جانداروں کی پیدائش و موت اور اُن کے تکلیف و آرام یا عذاب و ثواب سے متعلق کوئی خدائی

قانون نہیں ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ انسان نے اپنی خودی میں اپنے کو اتنا عظیم بنا لیا ہے کہ اُسے ہر ایک کام کی تحریک خدا ہی سے ملا کرتی ہے۔ اسی طرح وہ ٹڈیاں بھی خدا کو ذمہ دار ٹھہراتی ہوں گی جو اپنی راہ میں سمندر کے حائل ہو جانے پر اربوں کی تعداد میں مر جاتی ہیں۔ اگر خدائی قوانین اتنے ناقابلِ فہم ہیں کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتے تو اُنہیں ماننے ہی سے انسان کو ڈھارس مل سکتی ہے؟ خدائی تصوّر کا ایک ہی مقصد اُن کی سمجھ میں آتا تھا اور وہ تھا انسانی زندگی کا ایک ہونا۔ وحدت یا کثرت یا عدم تشدد کو روحانی نہیں، بلکہ مادّی نقطۂ خیال سے دیکھتے تھے۔ اگرچہ ان باتوں کا کسی تاریخی زمانے میں بھی بول بالا نہیں رہا پھر بھی بنی نوع انسان کے جبلّی ارتقاء میں اُن کا درجہ بڑی اہمیت کا ہے۔ انسانوں کی یکسانیت میں مہاتما کا بہت بڑا اعتقاد تھا مگر اس اعتقاد کے لئے انہیں خدائی وجود کے تسلیم کرنے کی ضرورت نہ معلوم ہوتی تھی۔ اُن کی انسانی محبت کا انحصار اس پر نہ تھا کہ جملہ جانداروں میں ایک روح ہے۔ توحید و شرک کا مسئلہ اُن کی نظر میں رواجی اہمیت کے سوا کوئی اور اہمیت نہ رکھتا تھا اور وہ استعمالی اہمیت اُن کے نزدیک انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے، اُن کی باہمی تفریق کے مٹانے اور اُن میں اُخوّت کا جذبہ پیدا کرنے ہی میں مضمر تھی۔ یہ یکسانیت اُن کے دل میں کچھ ایسی قائم ہو گئی تھی کہ اُس کے لئے کسی روحانی بنیاد کا پیدا کرنا اُن کی نظر میں بالکل فضول تھا۔ پھر ایک بار اس اصلیت کو جان کر وہ خاموش نہ بیٹھ سکتے تھے۔ بے لوثی کے ساتھ بلا کسی ذاتی غرض کے زیادہ سے زیادہ کام کرنا اُن کے لئے ضروری ہو گیا تھا جس کے بغیر اُن کے دل کو سکون نہ مل سکتا تھا۔ شہرت، منفعت یا فرض کی ادائگی کے خیالات اُن کے دل میں آتے ہی نہ تھے۔ ان کی بے مائگی ہی اُنہیں ان سے بچانے کے لئے کافی تھی۔ خدمت ہی اب اُن کی خاص غرض ہوتی جاتی تھی اور ان کی اُس

فراخ دلی کا اثر دریپردہ مالتی پر بھی پڑھتا جاتا تھا۔ اب تک جتنے مرد اُسے ملے سب نے اُس کی عیاشانہ رغبت ہی کو اُکسایا۔ اُس کے ترک و ایثار کی طاقت روز بروز نہ گھٹتی ہی تھی مگر مہتا کی صحبت سے اس پر تازگی آنے لگی۔ سبھی حقیقی انسانوں میں یہ جذبہ چھپا رہتا ہے اور روشنی پاکر چمک اُٹھتا ہے۔ انسان اگر دولت یا شہرت کے پیچھے پڑا ہے تو سمجھ لو کہ ابھی تک وہ کسی اہل دل کے لگاؤ میں نہیں آیا۔ مالتی اب اکثر غریبوں کے گھر بلا فیس لئے مریضوں کو دیکھنے چلی جاتی تھی اور مریضوں کے ساتھ اس کے برتاؤ میں بڑی نرمی آگئی تھی۔ ہاں ابھی تک وہ بناؤ سنگار سے اپنا دل نہ ہٹا سکی تھی۔ رنگ اور پاوڈر کا چھوڑنا اُسے اپنی باطنی تبدیلیوں سے بھی کہیں زیادہ مشکل معلوم ہوتا تھا۔

ادھر کبھی کبھی وہ دونوں دیہاتوں کی طرف چلے جاتے تھے اور کسانوں کے ساتھ دو چار گھنٹے رہ کر، اور کبھی کبھی ان کے جھونپڑوں میں رات کاٹ کر اور اُن ہی کا سا کھانا کھا کر اپنے کو خوش قسمت سمجھتے تھے۔ ایک روز وہ سمری پہنچ گئے اور گھومتے ہوئے بیلاری بھی جا پہنچے، ہوری دروازے پر بیٹھا چلم پی رہا تھا کہ مالتی اور مہتا آکر کھڑے ہو گئے۔ مہتا نے ہوری کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور بولا "یہی تمہارا گاؤں ہے؟ یاد رہے جب ہم لوگ رائے صاحب کے یہاں آئے تھے اور تم دھنش یگیہ میں مالی بنے تھے؟"

ہوری کی یاد تازہ ہو گئی، پہچان گیا اور پٹیشوری کے گھر کی طرف کرسیاں لانے چلا۔

مہتا نے کہا "کرسیوں کا کوئی کام نہیں۔ ہم لوگ اسی چارپائی پر بیٹھے جاتے ہیں۔ یہاں کرسی پر بیٹھنے نہیں، تم سے کچھ سیکھنے آئے ہیں۔"

دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ہوری متحیر کھڑا رہا۔ ان لوگوں کی کیا خاطر کرے؟

بڑے آدمی ہیں۔ ان کی خاطر کرنے لائق اُس کے پاس ہے کیا؟ آخر اُس نے پوچھا "پانی لاؤں؟"

مہتا نے کہا "ہاں، پیاس تو لگی ہے۔"

"کچھ مٹھائی بھی لیتا آؤں؟"

"لاؤ اگر گھر میں ہو۔"

ہوری گھر میں مٹھائی اور پانی لانے گیا تب تک گاؤں کے لڑکوں نے آکر ان دونوں کو گھیر لیا اور دیکھنے لگے۔ گویا عجائب خانے سے دو نئے نمونے آگئے ہوں۔ سلیا بچّے کو لئے کسی کام سے چلی جا رہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر تعجب سے ٹھہر گئی۔

مالتی نے آکر اُس کے بچّے کو گود میں لے لیا اور پیار کرتی ہوئی بولی "کتنے دنوں کا ہے؟"

سِلیا کو ٹھیک نہ معلوم تھا۔ ایک دوسری عورت نے بتلایا "کوئی سال بھر کا ہوگا؟"

سِتّو نے تائید کی۔

مالتی نے مذاق کیا "پیارا بچّہ ہے، اسے ہمیں دے دو۔"

سِلیا نے گھمنڈ سے پھول کر کہا "آپ ہی کا تو ہے۔"

"تو میں اسے لے جاؤں؟"

"لے جائیے، آپ کے ساتھ رہ کر آدمی ہو جائے گا۔"

گاؤں کی دوسری عورتیں آگئیں اور مالتی کو ہوری کے مکان میں لے گئیں کیونکہ یہاں مردوں کے سامنے مالتی سے گفتگو کرنے کا موقع انہیں نہ ملتا۔ مالتی نے دیکھا چارپائی بچھی ہے اور اُس پر ایک دری پڑی ہوئی ہے جو جھِنگوری کے یہاں سے

مانگ کمالاتی گئی تھی۔ مالتی جا کر بیٹھی۔ بچّوں کی حفاظت اور پرورش کی بات چلی۔ عورتیں جی لگا کر سُنتی رہیں۔

دھنیا نے کہا "یہاں یہ سب کام کیسے ہوگا، سرکار؟ کھانے تک کا ٹھکانا تو ہے نہیں"۔

مالتی نے سمجھایا "صفائی میں کچھ خرچ نہیں، صرف تھوڑی سی محنت اور ہوشیاری سے کام چل سکتا ہے"۔

دلاری نے پوچھا "یہ سب باتیں آپ کو کیسے معلوم ہوئیں سرکار؟ آپ کا تو ابھی بیاہ نہیں ہوا ہے؟"

مالتی نے مسکرا کر پوچھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرا بیاہ نہیں ہوا ہے؟"

سبھی عورتیں مُنہ پھیر کر مسکرائیں۔ پتیا بولی "بھلا یہ بھی چھپا رہتا ہے، سرکار! مُنہ دیکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے"۔

مالتی نے جھینپتے ہوئے کہا "اسی لئے بیاہ نہیں کیا کہ آپ لوگوں کی خدمت کیسے کرتی"۔

سب نے ایک زبان سے کہا "دھن ہو سرکار، دھن ہو!"

سلیا مالتی کے پیر دبانے لگی "سرکار کتنی دور سے آئی ہیں۔ تھک گئی ہوں گی"۔

مالتی نے پیر کھینچ کر کہا "نہیں نہیں، میں تھکی نہیں ہوں۔ میں تو موٹر پر آئی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ لوگ اپنے بچّے لائیں تو میں انہیں دیکھ کر بتاؤں کہ آپ اُنہیں کس طرح تندرست رکھ سکتی ہیں"۔

ذرا دیر میں بیس پچیس بچّے آ گئے۔ مالتی اُنہیں دیکھنے لگی۔ کئی بچوں کی آنکھیں اُٹھی تھیں، اُن کی آنکھوں میں دوا ڈالی۔ زیادہ تر بچّے کمزور تھے جس کا سبب تھا

والدین کو اچھا کھانا نہ ملنا۔ مالتی کو یہ جان کر تعجب ہوا کہ دودھ بہت کم گھروں میں ہوتا تھا اور گھی کے تو برسوں درشن نہ ہوتے تھے۔

مالتی نے یہاں بھی انہیں کھانے کی اہمیت بتائی جیسا وہ سبھی گاؤں میں بتایا کرتی تھی۔ اس کا جی اس لئے کڑھتا تھا کہ یہ لوگ اچھا کھانا کیوں نہیں کھاتے! ایسے دیہاتیوں پر غصہ آجاتا تھا۔ کیا تمہارا جنم اسی لئے ہوا ہے کہ تم مر مر کر کماؤ اور جو کچھ پیدا ہو اُسے کھا نہ سکو؟ جہاں دو چار بیلوں کے لئے چارا ہے وہاں دو ایک گائے بھینسوں کے لئے چارا نہیں ہے؟ کیوں یہ لوگ غذا کو زندگی کی خاص چیز نہ سمجھ کر اُسے صرف جان بچانے کی چیز سمجھتے ہیں۔ کیوں سرکار سے نہیں کہتے کہ برائے نام سود پر روپیہ دے کر انہیں سود خور مہاجنوں کے پنجے سے بچائے۔ اُس نے جس کسی سے پوچھا تو یہی معلوم ہوا کہ اُس کی کمائی کا بڑا حصہ مہاجنوں کا قرض ادا کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ بٹوارے کا مرض بھی بڑھتا جاتا تھا۔ آپس میں اتنی مغائرت تھی کہ شاید ہی کوئی دو بھائی ایک ساتھ رہتے ہوں۔ ان کی اس درگت کا سبب بہت کچھ ان کی تنگ خیالی اور خود غرضی تھی۔ مالتی یہی باتیں عورتوں سے کرتی رہی۔ اُن کی عقیدت دیکھ کر اس کے دل میں خدمت کی تحریک اور بھی زور پکڑ رہی تھی اس قربانی کی زندگی کے سامنے وہ عیش و آرام کی زندگی کتنی حقیر اور مصنوعی تھی۔ آج اُس کے وہ ریشمی کپڑے جن پر زری کا کام تھا، اور وہ خوشبو سے مہکتا ہوا بدن اور وہ پاوڈر لگا ہوا چہرہ اُسے شرمندہ کرنے لگا۔ اس کی کلائی پر بندھی ہوئی سونے کی گھڑی جیسے ٹکٹکی لگائے اُسے گھور رہی تھی۔ اُس کے گلے میں چمکتا ہوا جڑاؤ نیکلس جیسے اُس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ ان تیاگ اور بھگتی کی دیویوں کے سامنے وہ اپنی ہی نظر میں حقیر ہو رہی تھی۔ وہ ان دیہاتیوں سے بہت سی باتیں زیادہ جانتی تھی، وقتی رفتار سے زیادہ واقف تھی لیکن جن حالات

ہیں یہ غریب عورتیں اپنی زندگی کو کارآمد بنا رہی ہیں اُن میں کیا وہ ایک دن بھی رہ سکتی ہے جو دل میں غرور کا نام بھی نہیں، دن بھر کام کرتی ہیں، فاقہ کرتی ہیں، روتی ہیں، پھر بھی اتنی ہنس مکھ اور زندہ دل ہیں! بیگانے ان کے لئے اس قدر یگانے ہو گئے ہیں کہ اُن کا اپنا وجود ہی نہیں رہا۔ اُن کی یگانگت اپنے بچوں میں اپنے شوہر میں اور اپنے رشتہ داروں میں ہے۔ اِسی خیال کی حفاظت کرتے ہوئے اور اِسی کے دائرے کو بڑھاتے ہوئے مستقبل کا نِسائی معیار بنے گا۔ بیدار عورتوں میں اس کے بجائے خود پروری کا جو خیال پیدا ہو گیا ہے، یعنی سب کچھ اپنے لئے، اپنے ہی عیش و آرام کے لئے، اُس سے تو یہ خواب کی حالت ہی بھلی! مانا کہ مرد بے رحم ہے مگر ہے تو ان ہی ماؤں کا جایا ہوا۔ کیوں ماں نے لڑکے کو ایسی تعلیم نہیں دی کہ وہ ماں کی اور اُس کے ناطے کل نِسوانی طبقہ کی پرستش کرتا؟ اسی لئے کہ ماں کو ویسی تعلیم دینا نہیں آتی، اسی لئے کہ اُس نے خود کو اتنا مِٹا دیا ہے کہ اس کی ہئیت ہی تبدیل ہو گئی ہے، اُس کی شخصیت ہی ختم ہو گئی ہے!۔

نہیں خود کو مٹانے سے کام نہ چلے گا۔ عورت کو سماج کی فلاح کے لئے اپنے حقوق کی حفاظت کرنی ہوگی، اُسی طرح جیسے ان کِسانوں کو اپنی حفاظت کے لئے اپنی اس فرشتہ خصلتی کو کسی قدر ترک کرنا پڑے گا۔

شام ہو گئی تھی۔ مالتی کی عورتیں اب تک گھیرے ہوئے تھیں۔ اس کی باتوں سے جیسے اُن کا جی ہی نہ بھرتا تھا۔ کئی عورتوں نے اُن سے رات میں یہیں رہنے کا اصرار کیا۔ مالتی کو بھی اُن کا سادہ پریم ایسا پیارا لگا کہ اُس نے اُن کی دعوت منظور کر لی۔ رات کو عورتیں اُسے اپنا گانا سنائیں گی، مالتی نے گھر گھر میں جا کر ہر جگہ کی حالت سے واقفیت حاصل کرنے میں اپنا وقت صرف کیا۔ اُس کی پُر خلوص بہی خواہی اور ہمدردی دیہاتی عورتوں کے لئے دیوی کے بردان سے کم نہ تھی۔

اُدھر مہتا صاحب چارپائی پر بیٹھے ہوئے کسانوں کی کشتی دیکھ رہے تھے۔ پچھتا رہے تھے کہ مرزا صاحب کو کیوں نہ ساتھ لے لیا، ورنہ اُن کی بھی ایک کشتی ہو جاتی۔ اُنہیں تعجب ہو رہا تھا کہ ایسے مضبوط اور معصوم لڑکوں کے ساتھ تعلیم یافتہ لوگ کیسے بے رحمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ نادانی کی طرح دانائی بھی سادہ، صاف اور سُتھرے پیچوں خالی ہوتی ہے۔ انسانیت ہمیشہ اُس کا اتنا زبردست اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ مخالفانہ سلوک کو انسانیت کے خلاف سمجھنے لگتی ہے۔ وہ بھول جاتی ہے کہ بھیڑیوں نے بھیڑوں کی معصومیت اور بے چارگی کا جواب ہمیشہ پنجوں اور دانتوں سے دیا ہے۔ وہ اپنی ایک معیاری دُنیا بنا کر اسے معیاری شخصیتوں سے آباد کرتی ہے اور اسی میں مگن رہتی ہے۔ حقیقت کتنی ناقابلِ فہم، مشکل اور غیر قدرتی ہے، یہ خیال کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ مہتا صاحب اس وقت ان گنواروں کے بیچ میں بیٹھے ہوئے اسی مسئلے کو حل کر رہے تھے کہ ان کی حالت اتنی قابلِ رحم کیوں ہے۔ وہ اس سچائی سے سامنا کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے کہ ان کی فرشتہ خصلتی ہی ان کی تباہ حالی کا سبب ہے۔ کاش یہ لوگ زیادہ تر انسان اور کم تر فرشتہ ہوتے تو اس طرح نہ ٹھکرائے جاتے۔ مُلک میں کچھ بھی ہو، انقلاب ہی کیوں نہ آجائے مگر ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ کوئی جماعت ان کے سامنے طاقت دردِ بَن کر آئے اُس کے سامنے یہ سر جُھکا لینے کو تیار ہیں۔ ان کی معصومیت بے حسی کی حد تک پہنچ گئی ہے، جیسے کوئی سخت صدمہ ہی ذی حس اور متحرک بنا سکتا ہے۔ ان کی آتما گویا ہر طرف سے مایوس ہو کر اب اپنے اندر ہی پیر توڑ کر بیٹھ گئی ہے، گویا اُن میں زندگی کا احساس ہی نہیں ہے۔

شام ہو گئی تھی۔ جو لوگ اب تک کھیتوں میں کام کر رہے تھے وہ بھی دوڑے چلے آئے تھے۔ اُسی وقت مہتا نے مالتی کو گاؤں کی کئی عورتوں کے ساتھ ایسی محویت

سے ایک بچے کو گود میں لئے دیکھا گویا وہ بھی اُن ہی میں سے ایک ہو۔ مہتا کا دل خوشی سے بھر گیا۔ مالتی نے ایک طرح سے خود کو مہتا کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس کے متعلق مہتا کو اب کوئی شک و شبہ نہ تھا۔ مگر ابھی تک اُن کے دل میں مالتی کیلئے وہ پاک اور بلند خواہش پیدا نہ ہوئی تھی جس کے بغیر شادی کی تجویز کرنا اُن کے لئے مضحکہ انگیز تھا۔ مالتی ناخواندہ مہمان کیطرح اُن کے دروازے پر آکر کھڑی ہو گئی تھی اور مہتا نے اُسکا خیر مقدم کیا تھا۔ اس میں محبت کا جذبہ نہ تھا، صرف مردیت کا جذبہ تھا۔ اگر مالتی اُنھیں اس قابل سمجھتی ہے کہ اُن پر عنایت کی نظر کرے تو مہتا اُنکی اس عنایت کو نامنظور نہ کر سکتے۔ اسکے ساتھ ہی وہ مالتی کو گوبندی کے راستے سے ہٹا دینا چاہتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ مالتی جبتک ادھر آگے نہ جائے گی پچھلا پیر نہ اُٹھائے گی۔ وہ جانتے تھے کہ مالتی کے ساتھ فریب کرکے وہ دوستی ہی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کیلئے ان کا ضمیر انھیں برابر ملامت کرتا رہتا تھا، مگر جیوں جیوں وہ مالتی کو قریب سے دیکھتے تھے اُنکے دل میں کشش بڑھتی جاتی تھی۔ حُسن کی دلکشی تو اُن پر کوئی اثر نہ ڈال سکتی تھی، یہ اوصاف کی دلکشی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جسے سچی محبت کہہ سکتے ہیں وہ ایک رشتے میں منسلک ہو جانے کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے قبل جو محبت ہوتی ہے وہ تو محض فریفتگی ہے، جسے ذرا بھی قیام و قرار نہیں۔ مگر اس سے پہلے یہ تصفیہ تو کر لینا ضروری تھا کہ جو پتھر باہمی قربت کی خراد پر چڑھے گا وہ خراد کے لئے موزوں بھی ہے یا نہیں۔ سبھی پتھر تو خراد پر چڑھ کر خوبصورت مورتوں کی شکل نہیں اختیار کر لیتے۔ اتنے دنوں میں مالتی نے اُن کے دل کے مختلف حصوں پر اپنی شعاعیں ڈالی تھیں جو ابھی تک مرکوز ہو کر شعلے کی صورت میں نہ پھوٹ پڑی تھیں جس سے اُن کا سارا دل روشن ہو جاتا۔ آج مالتی نے اپنی دیہاتی بہنوں سے ملکر اور ساری تفریق کو مٹا کر گویا ان شعاعوں کو مرکوز کر دیا اور آج پہلی بار مہتا کو مالتی کے متعلق یگانگت کا احساس ہوا۔ جیوں ہی مالتی گاؤں کا گشت

لگاکر لوٹی، اُنھوں نے اُسے ساتھ لے کر ندی کی طرف رُخ کیا۔ رات یہیں گذارنے کا ارادہ ہو گیا۔ مالتی کا دل آج نہ جانے کیوں دھڑکنے لگا۔ مہتا کے چہرے پر آج اُسے ایک عجیب روشنی اور خواہش جھلکتی ہوئی نظر آئی۔

ندی کے کنارے چاندی کا فرش بچھا ہوا تھا اور ندی جواہرات سے جڑے ہوئے گہنے پہنے ہوئے میٹھے سروں میں گا کر چاند اور تاروں اور غنودگی کی حالت میں سر جھکائے ہوئے پیڑوں کو اپنا رقص دکھا رہی تھی۔ مہتا قدرت کی متوالی پھبن پر جیسے مست ہو گئے، گویا اُن کا بچپن اپنے سارے کھیلوں کے ساتھ لوٹ آیا ہو۔ ریت پر کودتے اور دوڑتے ہوئے ندی میں جا کر گھٹنے تک پانی میں کھڑے ہو گئے۔

مالتی نے کہا "پانی میں نہ کھڑے ہو، کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔"

مہتا نے پانی اُچھال کر کہا "میرا تو جی چاہتا ہے کہ تیر کر ندی کے اُس پار چلا جاؤں۔"

"نہیں نہیں، پانی سے نکل آؤ۔ میں نہ جانے دوں گی۔"

"تم میرے ساتھ نہ چلو گی؟ اس سونی بستی میں جہاں جنوں کا راج ہے۔"

"مجھے تو تیرنا نہیں آتا۔"

"اچھا تو آؤ ایک ناؤ بنائیں اور اُس پر بیٹھ کر چلیں۔"

وہ باہر نکل آئے۔ آس پاس بڑی دور تک جھاؤ کا جنگل کھڑا تھا۔ مہتا نے جیب سے چاقو نکالا اور بہت سی ٹہنیاں کاٹ کر جمع کیں۔ کنارے پر سرپت اُگا ہوا تھا۔ وہاں جا کر ایک گٹھا کاٹ لائے اور وہیں بالو کے فرش پر بیٹھ کر رسی بٹنے لگے۔ ایسے خوش گویا بہشت جانے کی تیاری کر رہے ہوں۔ کئی بار انگلیاں چر گئیں، خون نکلا۔ مالتی ناراض ہو رہی تھی اور بار بار گاؤں واپس جانے کے لئے اصرار کر رہی

تھی مگر اُنھیں کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہی بچّوں کی سی خوشی تھی، وہی الہڑ پن تھا۔ وہی نٹ کھٹ پن تھا۔ فلسفہ اور سائنس سبھی اس بہاؤ میں بہہ گئے تھے۔

رسّی تیار ہو گئی۔ جھاؤ کا بڑا تختہ سا بن گیا۔ ٹہنیاں دونوں سروں پر رسّی سے جوڑ دی گئی تھیں۔ اُس کے سوراخوں میں جھاؤ کی پتیاں بھر دی گئیں تاکہ پانی اوپر نہ آئے۔ ناؤ تیار ہو گئی۔ رات اور بھی خواب آلود ہو گئی تھی۔

مہتا نے ناؤ کو پانی میں ڈال کر مالتی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "آؤ بیٹھو!"

مالتی نے ڈرتے ہوئے کہا "دو آدمیوں کا بوجھ سنبھال سکے گی؟"

مہتا نے فلسفیانہ تبسم سے کہا "جس ناؤ پر بیٹھے ہوئے ہم لوگ زندگی کا سفر پورا کر رہے ہیں وہ تو اس سے کہیں زیادہ کمزور ہے مالتی! کیا ڈر رہی ہو؟"

"ڈر کس بات کا جب تم ساتھ ہو؟"

"سچ کہتی ہو؟"

"اب تک میں نے بلا کسی کی مدد کے مشکلوں کو سر کیا ہے۔ اب تو تمہارے ساتھ ہوں!"

دونوں اُس جھاؤ کے تختے پر بیٹھے اور مہتا نے جھاؤ ہی کے ایک ڈنڈے سے اُسے کھیلنا شروع کیا۔ تختہ ڈگمگاتا ہوا بہہ چلا۔

مالتی نے دل سے اس خطرے کا خیال دور کرنے کے لئے پوچھا "تم تو ہمیشہ شہروں میں رہے، دیہاتی زندگی کے عادی کیسے ہو گئے؟ میں تو ایسا تختہ کبھی نہ بنا سکتی۔"

مہتا نے اُسے چاہت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا "شاید یہ میرے پچھلے جنم کا سنسکار ہے۔ قدرت سے مس ہوتے ہی جیسے مجھ میں نئی زندگی سی آ جاتی ہے۔ رگ رگ میں جنبش ہونے لگتی ہے۔ ایک ایک پرندہ، ایک ایک جانور جیسے مجھے خوشی

کی دعوت دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے، جیسے بھولے ہوئے سُکھوں کی یاد دلا رہا ہو! یہ خوشی مجھے اور کہیں نہیں ملتی مالتی! موسیقی کے رُلانے والے راگوں میں بھی نہیں، فلسفہ کی بلند پروازیوں میں بھی نہیں! جیسے یہ سب میرے سامنے سگے ہوں، قدرت کے بیچ میں پڑ کر جیسے میں اپنے آپ کو پا جاتا ہوں، جیسے پرندہ اپنے گھونسلے میں آ جائے!"

تختہ ڈگمگایا، کبھی، کبھی ترچھا، کبھی سیدھا، کبھی چکر کھاتا ہوا جا رہا تھا۔

دفعتاً مالتی نے آزردگی سے پوچھا " اور میں تمہاری زندگی میں کبھی نہیں آتی ہوں؟"

مہتا نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا " آتی ہو، بار بار آتی ہو، خوشبو کے ایک جھونکے کی طرح، تصوّر کے ایک عکس کی طرح، اور پھر غائب ہو جاتی ہو۔ دوڑتا ہوں کہ تمہیں ہاتھوں سے جکڑ لوں، مگر ہاتھ کھلے رہ جاتے ہیں اور تم ہوا ہو جاتی ہو!"

مالتی نے جھنجھلا کر کہا " مگر تم نے اس کا سبب بھی سوچا یا سمجھنا چاہا؟"

" ہاں مالتی، بہت سوچا اور بار بار سوچا!"

" تو کیا معلوم ہوا؟"

" یہی کہ میں جس بُنیاد پر اپنی زندگی کا گھر کھڑا کرنا چاہتا ہوں وہ ناپائدار ہے۔ یہ کوئی بڑا محل نہیں، بلکہ صرف ایک چھوٹی سی کٹی ہے، مگر اس کے لئے بھی تو کوئی مستقل بُنیاد چاہئے۔"

مالتی نے اپنا ہاتھ چھڑا کر جیسے رُوٹھتے ہوئے کہا " یہ جھوٹا حملہ ہے!"

" یہ جھوٹا حملہ ہے۔ تم نے مجھے ہمیشہ امتحانی نظر سے دیکھا۔ کبھی محبت کی نگاہ سے نہیں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ عورت امتحان نہیں چاہتی، بلکہ محبت چاہتی ہے، امتحان تو اوصاف کو عیوب اور حُسن کو قبیح بنانے والی چیز ہے۔ محبت اس کے

برعکس کرہ کھاتی ہے۔ میں نے تم سے محبت کی تو میں خیال ہی نہ کر سکتی کہ تم میں کوئی عیب ہے، مگر تم نے میرا امتحان لیا اور تم مجھے متلون، شوخ اور منچلے کیا کیا سمجھ کر مجھ سے ہمیشہ دور بھاگتے رہے۔ نہیں میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ مجھے کہہ لینے دو۔ میں کیوں متلون اور شوخ تھی؟ اسی لئے کہ مجھے وہ محبت نہیں ملی جو مجھے مستقل مزاج بنائی۔ اگر تم نے اپنے آپ کو اسی طرح میرے لئے وقف کر دیا ہوتا جیسا میں نے تمہارے لئے کیا ہے تو تم آج مجھ پر ایسا نامناسب حملہ نہ کرتے۔"

مہتا نے مالتی کے روٹھنے کا لطف اٹھاتے ہوئے کہا "تم نے میرا امتحان کبھی نہیں لیا؟ سچ کہتی ہو؟"

"کبھی نہیں"

"تو تم نے غلطی کی۔"

"میں اس کی پروا نہیں کرتی۔"

"جذبے میں نہ آؤ مالتی۔ محبت کرنے سے پہلے ہم سب امتحان لیتے ہیں اور تم نے بھی لیا، خواہ برا ہی سہی۔ میں آج تم سے صاف کہتا ہوں کہ پہلے میں نے تمہیں اسی طرح دیکھا جیسے ہر روز ہزاروں عورتوں کو دیکھا کرتا ہوں، صرف تفریحی خیال سے۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو تم نے بھی مجھے اپنی تفریح کے لئے ایک نیا کھلونا سمجھا۔"

مالتی نے ٹوکا "غلط کہتے ہو۔ میں نے کبھی تم کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔ میں نے پہلے ہی دن تمہیں اپنا دیوتا بنا کر اپنے دل ۔ ۔ ۔"

مہتا نے بات کاٹ کر کہا "پھر وہی جذبہ! مجھے ایسے اہم معاملے میں جذبے کو دخل دینا پسند نہیں۔ اگر تم نے پہلے ہی دن سے مجھے اس عنایت کے قابل سمجھا تو اس کا یہی سبب ہو سکتا ہے کہ میں بھیس بنانے میں تم سے زیادہ ہوشیار ہوں

ورنہ جہاں تک میں نے نسوانی فطرت پر غور کیا ہے، عورتیں محبت کے بارے میں کافی چھان بین کرتی ہیں۔ پہلے تو ... دل کی آزمائش ہوتی تھی۔ وہی بات اب بھی سمجھ لی جاتا ہے اُس کا ... کچھ بدل گیا ہو۔ میں نے تب سے برابر یہی کوشش کی ہے کہ خود کو سراپا تمہارے سامنے رکھ دوں اور اُس کے ساتھ ہی تمہارے دل تک پہنچ جاؤں۔ اور میں جیون جیوں تمہارے دل کی گہرائی میں گیا ہوں مجھے جواہرات ہی ملے ہیں۔ میں انہی کے لئے آیا اور آج پرستار بنا ہوا ہوں۔ تم نے میرے اندر کیا پایا، معلوم نہیں۔"

ندی کا دوسرا کنارا آگیا۔ دونوں اُتر کر اُسی ریت کے فرش پر جا بیٹھے۔ اور مہنتا پھر اس رو میں بولے" اور آج میں یہاں وہی پوچھنے کے لئے تمہیں لایا ہوں۔"

مالتی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا" کیا ابھی تمہیں مجھ سے پوچھنے کی ضرورت باقی ہے؟"

"ہاں، اس لئے کہ میں آج تمہیں اپنا وہ روپ دکھاؤں گا جو اب بھی تک تم نے نہیں دیکھا اور جسے میں نے بھی چھپایا ہے۔ اچھا مان لو کہ میں تم سے شادی کر کے کل بیوفائی کروں تو تم مجھے کیا سزا دو گی؟"

مالتی نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا۔ اس کا مطلب وہ نہ سمجھی بولی" ایسا سوال کیوں کرتے ہو؟"

"میرے لئے یہ بہت اہم بات ہے۔"

"میں اسے ممکن نہیں سمجھتی۔"

"دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا مہاتما بھی ایک لمحے میں بھرشٹ ہو سکتا ہے۔"

"میں اُس کا سبب کھوجوں گی اور اُسے دور کروں گی۔"

"مان لو کہ میری عادت نہ چھوٹے۔"

"پھر میں نہیں کہہ سکتی کہ کیا کروں گی۔ شاید زہر کھا کر سو رہوں۔"

مالتی نے ڈرتے ہوئے پوچھا "بتاؤ؟"

مہتا نے استقلال سے کہا "میں پہلے تمہاری جان لے لوں گا۔ پھر اپنی دے دوں گا۔"

مالتی نے زور سے قہقہہ مارا اور سر سے پیر تک کانپ اُٹھی۔ اُس کا قہقہہ اس لرزش کے چھپانے ہی کے لئے تھا۔

مہتا نے پوچھا "تم ہنسیں کیوں؟"

"اسی لئے کہ تم ایسے ہنسنے والے نہیں معلوم ہوتے۔"

"نہیں مالتی، اس بارے میں پورا حیوان ہوں اور اس پہ لجانے کا کوئی سبب نہیں دیکھتا۔ روحانی محبت اور ایثار آمیز محبت اور بے غرضانہ محبت جس میں آدمی خود کو مٹا کر صرف معشوق کیلئے جیتا ہے۔ اسکی خوشی میں خوش ہوتا اور اُس کے پیروں پہ اپنی روح قربان کر دیتا ہے، یہ سب میرے لئے محض بے معنی الفاظ ہیں۔ میں نے کتابوں میں ایسی محبت کے قصے پڑھے ہیں۔ جہاں عاشق نے معشوق کے نئے عشاق کیلئے اپنی جان دیدی ہے۔ مگر اس جذبے کو میں حقیقت کہہ سکتا ہوں، اطاعت کہہ سکتا ہوں، مگر محبت کبھی نہیں۔ محبت سیدھی سادی گائے نہیں، بلکہ خونخوار شیرنی ہے جو اپنے شکار پر کسی کی آنکھ بھی نہیں پڑنے دیتی۔"

مالتی نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر کہا۔ "اگر محبت خونخوار شیرنی ہے تو میں اُس سے دُور ہی رہوں گی۔ میں نے تو اُسے گائے ہی سمجھ رکھا تھا۔ میں محبت

کہ بدگمانی سے بالاتر سمجھتی ہوں۔ وہ جسمانی نہیں، بلکہ روحانی چیز ہے۔ بدگمانی کی وہاں گنجائش نہیں، اور ہنسا تو بدگمانی ہی کا پھل ہے۔ وہ محبت روح کا پورے طور پر وقف کر دینا ہے۔ اسکے مندر میں تم آزمائش سے نہیں بلکہ عبادت ہی سے بردان پا سکتے ہو!"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور تیزی سے ندی کی طرف چلی، جیسے اس نے اپنا کھویا ہوا راستہ پا لیا ہو۔ ایسی زبردست تحریک کا اسے کبھی احساس نہ ہوا تھا۔ اس نے آزادانہ زندگی میں خود میں ایک کمزوری محسوس کی تھی جو اسے ہمیشہ متزلزل اور بے قرار رکھتی تھی۔ اس کا دل جیسے کسی سہارے کی تلاش میں تھا۔ جس کے ذریعے وہ دنیا کا مقابلہ کر سکے۔ خود میں اسے وہ سکت نہ ملتی تھی۔ دانائی اور کردار کی طاقت دیکھ کر وہ اسکی طرف راغب ہو جاتی تھی۔ پانی کی طرح ہر ایک برتن کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ اس کی اپنی کوئی شکل نہ تھی۔

اس کی طبیعت ابھی تک کسی امتحان دینے والے متعلّم کی سی تھی۔ متعلم کو کتابوں سے محبت ہو سکتی ہے اور ہو بھی جاتی ہے مگر وہ کتاب کے ان ہی حصوں پر زیادہ توجہ دیتا ہے جو امتحان میں آ سکتے ہیں۔ اسکی اوّل غرض امتحان میں کامیاب ہونا ہے۔ واقفیت حاصل کرنا اسکے بعد کا کام ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ ممتحن بڑا رحمدل یا اندھا ہے اور متعلموں کو یوں ہی پاس کر دیا کرتا ہے تو شاید وہ کتابوں کیطرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ مالتی جو کچھ کرتی تھی وہ مہتا کو خوش کرنے کے لئے۔ اسکی غرض تھی مہتا کی محبت اور عقیدت حاصل کرنا۔ انکے دل کی رانی بن جانا۔ لیکن اُسی متعلم کیطرح اپنی قابلیت کا یقین دلا کر، قابلیت آ جانے پر ممتحن خود بخود اس سے مطمئن ہو جائے گا۔ اتنا صبر اس میں نہ تھا۔

مگر آج مہتا نے جیسے اسے ٹھکرا کر اسکی روحانی قوت کو بیدار کر دیا۔ مہتا کو جب

اُسنے پہلی مرتبہ دیکھا تھا جبھی سے اُسکا دل ان کی طرف جھک رہا تھا۔ اُسے وہ اپنے شناساؤں میں قابل ترین معلوم ہوئے۔ اُنکی پاکیزہ زندگی میں عقل کی تیزی اور خیالوں کی مضبوطی ہی بہترین شئے تھی۔ دولت و اقتدار کو تو وہ صرف کھلونا سمجھتی تھی جسے کھیل کر بچے توڑ پھوڑ ڈالتے ہیں۔ صورت میں اب اس کیلئے کوئی خاص کشش نہ تھی اگرچہ اُسے بدصورتی سے نفرت تھی۔ اُس کو تو اب عقلی قوت ہی اپنی طرف متوجہ کرسکتی تھی جسکا سہارا پاکر اُسمیں خوداعتمادی پیدا ہو، اُنکی ترقی کی تحریک ملے، اپنے میں طاقت آئے اور اپنی زندگی کو کارآمد بنانے کی واقفیت ہو۔ مہتا کی عظمت و دانائی نے اُس پر اپنا سکہ جما دیا تھا اور تب سے وہ اپنی اصلاح کرتی چلی آرہی تھی۔ جس حرکت دینے والی طاقت کی اسے ضرورت تھی وہ مل گئی تھی اور پوشیدہ طور پر اُسے طاقت اور حرکت دے رہی تھی۔ زندگی کا نیا معیار جو اُسکے سامنے تھا وہ خود کو اُس تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہوئی اور کامیابی کا احساس کرتی اُس دن کا تصور کر رہی تھی جب وہ اور مہتا ایک سے ہو جائیں گے۔ آج یہ تصور اُسے اور بھی مستقل اور مضبوط بنا رہا تھا۔

مگر آج جب مہتا نے اُسکی اُمیدوں کو دروازے تک لاکر محبت کا وہ معیار اُسکے سامنے رکھا جسمیں محبت کو روحانیت اور ایثار کی بلندی سے گرا کر مادی سطح تک پہنچا دیا گیا تھا جہاں بدگمانی اور حسد کا راج ہے، تب اس کی پاک و صاف عقل کو چوٹ لگی اور مہتا سے اُس کو جو عقیدت تھی اُسے ایک دھکا سا لگا جیسے کوئی شاگرد اپنے اُستاد کو کوئی کمینی حرکت کرتے ہوئے دیکھ لے۔ اُس نے دیکھا کہ مہتا کی تیز فہمی محبت کو حیوانیت کی طرف کھینچے لئے جاتی ہے اور اُسکی فرشتہ صفتی کی جانب سے آنکھیں بند کئے لیتی ہے۔ یہ دیکھ کر اُسکا دل بیٹھ گیا

مہتا نے کچھ نادم ہو کر کہا "آؤ کچھ دیر اور بیٹھیں!"

مالتی بولی "نہیں اب لوٹنا چاہیئے۔ دیر ہو رہی ہے"!

(۳۱)

رائے صاحب کا ستارہ بلند تھا۔ ان کے تینوں منصوبے پورے ہو گئے تھے۔ لڑکی کی شادی دھوم دھام سے ہو گئی تھی، مقدمہ بھی جیت گئے تھے اور چناؤ میں کامیاب ہی نہ ہوئے تھے بلکہ ہوم ممبر بھی ہو گئے تھے۔ چاروں طرف سے مبارکباد مل رہی تھی۔ وقار تو اُن کا پہلے بھی کسی سے کم نہ تھا مگر اب تو اُس کی جڑ اور بھی گہری اور مضبوط ہو گئی تھی۔ وقتی اخباروں میں اُن کی تصویر اور سوانح عمری زوروں سے نکل رہی تھی۔ قرض بہت بڑھ گیا تھا مگر اب رائے صاحب کو اس کی پروا نہ تھی۔ وہ اس نئی جائداد کا ایک چھوٹا سا جزو فروخت کر کے قرض سے سبکدوش ہو سکتے تھے۔ راحت و آرام کا بلند سے بلند تصور جو انہوں نے کیا تھا وہ اس سے بھی زیادہ بلندی پر جا پہنچا تھا۔ ابھی تک اُن کا بنگلہ صرف لکھنؤ میں تھا، اب نینی تال منصوری اور شملہ تینوں مقاموں پر ایک ایک بنگلہ بنوانا ضروری ہو گیا۔ اب انھیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ان مقامات میں جائیں تو کسی ہوٹل میں یا کسی دوسرے راجہ کے بنگلے میں ٹھہریں۔ جب راجہ پرتاپ سنگھ کے بنگلے ان سبھی مقاموں میں تھے تو رائے صاحب کے لئے یہ بڑی شرم کی بات تھی کہ اُن کے بنگلے وہاں نہ ہوں۔ اتفاق سے بنگلے بنوانے کی زحمت نہ اُٹھانی پڑی۔ بنے بنائے بنگلے سستے داموں مل گئے۔ ہر بنگلے کے لئے مالی، چوکیدار، کارندہ، خانساماں وغیرہ بھی رکھ لئے گئے تھے۔ اور سب سے بڑی خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ اب کے ہز مجسٹی کی سالگرہ کے موقع پر انہیں راجہ کا خطاب بھی مل گیا تھا۔ اب اُن کی اعلیٰ خواہشیں تمام و کمال پوری ہو گئی تھیں۔ اُس دن خوب جشن منایا گیا اور ایسی

شاندار دعوت ہوئی کہ سارے پچھلے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ جس وقت ہز ایکسلنسی گورنر صوبہ نے انہیں خطاب دیا تو غرور کے ساتھ راج بھگتی کی ایسی ترنگیں آنکھوں میں اٹھیں کہ ان کا تن والا پھول اٹھا۔ یہ ہے زندگی! ورنہ پاٹیلوں کے پیچھے پڑ کر منصب کی بدنامی ایسی پھیل گئی تھی، افسروں کی نظروں سے گر گئے۔ جس سپرنٹنڈنٹ پولیس نے انہیں پچھلی مرتبہ گرفتار کیا تھا وہ اس وقت ان کے سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔ شاید اپنی خطاؤں کی معافی مانگ رہا تھا۔

مگر زندگی کی اعلیٰ ترین فتح تو انہیں اس وقت ملی جب ان کے پرانے اور سہارے ہوئے رقیب سورج پرتاپ سنگھ نے ان کے بڑے لڑکے رودرپال سنگھ سے اپنی لڑکی کے بیاہ کا پیغام دیا۔ رائے صاحب کو نہ مقدمہ جیتنے کی اتنی خوشی ہوئی تھی۔ نہ ہوم ممبر ہونے کی۔ وہ ساری باتیں خیال میں آتی تھیں، مگر یہ بات تو خلاف امید ہی نہیں، بلکہ خیال سے بھی باہر تھی۔ وہی سورج پرتاپ سنگھ جو ابھی کئی ماہ قبل انہیں اپنے کتے سے بھی کمتر سمجھتا تھا وہ آج ان کے لڑکے سے اپنی لڑکی کا بیاہ کرنا چاہتا ہے۔ کتنی ناممکن بات! رودرپال اس وقت ایم اے میں پڑھتا تھا، نہایت بے خوف، یکتا، معیار پرست، اپنے اوپر بھروسہ رکھنے والا، مغرور، کج مزاج اور کاہل نوجوان تھا، جسے اپنے باپ کی زبردستی اور جاہ طلبی بری معلوم ہوتی تھی۔

رائے صاحب اس وقت نینی تال میں تھے۔ یہ پیغام پا کر پھول اٹھے۔ اگرچہ وہ شادی کے بارے میں لڑکے پر کسی طرح کا دباؤ نہ ڈالنا چاہتے تھے مگر انہیں یقین تھا کہ وہ جو کچھ طے کر دیں گے اس پر رودرپال کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اور راجا سورج پرتاپ سنگھ سے رشتہ ہو جانا ایک ایسی خوش قسمتی کی بات تھی کہ رودرپال کا متفق نہ ہونا ان کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ انہوں نے فوراً راجا صاحب کو قبول دے دیا اور اسی وقت رودرپال کو فون کیا۔

روپپال نے جواب دیا "مجھے منظور نہیں"
رائے صاحب کو اپنی زندگی میں نہ کبھی اتنی مایوسی ہوئی تھی اور اتنا غصہ آیا تھا۔ پوچھا "کوئی وجہ ؟"
"وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا"
"میں ابھی جاننا چاہتا ہوں"
"میں نہیں بتانا چاہتا"
"تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا"
"جس بات کو میرا دل قبول نہیں کرتا اُسے میں آپ کے حکم سے نہیں مان سکتا"
رائے صاحب نے بڑی التجا سے سمجھایا "بیٹا، تم معیار کے لئے اپنے پیر میں کلہاڑی مار رہے ہو۔ اس رشتے سے سوسائٹی میں تمہارا درجہ کتنا اونچا ہو جائیگا، کچھ تم نے سوچا ہے؟ اسے خدائی تحریک سمجھو۔ اس خاندان کی کوئی بیکس لڑکی بھی مجھے ملتی تو میں اپنے بھاگ کو سراہتا، یہ تو راجا سورج پرتاپ سنگھ کی لڑکی ہے جو ہمارے سرتاج ہیں۔ میں اُسے روز دیکھتا ہوں۔ تم نے بھی دیکھا ہوگا۔ روپ گن شبھاؤ میں ایسی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ میں تو چار دن کا اور مہمان ہوں تمہارے سامنے ساری زندگی پڑی ہے۔ میں تم پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا۔ تم جانتے ہو کہ شادی کے بارے میں میرے خیال کتنے وسیع ہیں۔ لیکن میرا یہ بھی تو فرض ہے کہ اگر تمہیں غلطی کرتے دیکھوں تو آگاہ کر دوں"
روپپال نے جواب دیا "میں اس بارے میں بہت پہلے طے کر چکا ہوں اور اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی"
رائے صاحب کو لڑکے کی ہٹ اور نادانی پر غصہ آگیا۔ گرج کر بولے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا سر پھر گیا ہے۔ آگر مجھ سے پوچھو تو توقف نہ کرنا۔ میں راجا صاحب کو قول دے چکا ہوں"

رورپال نے جواب دیا "افسوس کہ ابھی مجھے فرصت نہیں ہے"

دوسرے دن رائے صاحب خود آ گئے۔ دونوں اپنے اپنے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر تیار کھڑے تھے۔ ایک طرف پوری زندگی کا حاصل کیا ہوا زبردست تجربہ تھا، مصلحتوں سے بھرا ہوا، اور دوسری طرف خام معیار پرستی تھی، ضدی، شریر اور بے مروّت!۔

رائے صاحب نے سیدھا وار کیا "میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون لڑکی ہے؟"

رورپال نے استقلال سے کہا "اگر آپ اتنے خواہشمند ہیں تو سنیے، وہ مالتی دیوی کی بہن سروج ہے"

رائے صاحب جیسے چوٹ کھا کر گر پڑے "اچھا وہ!"

"آپ نے تو سروج کو دیکھا ہو گا؟"

"خوب دیکھا ہے۔ تم نے راج کماری کو دیکھا ہے یا نہیں؟"

"جی ہاں، خوب دیکھا ہے"

"پھر بھی ... ..."

"میں صورت کو کوئی چیز نہیں سمجھتا"

"تمہاری سمجھ پر مجھے رنج ہوتا ہے، مالتی کو جانتے ہو کیسی عورت ہے تو اسکی بہن کیا کچھ ہو گی؟"

رورپال نے تیوری چڑھا کر کہا "میں اس بارے میں آپ سے اور کچھ نہیں کہنا چاہتا، مگر میری شادی ہو گی تو سروج سے"

"میرے جیتے جی کبھی نہیں ہو سکتی"

"تو آپ کے بعد ہوگی۔"

"اچھا تمہارے یہ ارادے ہیں!"

اور رائے صاحب کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں گویا ساری ہی زندگی اجڑ گئی ہو۔ ہوم ممبری اور علاقہ اور خطاب، سب جیسے باسی پھولوں کی طرح بے کیف اور ناخوشگوار ہوگئے ہوں۔ زندگی کی ساری ریاضت اور عیش و آرام بے کار گئی۔ اُن کی اہلیہ کا جب انتقال ہوا تھا تو ان کی عمر چھتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ شادی کر سکتے تھے اور عیش و آرام کا لطف بھی اُٹھا سکتے تھے۔ سبھی اُن سے شادی کیلئے اصرار کر رہے تھے مگر اُنہوں نے اِن لڑکوں کا منہ دیکھا اور تجردانہ زندگی کی مشقیں و ریاضت قبول کر لی۔ ان ہی لڑکوں پر زندگی کے سارے عیش و آرام کو قربان کر دیا۔ آج تک اپنے دل کی ساری محبت ان ہی لڑکوں کو دیتے ہوئے چلے آئے اور آج یہ لڑکا اتنی بے مروتی سے باتیں کر رہا ہے گویا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر وہ کیوں جائداد اور عزت اور اقتدار کیلئے جان دیں؟ ان ہی لڑکوں ہی کے لئے تو سب کچھ کر رہے تھے۔ جب لڑکوں کو ان کا ذرا بھی لحاظ نہیں تو وہ کیوں یہ تپسیا کریں؟ اُنہیں کونسی دنیا میں بہت دن رہنا ہے۔ انہیں بھی آرام سے پڑے رہنا آتا ہے۔ ان کے اور ہزاروں بھائی مونچھوں پر تاؤ دے کر زندگی کا لطف اُٹھا رہے ہیں اور مست گھومتے ہیں، پھر وہ بھی کیوں نہ وہی رویہ اختیار کریں؟ اُنہیں اس وقت یاد نہ رہا کہ وہ جو تپسیا کر رہے ہیں وہ لڑکوں کیلئے نہیں بلکہ اپنے لئے اور صرف شہرت کے لئے نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ کام کرنے کے عادی ہیں اور انہیں زندہ رہنے کے لئے اسکی ضرورت ہے۔ وہ عیاش اور کاہل بن کر اپنے دل کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ اُنہیں معلوم نہیں کہ لوگوں کی طبیعت ہی ایسی ہوتی ہے۔ وہ عیاشی اور کاہلی کو پسند نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے جگر کا خون پینے کیلئے بنے ہیں۔ جب تک زندہ ہیں پیتے ہی

جائیں گے۔

مگر اس صدمے کا ردِ عمل بھی فوراً ہی ہوا۔ ہم جس کیلئے ایثار کرتے ہیں اُن سے کسی صلے کی اُمید نہ رکھ کر بھی اُنکے دل پر حکومت کرنا چاہتے ہیں، خواہ وہ حکومت اُن ہی کے فائدے کے لئے ہو! اگرچہ اس فائدے کو ہم اس قدر اپنا بنا لیتے ہیں کہ گویا وہ ہمارا ہی فائدہ بن جاتا ہے۔ ترک جتنا ہی زیادہ ہوتا ہے، حکومت کا خیال بھی اتنا ہی زبردست ہوتا ہے۔ اور جب دفعتاً ہمیں احتجاج کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے تو ہم بھڑک اُٹھتے ہیں اور وہ ترک گویا انتقام کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ رائے صاحب کو یہ ضد پڑ گئی کہ بعد پال کی شادی سرویج سے نہ ہونے پائے، چاہے اُسکے لئے انہیں پولیس سے مدد کیوں نہ لینی پڑے۔ دھرم کی ہتیا کیوں نہ کرنی پڑے۔

انہوں نے جیسے تلوار کھینچ کر کہا "ہاں، میرے بعد ہی ہوگی! اور ابھی اُسے بہت دن ہیں!"

رودرپال نے جیسے گولی چلا دی "ایشور کرے آپ امر ہوں! سروج سے میرا بیاہ ہو چکا!"

"جھوٹ!"

"بالکل نہیں۔ سند موجود ہے!"

رائے صاحب صدمے سے گر پڑے۔ اتنی تیز انتقامانہ نظر سے اُنہوں نے کبھی کسی دشمن کو بھی نہ دیکھا تھا۔ دشمن زیادہ سے زیادہ اُن کے نفع پر چوٹ کر سکتا تھا یا اُن کے جسم پر یا وقار پر، مگر یہ چوٹ تو اس نازک جگہ پر تھی جہاں زندگی کی ساری رغبتوں کا اجتماع تھا۔ ایک آندھی تھی جس نے ان کی زندگی کو بیخ و بن سے اُکھاڑ دیا تھا۔ اب وہ بالکل بے دست و پا ہیں۔ پولیس کی ساری طاقت ہاتھ میں رکھتے ہوئے بھی بے دست و پا ہیں! تشدد ان کا آخری ہتھیار تھا۔ وہ ہتھیار ان کے ہاتھ سے

نکل چکا تھا۔ رودرپال بالغ ہے سروج بھی بالغ ہے اور رودرپال اپنی ریاست کا مالک ہے۔ اُن کا اس پر کوئی دباؤ نہیں آہ! اگر جانتا کہ یہ لونڈا ایسی مخالفت کریگا تو اس ریاست کیلئے لڑتا ہی کیوں؟ اس مقدمے بازی میں دو ڈھائی لاکھ بگڑ گئے۔ زندگی ہی تباہ ہو گئی۔ اب تو ان کی لاج اسی طرح بچے گی کہ اُس لونڈے کی خوشامد کرتے رہیں۔ وہ ذرا بھی خلل انداز ہوئے اور عزت خاک میں مل گئی۔ وہ اپنی زندگی کو قربان کر کے بھی اب مالک نہیں۔ آہ ساری زندگی برباد ہو گئی، ساری زندگی!

رودرپال چلا گیا تھا۔ رائے صاحب نے موٹر منگوایا اور مہتا سے ملنے چلے۔ مہتا اگر چاہیں تو مالتی کو سمجھا سکتے ہیں۔ سروج بھی ان کی عدول حکمی نہ کریگی۔ اگر دس بیس ہزار روپے غم کھانے سے بھی یہ شادی رُک جائے تو وہ اس کیلئے تیار تھے۔ اُنہیں خود غرضی کے نشے میں یہ بالکل خیال نہ رہا کہ وہ مہتا کے پاس ایسی تجویز لے کر جا رہے ہیں جس پر مہتا کی ہمدردی اُن کے ساتھ نہ ہو گی۔

مہتا نے کل ماجرا سُن کر اُنہیں بنانا شروع کیا۔ سنجیدگی سے بولے "یہ تو آپ کی عزت کا سوال ہے؟"

رائے صاحب بھانپ نہ سکے۔ اُچھل کر بولے "جی ہاں خالص عزت کا! راجا پرتاپ سنگھ کو تو آپ جانتے ہیں"

"میں نے اُن کی لڑکی کو بھی دیکھا ہے۔ سروج اُس کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہے"

"مگر اس لونڈے کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں"

"تو مار یئے گولی، آپ کو کیا کرنا ہے؟ وہی پچھتائے گا"

"آہ! یہی تو نہیں دیکھا جاتا مہتا جی! ملتی ہوئی عزت نہیں چھوڑی جاتی۔

میں اس عزت پر اپنی ریاست قربان کرنے کو تیار ہوں۔ آپ مالتی دیوی کو سمجھا دیں تو سب کام بن جائے۔ ادھر انکار ہو جائے، تو ریدپال سر پیٹ کر رہ جائے گا اور یہ نشہ دس پانچ دن میں آپ ہی اتر جائے گا۔ یہ پریم نہیں، صرف سنک ہے۔“

”لیکن مالتی بلا کچھ رشوت لئے ماننے کی نہیں۔“

”آپ جو کچھ کہئے، میں اسے دے دوں گا۔ وہ چاہے تو میں اسے یہاں کے ڈفرن اسپتال کا انچارج بنا دوں۔“

”ہاں لیجئے کہ وہ آپ ہی کو چاہے تو آپ راضی ہو گئے؟ جب آپ کو ہوم ممبری ملی ہے، آپ کے بارے میں اس کی رائے ضرور بدل گئی ہو گی۔“

رائے صاحب نے مہتا کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس پر مسکراہٹ سی نظر آئی۔ سمجھ گئے۔ غمگین لہجے میں بولے ”آپ کو مجھ سے مذاق کرنیکا یہی موقع ملا۔ میں آپکے پاس اسلئے آیا تھا کہ مجھے یقین تھا کہ آپ میری حالت پر غور کریں گے اور مناسب رائے دیں گے۔ اور آپ مجھے بنانے لگے۔ جس کے دانت نہیں دکھے وہ دانتوں کا درد کیا جانے؟“

مہتا نے متانت سے کہا ”معاف کیجئے گا، آپ سوال ہی ایسا لیکر آئے ہیں کہ اس پر سنجیدگی سے غور کرنا میں مضحکہ انگیز سمجھتا ہوں۔ آپ اپنی شادی کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ لڑکے کی شادی کی ذمہ داری آپ کیوں اپنے اوپر لیتے ہیں۔ خصوصاً جب آپکا لڑکا بالغ ہے اور اپنا نفع نقصان سمجھتا ہے؟ کم سے کم میں تو شادی جیسے اہم معاملے میں عزت کی گنجائش نہیں دیکھتا۔ عزت، دولت سے ہوتی تو راجا صاحب اس ننگے بابا کے سامنے گھٹنوں غلاموں کیطرح ہاتھ باندھے نہ کھڑے رہتے۔ معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے مگر راجا صاحب اپنے علاقے کے سب انسپکٹر تک کو سلام کرتے ہیں۔ اسے آپ عزت کہتے ہیں؟ لکھنؤ میں آپ کسی دوکاندار، کسی اہلکار، کسی

راہ گیر سے پوچھئے تو ان کا نام سنکر گالیاں دیگا۔ اسی کو آپ عزت کہتے ہیں؟ جا کر آرام سے بیٹھئے۔ سروج سے بہتر ہو آپ کو بہت مشکل سے ملے گی؟"

رائے صاحب نے احتجاج کیا "بہن تو مالتی ہی کی ہے!"

مہتا نے گرم ہو کر کہا "مالتی کی بہن ہونا کیا ذلت کی بات ہے، مالتی کو آپ نے جانا نہیں اور نہ جاننے کی پرواکی۔ میں نے بھی یہی سمجھا تھا، مگر اب معلوم ہوا کہ وہ آگ میں پڑ کر چمک اٹھنے والی سچی دھات ہے۔ وہ ان جانبازوں میں سے ہے جو موقع پڑنے پر اپنا جوہر دکھاتے ہیں، تلوار گھماتے نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کھنا کی کیا حالت ہے؟"

رائے صاحب نے ہمدردی سے سر ہلا کر کہا "سن چکا ہوں، اور بار بار خواہش ہوئی کہ ان سے ملوں مگر فرصت نہ ملی۔ اس مل میں آگ لگنا ان کی تباہی کا باعث ہو گیا۔"

"جی ہاں، اب وہ ایک طرح سے دوستوں کی عنایتوں پر گزر بسر کر رہے ہیں۔ اس پر گوبندی مہینوں سے بیمار ہے۔ اس نے کھنا پر خود کو قربان کر دیا، اس حیوان پر جس نے ہمیشہ اسے جلایا۔ اب وہ مر رہی ہے اور مالتی رات کی رات اس کے سرہانے بیٹھی رہ جاتی ہے، وہی مالتی جو کسی راجا یا نواب سے پانچ سو فیس پاتے ہوئے بھی رات بھر نہ بیٹھے گی۔ کھنا کے خورد سال بچوں کی پرورش کا بار بھی مالتی پر ہے۔ یہ مادریت اس میں کہاں سوئی ہوئی تھی، معلوم نہیں۔ مجھے تو مالتی کا یہ روپ دیکھ کر اپنے دل میں عقیدت کا احساس ہونے لگا حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ میں زبردست دہریہ ہوں۔ اور باطنی صفائی کے ساتھ اس کے چہرے پر بھی فوق البشریت کی چمک آنے لگی ہے۔ انسانیت اتنے زیادہ رنگوں والی اور اتنی زیادہ طاقتور ہے، اسکا مجھے کھلا تجربہ ہو رہا ہے۔ آپ ان سے ملنا چاہیں تو چلئے۔ اس بہانے میں بھی

چلا چلوں گا۔"

رائے صاحب نے شبہ سے کہا "جب آپ ہی میرے درد کو نہیں سمجھ سکے تو مالتی دیوی کیا سمجھیں گی؟ مُفت میں شرمندگی ہوگی۔ مگر آپ کو اُن کے پاس جانے کیلئے کسی بہانے کی ضرورت کیوں ہے؟ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ نے اُن پر اپنا جادو ڈال دیا ہے۔"

مہتا نے حسرت بھری مُسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "وہ باتیں اب خواب و خیال ہو گئیں۔ اب تو کبھی اُن کے درشن بھی نہیں ہوتے۔ اُنہیں اب فرصت بھی نہیں رہتی۔ دو چار بار گیا مگر مجھے معلوم ہوا کہ مجھ سے مل کر وہ بہت خوش نہیں ہوئیں۔ تب سے جاتے ہوئے شرم آتی ہے، ہاں خوب یاد آیا، آج نِسوانی ورزش گاہ کا جلسہ ہے، آپ چلیں گے؟"

رائے صاحب نے بے دلی کے ساتھ کہا "جی نہیں، مجھے فرصت نہیں ہے۔ مجھے تو فکر سوار ہے کہ راجا صاحب کو کیا جواب دوں گا۔ میں اُنہیں قول دے چکا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چلے۔ گھُتی جس گتھی کو سُلجھانے آئے تھے وہ اور بھی اُلجھ گئی، تاریکی اور بھی زیادہ تاریک ہو گئی۔ مہتا نے اُنہیں موٹر تک آ کر رخصت کیا۔

رائے صاحب سیدھے اپنے بنگلے تک آئے اور روز نامہ اُٹھایا ہی تھا کہ تنخا کا ملاقاتی کارڈ ملا۔ تنخا سے اُنہیں نفرت تھی اور اُن کا مُنہ بھی نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اسوقت دل کی کمزور حالت میں اُنہیں کسی ہمدرد کی تلاش تھی جو اور کچھ نہ کر سکے مگر اُن کے ساتھ ہمدردی کا اظہار تو کر سکے، فوراً بلا لیا۔

تنخا دبے پیروں روئی صورت بنائے کمرے میں داخل ہوئے، اور زمین تک

جھک کر سلام کرتے ہوئے بولے "میں تو حضور کے درشن کرنے نینی تال جا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے یہیں درشن ہو گئے۔ حضور کا مزاج تو اچھا ہے؟"

اس کے بعد اُنہوں نے بڑی لچھے دار زبان میں اور اپنے پچھلے سلوک کو بالکل بھول کر رائے صاحب کی تعریف کرنی شروع کی "ایسی ہوم ممبری کوئی کیا کرے گا؟ جدھر دیکھو حضور ہی کا چرچا ہے۔ یہ عہدہ حضور کی شان کے شایاں ہے۔"

رائے صاحب دل میں سوچ رہے تھے کہ یہ شخص بھی کتنا بڑا مکار ہے۔ اپنی غرض پڑنے پر گدھے کو دادا کہنے والا۔ پرلے سرے کا بے وفا اور بے شرم۔ مگر اُنہیں اس پر غصّہ نہ آیا۔ رحم آگیا۔ پوچھا "آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں حضور بے کار بیٹھا ہوں۔ اسی امید سے حضور کی خدمت میں حاضر ہونے جا رہا تھا کہ اپنے پرانے خادموں پر عنایت کی نظر رہے۔ آج کل بڑی مصیبت میں پڑا ہوا ہوں۔ راجا پرتاپ سنگھ کو تو حضور جانتے ہیں کہ وہ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھتے ایک روز آپ کی ہجو کرنے لگے۔ مجھ سے نہ سُنا گیا۔ میں نے کہا بس کیجئے مہاراج۔ رائے صاحب میرے مالک ہیں اور میں اُن کی بُرائی نہیں سُن سکتا۔ بس اسی بات پر بگڑ گئے۔ میں نے بھی سلام کیا اور گھر چلا آیا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ آپ کتنی ہی شان و شوکت دکھلائیں مگر رائے صاحب کی جو عزت ہے وہ آپ کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ عزت لیاقت سے ہوتی ہے۔ جو آپ میں جو لیاقت ہے وہ دُنیا جانتی ہے۔"

رائے صاحب نے بِھر بن کر کہا "آپ نے تو سیدھے گھر میں آگ لگا دی۔"

تنخا نے اکڑ کر کہا "میں تو حضور صاف کہتا ہوں خواہ کسی کو اچھا لگے یا بُرا۔ جب حضور کے قدموں کو پکڑے ہوئے ہوں تو کسی سے کیوں ڈروں؟ حضور کے تو نام سے جلتے ہیں۔ جب دیکھئے حضور کی ہجو گوئی۔ جب سے آپ ہوم ممبر ہوئے ہیں اُن کے

سینے پر سانپ لوٹ رہا ہے۔ میری ساری کی ساری اُجرت راجا صاحب ہضم کر گئے۔ دینا تو جانتے ہی نہیں حضور۔ اسامیوں پر اتنا ظلم کرتے ہیں کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کسی کی آبرو سلامت نہیں۔ دن دہاڑے عورتوں کو ۔۔ ۔۔ ۔۔"

موٹر کی آواز آئی اور راجا سورج پرتاپ سنگھ اُترے۔ رائے صاحب نے کمرے سے نکل کر اُن کا خیر مقدم کیا اور اس عزت افزائی کے بارے میں جھکتے ہوئے بولے "میں تو آپ کی خدمت میں حاضر ہونے ہی والا تھا"۔

یہ پہلا موقع تھا کہ راجا سورج پرتاپ سنگھ نے اس مکان میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ یہ خوش قسمتی!

ٹنکھا بھیگی بلی بنے ہوئے بیٹھے تھے۔ راجا صاحب یہاں! کیا اِدھر اِن دو اصحاب میں دوستانہ ہو گیا ہے؟ اُنہوں نے رائے صاحب کی آتشِ حسد کو مشتعل کر کے اپنے ہاتھ سینکنے چاہے تھے۔ مگر نہیں، راجا صاحب یہاں چاہے ملنے کیلئے آ گئے ہوں، مگر دلوں میں جو آگ ہے وہ تو کمہار کے بھٹے کی طرح صرف اوپر کی لیپا پوتی سے بجھنے والی نہیں۔

راجا صاحب نے سرکار جلاتے ہوئے ٹنکھا کی طرف بے رحمانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا "تم نے تو صورت ہی نہیں دکھائی مسٹر ٹنکھا۔ مجھ سے اس دعوت کے کُل روپے وصول کر لیے اور ہوٹل والوں کو ایک پائی نہ دی۔ اب وہ میرا سر کھا رہے ہیں۔ اسے دغا سمجھتا ہوں۔ چاہوں تو ابھی تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں"۔

یہ کہتے ہوئے اُنہوں نے رائے صاحب کو مخاطب کر کے کہا "ایسا بے ایمان آدمی میں نے نہیں دیکھا، رائے صاحب۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں کبھی آپ کے مقابلے میں نہ کھڑا ہوتا مگر مجھے اسی شیطان نے بہکایا اور میرے ایک لاکھ روپے برباد کرا دیئے۔ بنگلہ خرید لیا، موٹر رکھ لیا، ایک بیسوا سے آشنائی بھی کر رکھی ہے۔ بعد سے رئیس بنے

ہوئے ہیں۔ اور اب وفاداری شروع کی ہے۔ دشمنوں کی شان نبھانے کیلئے ریاست چاہتے تھے اور آپ کی ریاست اپنے احباب کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے!"

رائے صاحب منتھا کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے بولے "آپ چپ کیوں ہیں مسٹر منتھا؟ جواب دیجئے: راجا صاحب نے آپ کا سارا محنتانہ ہضم کر لیا تھا۔ اسکا کوئی جواب آپ کے پاس ہے؟ اب براہ کرم یہاں سے چلے جائیے اور خبردار پھر اپنی صورت نہ دکھائیے گا۔ وہ بھلے مانسوں کو لڑا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنا بے پونجی کا روزگار ہے مگر اسکے نفع یا نقصان دونوں ہی جان جوکھم ہیں۔ یہ سمجھ لیجئے!"

منتھا نے ایسا سر جھکایا کہ پھر نہ اُٹھا سکے۔ چپکے سے چلے گئے۔ جیسے کوئی چور گھر مالک کے اندر آجانے پر دبک کر نکل جائے۔

جب وہ چلے گئے تو راجا صاحب نے پوچھا "میری بُرائی کرتا ہوگا؟"

"جی ہاں، مگر میں نے بھی خوب بنایا!"

"شیطان ہے!"

"پورا"

"باپ بیٹے کو لڑا دے، میاں بیوی کو لڑا دے، اس فن میں اُستاد ہے۔ خیر آج حضرت کو اچھا سبق مل گیا۔

اس کے بعد روپالی کے بیاہ کی بات چیت شروع ہوئی۔ رائے صاحب کی جان سوکھی جا رہی تھی۔ گویا ان پر کوئی نشانہ لگایا جا رہا ہو۔ کہاں چھپ جائیں؟ کیسے کہیں کہ روپالی پر اُن کا کوئی قابو نہیں رہا؛ مگر راجا صاحب کو حالات معلوم ہو چکے تھے۔ رائے صاحب کو خود کچھ نہ کہنا پڑا۔ جان بچ گئی۔

اُنہوں نے پوچھا "آپ کو اسکی خبر کیونکر ہوئی؟"

"ابھی ابھی روپالی نے مسٹر ٹکی کے نام ایک خط بھیجا ہے جو اُنہوں نے مجھے دے دیا"

"آج کل کے لڑکوں میں اور تو کوئی خوبی نظر نہیں آتی، بس آزادی کی سنک سوار ہے!"

"سنک تو ہی ہے، مگر اس کی دوا میرے پاس ہے۔ میں اس چھوکری کو ایسا غائب کر دوں گا کہ کہیں پتہ نہ لگے گا۔ دس پانچ روز میں یہ سنک ٹھنڈی ہو جائے گی۔ سمجھانے سے کوئی فائدہ نہیں!"

رائے صاحب کانپ اُٹھے۔ اُن کے دل میں بھی اس طرح کی بات آئی تھی مگر انھوں نے اُسے کوئی صورت نہ پکڑنے دی تھی۔ سنسکار (سرشت) دونوں صاحبوں کے ایک سے تھے۔ گپھاؤں میں رہنے والی شخصیت دونوں ہی میں زندہ تھی۔ رائے صاحب نے اُسے بیرونی لباس سے ڈھانک دیا تھا، راجا صاحب میں وہ عریاں تھی۔ اپنی عظمت دکھانے کے اس موقع کو رائے صاحب نہ چھوڑ سکے، لجاتے ہوئے بولے "مگر یہ بیسویں صدی ہے، بارہویں نہیں۔

رودرپال کے اوپر اس کا کیا اثر ہوگا، میں نہیں کہہ سکتا، مگر انسانیت کے نقطۂ خیال سے ۔۔۔ ۔۔۔"

راجا صاحب نے بات کاٹ کر کہا "آپ انسانیت لئے پھرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ دُنیا میں آج بھی انسانیت کی حیوانیت ہی اس کی انسانیت پر فتح پا رہی ہے ورنہ سلطنتوں میں لڑائیاں کیوں ہوتیں؟ پنچایتوں سے جھگڑے طے نہ ہو جاتے۔ جب تک انسان رہے گا اس کی حیوانیت بھی رہے گی!"

چھوٹی موٹی بحث چھڑ گئی جو بالآخر بات کا بتنگڑ بن گئی اور راجا صاحب ناراض ہو کر چلے گئے۔ دوسرے دن رائے صاحب بھی نینی تال روانہ ہو گئے اور اُس کے ایک روز بعد رودرپال نے سروج کو ساتھ لے کر انگلستان کی راہ لی۔ اب اُن میں باپ بیٹے کا رشتہ نہ تھا۔ ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے تھے۔ تنخا صاحب اب

روپال کے مشیر و پیروکار تھے۔ اُنہوں نے روپال کی طرف سے رائے صاحب پر حساب فہمی کا دعویٰ کیا۔ رائے صاحب پر دس لاکھ کی ڈگری ہو گئی۔ اُنہیں ڈگری ہو جانے کا اتنا ملال نہ ہوا تھا جتنا اپنی بے عزتی کا۔ بے عزتی سے بھی زیادہ افسوس تھا زندگی کی تمام خواہشات کے خاک میں مل جانے کا اور سب سے بڑا رنج تھا اس بات کا کہ اپنے ہی بیٹے نے دغا کی۔ فرمانبردار بیٹے کے باپ بننے کا فخر اُن کے ہاتھ سے بڑی بے دردی کے ساتھ چھین لیا گیا تھا۔

مگر ابھی شاید اُنکے غم کا پیمانہ لبریز نہ ہوا تھا۔ جو کچھ کسر تھی وہ لڑکی اور داماد کے قطع تعلق نے پوری کر دی۔ عام ہندو لڑکیوں کی طرح مینا کشی بھی بے زبان تھی۔ باپ نے جس کے ساتھ بیاہ کر دیا تھا، اُسکے ساتھ چلی گئی۔ لیکن زن و شوہر میں محبت نہ تھی۔ دگ وجے سنگھ عیاش بھی تھے اور شرابی بھی۔ مینا کشی اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی اور کتابوں اور رسالوں سے دل بہلا کرتی تھی۔ دگ وجے سنگھ کی عمر تو تیس سال سے زیادہ نہ تھی پڑھا لکھا بھی تھا مگر بڑا مغرور اور اپنے خاندانی وقار کی ڈینگ مارنے والا اور بے رحم و بخیل۔ گاؤں کی کم ذات والی بہو بیٹیوں پر ڈورے ڈالا کرتا تھا۔ صحبت ایسی کمینوں کی تھی جنکی خوشامد نے اُسے بھی خود پسند بنا دیا تھا۔ مینا کشی ایسے شخص کی عزت دل سے نہ کر سکتی تھی۔ پھر اخباروں میں عورتوں کے حقوق کا تذکرہ پڑھ پڑھ کر اسکی آنکھیں بھی کھلنے لگی تھیں، اور زنانہ کلبوں میں آنے جانے لگی تھی۔ جہاں کتنی ہی تعلیم یافتہ اور خاندانی عورتیں آتی رہتی تھیں۔ اُن میں ووٹ اور حقوق اور آزادی اور نسوانی بیداری کا خوب چرچا ہوتا تھا، جیسے مردوں کے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہو۔ زیادہ تر وہی عورتیں تھیں جنکی اپنے شوہروں سے نہ بنتی تھی اور جو تعلیم یافتہ ہونیکے سبب قدیم رواجی بندشوں کو توڑ ڈالنا چاہتی تھیں۔ کئی ایسی عورتیں بھی تھیں جو ڈگریاں لے چکی تھیں اور ازدواجی زندگی کو خودداری کیلئے مہلک سمجھ کر

ملازمت کی تلاش میں تھیں۔ اُنہی میں ایک مس سُلطانہ تھیں جو ولایت سے بیرسٹر ہو کر آئی تھیں اور یہاں پر دولتمند عورتوں کو قانونی مشورہ دینے کا پیشہ کرتی تھیں۔ اُن ہی کی رائے سے مینا کشی نے شوہر پہ نان نفقے کا دعویٰ کیا۔ وہ اب اُسکے گھر میں رہنا چاہتی تھی۔ گزارے کی اُسے ضرورت نہ تھی اور وہ میکے میں بڑے آرام سے رہ سکتی تھی۔ مگر وہ ڈگ بجے سنگھ کے سہرے پر کالک لگا کر یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ ڈگ بجے سنگھ نے اس پر اُلٹا بد چلنی کا الزام لگایا۔ نائب صاحب نے اس لڑائی کو رفع کرنے کی حتی الامکان کوشش کی مگر مینا کشی اب شوہر کی صورت سے بیزار تھی۔ اگرچہ ڈگ بجے کا دعویٰ رد ہو گیا تھا۔ اور مینا کشی نے اُن پر گزارے کی ڈگری پائی مگر وہ بے عزتی اُس کے دل میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہی۔ وہ علیحدہ ایک کوٹھی میں رہتی تھی اور سوشلسٹ تحریک میں نمایاں حصّہ لیتی تھی۔ پھر بھی وہ جلن ٹھنڈی نہ ہوتی تھی۔

ایک روز وہ غصے میں آ کر ہنٹر لئے ہوئے ڈگ بجے سنگھ کے بنگلے پر پہنچی۔ شہدے جمع تھے اور رقاصہ ناچ رہی تھی۔ اُس نے جنگ کی دیوی کی طرح شیطانوں کے اُس مجمع میں پہنچ کر تہلکہ مچا دیا۔ ہنٹر کھا کر لوگ اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ اُس کے رعب کے سامنے وہ کمینے کیا ٹھہرتے۔ جب ڈگ بجے سنگھ تنہا رہ گئے تو اُس نے اُن پر تڑا تڑ ہنٹر جمانے شروع کئے اور اتنا مارا کہ کنور صاحب بے دم ہو گئے۔ زندگی ابھی تک نشے میں ڈوبی ہوئی گھڑی تھی۔ اب اُسکا نمبر آیا۔ مینا کشی ہنٹر تان کر جمانا ہی چاہتی تھی کہ وہ اُس کے پیروں پر گر پڑی اور رو کر بولی "بہو جی! آج میری جان بخشی کریں، میں پھر کبھی یہاں نہ آؤں گی۔ میں بے قصور ہوں۔"

مینا کشی نے اُس کی طرف نفرت سے دیکھ کر کہا "ہاں تو بے قصور ہے۔ جانتی ہے تو کہ میں کون ہوں؟ چلی جا، اب یہاں کبھی نہ آنا۔ ہم عورتیں مردوں کی تفریح و تعیش کا سامان ہی تو ہیں، تیرا کوئی قصور نہیں۔"

بلیسوا نے اس کے پیروں پر سر رکھ کر جوش میں کہا "خدا آپ کو خوش رکھے۔ جیسا نام مکھنی تھی ویسا ہی پایا۔"

"خوش رکھنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"آپ جو سمجھیں مہارانی جی۔"

"نہیں تم ہی بتاؤ۔"

بلیسوا کی جان ناخنوں میں آگئی، کہاں سے دعا بھی دینے چلی! جان بچ گئی تھی، چپکے سے اپنی راہ لینا چاہتی تھی۔ دعا دینے کا خبط سوار ہوا۔ اب جان کیسے بچے؟ ڈرتے ڈرتے بولی "سرکار کا اقبال بڑھے، رتبہ بڑھے، نام بڑھے۔"

مینا کنغی مسکراتی "ہاں ٹھیک ہے۔"

وہ اکمرا اپنے موٹر پر بیٹھی حاکم ضلع کے بنگلے پر پہنچ کر اس واقعہ کی اطلاع دی اور پھر اپنی کوٹھی کو چلی گئی۔ اس وقت سے عورت مرد ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ لوگ بجے سنگھ ریوالور لئے اس کی تاک میں پھرا کرتے تھے اور وہ بھی اپنی حفاظت کیلئے دو پہلوان ٹھاکر دں کو اپنے ساتھ لئے رہتی تھی۔ اور رائے صاحب نے سکھوں کا جو سورگ بنایا تھا اُسے اپنی ہی زندگی میں غارت ہوتے دیکھ رہے تھے۔ اب دُنیا سے مایوس ہو کر اُنکی روح اندر کی جانب متوجہ ہو رہی تھی۔ اب تک خواہشات سے جیتے رہنے کی تحریک ملتی رہتی تھی، اب اُدھر کا راستہ بند ہو جانے پر اُن کا دل خود بخود عبادت کی طرف جھکا جس میں خواہشات سے کہیں زیادہ سچائی تھی جس نئی جائداد کے بھروسے قرض لیا تھا وہ جائداد ادائی کے بغیر ہی ہاتھ سے نکل گئی تھی اور بوجھ سر پر لدا ہوا تھا۔ ہوم ممبری سے ضرور اچھی رقم ملتی تھی۔ مگر وہ سب کی سب اس عہدے کا وقار قائم رکھنے ہی میں صرف ہو جاتی تھی۔ اور رائے صاحب کو اپنی شاہانہ شان و شوکت نباہنے کیلئے وہی اسامیوں پر اضافہ اور بے دخلی

کرنا اور اُن سے نذرانہ لینا پڑتا تھا جس سے انہیں دلی نفرت تھی۔ وہ رعایا کو تکلیف نہ دینا چاہتے تھے۔ اُنکی حالت پر اُنہیں رحم آتا تھا، مگر اپنی ضروریات سے مجبور تھے مگر موہ انہیں چھوڑتا نہ تھا اور اس کشمکش میں بھی اُنہیں سکون نہ ملتا تھا۔ وہ موہ کو چھوڑنا چاہتے تھے مگر وہ اُنہیں چھوڑتا نہ تھا اور اس کشمکش میں پڑ کر اُنہیں ذلت، افسوس اور اضطراب سے چھٹکارا نہ ملتا تھا۔ اور جب دل ہی سکون نہیں تو جسم کیسے ٹھیک رہتا ہے۔ صحت قائم رکھنے کی پوری تدبیر کرنے پر بھی ایک نہ ایک روگ لگا رہتا تھا۔ رسوئی میں سبھی طرح کے لذیذ کھانے پکتے تھے مگر اُنکی تقدیر میں تو وہی مونگ کی دال اور پھلکے تھے۔ اپنے اور بھائیوں کو دیکھتے تھے جو ان سے نیچی یا وہ مقروض، پست اور مغموم تھے، جن کے عیش و عشرت اور شان و شوکت میں کوئی کمی نہ تھی، مگر ایسی بے حیائی کرنا اُن کے امکان سے بعید تھا۔ اُنکی روح کسا و بچے سنہ کاروں کی بربادی نہ ہوتی تھی۔ ظلم، مکاری، بے عزتی اور تکلیف رسانی کو وہ تعلقہ داری کی زینت اور شان و شوکت کا نام دیکر اپنے دل کو مطمئن نہ کر سکتے تھے۔ یہی ان کی سب سے بڑی شکست تھی۔

(۳۴)

مرزا خورشید نے اسپتال سے نکل ایک نیا کام شروع کر دیا تھا۔ بے فکری سے بیٹھے رہنا اُن کے مزاج میں داخل نہ تھا۔ یہ کام کیا تھا؟ شہری بسیواؤں کی ایک ناٹک منڈلی بنانا۔ فارغ البالی کے زمانے میں انہوں نے خوب عیاشی کی تھی، و ان دنوں اسپتال کے کھاٹ میں زخموں کی تکلیف سہتے سہتے اُنکا دل بھگتی سے بھر گیا تھا۔ اس زندگی کی یاد کر کے اُنہیں بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اس وقت اگر اُن میں سمجھ ہوتی تو وہ لوگوں کی کتنی بھلائی کر سکتے تھے، کتنوں کے رنج و افلاس کا

بوجھ ہلکا کر سکتے تھے، مگر وہ دولت اُنہوں نے عیاشی میں اُڑا دی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں کہ مصیبت ہی میں ہماری روح بیدار ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں کون اپنی جوانی کی غلطیوں پر افسوس نہیں کرتا؟ کاش وہ وقت عقل و طاقت کے حاصل کرنے میں لگایا جاتا، نیک اعمال کا خزانہ بھر لیا جاتا، تو آج دل کو کتنی تسکین ملتی! وہیں انکو اس امر کا افسوسناک تجربہ ہوا کہ دنیا میں کوئی اپنا نہیں، کوئی انکی موت پر دو آنسو بہانے والا نہیں۔ اُنہیں رہ رہ کر زندگی کا ایک پرانا واقعہ یاد آتا تھا۔ بصرہ کے ایک گاؤں میں جب وہ کیمپ میں ملیریا سے بیمار پڑے تھے اُس وقت ایک دیہاتی لڑکی نے اُن کی تیمارداری کتنی جانفشانی سے کی تھی۔ صحت ہو جانے پر جب انہوں نے روپے اور زیوروں سے اُس کے احسانوں کا بدلہ چکانا چاہا تو اُس نے کس طرح آنکھوں میں آنسو بھر کر سر نیچا کر لیا تھا، اور اُن تحائف کے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان دائیوں کی خدمت میں ضبط ہے، قاعدہ ہے، سچائی ہے، مگر وہ محبت کہاں؟ وہ انہماک کہاں، جو اس لڑکی کی بے غرض اور طفلانہ خدمات میں تھا؟ وہ محبت کی مورت ان کے دل سے کب کی مٹ چکی تھی۔ وہ ان سے پھر آنے کا وعدہ کرکے کبھی اس کے پاس نہ گئے تھے۔ عیش و عشرت کی مصروفیتوں میں کبھی اسکی یاد بھی آئی، آئی بھی تو اُس میں صرف رحم تھا، محبت نہ تھی۔ معلوم نہیں اس لڑکی پر کیا گزری۔ مگر آج کل اس کا وہ انکسار، شگفتگی اور سادگی سے بھرا ہوا چہرہ بار بار انکی آنکھوں کے سامنے پھرا کرتا تھا۔ کاش اس سے شادی کر لی ہوتی تو آج زندگی کتنی پُر کیف ہوتی۔ اور اس کے متعلق اس نامنصفانہ سلوک کی دکھ بھری یاد نے کل نسوانی طبقے کو انکی نفرت اور ہمدردی کا مستحق بنا دیا تھا۔ جب تک ندی بڑھاؤ پر تھی، لہریں تیز اور جھاگ دار بہاؤ میں روشنی کی شعاعیں بکھر کر رہ جاتی تھیں۔ اب پانی برابر اور برقرار ہو گیا تھا اور کرنیں اُس کی تہہ تک پہنچ رہی تھیں۔

مرزا صاحب نسبتاً رُت کی اس ٹھنڈی شام میں اپنے چھوٹے سے برآمدے میں دو طوائفوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے تھے کہ مہتا آ پہنچے۔ مرزا نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور بولے "میں تو آپ کی خاطر داری کا سامان لئے ہوئے آپ کی راہ دیکھ رہا ہوں!"

دونوں بیسوائیں مسکرائیں۔ مہتا کٹ گئے۔

مرزا نے دونوں کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور مہتا کو مسند پر بٹھاتے ہوئے بولے "میں تو خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میں جو کام کرنے جا رہا ہوں وہ آپ کی مدد کے بغیر پورا نہ ہو گا۔ آپ صرف میری پشت پر ہاتھ رکھے رہیئے اور للکارتے جائیے، وہاں مرزا بڑھتا چلا جائے گا!"

مہتا نے ہنس کر کہا "آپ جس کام میں ہاتھ لگائیں گے اس میں ہم جیسے کتابی کیڑوں کی امداد کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ کی عمر مجھ سے زیادہ ہے۔ دنیا بھی آپ نے خوب دیکھی ہے اور چھوٹے بڑے آدمیوں پر اپنا اثر ڈالنے کی جو طاقت آپ میں ہے وہ مجھ میں ہوتی تو میں نے خدا جانے کیا کچھ کر دیا ہوتا!"

مرزا صاحب نے مختصر الفاظ میں اپنی نئی تجویز بیان کی۔ اُن کی رائے تھی کہ حُسن کے بازار میں وہی عورتیں آتی ہیں جنہیں یا تو اپنے گھر میں کسی وجہ سے باعزت قیام نہیں ملتا یا جو مالی تکلیفوں سے مجبور ہو جاتی ہیں اور اگر یہ دونوں مسئلے حل کر دیئے جائیں تو بہت کم عورتیں اس طرح ذلیل و خوار ہوں۔

مہتا نے بھی دوسرے سمجھدار لوگوں کی طرح اس مسئلہ پر کافی غور کیا تھا اور اُن کا خیال تھا کہ زیادہ تر فطرتی رجحان اور عیش و عشرت کا شوق ہی عورتوں کو اس طرف کھینچتا ہے۔ اِسی بات پر دونوں میں بحث چھڑ گئی۔ دونوں اپنی اپنی بات پر اڑ گئے۔

جہتا نے مٹھی باندھ کر ہوا میں جھٹکتے ہوئے کہا "اچھا اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا، مرزا صاحب! رزق کے لئے اور بہت سے فرائع ہیں مگر جنس کی بھوک روٹیوں سے نہیں مٹتی۔ اس کیلئے دنیا کی بڑھیا بڑھیا چیزیں چاہیئے۔ جب تک سوشیل نظام اوپر سے نیچے تک بدل نہ ڈالا جائے، اس طرح کی منڈلی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا!"

مرزا نے مونچھیں کھڑی کیں "اور میں کہتا ہوں کہ یہ محض رزق کا سوال ہے۔ ہاں یہ سوال سبھی لوگوں کے لئے یکساں نہیں ہے۔ مزدور کیلئے وہ صرف آٹا دال اور ایک پھوس کی جھونپڑی کا سوال ہے۔ وکیل کے لئے وہ ایک موٹر بنگلہ اور خدمتگاروں کا سوال ہے۔ آدمی صرف روٹی نہیں چاہتا اور بھی بہت سی چیزیں چاہتا ہے۔ اگر عورتوں کے سامنے بھی وہ سوال انواع و اقسام کی صورتوں میں آتا ہے تو انکا کیا قصور ہے؟"

ڈاکٹر جہتا اگر ذرا غور کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ انمیں اور مرزا میں کوئی فرق نہیں، صرف الفاظ کا ردوبدل ہے، مگر بحث کی گرماگرمی میں غور کرنے کیلئے صبر کہاں؟ گرم ہو کر بولے "معاف کیجئے مرزا صاحب! جبتک دنیا میں دولت والے رہیں گے بیسوائیں بھی رہیں گی، آپ کی منڈلی اگر کامیاب بھی ہو جائے، حالانکہ مجھے اسمیں بہت شک ہے، تو آپ دس پانچ عورتوں سے زیادہ اس میں کبھی نہ لے سکیں گے اور وہ بھی تھوڑے دنوں کیلئے۔ سبھی عورتوں میں ناٹک کرنے کی اہلیت نہیں ہوتی، اسی طرح جیسے سبھی لوگ شاعر نہیں ہو سکتے اور یہ بھی مان لیں کہ یہ عورتیں آپ کی منڈلی میں مستقل طور پر ٹھہر جائیں گی تو بھی بازار میں ان کی جگہ خالی نہ رہے گی۔ جڑ پر جبتک کلہاڑے نہ چلیں گے، پتیاں توڑنے سے کوئی نتیجہ نہیں۔ دولت والوں میں کبھی کبھی ایسے لوگ نکل آتے ہیں

جو سب کچھ چھوڑ کر خدا کی راہ میں جا بیٹھتے ہیں۔ مگر دولت کا راج بدستور قائم ہے۔ اس میں ذرا بھی زوال نہیں آنے پایا!"

مرزا کو مہتا کی ہٹ دھرمی پر رنج ہوا۔ اتنا پڑھا لکھا سمجھدار آدمی ایسی باتیں کرے! سوشل نظام کیا آسانی سے بدل جائیگا؟ وہ تو صدیوں کا معاملہ ہے۔ تب تک کیا یہ اندھیر ہونے دیا جائے؟ اُسکی روک تھام نہ کی جائے۔ اور ان غریب عورتوں کو مردوں کی ہوس کا شکار ہونے دیا جائے؟ کیوں نہ شیر کو پنجرے میں بند کر دیا جائے کہ وہ دانت اور ناخون رکھتے ہوئے بھی کسی کو نقصان نہ پہنچا سکے؟ کیا اسوقت تک خاموش بیٹھا رہا جائے جبتک شیر اہنسا کا برت نہ لے لے؟ دولت والے اور جس طرح چاہیں اپنی دولت اُڑائیں۔ مرزا کو غم نہیں۔ شراب میں ڈوب جائیں، موٹروں کی مالا گلے میں ڈال لیں، قلعے بنوائیں، دھرم شالے اور مسجدیں کھڑی کریں، مرزا کو پروا نہیں۔ ہاں عورتوں کی زندگی نہ خراب کریں۔ اسے مرزا نہیں دیکھ سکتے۔ وہ حسن کے بازار کو ایسا سُنسان کر دینگے کہ دولتمندوں کی اشرفیوں پر کوئی تھوکنے والا بھی نہ ملے۔ کیا جن دنوں شراب کی دوکانوں پر پکٹنگ ہوتی تھی بڑے بڑے شرابی پانی پی پی کر دل کی آگ نہیں بجھا لیتے تھے؟

مہتا نے مرزا کی بے وقوفی پر ہنس کر کہا "آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ دنیا میں ایسے ملک بھی ہیں جہاں کسبیاں نہیں ہیں مگر امیروں کی دولت وہاں بھی اپنی دلچسپیوں کا سامان پیدا کر ہی لیتی ہے"!

مرزا بھی مہتا کی نادانی پر ہنسے "جانتا ہوں مہربان، جانتا ہوں! آپ کی دعا سے دنیا دیکھ چکا ہوں، مگر یہ ہندوستان ہے۔ یورپ نہیں ہے"!

"انسانی سرشت ساری دنیا میں ایک سی ہے"!

"مگر یہ بھی معلوم ہے کہ ہر قوم میں ایک ایسی چیز ہوتی ہے جسے اس کی روح

کہہ سکتے ہیں اور عصمت ہندوستانی تہذیب کی روح ہے!"

"اپنے منہ میاں مٹھو بن لیجیے!"

"دولت کی آپ اتنی برائی کرتے ہیں پھر بھی کھنّا کی حمایت کرتے نہیں تھکتے۔ یہ کیسے گا!"

مہتا کی تیزی رخصت ہو گئی، انکسار سے بولے "میں نے کھنّا کی حمایت اسوقت کی ہے جب وہ دولت کے پنجے سے چھوٹ گئے ہیں، اور آج کل آپ ان کی حالت دیکھیں تو آپ کو رحم آئے گا۔ اور میں کیا حمایت کروں گا جسے اپنی کتابوں اور لائبریری سے فرصت نہیں؟ زیادہ سے زیادہ مختصر ہمدردی ہی تو کر سکتا ہوں۔ حمایت کی ہے مس مالتی نے کہ کھنّا کو بچا لیا۔ انسان کی گہرائیوں میں ایثار کی کتنی طاقت چھپی ہوتی ہے۔ اسکا مجھے اب تک تجربہ نہ ہوا تھا۔ آپ بھی ایک دن کھنّا سے مل آئیے۔ طبیعت خوش ہو جائے گی۔ اسوقت اُسے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہمدردی ہے!"

مرزا نے جیسے اپنی مرضی کے خلاف کہا "آپ کہتے ہیں تو جاؤں گا۔ آپ کے ساتھ جہنم میں بھی عذر نہیں۔ مگر مس مالتی سے تو آپ کی شادی ہونے والی تھی۔ بڑی گرم خبر تھی!"

مہتا نے جھینپتے ہوئے کہا "ریاضت کر رہا ہوں، دیکھیے ثمرہ کب ملے!"

"اجی وہ تو آپ پر مرتی تھی!"

"مجھے بھی وہم ہوا تھا، مگر جب میں نے ہاتھ بڑھا کر اُسے پکڑنا چاہا تو دیکھا کہ وہ آسمان میں جا بیٹھی ہے۔ اُس بلندی تک تو میں کیا پہنچوں گا، ہاں اُسی سے التجا کر رہا ہوں کہ نیچے آ جائے۔ آج کل تو وہ مجھ سے بولتی بھی نہیں!"

یہ کہتے ہوئے مہتا زور سے ایک روتی ہوئی ہنسی ہنسے اُٹھ کھڑے

ہوئے۔

مرزا نے پوچھا "اب پھر کب ملاقات ہوگی؟"

"اب کے آپ کو تکلیف کرنی پڑے گی۔ لکھنؤ کے پاس جائیے گا ضرور!"

"جاؤں گا"

مرزا نے کھڑکی سے مہتا کو جاتے دیکھا۔ رفتار میں وہ تیزی نہ تھی جیسے کسی فکر میں ڈوبے ہوئے ہوں۔

(۳۳)

ڈاکٹر مہتا ممتا سے مطمئن ہو گئے ہیں، مالتی سے دور دور رہ کر انہیں یہ فکر ہونے لگا ہے کہ کہیں اسے کھو نہ بیٹھیں۔ کئی مہینے سے مالتی انکے پاس نہ آئی تھی اور جب وہ بے قرار ہو کر اُسکے گھر گئے تو ملاقات نہ ہوئی۔ جن دنوں رودرپال اور سروج کا عشقیہ واقعہ ہو رہا تھا تو مالتی ان کی صلاح لینے عموماً روزانہ دو ایکبار آتی تھی۔ مگر جب سے دونوں انگلستان چلے گئے تھے اُسکا آنا جانا بند ہو گیا تھا گھر پر بھی مشکل سے ملتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سے بچتی ہے، گویا انکی طرف سے اپنے دل کو ہٹا لینا چاہتی ہے۔ جس کتاب کو وہ آجکل لکھ رہے تھے وہ آگے بڑھنے سے انکار کر رہی تھی گویا انکی توجہ مفقود ہو گئی ہو۔ خانہ داری کے انتظام میں تو وہ کبھی بڑے ہوشیار نہ تھے۔ فی الجملہ ایک ہزار روپے سے زیادہ مہینے میں کما لیتے تھے مگر بچت ایک کوڑی کی بھی نہ ہوتی تھی۔ روٹی دال کھانے کے سوا اور ان کے ہاتھ کچھ نہ لگتا تھا۔ تکلف کا اگر کوئی سامان تھا تو وہ ان کا موٹر تھا جسے وہ خود چلاتے تھے۔ کچھ روپے کتابوں میں اُڑ جاتے تھے، کچھ چندوں میں، کچھ غریب طلباء کی امدادیں اور کچھ

باغ کی آرائش میں جس سے اُنہیں عشق سا تھا۔ طرح طرح کے پودے اور نباتاتی نمونے ولایتوں سے مہنگے داموں منگانا اور ان کی داشت کرنا یہی ان کا چھوٹا پن تھا۔ مگر ادھر کئی مہینے سے اُس باغیچے کی طرف سے بھی وہ کچھ بیزار سے ہو رہے تھے۔ اور گھر کا انتظام بھی ابتر ہو گیا تھا۔ کھاتے وہ پہلے اور خرچ ہوتا ایک سو سے زیادہ۔ اچکن پرانی ہو گئی تھی۔ مگر اسی میں اُنھوں نے کڑا کے کا جاڑا کاٹ دیا۔ نئی اچکن سلانے کی توفیق نہ ہوئی۔ کبھی کبھی جلا گھی کی دال کھا کر اُٹھ آنا پڑتا۔ کب گھی کا کنستر منگایا تھا، اس کی انہیں یاد ہی نہ تھی اور مہراج سے پوچھیں بھی تو کیسے؟ وہ سمجھے گا نہیں کہ اُس پر بے اعتباری ہو رہی ہے؟ آخر ایک روز جب تین مرتبہ کی مایوسیوں کے بعد چوتھی مرتبہ مالتی سے ملاقات ہوئی اور اُسنے اُن کی یہ حالت دیکھی تو اس سے نہ رہا گیا۔ بولی ”تم کیا اب کے جاڑا یوں ہی کاٹ دوگے؟ یہ اچکن پہنتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی ہے؟“

مالتی اُن کی بیوی نہ ہو کر بھی اُن کے اتنے پاس تھی کہ یہ سوال اُس نے اُسی معمولی انداز سے کیا جس طرح وہ اپنے کسی یگانے سے کرتی۔

مہتا نے بلا شرمائے ہوئے کہا ”کیا کروں مالتی، پیسہ تو بچتا ہی نہیں“!

مالتی کو تعجب ہوا ”تم ایک ہزار سے زیادہ کماتے ہو اور تمہارے پاس اپنے کپڑے بنوانے کو بھی پیسے نہیں؟ میری آمدنی کبھی چار سو سے زیادہ نہ تھی مگر میں اُسی میں ساری گرہستی چلاتی ہوں اور کچھ بچا بھی لیتی ہوں۔ آخر تم کیا کر ڈالتے ہو؟“

”میں ایک پیسہ بھی فالتو نہیں خرچ کرتا۔ مجھے کوئی ایسا شوق بھی تو نہیں ہے“!

"اچھا تو مجھ سے روپیہ لے جاؤ اور دو اچکنیں بنوا لو۔"

مہتا نے خجالت سے کہا "اب کے بنوا لوں گا۔ سچ کہتا ہوں۔"

"اب آپ یہاں آئیں تو آدمی بن کر آئیں۔"

"یہ تو بڑی کڑی شرط ہے۔"

"کڑی سہی۔ تم جیسوں کے ساتھ کڑائی کئے بغیر کام بھی تو نہیں چلتا۔"

مگر وہاں تو صندوق خالی تھا اور پیسے کے بغیر کسی دوکان پر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مالتی کے گھر جائیں کس منہ سے؟ دل میں تڑپ کر رہ جاتے تھے۔ ایک دن ایک نئی مصیبت آپڑی۔ ادھر کئی مہینے سے مکان کا کرایہ نہیں دیا تھا۔ پچھتر روپئے ماہوار بڑھتے جاتے تھے۔ مالک مکان نے جب کئی تقاضوں کے بعد بھی روپئے نہ وصول کر پائے تو نوٹس دے دیا۔ مگر نوٹس روپیہ بنانے کی مشین تو ہے نہیں۔ تاریخ نکل گئی اور روپئے نہ پہنچے۔ تب مالک مکان نے مجبور ہو کر نالش کر دی۔ وہ جانتا تھا کہ مہتا جی بڑے شریف اور بھلے مانس آدمی ہیں مگر اس سے زیادہ بھلمنسی وہ کیا کرتا کہ چھ ماہ تک صبر کئے بیٹھا رہا؟ مہتا نے کوئی پیروی نہ کی اور یک طرفہ ڈگری ہو گئی۔ مالک نے فوراً ڈگری جاری کرائی اور قرق امین مہتا صاحب کے پاس پہلی اطلاع دینے آیا۔ کیونکہ اس کا لڑکا یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور اسے مہتا صاحب کچھ وظیفہ بھی دیتے تھے۔ اتفاقاً اس وقت مالتی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔

بولی "کیسی قرقی ہے؟ کس بات کی ہے؟"

امین نے کہا "وہی کرایہ کی ڈگری جو ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ حضور کو اطلاع دے دوں۔ چار پانچ سو کا معاملہ ہے۔ کون سی بڑی رقم ہے؟ دس دن میں بھی روپئے دے دیجئے تو کوئی حرج نہیں۔ میں مہاجن کو دس دن تک الجھائے رکھوں گا۔"

جب امین چلا گیا تو مالتی نے خفگی کے لہجے میں پوچھا "تو اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی! مجھے تعجب ہوتا ہے کہ تم اتنی موٹی موٹی کتابیں کیسے لکھتے ہو۔ ہزاروں کا کرایہ چھ چھ ماہ سے باقی پڑا ہے اور تمہیں خبر نہیں۔"

مہتا شرم سے سر جھکا کر بولے "خبر کیوں نہیں ہے، لیکن روپے بچتے ہی نہیں۔ میں ایک پیسہ بھی فضول صرف نہیں کرتا۔"

"کوئی حساب کتاب بھی ہے؟"

"حساب کیوں نہیں لکھتا۔ جو کچھ پاتا ہوں وہ سب درج کر لیتا ہوں ورنہ انکم ٹیکس والے زندہ نہ چھوڑیں۔"

"جو کچھ خرچ کرتے ہو وہ؟"

"اس کا تو کوئی حساب نہیں رکھتا۔"

"کیوں؟"

"کون لکھے؟ بوجھ سا لگتا ہے۔"

"اور یہ پوتھے کیسے لکھ ڈالتے ہو؟"

"اس میں تو زیادہ کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ قلم لے کر بیٹھ جاتا ہوں اور لکھنے لگتا ہوں۔ ہر وقت خرچ کا کھاتا کھول کر تو نہیں بیٹھتا۔"

"تو یہ روپے کیسے ادا کرو گے؟"

"کسی سے قرض لے لوں گا۔ تمہارے پاس ہوں تو تم ہی دے دو۔"

"میں تو ایک ہی شرط پر دے سکتی ہوں کہ تمہاری آمدنی سب میرے ہاتھ آئے اور خرچ بھی میرے ہی ہاتھ ہو۔"

مہتا خوش ہو کر بولے "واہ! اگر یہ ذمہ داری لے لو تو کیا کہنا! ہم سولی سے ڈھول بجاؤں!"

مالتی نے پگڑی کے روپئے دے دیئے اور دوسرے ہی روز مہتا کو بنگلہ خالی کر دینے پر مجبور کیا۔ اپنے بنگلے میں اُس نے اُنہیں دو بڑے بڑے کمرے دے دیئے۔ اُن کے کھانے وغیرہ کا بندوبست بھی اپنے ہی گھر میں کر دیا۔ مہتا کے پاس اور سامان تو زیادہ نہ تھا، مگر کتابیں کئی گاڑی تھیں۔ ان کے دونوں کمرے کتابوں سے بھر گئے۔ باغیچہ چھوڑنے کا اُنہیں ضرور قلق ہوا لیکن مالتی نے اپنا پورا احاطہ اُنکے لئے چھوڑ دیا تھا کہ جو پھول پودے چاہیں، لگائیں۔

مہتا تو بے فکر ہو گئے، لیکن مالتی کو ان کی اور خرچ کے ٹھیک کرنے میں بڑی دِقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس نے دیکھا کہ آمدنی تو ہزار سے زیادہ ہے مگر وہ ساری کی ساری خفیہ خیرات میں صرف ہو جاتی ہے۔ بیس پچیس لڑکے اُنہیں سے وظیفہ پا کر اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ بیواؤں کی تعداد بھی اس سے کم نہ تھی۔ کس طرح میں کمی کرے اُسے یہ نہ سوجھتا تھا۔ سارا الزام اُسی کے سر منڈھا جائے گا۔ ساری بدنامی اُسی کے حصے میں آئے گی۔ کبھی مہتا پر جھنجھلاتی کبھی اپنے اوپر، اور کبھی سائلوں کے اوپر جو ایک سادہ اور سخی انسان پر اپنا بار رکھتے ہوئے ذرا بھی نہ شرماتے تھے۔ یہ دیکھ کر اور بھی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی کہ ان خیرات لینے والوں میں کچھ تو اس کے مستحق نہ تھے۔ ایک روز مہتا کو آڑے ہاتھوں لیا۔

مہتا نے اس کا اعتراض سُن کر بے فکری سے کہا "تمہیں اختیار ہے کہ جسے چاہے دو اور جسے چاہے نہ دو۔ مجھ سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ جواب بھی تم ہی کو دینا پڑے گا۔"

مالتی نے چڑھ کر کہا "ہاں، اور کیا؟ نیک نامی تم لو اور بدنامی میری ہو۔ میں نہیں سمجھتی کہ تم کس دلیل سے اس خیرات کی حمایت کر سکتے ہو۔ انسانوں کو اسی

رواج نے جتنا کاہل اور مفت خور بنایا ہے اور اُسکی خودداری کو جتنا دھکا پہنچایا ہے' اتنا بے انصافی نے بھی نہ کیا ہوگا' بلکہ میرے خیال سے بے انصافی نے انسانوں میں انقلابی جذبہ پیدا کر کے سماج کو بڑا نفع پہنچایا ہے''

مہتا نے تسلیم کیا ''میرا ابھی یہی خیال ہے''۔

''تمہارا یہ خیال نہیں ہے''!

''نہیں مالتی۔ میں سچ کہتا ہوں''۔

''تو خیال اور عمل میں اتنا فرق کیوں؟''

مالتی نے تیسرے مہینے بہتوں کو مایوس کیا۔ کسی کو صاف جواب دیا کسی سے مجبوری جتائی اور کسی کی فضیحت کی۔

مہتا صاحب کا بجٹ تو رفتہ رفتہ ٹھیک ہو گیا مگر اس سے انہیں ایک طرح کا رنج ہوا مالتی نے جب تیسرے مہینے میں سیمن سو کی بچت دکھائی تب وہ اس سے کچھ بولے تو نہیں مگر اُن کی نظر میں اسکی عظمت کچھ کم ضرور ہو گئی۔ عورت میں دان اور تیاگ ہونا چاہئے۔ یہی اس کی سب سے بڑی پونجی ہے اس کی بنیاد پر سوسائٹی کا محل کھڑا ہوا ہے۔ تجارتی عقل کو وہ ضروری برائی ہی سمجھتے تھے۔

جب مہتا کی اچکنیں بن کر آئیں اور نئی گھڑی بھی آئی تو وہ شرم کے مارے کئی دن باہر نہ نکلے۔ خود آرائی سے بڑا ان کی نظر میں دوسرا گناہ نہ تھا۔

مگر راز کی بات یہ تھی کہ مالتی اُن کو تو حسابی شکنجے میں کس کر رکھنا چاہتی تھی ان کی مالی خیرات کا دروازہ بند کر دینا چاہتی تھی اور خود ذاتی ایثار میں اپنے وقت اور اپنی خیر اندیشی کو دونوں ہاتھوں سے لٹاتی تھی۔ امیروں کے گھر تو وہ بلا فیس لئے نہ جاتی تھی مگر غریبوں کو مفت دیکھتی تھی اور مفت دوا بھی دیتی

تھی۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہی تھا کہ مالتی گھر کی تھی اور باہر کی بھی جبکہ مہتا صرف باہر کے تھے، گھر اُن کے لئے نہ تھا۔ اپنے کو دونوں مٹا دینا چاہتے تھے۔ مہتا کا راستہ صاف تھا۔ ان پر ذاتی ذمّہ داری کے سوا اور کوئی بندش نہ تھی۔ مالتی کا راستہ مشکل تھا۔ اُس پر ذمّہ داری تھی اور بندش تھی، جسے وہ نہ توڑ سکتی تھی اور نہ توڑنا چاہتی تھی۔ اس بندش ہی میں اُسے زندگی کی تحریک ملتی تھی۔ اُسے اب مہتا کو پاس دیکھ کر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کھلے جنگل میں گھومنے والے جیو کو پنجرے میں بند نہیں کر سکتی، اور بند کر دے گی، تو وہ کاٹنے اور نوچنے دَوڑے گا۔ پنجرے میں سب طرح کا آرام ملنے پر بھی اُس کا دل ہمیشہ جنگل کے لئے بے قرار رہے گا۔ مہتا کے لئے گھر کی دُنیا ایک اجنبی دُنیا تھی جس کے رسم و رواج سے وہ ناآشنا تھے۔

اُنہوں نے دُنیا کو باہر سے دیکھا تھا اور اُسے مکر و فریب ہی سے معمور سمجھتے تھے۔ جدھر دیکھتے تھے، اُدھر ہی برائیاں نظر آتی تھیں۔ مگر سماج جب گہرائی تک جا کر دیکھا تو اُنہیں معلوم ہوا کہ ان برائیوں کے نیچے ایثار بھی ہے محبّت بھی ہے، اس شک و شبہہ کی حالت میں جب مالتی کا تاریکی سے نکلتا ہوا دیوی کا روپ اُنہیں نظر آیا تب وہ اس کی طرف عجلت اور بے صبری کے ساتھ دَوڑ پڑے اور چاہا کہ اُسے ایسی حکمت سے چھپا کر رکھیں کہ کسی دوسرے کی آنکھ بھی نہ پڑے۔ یہ خیال نہ رہا کہ یہ انتہائی رغبت ہی تباہی کی جڑ ہے۔ محبّت جیسی بے مروّت شے کیا خوف سے باندھ کر رکھی جا سکتی ہے؟ وہ تو پورا اعتبار چاہتی ہے پوری آزادی چاہتی ہے، اور پوری ذمہ داری چاہتی ہے۔ اُسکے نشوونما کی طاقت اسکے اندر ہے۔ اُسے روشنی اور فضا ملنی چاہئے۔ وہ کوئی دیوار نہیں ہے جس پر اوپر سے اینٹیں رکھی جاتی ہیں۔ اُس میں تو جان ہے ارتقاء ہے اور پھیلنے کی بے حد سکت ہے۔

جب سے مہتا اس بنگلے میں آئے، اُنہیں مالتی سے دن میں کئی بار ملنے کا

موقع ملتا ہے۔ ان کے دوست سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے بیاہ کی تیاری ہے اور صرف رسم ادائی کی دیر ہے۔ مہتا بھی یہی خواب دیکھتے ہیں۔ اگر مالتی نے انہیں سدا کیلئے ٹھکرا دیا ہوتا تو کیوں ان سے اتنی محبت رکھتی؟ شاید وہ انہیں سوچنے کا موقع دے رہی ہے اور وہ خوب سوچ کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مالتی کے بغیر وہ نصف ہیں اور وہی انہیں تکمیل کی طرف لے جا سکتی ہے۔ باہر سے وہ رنگین مزاج ہے مگر اندر سے وہی رجحان طاقت کا مرکز ہے۔ حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ پہلے مالتی پیاسی تھی اور اب مہتا پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور ایک مرتبہ جواب پا جانے کے بعد انہیں اس مسئلہ پر مالتی سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی، اگرچہ اُن کے دل میں اب شک کا نام بھی نہیں رہا۔ مالتی کو قریب سے دیکھ کر اُن کی کشش بڑھتی ہی جاتی ہے دور سے کتاب کے جو حروف ملے جلے سے لگتے تھے اب قریب سے وہ صاف ہو گئے ہیں۔ اُن میں مطلب ہے اور پیغام ہے!

اِدھر مالتی نے باغ میں مالی کا کام کرنے کے لئے گوبر کو رکھ لیا تھا۔ ایک روز وہ کسی مریض کو دیکھ کر آ رہی تھی کہ راستے میں پٹرول ختم ہو گیا۔ وہ خود موٹر چلا رہی تھی فکر ہوئی کہ پٹرول کیسے آئے۔ رات کے نو بج گئے تھے اور ماگھ کی ٹھنڈ پڑ رہی تھی سڑکوں پر سناٹا ہو گیا تھا۔ کوئی ایسا آدمی نظر نہ آتا تھا جو موٹر کو ڈھکیل کر پٹرول کی دوکان تک لے جائے۔ بار بار نوکر پر جھنجلا رہی تھی "حرام خور کہیں کا! بے خبر پڑا رہتا ہے!"

اتفاقاً گوبر اُدھر سے آ نکلا۔ مالتی کو کھڑے دیکھ کر اُس نے سب سمجھ لیا اور گاڑی کو دو فرلانگ ڈھکیل کر پٹرول کی دوکان تک لایا۔

مالتی نے خوش ہو کر پوچھا "نوکری کرو گے؟"

گوبر نے شکریے کے ساتھ منظور کیا۔ پندرہ روپئے تنخواہ طے ہوئی۔ مالی کا

کام اُسے پسند تھا۔ یہی کام اُس نے کیا تھا اور اس میں مشاق تھا۔ مِل کی مزدوری میں اُجرت زیادہ ملتی تھی مگر اُس میں اُس کو اُلجھن ہوتی تھی۔

دوسرے دن سے گوبر نے مالتی کے یہاں کام کرنا شروع کر دیا۔ اُسے رہنے کو ایک کوٹھری بھی مل گئی۔ جھُنیا بھی آ گئی۔ مالتی باغ میں آتی تو اُسے جھُنیا کا بچّہ دھول مٹی میں کھیلتا ملتا۔ ایک دن مالتی نے اُسے مٹھائی دے دی۔ بچہ اُس دن سے مانوس ہو گیا۔ اُسے دیکھتے ہی اُسکے پیچھے لگ جاتا اور جب تک مٹھائی نہ لے لیتا، پیچھا نہ چھوڑتا۔

ایک دن مالتی باغ میں آئی تو بچّہ نہ دکھائی دیا۔ جھُنیا سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ بچّے کو بخار آ گیا ہے۔ مالتی نے گھبرا کر کہا "بخار آ گیا تو میرے پاس کیوں نہیں لائی؟ چل، دیکھوں!"

بچّہ کھٹولے پر بخار میں غافل پڑا تھا۔ کھپریل کی کوٹھری میں اتنی نمی، اتنی تاریکی اور ان جاڑے کے دنوں میں بھی مچھّروں کی اتنی کثرت تھی کہ مالتی ایک منٹ بھی وہاں نہ ٹھہر سکی۔ فوراً آ کر تھرما میٹر لیا اور پھر جا کر دیکھا تو بخار ایک سو چار تھا۔ مالتی کو اندیشہ ہوا کہ کہیں چیچک نہ ہو۔ بچّے کے ابھی تک ٹیکہ نہ لگا تھا۔ اور اگر اس نم کوٹھری میں رہا تو اندیشہ تھا کہ بخار نہ بڑھ جائے۔

دفعتاً بچّے نے آنکھیں کھول دیں اور مالتی کو کھڑا دیکھ کر رونی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی گود کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ مالتی نے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور تھپکیاں دینے لگی۔

بچّہ مالتی کی گود میں جا کر جیسے کسی بڑے سُکھ کا احساس کرنے لگا اور اپنی جلتی ہوئی انگلیوں سے اُس کے گلے کی موتیوں کی مالا پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ مالتی نے نکلیس اُتار کر اُس کے گلے میں ڈال دی۔ بچّے کی خود غرضانہ فطرت اس حالت میں

بھی برقرار تھی۔ نکلیس پاکر اب اُسے گودی میں رہنے کی کوئی ایسی ضرورت نہ رہی۔ یہاں نکلیس کے چھن جانے کا خوف تھا۔ اسوقت جھنیا کی گود زیادہ محفوظ تھی۔

مالتی نے شگفتہ دلی سے کہا "بڑا چالاک ہے یہ چیز لیکر کیسا بھاگا!"

جھنیا نے کہا "دے دو بیٹا، مس صاحب کا ہے"

بچے نے مالا کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور ماں کی طرف غصے سے دیکھا۔

مالتی بولی "تم پہنے رہو بچہ، میں مانگتی نہیں ہوں"

اُسی وقت بنگلے میں آکر اُسنے اپنی نشست کا کمرہ خالی کر دیا اور اُسی وقت جُھنیا اس میں آکر مقیم ہو گئی۔ منگل نے اُس بہشت کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھا۔ چھت میں پنکھا تھا، رنگین برقی بلب تھے، دیواروں پر تصویریں تھیں۔ ان چیزوں کو دیرتک ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ مالتی نے بڑے پیار سے پکارا "منگل!"

منگل نے مُسکرا کر اسکی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "آج تو ہنسا نہیں جاتا مس صاحب! کیا کروں؟ آپ سے کچھ ہو سکے تو کیجئے"

مالتی نے جھنیا کو بہت سی باتیں سمجھائیں اور جاتے ہوئے پوچھا "تیرے گھر میں کوئی دوسری عورت ہو تو گوبر سے کہہ دے کہ دو چار روز کیلئے بُلا لائے۔ مجھے چیچک کا اندیشہ ہے۔ کتنی دور ہے تیرا گھر؟"

جھنیا نے اپنے گاؤں کا نام اور پتہ بتایا "اٹھارہ بیس کوس کے قریب ہوگا!"

مالتی کو بلاری یاد تھا۔ بولی "وہی گاؤں تو نہیں جس کے پچھم طرف آدھے میل پر ندی ہے؟"

"ہاں ہاں صاحب! وہی گاؤں ہے۔ آپ کو کیسے معلوم ہے؟"

"ایک بار ہم لوگ وہاں گئے تھے اور ہوری کے گھر ٹھہرے تھے۔ تو اُسے جانتی ہے؟"

"وہ تو میرے سسر ہیں، مس صاحب، میری ساس بھی ملی ہو گی!"

"ہاں ہاں، بڑی سمجھدار عورت معلوم ہوتی تھی۔ مجھ سے خوب باتیں کرتی رہی۔ تو گوبر کو بھیج دے، اپنی ماں کو بلا لائے!"

"وہ اُنہیں بلانے نہ جائیں گے!"

"کیوں؟"

"کچھ ایسا ہی کارن ہے"

جھنیا کو اپنے گھر کا چوکا برتن روٹی پانی اور جھاڑنا بٹورنا وغیرہ سبھی کچھ کرنا پڑتا تھا۔ دن کو تو دونوں چمن پر رہ جاتے تھے اور رات کو جب مالتی آجاتی تو جھنیا اپنا کھانا پکاتی اور مالتی بچے کے پاس بیٹھتی۔ جھنیا بار بار چاہتی کہ بچے کے پاس بیٹھے مگر مالتی اُسے نہ آنے دیتی۔ رات کو بچے کا بخار تیز ہو جاتا اور وہ بےچینی سے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا لیتا۔ مالتی اُسے گود میں لیکر گھنٹوں کمرے میں ٹہلتی۔ چوتھے دن چیچک نکل آئی۔ مالتی نے سارے گھر کو ٹیکہ لگایا، خود اپنے لگایا اور مہتا کو بھی لگایا۔ گوبر، جھنیا، مہراج کوئی نہ بچا۔ پہلے دن تو دانے چھوٹے اور الگ الگ تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ چھوٹی چیچک ہے۔ دوسرے دن دانے جیسے کھل اُٹھے اور انگور کے برابر ہو گئے۔ اور پھر کئی کئی دانے مل کر بڑے بڑے آبلہ سے ہو گئے۔ منگل جلن اور کھجلی اور درد سے بےچین ہو کر کچھ بھری آوازیں کراہتا اور عاجزی اور بےچارگی بھری نظروں سے مالتی کی طرف دیکھتا۔ اس کا کراہنا بھی بڑے دن کا سا تھا اور نگاہوں میں بھی بختگی تھی، گویا وہ لڑکا یکایک جوان ہو گیا ہو۔ اس نا قابل تکلیف نے گویا اس کے معصوم بچپن کو مٹا ڈالا تھا۔ اس کی طفلانہ عقل کو ہرایا

وسعت پاکر سمجھ رہی تھی کہ مالتی ہی کے جتن سے وہ اچھا ہو سکتا ہے۔ مالتی جیسے ہی کسی کام سے چلی جاتی تو وہ رونے لگتا اور مالتی کے آنے ہی چپ ہو جاتا۔ رات کو اُس کی بے چینی بڑھ جاتی اور مالتی کو عموماً ساری ہی رات بیٹھنا پڑ جاتا۔ مگر وہ نہ کبھی جھنجھلاتی نہ چڑھتی۔ ہاں جھنیا پر اُسے ضرور کبھی کبھی غصہ آتا، کیونکہ وہ اپنی نادانی کے سبب نہ کرنے والا کام بھی کر بیٹھتی۔ گوبر اور جھنیا دونوں کا جھاڑ پھونک پر زیادہ اعتقاد تھا، مگر یہاں اس کا کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ اُس پر جھنیا دو بچوں کی ماں ہو کر بھی بچہ کی داشت کرنا نہیں جانتی تھی۔ منگل دق کرتا تو اُسے ڈانٹتی، ڈپٹتی۔ ذرا بھی موقع پاتی تو زمین پر سو جاتی اور صبح سے پہلے نہ اُٹھتی۔ اور گوبر تو اُس کمرے میں جیسے آتے ڈرتا تھا۔ مالتی وہاں بیٹھی ہے، کیسے جائے؟ جھنیا سے بچے کا حال پوچھ لیتا اور کھا پی کر سو جاتا۔ اس پرانی چوٹ کے بعد وہ پورا تندرست نہ ہونے پایا تھا۔ ذرا سا کام کر کے بھی تھک جاتا تھا۔ اِن دنوں جب جھنیا گھاس بیچتی تھی اور وہ آرام سے پڑا رہتا تھا تب کچھ سنبھل گیا تھا، مگر اِدھر کئی مہینوں تک بوجھ ڈھونے اور چونے گارے کا کام کرنے سے اُس کی حالت پھر گر گئی تھی۔ اس پر یہاں کام بہت تھا۔ سارے باغ کو سینچنا، کیاریوں کو گوڈنا، گھاس چھیلنا، گایوں کو چارہ پانی دینا اور دوہنا۔ اور جب مالک اتنا رحم دل ہو اُس کے کام میں تساہلی کیسے کرے؟ یہ احسان اُسے ایک منٹ بھی آرام سے نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ اور جب مہتا خود کھرپی لے کر گھنٹوں باغ میں کام کرتے تھے تو وہ کیسے آرام کرتا؟ وہ خود گھلتا جاتا تھا مگر باغ ہرا ہو رہا تھا۔

مہتا کو بھی بچے سے محبت ہو گئی تھی۔ ایک روز مالتی نے اُسے گود میں لے کر اُن کی مونچھیں اُکھڑوائی تھیں۔ دُشٹ نے مونچھوں کو ایسا پکڑا تھا جیسے جڑ سے اُکھاڑ لے گا۔ مہتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور اُنہوں نے بگڑ کر کہا تھا

"بڑا شیطان لونڈا ہے!"

مالتی نے اُنھیں ڈانٹا تھا "تم مونچھیں صاف کیوں نہیں کر لیتے!"

"میری مونچھیں مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں!"

"اب کے پکڑے گا تو اُکھاڑ ہی کے چھوڑے گا!"

"بس اُس کے کان بھی اُکھاڑ لوں گا!"

منگل کو اُن کی مونچھیں اُکھاڑنے میں کوئی خاص مزہ آتا تھا۔ وہ خوب کھلکھلا کر ہنستا تھا اور مونچھوں کو زیادہ زور سے کھینچتا تھا مگر مہتا کو بھی شاید مونچھیں اُکھڑوانے میں مزہ آتا تھا کیونکہ وہ عموماً دو ایک بار روزانہ اس سے اپنی مونچھوں کی رسّہ کشی کرا لیا کرتے تھے۔

اِدھر جب سے منگل کو چیچک نکل آئی تھی، مہتا کو بڑی تشویش ہو گئی تھی۔ اکثر کمرے میں جا کر منگل کو مغموم آنکھوں سے دیکھا کرتے۔ اس کی تکلیف کے خیال سے اُنکا نرم و نازک دل کانپ جاتا تھا۔ اُن کی دوڑ دھوپ سے وہ اچھا ہو جاتا تو وہ زمین کے دوسرے سرے تک بھی دوڑ لگاتے۔ روپے خرچ کرنے سے اچھا ہوتا تو خواہ اُنھیں بھیک ہی مانگنا پڑتا وہ اُسے اچھا کر ہی کے رہتے۔ مگر یہاں کوئی بس نہ تھا۔ اُسے چھوتے ہوئے بھی اُن کے ہاتھ لرزتے تھے کہیں اُسکے آبلے نہ ٹوٹ جائیں۔ مالتی کتنی آہستگی سے اُٹھاتی ہے، کندھے پر بٹھا کر کمرے میں ٹہلتی ہے اور کتنی محبت سے اُسے بہلا کر دودھ پلاتی ہے۔ یہ مادرانہ محبت مالتی کو اُن کی نظروں میں نہ جانے کتنا اونچا اُٹھا دیتی ہے۔ مالتی صرف عورت نہیں بلکہ ماں بھی ہے، اور ایسی ویسی ماں نہیں بلکہ اصلی معنی میں ماں، اور دیوی، اور زندگی دینے والی۔ جو پرائے بچے کو بھی اپنا سمجھ سکتی ہے گویا اُس نے مادری جذبات کو سدا سے فراہم کیا ہو اور آج اُنھیں دونوں ہاتھوں سے لٹا رہی ہو اُس کے

عضو عضو سے مادریت پھوٹی پڑتی تھی گویا یہی اس کا اصلی روپ ہو۔ وہ ناز و انداز، وہ بناؤ اور سنگار اس کی مادریت کے محض پردے تھے تاکہ اس کے اندر وہ پونجی خوب محفوظ رہے۔

رات کو ایک بج گیا تھا، منگل کا رونا سُن کر مہتا چونک پڑے۔ سوچا بیچاری مالتی آدھی رات تک تو جاگتی رہی ہوگی، اس وقت اُسے اُٹھنے میں کتنی تکلیف ہوگی، بس اگر دروازہ کھلا ہو تو میں خود ہی بچے کو چپ کرا دوں۔ وہ فوراً اُٹھ کر اس کمرے کے دروازے پر گئے۔ اور شیشے سے اندر جھانکا، مالتی بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی اور بچہ یوں ہی رو رہا تھا۔ شاید اس نے خواب دیکھا تھا، یا کسی اور وجہ سے ڈر گیا تھا۔ مالتی پچکارتی تھی، تھپکتی تھی، تصویریں دکھاتی تھی، گود میں لے کر ٹہلتی تھی، مگر بچہ چپ نہ ہوتا تھا۔ مالتی کی یہ بے حد محبت اور لازوال مادریت دیکھ کر اُن کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ دل میں ایسی گدگدی اُٹھی کہ اندر جا کر مالتی کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیں۔ دل سے محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ کا ایک ہجوم نکل پڑا۔ "پیاری، میرے بہشت کی دیوی، میری رانی۔۔۔"

اور اسی مجنونانہ محبت میں وہ پکار اُٹھے "مالتی ذرا دروازہ کھول دو۔"

مالتی نے آکر دروازہ کھولا اور اُن کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

مہتا نے پوچھا "کیا جھنیا نہیں اُٹھی؟ یہ تو بہت رو رہا ہے؟"

مالتی نے تکلیف کے لہجے میں کہا "آج آٹھواں دن ہے درد زیادہ ہوگا۔ اسی سے۔"

"تو لاؤ میں کچھ دیر ٹہلا دوں، تم تھک گئی ہوگی۔"

مالتی نے مسکرا کر کہا "تمہیں ذرا ہی دیر میں غصہ آجائے گا۔"

بات سچ تھی، مگر اپنی کمزوری کون تسلیم کرتا ہے؟ مہتا نے ضد سے کہا "تم نے

مجھے اتنا ڈبک سمجھ رکھا ہے؟"

مالتی نے بچّے کو ان کی گود میں دے دیا۔ اُن کی گود میں جاتے ہی وہ یک دم چُپ ہو گیا۔ بچّوں میں جو ایک فطری سمجھ ہوتی ہے اُسی نے اُس کو بتا دیا کہ رونے میں اب تمہارا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ نیا آدمی عورت نہیں بلکہ مرد ہے اور مرد غصّہ ور ہوتا ہے۔ اور بے رحم بھی ہوتا ہے۔ اور چارپائی پر لٹا کر اور باہر اندھیرے میں ڈال کر وہ دور بھی چلا جا سکتا ہے اور کسی کو پاس آنے بھی نہ دے گا۔

مہتا نے فخریہ کہا "دیکھا، کیسا چُپ کر دیا"

مالتی نے مذاق کیا "ہاں تم اس فن میں بھی طاق ہو۔ کہاں سیکھا؟"

"تم سے"

"میں عورت ہوں اور مجھ پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا"

مہتا نے شرم سے کہا "مالتی، میں تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ اب میری اُن باتوں کو بھول جاؤ۔ اِن کئی مہینوں میں کتنا پچھتایا ہوں، کتنا نادم و ملول ہوا ہوں، اس کا اندازہ شاید تم نہ کر سکو گی"

مالتی نے سادگی سے کہا "میں تو بھول گئی، سچ کہتی ہوں"

"مجھے کیسے یقین آئے؟"

"اس کا ثبوت یہی ہے کہ ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں، ایک ہی ساتھ کھاتے ہیں، ہنستے ہیں، بولتے ہیں"

"کیا مجھے کچھ مانگنے کی اجازت نہ دو گی؟"

انھوں نے منگل کو چارپائی پر لٹا دیا جہاں وہ مسکرا کر سو رہا اور مالتی کی طرف التجا آمیز نگاہوں سے دیکھا گویا اُسی اجازت پر اُن کا جینا مرنا منحصر ہو۔

مالتی نے متاثر ہو کر کہا "تم جانتے ہو کہ تم سے زیادہ قریبی دنیا میں میرا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ میں نے بہت دن ہوئے کہ خود کو تمہارے چرنوں کی بھینٹ کر دیا ہے۔ تم میرے رہنما ہو، میرے دیوتا ہو، میرے اُستاد ہو، تمہیں مجھ سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں، صرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ جب تک مجھے تمہارے درشن نہ ہوئے تھے اور میں نے تمہیں پہچانا نہ تھا اُس وقت تک عیش اور خود پروری ہی میری زندگی کا مقصد تھا۔ تم نے آکر اُسے تحریک دی، پائداری دی۔ میں تمہارا احسان کبھی بھول نہیں سکتی۔ میں نے ندی کے کنارے والی تمہاری باتیں گرہ کر لیں۔ رنج یہی ہوا کہ تم نے بھی مجھے وہی سمجھا جو دوسرا مرد سمجھتا اور جس کی اُمید مجھے تم سے نہ تھی۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے، یہ میں جانتی ہوں۔ مگر میں تمہاری گرانبہا محبت پا کر بھی وہی بنی رہوں گی، ایسا سمجھ کر تم نے میرے ساتھ بے انصافی کی۔ میں اس وقت کتنے غرور کا احساس کر رہی ہوں، یہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ تمہارا عشق اور اعتماد پا کر اب میرے لئے کچھ باقی نہیں رہا۔ یہ برکت میری زندگی بامعنی بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ یہی میری تکمیل ہے۔"

یہ کہتے ہوئے مالتی کے دل میں ایسی رغبت پیدا ہوئی کہ مہتا کے سینے سے لپٹ جائے۔ اندر کی خواہشیں باہر آکر گویا سچ ہو گئی تھیں۔ اُس کا رواں رواں پھول اُٹھا۔ جس سرور کو اُس نے نایاب سمجھ رکھا تھا وہ اتنا قابلِ حصول اور اتنا قریب ہے! اور دل کا وہ سرور چہرے پر آکر اُسے ایسی رونق دینے لگا کہ مہتا کو اُس میں دیوتا پن کی سی جھلک دکھائی پڑی۔ یہ عورت ہے یا خیر اور پاکیزگی اور ایثار کی مجسم صورت!

اُسی وقت جھنیا جاگ کر اُٹھ بیٹھی اور مہتا اپنے کمرے میں چلے گئے اور پھر دو ہفتے تک مالتی سے کچھ بات چیت کرنے کا موقع اُنہیں نہ ملا۔ مالتی کبھی اُن سے

تنہائی میں نہ ملتی۔ مالتی کے وہ الفاظ اُن کے دل میں گونجتے رہتے۔ اُن میں کتنی تشفی تھی، کتنی عاجزی تھی، کتنا نشہ تھا۔

دو ہفتے میں منگل اچھا ہو گیا۔ البتہ مُنہ پر کے داغ نہ بھر سکے۔ اُس دن مالتی نے پڑوس کے لڑکوں کو خوب مٹھائی کھلائی اور جو منتیں کر رکھی تھیں وہ بھی پوری کیں۔ قربانی کی زندگی میں کتنی خوشی ہے۔ اس کا اب اُسے تجربہ ہو رہا تھا۔ جھنیا اور گوبر کی خوشی گویا اُس کے دل میں منعکس ہو رہی تھی۔ دوسروں کی تکلیف دور کرنے میں اُس نے جو خوشی محسوس کی وہ کبھی عیش و آرام کی زندگی میں نہ ملی تھی۔ وہ ہوس اب اُن پھولوں کی طرح کمزور ہو گئی تھی جن میں پھل لگ رہے ہوں۔ اب وہ اُس درجے سے آگے نکل چکی تھی جب انسان مادّی خوشی کو اصلی خوشی سمجھتا ہے۔ وہ خوشی اب اُسے ہیچ اور پستی کی طرف لے جانے والی، اور ہلکی بلکہ بھیانک سی لگتی تھی۔ اُس بڑے بنگلے میں رہنے کا لطف جب اُس کے آس پاس مٹی کے جھونپڑے گویا فریاد کر رہے ہوں، موٹر پر چڑھ کر اب اُسے فخر نہیں ہوتا تھا۔ منگل جیسے نادان بچّے نے اُس کی زندگی کو منور کر دیا تھا۔ اُس کے لئے حقیقی خوشی کا دروازہ سا کھول دیا تھا!۔

ایک روز مہتا کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے پلنگ پر پڑے تڑپ رہے تھے کہ مالتی نے آکر ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا "یہ درد کب سے ہو رہا ہے؟"

مہتا کو ایسا معلوم ہوا گویا اُن نرم و نازک ہاتھوں نے سارا درد کھینچ لیا اُٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے "درد تو دوپہر ہی سے ہو رہا تھا اور ایسا درد مجھے آج تک نہیں ہوا تھا، مگر تمہارے ہاتھ رکھتے ہی سر ایسا ہلکا ہو گیا ہے گویا درد تھا ہی نہیں تمہارے ہاتھوں میں شفا ہے!"

مالتی نے انہیں کوئی دوا لاکر کھانے کو دے دی اور آرام سے لیٹے رہنے کی تاکید کر کے فوراً ہی کمرے سے نکل جانے کو ہوئی کہ مہتا نے اصرار سے کہا "دو منٹ بیٹھو گی نہیں ؟"

مالتی نے دروازے پر سے مُڑ کر کہا "اس وقت باتیں کرو گے تو شاید پھر درد ہونے لگے۔ آرام سے لیٹے رہو۔ آج کل میں تمہیں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پڑھتے یا لکھتے دیکھتی ہوں۔ دو چار دن پڑھنا لکھنا بند کر دو"

"تم ایک منٹ بیٹھو گی نہیں ؟"

"مجھے ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے"

"اچھی بات ہے جاؤ"

مہتا کے چہرے پر کچھ ایسی اُداسی چھا گئی کہ مالتی لوٹ پڑی اور سامنے آکر بولی۔ اچھا کہو، کیا کہتے ہو ؟"

مہتا نے بے دلی سے کہا "کوئی خاص بات نہیں۔ یہی کہہ رہا تھا کہ اتنی رات گئے کس مریض کو دیکھنے جاؤ گی ؟"

"وہی رائے صاحب کی لڑکی ہے۔ اُس کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی مگر اب کچھ سنبھل گئی ہے"

اس کے جاتے ہی مہتا پھر لیٹ رہے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ مالتی کے ہاتھ رکھتے ہی درد کیوں رفع ہو گیا۔ ضرور اس میں کوئی عجیب طاقت ہے اور یہ اُس کی ریاضت اس کی علمی انسانیت ہی کی برکت ہے۔ مالتی نسائیت کے اُس بلند معیار پر پہنچ گئی تھی جہاں وہ نور کے ایک ستارے کی طرح روشن نظر آتی تھی۔ اب وہ عشق کی چیز نہیں، عقیدت کی چیز تھی۔ اب وہ نایاب ہو گئی تھی اور ایسا ہونا فہم و فراست والوں کے لئے سعی و کوشش کرنے کا ایک منتر ہے۔

مہتا عشق میں جس خوشی کا تصور کر رہے تھے اُسے عقیدت نے اور بھی گہرائی اور جانداری دے دی تھی۔ عشق میں کچھ گھمنڈ بھی ہوتا ہے اور کچھ لگاؤ بھی، مگر عقیدت تو خود کو فنا کر دیتی ہے اور اپنی اس فنا ہی کو اپنا اعلیٰ مقصد بنا لیتی ہے۔ عشق اقتدار جانا چاہتا ہے، جو کچھ دیتا ہے اُس کے عوض میں کچھ چاہتا بھی ہے، مگر عقیدت کی انتہائی خوشی رنجی قربانی میں ہے جس میں خودی کا فقدان ہو جاتا ہے!۔

مہتا کی وہ بڑی کتاب ختم ہو گئی تھی جسے وہ تین سال سے لکھ رہے تھے اور جس میں اُنہوں نے دنیا کی سبھی فلسفیانہ اجزا کو شامل کیا تھا۔ یہ کتاب اُنہوں نے مالتی کے نام معنون کی اور جس دن اُس کی جلدیں انگلستان سے آئیں اور اُنہوں نے ایک جلد مالتی کی نذر کی تو وہ اُسے اِس طرح معنون دیکھ کر متعجب بھی ہوئی اور مغموم بھی۔

اُس نے کہا "یہ تم نے کیا کیا؟ میں تو اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتی۔"

مہتا نے فخریہ کہا "مگر میں تو سمجھتا ہوں۔ یہ تو کوئی چیز نہیں۔ مجھ میں تو اگر سو جانیں ہوتیں تو وہ سب تمہارے قدموں پر نثار کر دیتا!"

مجھ پر؟ جس نے خود غرضی کے سوا کچھ اور جانا ہی نہیں۔"

"تمہارے تیاگ کا ایک ٹکڑا بھی میں پا جاتا تو خود کو خوش نصیب سمجھتا تم دیوی ہو۔"

"پتھر کی، اتنا اور کیوں نہیں کہتے؟"

"قربانی کی، راحت کی، پاکیزگی کی!"

"تب تم نے مجھے خوب سمجھا۔ میں اور تیاگ! میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ سیوا یا تیاگ کا خیال میرے دل میں کبھی نہیں آیا۔ میں جو کچھ کرتی ہوں وہ پوشیدہ یا علانیہ غرض کے لئے کرتی ہوں۔ میں گاتی اس لئے نہیں کہ تیاگ کرتی ہوں یا اپنے

گیتوں سے غمزدوں کو تسکین دیتی ہوں، بلکہ صرف اس لئے کہ اُس سے میرا دل خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح دوا بھی غریبوں کو دے دیتی ہوں، صرف اپنے دل کو خوش کرنے کے لئے۔ شاید دل کی خودی اس میں خوشی محسوس کرتی ہے۔ تم مجھے خواہ مخواہ دیوی بنائے ڈالتے ہو۔ اب تو اتنی ہی کسر رہ گئی ہے کہ آرتی اور چڑھاوا وغیرہ لے کر میری پوجا کرو۔"

مہتا بولے "وہ تو میں برسوں سے کر رہا ہوں مالتی! اور اُس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک بردان نہ مل جائے گا۔"

مالتی نے چٹکی لی "تو بردان پا جانے کے بعد شاید دیوی کو مندر سے نکال پھینکو۔"

مہتا نے سنبھل کر کہا "تب تو میری جداگانہ ہستی ہی نہ رہے گی۔ عابد معبود میں جذب ہو جائے گا۔"

مالتی نے سنجیدگی سے کہا "نہیں مہتا! میں مہینوں سے اس مسئلے پر غور کر رہی ہوں اور آخر میں میں نے یہ طے کیا ہے کہ دوست بن کر رہنا زن و شوہر بن کر رہنے سے کہیں زیادہ آرام دہ ہے۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھ پر اعتبار کرتے ہو، اور مجھے بھروسہ ہے کہ آج موقع آ پڑے تو تم اپنی جان دے کر بھی میری حفاظت کرو گے۔ تم میں میں نے اپنا ہادی ہی نہیں بلکہ اپنا محافظ بھی پایا ہے۔ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں اور تم پر اعتبار کرتی ہوں اور تمہارے لئے کوئی ایسی قربانی نہیں جو میں نہ کر سکوں۔ ایشور سے میری یہی بنتی ہے کہ وہ زندگی بھر مجھے اسی راہ پر قائم رکھے۔ ہماری تکمیل کے لئے، ہمارے روحانی ارتقاء کے لئے اور کیا چاہئے؟ اپنی چھوٹی سی گرہستی بنا کر، اپنی روحوں کو چھوٹے سے پنجرے میں بند کر کے، اپنے سُکھ دکھ کو اپنے ہی تک رکھ کر کیا ہم لامحدود کے قریب تک پہنچ سکتے ہیں؟

ویسا کرنا تو ہماری راہ میں رُکاوٹ ہی ڈالے گا۔ معدودے چند آدمی ایسے بھی ہیں جو پیروں میں بیڑیاں ڈال کر بھی ارتقائی راستے پر چل سکتے ہیں اور چل رہے ہیں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ تکمیل کے لئے اُس محبّت اور ترکِ ایثار میں بڑی اہمیت ہے جو کنبے کے لئے کئے جاتے ہیں، لیکن میں اپنے دل کو اتنا مضبوط و مستقل نہیں پاتی۔ جب تک محبت نہیں ہے، خودی نہیں ہے، اُس وقت تک زندگی کا لالچ نہیں ہے، خود غرضی کا زور نہیں ہے۔ جس روز دل لالچ میں پڑا اور ہمارے لئے بندش تیار ہوئی۔ اُسی وقت ہماری انسانیت کا دائرہ محدود ہو جائے گا۔ نئی نئی ذمہ داریاں پیدا ہوں گی اور ہماری ساری طاقت اُن ہی کے پورا کرنے میں لگنا شروع ہو جائے گی۔ تم جیسے طبّاع و دانشمند انسان کی روح کو میں اس قید میں بند نہیں کرنا چاہتی۔ ابھی تک تمہاری زندگی ایک یگانیت تھی جس میں خود غرضی کے لئے بہت کم گنجائش تھی۔ میں اُسی کو پستی کی طرف نہ لے جاؤں گی۔ دُنیا کو تم جیسے مرتاضوں کی ضرورت ہے جو اپنے دل کو اتنا وسیع بنا دیں کہ ساری دُنیا اُن کی اپنی ہو جائے۔ دُنیا میں بے انصافی کی، ظلم کی اور خوف کی دُہائی مچی ہوئی ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا، مذہبی مکّاری کا، اور خود غرضی کا دَور دَورہ ہے۔ تم نے وہ پکار سُنی ہے۔ تم بھی نہ سُنو گے تو سُننے والے آئیں گے کہاں سے؟ دوسرے ظاہری انسانوں کی طرح تم بھی اُس کی طرف سے اپنے کان نہیں بند کر سکتے۔ تمہیں ویسی زندگی ہی وبال ہو جائے گی۔ اپنے علم اور اپنی عقل کو، اپنی بیدار انسانیت کو زیادہ حوصلہ اور زور کے ساتھ اُسی راستے پر لے جاؤ۔ میں بھی تمہارے پیچھے پیچھے چلوں گی۔ اپنی زندگی کے ساتھ میری زندگی بھی سپھل کر دو۔ تم سے میرا یہی کہنا ہے۔ اگر تمہارا دل دنیوی عیش کی طرف دوڑتا ہے، اب بھی میں اپنا بس چلتے تمہیں اُدھر سے ہٹاؤں گی اور ایشور نہ کرے کہ مجھے اپنے اس ارادے میں ناکامیاب ہونا پڑے، لیکن اس حالت

میں میں دو بوند آنسو گرا کر تمہارا ساتھ چھوڑ دوں گی۔ اور کہہ نہیں سکتی کہ پھر میرا کیا انجام ہوگا، میں کس گھاٹ لگوں گی۔ مگر چاہے وہ کوئی گھاٹ ہو پھر بھی اس غم نیوی بندش کا گھاٹ نہ ہوگا بولو، مجھے کیا حکم دیتے ہو؟"

مہتا سر جھکائے سنتے رہے۔ ایک ایک لفظ گویا اُن کے دل کی آنکھیں اس طرح کھولے دیتا تھا جیسے اب تک کبھی نہ کھلی تھیں۔ وہ خیالات جواب تک اُنکے سامنے خواب کی تصویروں کی طرح آتے تھے اب زندگی کی سچائیوں سے معمور ہو کر متحرک ہو رہے تھے۔ وہ اپنے رونگٹے رونگٹے میں روشنی اور ترقی کا احساس کر رہے تھے۔ زندگی کے بھٹکے راہوں کے سامنے ہمارا بچپن ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ مہتا کی آنکھوں میں بھی میٹھی یادوں والا بچپن پھر گیا جب وہ اپنی بیوہ ماں کی گود میں بیٹھ کر بہت بڑے سکھ کا احساس کیا کرتے تھے۔ کہاں ہے وہ ماں؟ آئے اور دیکھے اپنے کی اس شہرت و نیکنامی کو! مجھے دُعا دو، تمہارا وہ ہٹی لڑکا آج ایک نیا جنم لے رہا ہے!۔

اُنھوں نے مالتی کے پیر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیے اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے "تمہارا حکم منظور ہے، مالتی!"

اور دونوں ایک سے دل والے ہو کر باہم بغلگیر ہو گئے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

(۳۴)

سلیا کا لڑکا اب دو سال کا ہو رہا تھا اور سارے گاؤں کی دوڑ لگا جاتا تھا۔ اپنے ساتھ ایک عجیب بولی لایا تھا اور اُسی میں بولتا تھا، خواہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔ اُس کی بولی میں ٹ، ل اور گھ کی کثرت تھی اور س، ر وغیرہ غائب تھے۔ اُس بولی

میں روٹی کا نام اوٹی، دودھ کا توت، ساگ کا چھلگ اور گوڑی کا تولی۔ جانوروں کی بولیوں کی ایسی نقل کرتا ہے کہ ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتا ہے۔ کسی نے پوچھا "رامو، کتا کیسے بولتا ہے؟" تو رامو سنجیدگی سے کہتا "بھوں بھوں" اور کاٹنے دوڑتا۔ بلی کیسے بولے؟ اور رامو "میاؤں میاؤں" کہہ کے آنکھیں نکال کر تا کیا اور پنجوں سے نوچتا۔ بڑا مست لڑکا تھا۔ جب دیکھو کھیلنے میں مگن ہے، نہ کھانے پینے کی سدھ نہ تھی۔ گود سے اسے چڑھ تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوشی کے لمحے وہ ہوتے جب وہ دروازے پر نیم کے نیچے منوں دھول اکٹھا کر کے اس میں لوٹتا، اسے سر پر چڑھاتا، اس کی ڈھیریاں لگاتا، اس کے گھروندے بناتا۔ اپنے ہم عمروں سے اس کی ایک لمحہ بھی نہ بنتی۔ وہ شاید ان کو اپنے ساتھ کھیلنے کے قابل ہی نہ سمجھتا تھا۔

کوئی پوچھتا "تمہارا کیا نام ہے؟"

فوراً کہتا "لامو"۔

"تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟"

"ماتا دین"

"اور تمہاری ماں کا؟"

"چھلیا"

"اور ماتا دین کون ہے؟"

"وہ اماں کا چھالا ہے!"

نہ جانے کس نے ماتا دین سے اس کا یہ رشتہ بتادیا تھا۔

رامو اور رو پا میں خوب گھٹتی تھی۔ وہ روپا کا کھلونا تھا۔ اسے ڈبٹن ملتی، کاجل لگاتی، نہلاتی، بال سنوارتی اور اپنے ہاتھوں ننھے بنا بنا کر کھلاتی اور کبھی کبھی اسے

گود میں لئے رات کو سو بھی جاتی۔ دھنیا ڈانٹتی کہ تو سب چھوا چھوت کئے دیتی ہے۔ مگر وہ کسی کی نہ سنتی۔ چیتھڑے کی گڑیوں نے اُسے ماں بننا سکھا دیا تھا۔ وہ باؤرا نہ جانے، جیتا جاگتا بچہ پا کر اب گڑیوں سے مطمئن نہ ہو سکتا تھا۔

ہوری کے گھر کے پچھواڑے جس مکان میں کسی وقت اُس کے بیل بندھتے تھے اُسی کے کھنڈر میں سلیا اپنا ایک پھوس کا جھونپڑا ڈال کر رہنے لگی تھی۔ ہوری کے گھر میں عمر تو نہیں کٹ سکتی تھی۔

ماتادین کو کئی سو روپئے خرچ کرنے کے بعد آخر میں کاشی کے پنڈتوں نے پھر برہمن بنا دیا تھا۔ اُس روز بڑا بھاری ہوم ہوا۔ بہت سے برہمنوں نے کھانا کھایا اور بہت سے منتر اور اشلوک پڑھے گئے۔ ماتادین کو شدھ گوبر اور گئو موتر کھانا پینا پڑا۔ گوبر سے اُس کا دل پاک ہو گیا، اور گئو موتر سے اُس کی روح کے ناپاک جراثیم ہلاک ہو گئے۔

لیکن ایک طرح سے اس پرایشچت نے اُسے سچ مچ پوتر کر دیا۔ ہوم کے جلتے ہوئے کنڈ میں اُس کی بشریت نکھر گئی۔ اور ہوم کے شعلوں کی روشنی میں اُس نے مذہبی ارکان کو اچھی طرح پرکھ لیا۔ اُس دن سے اُسے دھرم کے نام سے چڑھ ہو گئی۔ اُس نے جنیو اُتار کر پھینک دیا اور پروہتی کو گنگا میں ڈبو دیا۔ اب وہ پکا کسان تھا۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ اگرچہ علماء نے اُس کا برہمن ہونا تسلیم کر لیا۔ لیکن لوگ اب بھی اُس کے ہاتھ کا پانی نہیں پیتے۔ اُس سے مہورت پوچھتے ہیں، ساعت اور لگن کا بچار کراتے ہیں، اُسے تیوہار کے موقعوں پر دان دکشنا دیتے ہیں مگر اپنے برتن نہیں چھونے دیتے۔

جس دن سلیا کے بچہ پیدا ہوا اُس نے دگنی مقدار میں بھنگ پی اور گھمنڈ جیسے اُس کا سینہ تن گیا اور انگلیاں بار بار مونچھوں پر پڑنے لگیں۔ بچہ کیسا

ہوگا؟ اُس کا سا؟ کیسے دیکھیں؟ اُس کا دل مسوس کر رہ گیا۔

تیسرے دن رُوپا کھیت میں اُس سے ملی تو اُس نے پوچھا "رُوپا تو نے سِلیا کا لڑکا دیکھا ہے؟"

رُوپا بولی "دیکھا کیوں نہیں؟ لال لال ہے، خوب موٹا۔ بڑی بڑی آنکھیں ہیں، سر میں جھبرالے بال ہیں، ٹکر ٹکر تاکتا ہے!"

ماتادین کے دل میں جیسے وہ لڑکا آ بیٹھا تھا اور ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں نشہ سا چھا گیا۔ اُس نے اُس بچّے کو گود میں اُٹھا لیا، پھر کندھے پر بٹھا لیا اور پھر کندھے سے اُتار کر اُس کے گالوں کو چوم لیا۔

رُوپا بال [illegible] ہنس کر بولی "میں تم کو دور سے دکھا دوں۔ دالان ہی میں تو ہے۔ سِلیا بہن نہ جانے کیوں ہر دم روتی رہتی ہے۔"

ماتادین نے مُنہ پھیر لیا۔ اُس کی آنکھیں پُرنم ہوگئی تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

اُس رات کو جب سارا گاؤں سو گیا اور پیڑ تاریکی میں سما گئے تو وہ سِلیا کے دروازے پر آیا اور پوری توجّہ سے بچّے کا رونا سُنا جس میں ساری دُنیا کی موسیقیت، مسرّت اور حلاوت بھری ہوئی تھی۔

سِلیا بچّے کو ہوری کے مکان میں کھٹولے پر سُلا کر مزدوری کرنے چلی جاتی تو ماتادین کسی نہ کسی بہانہ سے ہوری کے گھر آتا اور کنکھیوں سے بچّے کو دیکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتا۔

دھنیا مسکرا کر کہتی "لجاتے کیوں ہو؟ گود میں لے لو، پیار کرو۔ کیسا کاٹھ کا کلیجہ ہے تمہارا؟ بالکل تم پر پڑا ہے!"

ماتادین دو ایک روپئے سِلیا کے لئے پھینک کر باہر نکل آتا۔ بچّے کے ساتھ

اس کی روح میں بھی بالیدگی، شگفتگی اور چمک آرہی تھی۔ اب اس کی زندگی کا بھی ایک ہی مقصد تھا، ایک ہی عہد تھا اس میں باقاعدگی آگئی، سنجیدگی آگئی، خدمت داری آگئی!۔

ایک دن رامو کھٹولے پر لیٹا ہوا تھا۔ دھنیا کہیں گئی تھی۔ روپا بھی لڑکوں کا شور و غل سن کر کھیلنے چلی گئی تھی۔ گھر سونا تھا۔ اسی وقت ماتا دین پہنچا۔ بچہ نیلے آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ پاؤں پھینک رہا تھا ہمک رہا تھا۔ زندگی کی اس خوشی کے ساتھ جو ابھی اس میں تازہ تھی۔ ماتا دین کو دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔ ماتا دین محبت سے بے چین ہو گیا۔ اس نے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اس کا دل اور سارا بدن خوشی سے کانپ اٹھا، گویا پانی کی لہروں میں نور کی شعاعیں کانپ رہی ہوں۔ بچہ کی گہری، صاف، اتھاہ خوشی بھری آنکھوں میں گویا اس کی زندگی کی سچائی مل گئی۔ اسے ایک طرح کا ڈر سا لگا گویا وہ نگاہیں اس کے دل میں گھسی جاتی ہوں، وہ کتنا ناپاک ہے! الشور کی اس دین کو کیسے چھو سکتا ہے؟ اسنے بچے کو خوف بھرے دل کے ساتھ پھر لٹا دیا۔ اسی وقت روپا باہر سے آگئی اور وہ باہر نکل گیا۔

ایک دن خوب اولے پڑے۔ سلیا گھاس لے کر بازار گئی ہوئی تھی اور روپا اپنے کھیل میں مگن تھی۔ رامو نے آنگن میں بنولے بچھے دیکھے تو سمجھا کہ بتاشے بچھے ہوئے ہیں۔ کئی بنولے اٹھا کر کھائے اور آنگن میں خوب کھیلا۔ رات کو اسے بخار آگیا اور دوسرے دن نمونیا ہو گیا اور تیسرے دن شام کو سلیا کی گود میں بچے کی روح پرواز کر گئی۔

لیکن بچہ مر کر بھی سلیا کی زندگی کا مرکز بنا رہا۔ اس کے سینے میں دودھ کا ابال سا آتا اور آنچل تر ہو جاتا۔ اسی وقت آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو جاتے۔

پہلے سب کاموں سے فراغت پاکر رات کو جب وہ رامو کو سینے سے لگا کر اُس کے مُنہ میں دودھ ڈالتی تو گویا اُس کا دل بچّے کی تازگی سے بھر جاتا۔ تب وہ پیارے پیارے گیت گاتی اور میٹھے میٹھے سپنے دیکھتی۔ اور نئی نئی دنیا بناتی جس کا راجا رامو ہوتا۔ اب سب کاموں سے فرصت پاکر وہ اپنی سونی جھونپڑی میں روتی، اور اُس کی روح تڑپتی رہتی تھی۔ اُڑ جانے کے لئے اُس لوک میں جہاں اُس کی گودی کا لال اس وقت بھی کھیل رہا ہوگا! اُس کے غم میں کُل گاؤں شریک تھا۔ رامو کتنا چُلبلا تھا، جو کوئی بُلاتا اُسی کی گود میں چلا جاتا۔ مر کر اور پہنچ سے باہر ہو کر وہ اب اور بھی عزیز ہو گیا تھا۔ اُس کا عکس اُس سے کہیں زیادہ شرارتی، چُلبلا اور لُبھاونا تھا!۔

ماتادین اُس دن کھُل پڑا۔ پردہ ہوتا ہے ہوا کے لئے۔ آندھی میں پردے اُٹھا کر دھر دیئے جاتے ہیں کہ آندھی کے ساتھ اُڑ نہ جائیں۔ اُس نے لاش کو دونوں ہتھیلیوں پر اُٹھا لیا اور تنہا ندی کے کنارے تک لے گیا جو ایک میل کا پاٹ چھوڑ کر ایک پتلی سی دھار میں سما گئی تھی۔ آٹھ روز تک اُس کے ہاتھ سیدھے نہ ہوسکے۔ اُس دن وہ ذرا بھی نہ شرمایا، ذرا بھی نہ جھجکا۔

اور کسی نے کچھ کہا بھی نہیں، بلکہ سب نے اُس کی ہمت اور استقلال کی تعریف کی۔

ہوری نے کہا "یہی مرد کا دھرم ہے۔ جس کی بانہہ پکڑی اُسے کیسا چھوڑنا!"

دھنیا نے آنکھیں نچا کر کہا "مت بکھان کرو، جی جلتا ہے۔ وہ مرد ہے؟ میں تو ایسے مرد کو نامرد کہتی ہوں۔ جب بانہہ پکڑی تھی تب کیا دودھ پیتا تھا کہ سلیا باہمنی ہو گئی تھی؟"

ایک مہینہ بیت گیا۔ سلیا پھر مزدوری کرنے لگی تھی۔ شام ہو گئی تھی۔ پورنماسی کا چاند ہنستا ہوا سا نکل آیا تھا۔ سلیا نے کٹے ہوئے کھیت میں سے گرے ہوئے جو کے خوشے چن کر ٹوکری میں رکھ لئے تھے اور گھر جانا چاہتی تھی کہ چاند پر نظر پڑ گئی اور درد بھری یاد کا جیسے سوتا سا کھل گیا۔ آنچل دودھ سے بھیگ گیا اور چہرہ آنسوؤں سے۔ اس نے سر جھکا لیا اور گویا رونے کا لطف اٹھانے لگی۔

دفعتاً کسی کی آہٹ پا کر چونک پڑی۔ ماتا دین پیچھے سے آ کر سامنے کھڑا ہو گیا اور بولا "کب تک روئے جائے گی سلیا؟ رونے سے وہ پھر تو نہ آ جائے گا۔"

اور یہ کہتے کہتے وہ خود رو پڑا۔

سلیا کے منہ میں آئے ہوئے شکوے کے الفاظ پگھل گئے۔ آواز سنبھال کر بولی "تم آج ادھر کیسے آ گئے؟"

ماتا دین نے رنجیدہ ہو کر کہا "ادھر سے جا رہا تھا، تجھے بیٹھے دیکھا تو چلا آیا۔"

"تم تو اسے کھلا بھی نہ پائے"

"نہیں سلیا، ایک دن کھلا آیا تھا۔"

"سچ؟"

"سچ!"

"میں کہاں تھی؟"

"تو بازار گئی تھی!"

"تمہاری گود میں رویا نہیں؟"

"نہیں سلیا، ہنستا تھا!"

"سچ؟"

"سچ!"

"بس ایک ہی دن کھلایا؟"

"ہاں، ایک ہی دن۔ مگر وہ دیکھنے نت آتا تھا۔ اُسے کھٹولے پر کھیلتے دیکھتا تھا اور دل تھام کر چلا جاتا تھا!"

"تم ہی پر پڑا تھا!"

"مجھے تو پچھتاوا ہوتا ہے کہ ناحق اُس دن اُسے گود میں لیا۔ یہ میرے پاپوں کا ڈنڈ ہے!"

سلیا کی آنکھوں میں عفو جھلک رہا تھا۔ اُس نے ٹوکری سر پر رکھ لی۔ اور گھر چلی۔ ماتا دین بھی اُس کے ساتھ ساتھ چلا۔

سلیا نے کہا "میں تو اب دھنیا کاکی کے بردوٹھے میں سوتی ہوں۔ اپنے گھر میں اچھا نہیں لگتا!"

"دھنیا مجھے برابر سمجھاتی رہتی تھی!"

"سچ؟"

"ہاں، سچ! جب ملتی تھی سمجھانے لگتی تھی!"

گاؤں کے قریب جاکر سلیا نے کہا "اچھا، اب ادھر سے اپنے گھر چلے جاؤ۔ کہیں پنڈت دیکھ نہ لیں!"

ماتا دین نے گردن اُٹھا کر کہا "میں اب کسی سے نہیں ڈرتا!"

"گھر سے نکال دیں گے تو کہاں جاؤ گے؟"

"میں نے اپنا گھر بنا لیا ہے!"

"سچ؟"

"ہاں، سچ!"

"کہاں؟ میں نے تو نہیں دیکھا۔"

"چل تو، دکھاتا ہوں۔"

دونوں اور آگے بڑھے۔ ماتادین آگے تھا اور سلیا پیچھے۔ بھوری کا گھر آگیا۔ ماتادین اُسی کے پچھواڑے جاکر سلیا کی جھونپڑی کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور بولا "یہی میرا گھر ہے!"

سلیا نے بے اعتباری، عفو، طنز اور درد سے بھرے لہجے میں کہا "یہ تو سلیا چمارن کا گھر ہے۔"

ماتادین نے دروازے کی ٹٹّی کھولتے ہوئے کہا "یہ میری دیوی کا مندر ہے۔"

سلیا کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ بولی "مندر ہے تو ایک لوٹا پانی اُنڈیل کر چلے جاؤ گے۔"

ماتادین نے اُس کے سر کی ٹوکری اُتارتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "نہیں سلیا، جب تک جان ہے تیری شرن میں رہوں گا اور تیری ہی پوجا کروں گا۔"

"جھوٹ کہتے ہو۔"

"نہیں تیرے چرن چھو کر کہتا ہوں۔ سُنا کہ پٹواری کا لونڈا جھنیسری تیرے پیچھے بہت پڑا تھا۔ تو نے اُسے خوب ڈانٹا۔"

"تم سے کس نے کہا؟"

"جھنیسری آپ ہی کہتا تھا۔"

"سچ ؟"

"ہاں سچ!"

سلیما نے دیا سلائی سے کُپی جلائی۔ ایک طرف مٹی کا گھڑا تھا۔ اور دوسری طرف چولھا، جہاں دو تین پتیلی اور لوہے کے برتن صاف کئے ہوئے رکھے تھے۔ درمیان میں پوال بچھا ہوا تھا۔ وہی سلیما کا بستر تھا۔ اس بستر کے سرہانے رامو کا چھوٹا سا کھٹولا پڑا ہوا گویا رو رہا تھا اور اُسی کے پاس دو تین مٹی کے ہاتھی گھوڑے ٹوٹی ہوئی حالت میں پڑے تھے۔ جب مالک ہی نہ رہا تو کون اُن کی دیکھ بھال کرتا؟ ماتادین پوال پر بیٹھ گیا۔ دل میں ہوک سی اُٹھ رہی تھی جی چاہتا تھا کہ خوب روئے۔

سلیما نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "تمہیں کبھی میری یاد آتی تھی؟"

ماتادین نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا "تو ہر دم میری آنکھوں میں پھرتی رہتی تھی۔ تو بھی کبھی مجھے یاد کرتی تھی؟"

"میرا تو تم سے جی جلتا تھا!"

"اور دیا نہیں آتی تھی؟"

"کبھی نہیں!"

"تو بھٹیری ......"

"اچھا گالی مت دو۔ میں ڈر رہی ہوں کہ گاؤں والے کیا کہیں گے!"

"جو بھلے آدمی ہیں وہ کہیں گے کہ یہی اس کا دھرم تھا۔ جو بُرے ہیں اُن کی میں پرواہ نہیں کرتا۔"

"اور تمہارا کھانا کون پکائے گا؟"

"میری رانی سلیا!"

"تو براہمن کیسے رہو گے؟"

"میں براہمن نہیں، چمار ہی رہنا چاہتا ہوں۔ جو اپنا دھرم پالے وہی براہمن ہے، جو دھرم سے مُنہ موڑے وہی چمار ہے!"

سلیا نے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

(۳۵)

ہوری کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ زندگی کی جدوجہد میں اُسے ہمیشہ شکست ملی، مگر اُس نے کبھی ہمّت نہ ہاری۔ ہر شکست گویا اُسے قسمت سے لڑنے کی طاقت دے دیتی تھی۔ مگر اب وہ اُس آخری حالت میں پہنچ گیا تھا۔ جب اُس میں خود اعتمادی بھی نہ رہ گئی تھی۔ اگر وہ اپنے دھرم پر اٹل رہ سکتا تو بھی کچھ اشک شوئی ہو جاتی۔ مگر یہ بات نہ تھی، اُس نے نیّت بھی بگاڑی، ادھرم بھی کمایا، کوئی ایسی برائی نہ تھی جس میں وہ نہ پڑا ہو۔ پھر بھی زندگی کی کوئی خواہش پوری نہ ہوئی اور اچھے دن سراب کی طرح دور ہی ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ اب اُسے وہ دھوکا بھی نہ رہ گیا تھا، جھوٹی اُمید کی ہریالی اور چمک بھی اب نہ دکھائی دیتی تھی۔ ہارے ہوئے راجا کی طرح اُس نے خود کو اس تین بیگھے کھیت کے قلعے میں بند کر دیا تھا اور اُسے جان کی طرح بچا رہا تھا۔ فاقے کئے، بدنام ہوا، مزدوری کی، مگر قلعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مگر اب وہ قلعہ بھی قبضہ سے نکلا جاتا تھا۔ تین سال سے لگان باقی پڑا ہوا تھا اور اب پنڈت نوکھے رام نے اس پر بیدخلی دائر کر دی تھی۔ کہیں سے روپے ملنے کی اُمید نہ تھی۔ زمین اُس کے ہاتھ سے نکل جائے گی اور اس کی بقیہ زندگی مزدوری میں

کٹے گی۔ بھگوان کی اِچھا! رائے صاحب کو کیوں دوکھ دے۔ اسامیوں ہی سے تو اُن کا بھی گجر ہے۔ اسی گاؤں پر آدھے سے ادِھک گھروں پر بید کھلی آ رہی ہے، آوے۔ اوروں کو جو دسا ہوگی، وہی اُس کی بھی ہوگی۔ بھاگ میں سُکھ بدا ہوتا تو لڑکا کیوں ہاتھ سے بے ہاتھ ہو جاتا؟

شام ہو گئی تھی۔ وہ اِسی فکر میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا کہ پنڈت داتا دین نے آکر کہا "کیا ہوا ہوری تمہاری بید کھلی کا؟ اِن دنوں تو مجھے رام سے میری بول چال بند ہے۔ کچھ پتہ نہیں۔ سُنا ہے کہ تاریکھ سے پندرہ دن اور رہ گئے ہیں۔"

ہوری نے اُن کے لیے کھاٹ ڈال کر کہا "وہ مالک ہیں، جو چاہیں سو کریں۔ میرے پاس روپیہ ہوتا تو یہ دُرگت کیوں ہوتی؟ کھایا نہیں، اُڑایا نہیں، اُپج ہی نہ ہوا اور جو ہو بھی وہ کوڑی مول جائے تو کسان کیا کرے؟"

"پر دھرتی تو بچانا ہی پڑے گی۔ نباہ کیسے ہوگا؟ باپ دادوں کی اتنی ہی نشانی بچ رہی ہے۔ وہ نکل گئی تو کہاں رہو گے؟"

"بھگوان کی مرجی ہے، میرا کیا بس ہے؟"

"ایک اُپائے ہے جو تم کرو۔"

ہوری کو جیسے جان سی مل گئی۔ اُس کے پاؤں پڑ کر بولا "بڑا دھرم ہوگا مہاراج، تمہارے سوا میرا کون ہے؟ میں تو نراس ہو گیا تھا۔"

"نراس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ بس اتنا ہی سمجھ لو کہ سُکھ میں آدمی کا دھرم کچھ اور ہوتا ہے، دُکھ میں کچھ اور۔ سُکھ میں آدمی دان دیتا ہے پر دُکھ میں بھیک تک مانگتا ہے۔ تب آدمی کا یہی دھرم ہو جاتا ہے۔ چولا اچھا رہتا ہے تو ہم اسنان پوجا کیے بنا مُنہ میں پانی بھی نہیں ڈالتے، پر بیمار ہو جاتے ہیں تو بنا نہائے دھوئے، کپڑے پہنے اور کھاٹ پر بیٹھے ہوئے کھا لیتے ہیں۔ اُس سمے کا یہی

دھرم ہے۔ یہاں ہم میں تم میں کتنا پھرک ہے مگر جگناتھ پوری میں ایسی کوئی بات نہیں۔ اونچے نیچے سبھی ایک پنگت میں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ مجھے وفوں میں رام چندر جی نے سیوری کے جوٹھے بیر کھائے تھے اور بال کو چھپ کر مارا تھا۔ جب سنکٹ میں بڑے بڑے لوگوں کی مرجاد ٹوٹ جاتی ہے تو ہماری تمہاری کون چلاوے؟ رام سیوک مہتو کو تو جانتے ہو نا؟"

ہوری نے بیدلی سے کہا "ہاں، جانتا کیوں نہیں!"

"میرا ججمان ہے۔ بڑا اچھا جمانہ ہے اُس کا کھیتی باڑی الگ، لین دین الگ۔ ایسے رُعب داب کا آدمی ہی نہیں دیکھا۔ کئی مہینے ہوئے کہ اُس کی عورت مرگئی۔ اولاد کوئی نہیں ہے۔ اگر روپا کا بیاہ اُس سے کرنا چاہو تو میں اُسے راجی کرلوں گا۔ میری بات وہ کبھی نہ ٹالے گا۔ لڑکی سیانی ہوگئی ہے اور سمے بُرا ہے کہیں کوئی بات ہوجائے تو مُنہ میں کالکھ لگے۔ یہ بڑا اچھا موکا ہے۔ لڑکی کا بیاہ بھی ہوجائے گا اور تمہارے کھیت بھی بچ جائیں گے۔ بیاہ کے کھرچ سے بھی بچے جاتے ہو۔"

رام سیوک ہوری سے دو ہی چار برس چھوٹا تھا۔ ایسے آدمی سے روپا کے بیاہ کرنے کی تجویز ہی ہتک آمیز تھی، کہاں پھول سی روپا اور کہاں وہ بوڑھا ٹھوٹھ۔ زندگی میں ہوری نے بڑی بڑی چوٹیں سہی تھیں مگر یہ چوٹ سب سے گہری تھی آج اُس کے ایسے دن آگئے ہیں کہ اُس سے لڑکی بیچنے کی بات کہی جاتی ہے اور اُس میں انکار کرنے کی ہمت نہیں ہے! رنج سے اُس کا سر جھک گیا۔

داتا دین نے ایک منٹ کے بعد پوچھا "تو کیا کہتے ہو؟"

ہوری نے صاف جواب نہ دیا۔ بولا "سوچ کر کہوں گا!"

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟"

"دھنیا سے بھی تو پوچھ لوں۔"

"تم راضی ہو کہ نہیں؟"

"تنک سوچ لینے دو مہاراج۔ آج تک گھرانے میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اُس کی مریاد بھی تو رکھنی ہے۔"

"پانچ چھ دن کے اندر جواب دے دینا۔ ایسا نہ ہو کہ تم سوچتے ہی رہو اور بے دکھلی ہو جائے۔"

داتا دین چلے گئے۔ ہوری کی طرف سے اُنہیں کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اندیشہ تھا دھنیا کی طرف سے۔ اُس کی ناک بڑی لمبی ہے۔ چاہے آپ مٹ جائے، مریاد نہ چھوڑے گی۔ مگر ہوری ہاں کہہ لے تو وہ بھی رو دھو کر مان ہی جائے گی کھیتوں کے نکل جانے میں بھی تو مریاد بگڑتی ہے۔

دھنیا نے آ کر پوچھا "پنڈت کیوں آئے تھے؟"

"کچھ نہیں، یہی بے دکھلی کی بات چیت تھی۔"

"آنسو پونچھنے آئے ہوں گے، یہ تو نہ ہوگا کہ سو روپے اُدھار دے دیں۔"

"مانگنے کا مُنہ بھی تو نہیں ہے۔"

"تو یہاں آئے ہی کیوں تھے؟"

"رُوپا کی سگائی کی بات بھی تھی۔"

"کس سے؟"

"رام سیوک کو جانتی ہے؟ اُن ہی سے۔"

"میں نے اُنھیں کب دیکھا؟ ہاں نام بہت دن سے سُنتی ہوں۔ وہ تو بوڑھا ہوگا؟"

"بوڑھا نہیں ہے، ہاں ادھیڑ ہے۔"

"تم نے پنڈت کو پھٹکارا نہیں، مجھ سے کہتے تو ایسا جواب دیتی کہ یاد کرتے۔"

"پھٹکارا نہیں، مگر انکار کر دیا۔ کہتے تھے کہ بیاہ بھی بنا کھرچ کے ہو جائے گا اور کھیت بھی بچ جائیں گے۔"

"کھل کے کیوں نہیں کہتے کہ لڑکی بیچنے کو کہتے تھے۔ کیسے اس بوڑھے کی ہمت پڑی۔"

لیکن ہوری اس مسئلے پر جتنا ہی غور کرتا تھا اتنی ہی اس کی ہٹ کمزور ہوتی جاتی تھی۔ مرجاد کی لاج اسے کچھ کم نہ تھی، لیکن جس مرض کا عارضہ مہلک ہو گیا ہو وہ کھانے پینے میں پرہیز کی پروا کب کرتا ہے؟ داتا دین کے سامنے ہوری نے کچھ ایسے طرز کا اظہار کیا تھا جسے منظوری نہیں کہا جا سکتا تھا مگر اندر سے وہ پگھل گیا تھا۔ عمر کی ایسی کوئی بات نہیں۔ مرنا جینا بھاگ کے ہاتھ ہے۔ بوڑھے بیٹھے رہتے ہیں، جوان چلے جاتے ہیں۔ روپا کے بھاگ میں سکھ لکھا ہے تو وہاں بھی سکھ اٹھاوے گی اور دکھ لکھا ہے تو کہیں بھی سکھ نہیں پا سکتی۔ اور لڑکی بیچنے کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ ہوری اس سے جو کچھ لے گا ادھار لے گا اور ہاتھ میں روپیہ آتے ہی ادا کر دے گا۔ اس میں شرم یا جھجک کی کوئی بات نہیں۔ ہاں اس میں سمائی ہوتی تو وہ روپا کا بیاہ کسی جوان لڑکے سے، اونچے گھرانے میں کرتا، جہیز بھی دیتا اور براتیوں کے کھلانے پلانے میں دل کھول کر خرچ بھی کرتا۔ مگر جب ایشور نے اسے اس لائق نہیں بنایا تو کسا کنیا دینے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے؟ لوگ ہنسیں گے، مگر جو لوگ صرف ہنستے ہیں اور کوئی مدد نہیں کرتے ان کی ہنسی کی وہ کیوں پرواہ کرے؟ مشکل یہی ہے کہ

دھنیا نہ مانے گی۔ گدھی تو ہے ہی! وہی پُرانی لاج لیے بیٹھی رہے گی۔ یہ گھر لانے کی مرجاد نباہنے کا سمے نہیں ہے، اپنی جان بچانے کا سمے ہے۔ ایسی ہی بڑی لاج مرجاد والی ہے تو لائے پانچ سو روپے نکالے۔ کہاں دھرے ہیں؟

دو دن گزر گئے اور اس کے متعلق دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ ہاں، دونوں اشارتاً گفتگو کرتے رہتے تھے۔

دھنیا کہتی "برادری کیا جوڑے کے ہوں تبھی بیاہ کا سُکھ ہے!"

ہوری جواب دیتا "بیاہ سکھ کا نام نہیں ہے پگلی، یہ تو تپسیا ہے!"

"چل! تپسیا ہے!"

"ہاں میں کہتا جو ہوں، بھگوان آدمی کو جس وسا میں ڈال دیں اس میں سُکھی رہنا تپسیا نہیں تو اور کیا ہے؟"

دوسرے دن دھنیا نے ازدواجی مسرت کا دوسرا پہلو سوچ نکالا "گھر میں جب تک ساس سُسر دیورانیاں جِٹھانیاں نہ ہوں تب تک سُسرال کا سُکھ ہی کیا؟ کچھ دن تو لڑکی بہو بننے کا سُکھ پائے!"

ہوری نے کہا "یہ بیاہ کا سکھ نہیں ہے، دُکھ ہے!"

دھنیا بگڑ اٹھی "تمہاری باتیں بھی نرالی ہوتی ہیں۔ اکیلی بہو گھر میں کیسے رہے گی؟ نہ کوئی آگے نہ پیچھے!"

ہوری بولا "تو اس گھر میں آئی تو ایک نہیں دو دو دیور تھے، ساس تھی، سُسر تھا، تو نے کون سا سُکھ اُٹھا لیا بتا!"

"کیا سبھی گھروں میں ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں؟"

"اور نہیں تو کیا، آسمان کی دیویاں آ جاتی ہیں؟ اکیلی تو بہو اور اس پر حکم چلانے والا سارا گھر، بے چاری کس کس کا کہنا کرے جس کا حکم نہ مانے وہی

بیری، سب سے بھلا اکیلا۔

پھر بھی بات یہیں تک رہ گئی، مگر دھنیا کا پلڑا ہلکا ہوتا جاتا تھا۔ چوتھے دن رام سیوک مہتو خود آ پہنچے۔ کلاں راس گھوڑے پر سوار، ساتھ میں ایک نائی اور ایک خدمت گار لئے، جیسے کوئی بڑا زمیندار ہو۔ عمر چالیس سے اوپر تھی اور بال کھچڑی ہو گئے تھے، مگر چہرے پر رونق تھی اور بدن مضبوط تھا۔ ہوری ان کے سامنے بالکل بوڑھا لگتا تھا۔ کسی مقدمے کی پیروی کرنے جا رہے تھے۔ یہاں ذرا دوپہر گزارنا چاہتے تھے۔ دھوپ کتنی تیز ہے اور لو کتنے زور کی چل رہی ہے! ہوری دلاری کی دکان سے گیہوں کا آٹا اور گھی لایا۔ پوریاں تینوں مہمانوں نے کھایا۔ داتا دین بھی دعا دینے آ پہنچے تھے۔ باتیں ہونے لگیں۔

داتا دین نے پوچھا "کیسا مقدمہ ہے مہتو؟"

رام سیوک نے شان جتاتے ہوئے کہا "مقدمہ تو ایک نہ ایک لگا ہی رہتا ہے مہاراج! دنیا میں گؤ بننے سے کام نہیں چلتا۔ جتنا دبتے جاؤ اتنا ہی لوگ دباتے ہیں۔ تھانہ پولیس، کچہری عدالت سب ہیں ہماری رکشا کے لئے، مگر رکشا کوئی نہیں کرتا۔ ہر جگہ لوٹ ہے۔ جو غریب ہے، لاچار ہے، اس کی گردن کاٹنے کے لئے سبھی تیار رہتے ہیں۔ بھگوان نہ کرے کوئی بے ایمانی کرے۔ یہ بڑا پاپ ہے۔ تم ہی سوچو کہ آدمی کہاں تک دبے۔ یہاں تو جو کسان ہے وہ سب کا ملائم چارا ہے۔ پٹواری کو نذر اور دستوری نہ دیں تو گاؤں میں رہنا کٹھن، جمیندار کے چپراسی اور کارندوں کا پیٹ نہ بھریں تو نباہ نہیں۔ تھانیدار اور کانسٹیبل تو جیسے اس کے داماد ہیں، جب ان کا دورہ گاؤں میں ہو جائے تو کسانوں کا دھرم ہے کہ وہ ان کی ہر طرح آؤ بھگت کریں، نہیں تو ایک رپٹ میں گاؤں

کا گاؤں بندھ جائے۔ کبھی کانون گو، کبھی تحصیلدار، کبھی ڈپٹی، کبھی جنٹ، کبھی کلکٹر، کبھی کپتان آتے ہی رہتے ہیں اور کسانوں کو اُن کے آگے ہاتھ باندھے کھڑا رہنا چاہئے۔ اُن کے لئے رسد چارا، انڈا مرغی، دودھ گھی کا بندوبست کرنا چاہئے۔ تم پر بھی تو وہی بیت رہی ہے مہاراج۔ ایک نہ ایک حاکم نت نئے بڑھتے جاتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر کنوؤں میں دوائی ڈالنے کے لئے آنے لگا ہے۔ ایک دوسرا ڈاکٹر کبھی کبھی آ کر ڈھور ڈنگر کو دیکھتا ہے۔ لڑکوں کا امتحان لینے والا انسپکٹر ہے اور نہ جانے کون کون افسر ہیں، نہر کے الگ، جنگل کے الگ، سراب تاڑی کے الگ، گاؤں سدھار کے الگ، کھیتی کے الگ، کہاں تک گناؤں؟ پادری آجاتا ہے تو اُسے بھی رسد دینا پڑتا ہے۔ اور جو کہو کہ اتنے محکموں اور اتنے افسروں سے کسان کا کچھ بھلا ہوتا ہے تو نام کو نہیں۔ ابھی جمیندار نے گاؤں میں ہل پیچھے دو دو روپیہ چندہ لگایا۔ کسی بڑے افسر کی دعوت تھی۔ کسانوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ بس اُس نے گاؤں بھر پر اجافا کر دیا۔ حاکم بھی جمیندار کا پچھ کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ کسان بھی آدمی ہے۔ اُس کے بھی بال بچے ہیں، اُس کی اجت آبرو ہے۔ اور یہ سب ہمارے دبّوپن کا نتیجہ ہے میں نے گاؤں بھر میں ڈھول بجوا دی کہ کوئی بیسی لگان نہ دو اور نہ کھیت چھوڑو۔ ہم کو کوئی قائل کر دے تو ہم بیسی دینے کو تیار ہیں، پر جو تم چاہو کہ بے منہ کے کسانوں کو پیس کر پی جاؤ تو یہ نہ ہوگا۔ گاؤں والوں نے میری بات مان لی اور سب نے بیسی دینے سے انکار کر دیا۔ جمیندار نے دیکھا کہ سارا گاؤں ایک ہو گیا ہے تو لاچار ہو گیا۔ کھیت بے دخل بھی کر دے تو جوتے کون؟ آج کل جب تک کڑے نہ پڑو کوئی نہیں سنتا۔ روئے بنا تو بالک کا بھی ماں سے دودھ نہیں پاتا۔"

رام سیوک تیسرے پہر چلا گیا مگر دھنیا او رہوری پر ایک نہ مٹنے والا اثر

چھوڑ گیا۔ داتا دین کا جادو چل گیا۔ اُنہوں نے پوچھا "اب کیا کہتے ہو ہوری؟"

ہوری نے دھنیا کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس سے پوچھو۔"

"تم دونوں سے پوچھتے ہیں۔"

دھنیا بولی "عمر تو ادھک ہے پر تم لوگوں کی رائے ہے تو مجھے بھی منظور ہے۔ بھاگ میں جو لکھا ہو گا وہ تو آگے آوے ہی گا پر آدمی اچھا ہے۔"

اور ہوری کو تو رام سیوک پر ویسا ہی بھروسہ ہو گیا تھا جیسا کمزور کو طاقتور پر ہوتا ہے۔ وہ شیخ چلی کے منصوبے باندھنے لگا تھا۔ آدمی اس کا ہاتھ پکڑ لے تو بیڑا پار ہے۔

بیاہ کا مہورت ٹھیک ہو گیا۔ گوبر کو بھی بلانا ہو گا۔ لکھنا چاہیے۔ پھر آنا نہ آنا اُس کے من کی بات ہے۔ یہ کہنے کو تو منہ نہ رہے کہ مجھے بلایا کب تھا۔ سونا کو بھی بلانا ہو گا۔

دھنیا نے کہا "گوبر تو ایسا نہیں تھا مگر جب جھنیا آنے دے۔ پردیس جا کر ایسا بھول گیا کہ نہ چٹھی نہ پتری۔ نہ جانے کیسے ہے۔" یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

گوبر کو خط ملا تو چلنے کو تیار ہو گیا۔ جھنیا کو جانا اچھا تو نہ لگتا تھا مگر اس موقع پر کچھ نہ کہہ سکی۔ بہن کے بیاہ میں بھائی کا نہ جانا کیسے ممکن ہے۔ سونا ہی کے بیاہ میں نہ جانے کا کلنک کیا کم ہے۔

گوبر بھرے ہوئے گلے سے بولا "ماں باپ سے کھنچے رہنا کوئی اچھا کام نہیں۔ اب ہمارے ہاتھ پاؤں ہیں تو ان سے کھنچیں چاہے لڑیں، مگر جنم تو اُن ہی نے دیا، پال پوس کر جوان تو اُن ہی نے کیا، اب وہ ہمیں چار بات بھی کہیں تو گم کھانا چاہیے۔ اِدھر مجھے بار بار اماں دادا کی یاد آیا کرتی ہے۔ اُس سے

مجھے نہ جانے کیوں اُن پر گُسّہ آگیا تھا۔ تیرے کارن ماں باپ کو بھی چھوڑنا پڑا!"

جھنیا بگڑ اُٹھی "مجھے یہ پاپ نہ لگاؤ، ہاں تم ہی کو لڑنا سوجھا تھا۔ میں تو امّاں کے پاس اتنے دِن رہی کبھی سانس تک نہ لیا!"

"لڑائی تیرے کارن ہوئی!"

"اچھا میرے ہی کارن سہی، میں نے بھی تو تمہارے لئے اپنا گھر بار چھوڑ دیا!"

"تیرے گھر میں کون تجھے پیار کرتا تھا؟ بھائی بگڑتے تھے، بھاوجیں ستاتی تھیں اور بھولا تجھے پاتے تو کچّا ہی کھا جاتے۔"

"تمہارے ہی کارن!"

"اب کی جب تک رہیں اس طرح رہیں کہ اُنہیں بھی جندگانی کا کچھ سُکھ ملے۔ اُن کی مرجی کے بنا کوئی کام نہ کریں۔ دادا اتنے اچھے ہیں کہ کبھی مجھے ڈانٹا بھی نہیں۔ امّاں نے کئی بار مارا ہے مگر وہ جب مارتی تھیں تب کچھ نہ کچھ کھانے کو بھی دے دیتی تھیں۔ مارتی تھیں، پر جب تک مجھے ہنسا نہ لیں اُنہیں چین نہ آتا تھا!"

دونوں نے مالتی سے ذکر کیا۔ مالتی نے چھٹی ہی نہیں دی بلکہ کنّیا کی بھینٹ کے لئے ایک جوڑا اور ہاتھوں کا کنگن بھی دیا۔ وہ خود جانا چاہتی تھی مگر کئی ایسے مریض اُس کے زیرِ علاج تھے جنہیں ایک دن کے لئے نہ چھوڑ سکتی تھی، ہاں شادی کے دن آنے کا وعدہ کیا۔ اور بچّے کیلئے کھلونوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اسے بار بار چومتی اور پیار کرتی تھی۔ گویا سب کچھ ہیٹ ہی لے لینا چاہتی ہے، اور بچّہ اُس کے پیار کی بالکل پرواہ نہ کر کے گھر جانے کے لئے خوش تھا۔ اُسی گھر کے لئے جس کو اُس نے دیکھا تک

نہ تھا اُس کے طفلانہ تصوّر میں گھر بہشت سے بڑھ کر کوئی چیز تھا۔

گوبر نے گھر پہنچ کر وہاں کی حالت دیکھی تو بڑی مایوسی ہوئی کہ اُسی وقت واپس جائے۔ گھر کا ایک حصّہ گرنے کے قریب تھا۔ دروازے پر صرف ایک بیل بندھا ہوا تھا اور وہ بھی اَدھ مَرا سا۔ دھنیا اور ہوری دونوں خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ مگر گوبر کا جی اُچاٹ تھا۔ اب اس گھر کے سنبھلنے کی کیا اُمید ہے؟ وہ غلامی کرتا ہے مگر پیٹ بھر کھاتا تو ہے۔ صرف ایک ہی مالک کا تو نوکر ہے۔ یہاں تو جسے دیکھو وہی رعب جماتا ہے۔ غلامی ہے مگر خشک! محنت کر کے اناج پیدا کرو اور جو روپئے ملیں اُسے دوسرے کو دے دو۔ اور آپ بیٹھے ہوئے "رام رام" جپو۔ دادا ہی کا کلیجہ ہے کہ یہ سب سہتے ہیں۔ اُس سے تو ایک دن نہ سہا جائے۔ اور یہ حالت کچھ ہوری ہی کی نہ تھی۔ سارے گاؤں پر یہی مصیبت تھی۔ ایسا ایک آدمی بھی نہیں جس کی حالت زار نہ ہو، گویا جسم میں جان کے بجائے کلفت ہی بیٹھی ہوئی لوگوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہی تھی۔ چلتے پھرتے تھے، کام کرتے تھے، پستے تھے، صرف اس لئے کہ ایسا ہونا اُن کی قسمت میں لکھا تھا۔ زندگی میں نہ کوئی اُمید ہے اور نہ کوئی اُمنگ۔ گویا اُن کی زندگی کے سوتے سوکھ گئے ہوں اور ساری ہریالی مُرجھا گئی ہو۔ جیٹھ کے دن ہیں، ابھی تک کھلیانوں میں اناج موجود ہے۔ مگر کسی کے چہرے پر خوشی نہیں ہے۔ بہت کچھ اناج تو کھلیان ہی میں تل کر مہاجنوں اور کارندوں کی نذر ہو چکا ہے اور جو کچھ بچ رہا ہے وہ بھی دوسروں ہی کا ہے۔ مستقبل تاریکی کی طرح اُن کے سامنے ہے جس میں انہیں کوئی راستہ نہیں سوجھتا۔ اُن کی ساری حسیّات مُردہ ہو گئی ہیں۔ دروازے پر منوں کوڑا کرکٹ جمع ہے، بدبو اُڑ رہی ہے۔ مگر اُن کی ناک میں نہ بو ہے اور نہ آنکھوں

میں نور۔ سرِ شام سے دروازے پر گیدڑ رونے لگتے ہیں مگر کسی کو غم نہیں۔ سامنے جو کچھ موٹا جھوٹا آجاتا ہے وہ کھا لیتے ہیں، اُسی طرح جیسے انجن کوئلہ کھا لیتا ہے۔ اُنکے بیل چونی چوکر کے بغیر ناند میں مُنہ نہیں ڈالتے۔ انکو نہیں صرف پیٹ میں کچھ ڈالنے کو چاہیئے۔ مزے سے کچھ مطلب نہیں۔ اُن کی قوتِ ذائقہ مر چکی ہے۔ اُن کی زندگی میں اُس کا فقدان ہوگیا ہے۔ اُن سے دھیلے دھیلے کیلئے بے ایمانی کرالو، مٹھی بھر اناج کے لئے لاٹھیاں چلوالو۔ پستی کی وہ انتہا ہے جب آدمی عزت و غیرت کو بھی بھول جاتا ہے۔

لڑکپن سے گوبر نے گاؤں کی یہی حالت دیکھی تھی۔ اور اس کا عادی ہو چکا تھا۔ مگر آج چار سال کے بعد اُس نے جیسے ایک نئی دُنیا دیکھی۔ بھلے آدمیوں کے ساتھ رہنے سے اُس کی عقل کچھ جاگ اُٹھی ہے۔ اُس نے سیاسی جلسوں میں جا کر لکچر سُنے ہیں جو اُس کے عضو عضو میں پیوست ہو گئے ہیں۔ اُسنے سُنا ہے اور سمجھا کہ اپنا بھاگ خود بنانا ہوگا، اپنی عقل اور ہمت سے اُن تکلیفوں پر فتح پانا ہوگا۔ کوئی دیوتا، کوئی پوشیدہ طاقت اُن کی مدد کرنے نہ آئیگی۔ اُسے یہی احساس آگیا ہے۔ اب اُسمیں وہ پہلے کا کنوارپن اور گھمنڈ نہیں ہے۔ وہ منکسر المزاج اور زیرک ہو گیا ہے۔ جس حالت میں پڑے ہوئے ہو اُسے خود غرضی اور حرص میں مبتلا ہو کر اور کیوں بگاڑتے ہو؟ غم نے تم کو ایک رشتے میں باندھ دیا ہے۔ اخوت کی اس قدرتی بندش کو کیوں اپنی ذاتی اغراض سے توڑے ڈالتے ہو؟ اُس بندش کو اتحاد کی بندش بنالو۔ اسطرح کے خیالات نے اُسکی بشریت کو گویا پر لگا دیئے ہیں۔ دنیوی نشیب و فراز دیکھ لینے کے بعد سیدھے سادھے لوگوں میں جو فراخ دلی آجاتی ہے وہ گویا اب آسمان میں اُڑنے کیلئے پروں کو تول رہی ہے۔ ہمدردی کو جب کوئی کام کرتے دیکھتا ہے

تو اُسے ہٹا کر خود کرنے لگتا ہے گویا اگلی بدسلوکیوں کا کفّارہ کرنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ دادا اب تم کوئی چنتا مت کرو۔ سارا بار مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اب ہر مہینے خرچ بھیجوں گا۔ اتنے دن تو مرتے کھپتے رہے، اب کچھ دن تو آرام کر لو۔ مجھ پر لعنت ہے کہ میرے رہتے تمہیں اتنی تکلیف اُٹھانی پڑے۔ اور ہوری کے روئیں روئیں سے بیٹے کے لئے دعا نکلتی ہے۔ اُسے اپنے کمزور جسم میں قدرتی طاقت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اس وقت اپنے فرض کی مراحت کر کے اُس کی اُٹھتی جوانی کا تفکّر اور تمنّا کی بجلی کیوں گرائے؟ وہ آرام سے کھائے پیئے، زندگی کا سُکھ اُٹھائے۔ مرنے کھپنے کے لئے وہ تیار ہے۔ یہی اُس کی زندگی ہے۔ "رام رام" جپ کر وہ جی بھی تو نہیں سکتا۔ اُسے تو پھاوڑا اور کدال چاہیئے۔ رام کے نام کی مالا پھیر کر اس کے دل کو سکون نہ ہوگا۔

گوبر نے کہا "کہو تو سب سے کِست کرا دوں اور ہر مہینے ادا کرتا جاؤں کُل ملا کر کتنا ہوگا؟"

ہوری نے سر ہلا کر کہا "نہیں بیٹا، تم کاہے کو کشٹ اُٹھاؤ گے۔ تم ہی کو کون بہت ملتا ہے۔ میں سب دیکھ لوں گا۔ ایسا ہی ہمیشہ تھوڑے رہے گا۔ رُوپا چلی جاتی ہے۔ اب کرج ہی چکانا تو ہے۔ تم کوئی چنتا مت کرنا۔ اچھی طرح کھانا پینا۔ ابھی بدن بنا لو گے تو سدا سُکھ سے رہو گے۔ میری کون؟ مجھے تو مرنے کھپنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ابھی تم کو کھیتی میں نہیں جوتنا چاہتا تھا۔ مالک اچھا مل گیا ہے۔ اُس کی کچھ دن سیوا کر لو گے تو آدمی بن جاؤ گے۔ وہ تو یہاں آ چکی ہیں۔ پوری دیوی ہیں!"

"بیاہ کے دن پھر آنے کو کہا ہے!"

"ہمارے سر آنکھوں پر آویں۔ ایسے بھلے مانسوں کے ساتھ

رہنے میں چاہے جیسے کم بھی ملیں مگر گیان بڑھتا ہے اور آنکھیں کھلتی ہیں ۔"

اُسی وقت پنڈت داتا دین نے ہوری کو اشارے سے بلایا اور دور لے جا کر کمر سے سو سو روپے کے دو نوٹ نکالتے ہوئے بولے "تم نے میری صلاح مان لی، بڑا اچھا کیا۔ دونو کام بن گئے۔ کنیا سے بھی اُرِن ہو گئے، اور باپ دادوں کی نسانی بھی بچ گئی۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا وہ میں نے تمہارے لئے کر دیا، اب تم جانو اور تمہارا کام جانے ۔"

ہوری نے روپے لئے تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اُس کا سر اوپر نہ اُٹھ سکا، مُنہ سے ایک لفظ نہ نکلا، گویا ذلت کے اتھاہ سمندر میں گر پڑا ہو اور گرتا چلا جا رہا ہو۔ آج تیس سال زندگی سے لڑتے رہنے کے بعد وہ ہار گیا اور ایسا ہارا ہے کہ گویا اُسے شہر کے پھاٹک پر کھڑا کر دیا گیا ہے اور جو جاتا ہے وہ اُس کے مُنہ پر تھوک دیتا ہے۔ اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ بھائیو! میں رحم کا مستحق ہوں، میں نے نہیں جانا کہ جیٹھ کی لو کیسی ہوتی ہے اور ماگھ کی برکھا کیسی ہوتی ہے۔ اس بدن کو چیر کر دیکھو اس میں کتنی جان رہ گئی ہے اور وہ کتنی چوٹوں سے چُور اور ٹھوکروں سے کچلا ہوا ہے۔ اُس سے پوچھو کبھی تو نے آرام کے درشن کئے ہیں، کبھی تو چھاؤں میں بیٹھا ہے؟ اُس پر یہ ذلت! اور وہ اب بھی جیتا ہے، نامرد، لالچی، کمینہ! اُس کا سارا اعتقاد جو بہت گہرا ہو کر ٹھوس اور اندھا ہو گیا تھا۔ گویا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔

داتا دین نے کہا "تو میں جاتا ہوں۔ نہ ہو، تم ابھی نوکھے رام کے پاس چلے جاؤ۔"

ہوری نے عاجزی سے کہا "چلا جاؤں گا مہاراج، مگر میری آبرو تمہارے ہاتھ ہے۔"

(۳۶)

دو دن تک گاؤں میں خوب دھوم دھام رہی۔ باجے بجے، گانا بجانا ہوا اور رو پار دھو کر رخصت ہو گئی۔ مگر ہوری کو کسی نے گھر سے نکلتے نہ دیکھا۔ ایسا چھپا بیٹھا تھا جیسے منہ میں کالکھ لگی ہو۔ مالتی کے آ جانے سے چہل پہل اور بڑھ گئی۔ دوسرے گاؤں کی عورتیں بھی آ گئیں۔

گوبر نے اپنے اُنس و اخلاق سے سارے گاؤں کو گرویدہ بنا لیا ہے۔ ایسا کوئی گھر نہ تھا جہاں وہ اپنے اچھے سلوک کی یاد نہ چھوڑ آیا ہو۔ بھولا تو اس کے پیروں پر گر پڑے۔ اُس کی عورت نے اُسے پان دیئے اور ایک روپیہ رخصتانہ دیا اور اس کا لکھنؤ کا پتہ بھی پوچھا۔ کبھی لکھنؤ آئے گی تو اُس سے ضرور ملے گی۔ اپنے روپئے کا اس نے کوئی ذکر نہ کیا۔

تیسرے دن جب گوبر چلنے لگا تو ہوری نے دھنیا کے سامنے آنکھوں میں آنسو بھر کر اُس گناہ کا اعتراف کر لیا جو کئی روز سے اُس کے دل کو پریشان و پشیمان کر رہا تھا اور رو کر بولا "بیٹا، میں نے اس دھرتی کے موہ سے یہ پاپ کی گٹھری سر پر لادی۔ نہ جانے بھگوان مجھے اس کا کیا ڈنڈ دیں گے!"

گوبر ذرا بھی ناخوش نہ ہوا، کسی طرح کی خفگی اُس کے چہرے پر نہ تھی۔ عقیدت سے بولا "اس میں پاپ کی تو کوئی بات نہیں ہے دادا! ہاں رام سیوک کے روپئے ادا کر دینا چاہیے۔ اور تم کرتے کیا؟ میں کسی لائق نہیں۔ تمہاری کھیتی میں اپج نہیں۔ اُدھار کہیں مل نہیں سکتا۔ مہینے بھر کے لئے بھی گھر میں اناج نہیں۔ ایسی حالت میں تم کر ہی کیا سکتے تھے؟ کھیت نہ بچاتے تو رہتے کہاں؟ جب آدمی کا کوئی بس نہیں چلتا تو اپنے کو بھاگ ہی پر چھوڑ دیتا ہے۔ نہ جانے

یہ دھاندلی کب تک چلتی رہے گی۔ جسے پیٹ کی روٹی میسر نہیں اُس کے لئے آبرو اور مرجاد سب ڈھونگ ہے۔ اوروں کی طرح تم نے بھی دوسروں کا گلا دبایا ہوتا، اُن کا روپیہ مارا ہوتا تو تم بھی بھلے مانس ہوتے۔ تم نے کبھی دھرم کو نہیں چھوڑا یہ اُسی کا ڈنڈ ہے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو یا تو جیل میں ہوتا یا پھانسی پا گیا ہوتا۔ مجھ سے یہ کبھی نہ سہا جاتا کہ میں کما کما کر سب کا گھر بھروں اور آپ اپنے بال بچوں کے ساتھ منہ میں جابی لگائے بیٹھا رہوں۔"

دھنیا بہو کو اُس کے ساتھ بھیجنے پر راضی نہ ہوئی۔ جھنیا بھی چاہتی تھی کہ ابھی کچھ دن یہیں رہے۔ طے ہوا کہ گوبر اکیلا ہی جائے۔

دوسرے روز علی الصباح گوبر سب سے رخصت ہو کر لکھنؤ چلا۔ ہوری اُسے گاؤں کے باہر تک پہنچانے گیا۔ گوبر سے اتنی محبت اُسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ جب گوبر اُس کے پیروں پر جھکا تو ہوری رو پڑا جیسے پھر اُسے بیٹے کے درشن نہ ہوں گے۔ اُس کی آتما میں خوشی تھی، غرور تھا اور عزم تھا۔ بیٹے سے یہ عقیدت اور محبت پا کر اُس میں رونق اور بالیدگی آ گئی ہے۔ کئی روز پہلے اُس پر جو پستی سی چھا گئی تھی، ایک ایسی تاریکی سی جس میں وہ اپنا راستہ بھول رہا تھا، وہاں اب مستعدی ہے اور روشنی ہے۔

روپا اپنی سسرال میں خوش تھی۔ جس حالت میں اُس کا بچپن بیتا تھا اُس میں پیسہ سب سے قیمتی چیز تھا۔ دل میں کتنی خواہشیں تھیں جو دل ہی میں گھُٹ گھُٹ کر رہ گئی تھیں۔ وہ اب انہیں پورا کر رہی تھی اور رام سیوک ادھیڑ ہو کر بھی جوان ہو گیا تھا۔ روپا کے لئے وہ شوہر تھا۔ اُس کے جوان، ادھیڑ یا بوڑھے ہونے سے اُس کے نسائی جذبے میں کوئی فرق نہ آ سکتا تھا۔ یہ جذبہ شوہر کے رنگ روپ یا سن پر منحصر نہ تھا، اُس کی بنیاد اس سے بہت گہری تھی۔ اُجلے

نسلی رواجوں کی تہہ میں بجز صرف کسی زلزلہ ہی سے ہل سکتی تھی۔ اُس کا شباب اپنے ہی میں مست تھا، وہ اپنے ہی لئے اپنا بناؤ سنگار کرتی تھی اور آپ ہی خوش ہوتی تھی۔ رام سیوک کے لئے اُس کا دوسرا روپ تھا۔ تب وہ گرہستن بن جاتی تھی۔ کسی طرح کی خامی کا خیال اُس کے دل میں نہ آتا تھا۔ اناج سے بھری ہوئی کھتیاں اور گاؤں کے سرے تک پھیلی ہوئی کھیتی اور دروازے پر مویشی کی قطاریں، یہ سب اور کسی طرح کے عدم تکمیل والے خیال کو اُس کے دل میں نہ آنے دیتی تھیں۔

اور اُس کی سب سے بڑی خواہش تھی اپنے گھر والوں کو سُکھی دیکھنا۔ اُنکی غریبی کیسے دُور کرے؟ اُس گائے کی یاد ابھی تک اُس کے دل میں تازہ تھی جو مہمان کی طرح آئی تھی اور سب کو روتا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ یاد آتے دنوں کے بعد اب اور بھی شیریں ہو گئی تھی۔ ابھی اُس کا بچپن اس نئے گھر میں نہ دائم ہو پایا تھا۔ وہی پرانا گھر اُس کا اپنا گھر تھا۔ وہیں کے لوگ اپنے یگانے تھے۔ اُن ہی کا دُکھ اپنا دُکھ اور اُن ہی کا سُکھ اپنا سُکھ تھا۔ اس دروازے پر مویشیوں کا ایک جھنڈ دیکھ کر اُسے وہ خوشی نہ ہو سکتی تھی جو اپنے دروازے پر ایک گائے دیکھ کر ہوتی۔ اُس کے دادا کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی۔ جس دن وہ گائے آئی تھی اُنہیں کتنی خوشی ہوئی تھی جیسے آسمان سے کوئی دیوی آ گئی ہو۔ تب سے پھر اُنھیں اتنی سمائی نہ ہوئی کہ کوئی دوسری گائے لاتے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ آج بھی ہوری کے دل میں وہ خواہش اتنی ہی تازہ ہے۔ اب کی وہ جائے گی تو وہ اپنے ساتھ وہ دھوری گائے ضرور لیتی جائے گی۔ نہیں، وہ نوکر سے کیوں نہ بھجوا دے۔ رام سیوک سے پوچھنے بھر کی دیر تھی۔ منظوری ہو گئی اور دوسرے دن ایک اہیر کی معرفت روپا نے گائے بھیج دی۔ اہیر سے کہا کہ دادا سے

کہہ دیا منگل کے دودھ پینے کیلئے گائے بھیجی ہے۔ ہوری بھی گائے لینے کی فکر میں تھا۔ یوں ابھی گائے لینے کی عجلت نہ تھی۔ مگر منگل یہیں اور وہ بلا دودھ کے کیسے رہ سکتا ہے؟ روپیہ ملتے ہی وہ سب سے پہلے گائے لے گا۔ منگل اب صرف اُس کا پوتا نہیں ہے، صرف گوبر کا بیٹا نہیں ہے، بلکہ مالتی دیوی کا کھلونا بھی ہے۔ اُس کی پرورش و پرداخت اُسی طرح ہونی چاہیئے۔

مگر روپئے کہاں سے آئیں؟ اتفاقاً اُسی روز ایک ٹھیکہ دار نے سڑک کے لئے گاؤں کے اوسر میں کنکر کی کھدوائی شروع کی۔ ہوری نے سُنا تو فوراً وہاں جا پہنچا اور آٹھ آنے روز پر کھدائی کرنے لگا۔ اگر یہ کام دو مہینے بھی چل گیا تو اُسے گائے بھر کو روپئے مل جائیں گے۔ دن بھر لو اور دھوپ میں کام کرنے کے بعد وہ گھر آتا تو بالکل مرا ہوا سا، لیکن تکان کا نام نہیں۔ اُسی حوصلے سے دوسرے روز پھر کام کرنے جاتا۔ رات کو بھی کھانا کھا کر ڈھبری کے سامنے بیٹھ جاتا اور سُتلی کاتتا۔ کہیں ایک بجے سونے کی نوبت آتی۔ دھنیا بھی پاگل ہو گئی تھی۔ اُسے اتنی محنت کرنے سے روکنے کے بدلے وہ خود اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی سُتلی کاتتی۔ گائے تو لینی ہی ہے، رام سیوک کے روپئے بھی تو ادا کرنے ہیں۔ گوبر کہہ گیا ہے۔ اُسے بڑی فکر ہے۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ دونوں بیٹھے سُتلی کات رہے تھے۔ دھنیا نے کہا "تمہیں نیند لگی ہو تو جا کر سو رہو، تڑکے سے پھر تو کام کرنا ہے!"

ہوری نے آسمان کی طرف دیکھا "چلا جاؤں گا۔ ابھی تو دس بجے ہوں گے۔ تو جا، سو رہ!"

"میں تو دوپہر کو تھوڑی دیر سو لیتی ہوں!"

"میں بھی چبینا کر کے تھوڑی دیر سو لیتا ہوں!"

"بڑی لو لگتی ہو گی۔"

"لو کیا لگے گی، ابھی چھانہہ ہے۔"

"بس ڈرتی ہوں کہ کہیں تم بیمار نہ ہو جاؤ۔"

"چل بیمار وہ پڑتے ہیں جنھیں بیمار پڑنے کی پھر صت ہوتی ہے۔ یہاں تو یہ دُھن ہے کہ اب گوبر آوے تو رام سیوک کے آدھے روپئے جمع ہیں۔ کچھ وہ بھی لاوے ہی گا۔ بس اس سال اس روپئے سے گلا چھوٹ جائے تو دوسری جندگی ہو۔"

"گوبر کی اب کی بڑی یاد آتی ہے۔ کتنا بھلا بن گیا ہے۔"

"چلتے سمے میرے پاؤں پر گر پڑا۔"

"منگل وہاں سے آیا تو کتنا موٹا تھا۔ یہاں آکر دُبلا ہو گیا ہے۔"

"وہاں دودھ، مکھن، کیا نہیں پاتا تھا۔ یہاں روٹی مِل جائے تو بہت ہے۔ ٹھیکہ دار سے روپئے ملے اور گائے لایا۔"

"گائے تو کبھی کی آگئی ہوتی، مگر تم جب کہنا مانو۔ اپنی کھیتی تو سنبھالے نہ سنبھلتی تھی، پُنیا کا بوجھ بھی اپنے سر پر لاد لیا۔"

"کیا کرتا؟ اپنا دھرم بھی تو کچھ ہے۔ ہیرا نے نالائقی کی تو اس کے بال بچوں کی سنبھال کرنے والا بھی تو کوئی چاہیے تھا۔ کون تھا میرے سوائے؟ بتا! میں نہ مدد کرتا تو آج اُن کی کیا گت ہوتی، سوچ! اتنا سب کرنے پر بھی تو منگرو نے اس پر نالِس کر ہی دی۔"

"روپئے گاڑ کر رکھے گی تو نالِس نہ ہو گی؟"

"کیا بکتی ہے؟ کھیتی سے پیٹ بھر کر ہو نا چاہئے، یہی بہت ہے۔ گاڑ کر کوئی کیا رکھے گا۔"

"ہیرا تو جیسے سنسار ہی سے چلا گیا۔"

"میرا من بولتا ہے کہ وہ آوے گا کبھی نہ کبھی جرور۔"

دونوں سو گئے۔ ہوری منہ اندھیرے اُٹھا تو دیکھا کہ ہیرا سامنے کھڑا ہے۔ بال بڑھے ہوئے۔ کپڑے تار تار، مُنہ سوکھا ہُوا، بدن میں گوشت اور خون کا نام نہیں، جیسے قد بھی چھوٹا ہو گیا ہو۔ دوڑ کر ہوری کے قدموں پر گر پڑا۔

ہوری نے اُسے سینے سے لگا کر کہا "تم تو بالکل گھُل گئے ہیرا! کب آئے؟ آج تمہاری بار بار یاد آ رہی تھی۔ بیمار ہو گیا ہے؟"

آج اُس کی آنکھوں میں وہ ہیرا نہ تھا جس نے اُس کی زندگی تلخ کر دی تھی۔ بلکہ وہ ہیرا تھا جو بے ماں باپ کا چھوٹا سا بچہ تھا۔ درمیانی پچیس تیس سال مٹ گئے تھے۔ اُن کا نشان بھی نہ تھا۔

ہیرا نے کچھ جواب نہ دیا۔ کھڑا رو رہا تھا۔

ہوری نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر بھرے گلے سے کہا "کیوں روتے ہو بھیا؟ آدمی سے بھول چوک ہوتی ہی ہے۔ کہاں رہے اتنے دن؟"

ہیرا نے بے چارگی سے کہا "کہاں بتاؤں دادا، بس یہی سمجھ لو کہ تمہارا درسن بدا تھا سو بچ گیا۔ ہتیا سر پر سوار تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گئو میرے سامنے کھڑی ہے۔ ہر دم سوتے جاگتے کبھی آنکھوں کی اوٹ نہ ہوتی تھی۔ میں پاگل ہو گیا۔ اور پانچ سال تک پاگل خانے میں بند رہا۔ آج وہاں سے نکلے چھ مہینے ہوئے۔ مانگتا کھاتا پھرتا رہا۔ یہاں آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ دنیا کو کون مُنہ دکھاؤں گا؟ آخر جی نہ مانا۔ کلیجہ کڑا کر کے چلا آیا۔ تم نے میرے بال بچوں کو......"

ہوری نے بات کاٹی "تم ناحک بھاگے۔ ارے دروگا کو دس پانچ

روپئے دے کر معاملہ دبوا دیا جاتا، اور کیا ہوتا ہے؟"

"تم سے جیتے جی اُرِن نہ ہوں گا دادا"

"میں کوئی غیر تھوڑے ہی ہوں بھیا"

ہوری خوش تھا۔ زندگی کی ساری تکلیفیں اور ساری مایوسیاں گویا اُس کے قدموں پر لوٹ رہی تھیں۔ کون کہتا ہے کہ زندگی کی جد و جہد میں وہ ہارا ہے؟ یہ خوشی، یہ غرور، یہ حوصلہ کیا ہار کی علامت ہے؟ ایسی ہی شکستوں میں اُس کی فتح ہے۔ اُس کے ٹوٹے ہوئے ہتھیار اُسکی فتح کے جھنڈے ہیں۔ اُسکا سینہ پھول اُٹھا ہے اور چہرے پر چمک آگئی ہے۔ ہیرا کی ممنونیت میں اُس کی زندگی کی ساری کامیابی مجسّم ہوگئی ہے۔ اُس کے بکھارے میں سو دو سو من غلہ بھرا ہوتا، اُس کی ہانڈی میں ہزار پانچ سو روپئے گڑے ہوتے۔ لیکن اُس سے یہ جنّت کی خوشی کیا مل سکتی تھی؟

ہیرا نے اُسے سر سے پیر تک دیکھ کر کہا "تم بھی تو بہت دُبلے ہو گئے ہو، دادا!"

ہوری نے ہنس کر کہا "تو کیا یہ میرے موٹے ہونے کے دن ہیں؟ موٹے وہ ہوتے جنہیں نہ روپئے کا سوچ ہوتا ہے نہ مرجاد کا۔ اس جگ میں موٹا ہونا بے حیائی ہے۔ سو کو دُبلا کر کے تب ایک موٹا ہوتا ہے۔ ایسے موٹاپے میں کیا سکھ؟ سکھ تو تب ہے کہ سبھی موٹے ہوں۔ سوبھا سے بھینٹ ہوئی ہے؟"

"اُس سے تو راستہ ہی کو بھینٹ ہو گئی تھی۔ تم نے تو اپنے کو بھی پالا اور جو تم سے بیر کرتے تھے اُن کو بھی پالا اور اپنی آبرو بنائے بیٹھے ہو۔ اُس نے تو کھیتی باڑی سب بیچ باچ ڈالی اور اب بھگوان ہی جانے اُس کا

نباہ کیسے ہوگا؟"

آج ہوری کھدائی کرنے چلا تو بدن بھاری تھا۔ رات کی تھکن دور نہ ہو پائی تھی۔ مگر اُس کے قدم تیز تھے اور چال میں بے پروائی کی اکڑ تھی۔

آج دس ہی بجے سے لو چلنے لگی اور دوپہر ہوتے ہوتے تو آگ برس رہی تھی۔ ہوری کنکر کے ٹوکرے اُٹھا اُٹھا کر کان سے سڑک پر لاتا تھا اور گاڑی پر لاد دیتا تھا۔ جب دوپہر کی چھٹی ہوئی تو وہ بے دم ہو گیا تھا۔ ایسی تھکن اُسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اُس کے پاؤں تک نہ اُٹھتے تھے۔ بدن اندر سے جھلسا جا رہا تھا وہ نہ نہایا اور نہ کچھ چبایا۔ اُسی تکان میں اپنا انگوچھا بچھا کر ایک پیڑ کے تلے سو رہا، مگر پیاس کے مارے گلا سوکھا جاتا ہے۔ خالی پیٹ پانی پینا ٹھیک نہیں۔ اُس نے پیاس کو روکنے کی کوشش کی مگر ہر لمحہ اندر کی جلن بڑھتی جاتی تھی۔ اُس سے نہ رہا گیا۔ ایک مزدور نے بالٹی بھر کر رکھی تھی اور چبین چبا رہا تھا۔ ہوری نے اُٹھ کر ایک لوٹا پانی خوب کھینچ کر پیا اور پھر جا کر لیٹ رہا۔ مگر آدھ گھنٹے میں اُسے قے ہو گئی اور چہرے پر مُردنی سی چھا گئی۔

اُس مزدور نے کہا "کیسا جی ہے ہوری بھیا؟"

ہوری کا سر چکرا رہا تھا۔ بولا "کچھ نہیں، اچھا ہوں۔"

یہ کہتے کہتے اُسے پھر قے ہوئی اور ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔ وہ گھبرایا۔ یہ سر میں چکر کیوں آ رہا ہے؟ آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا چھایا جاتا ہے۔ اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور زندگی کی ساری باتوں کی یاد مجسم ہو کر دل میں آنے لگیں، مگر بے سلسلہ خواب کی تصویروں کی طرح بے ربط اور گڈمڈ ہوئی۔ وہ خوشگوار بچپن یاد آیا جب وہ گلیاں کھیلتا تھا اور ماں کی گود میں سوتا تھا۔ پھر دیکھا کہ جیسے گوبر آیا ہے اور اُس کے پیروں پر گر رہا ہے۔ پھر منظر بدلا؛ دھنیا دلہن بنی ہوئی سرخ

چُنڈری پہنے اُسے کھانا کھلا رہی ہے۔ پھر ایک گائے کی تصویر سامنے آئی۔ اُس نے اُس کا دودھ دوہا۔ اور منگل کو پلا دیا تھا کہ گائے ایک دیوی بن گئی اور......"

اُسی مزدور نے پھر پکارا "دوپہری ڈھل گئی ہوری۔ چلو جھوّا اُٹھاؤ!"

ہوری کچھ نہ بولا اُس کی روح تو نہ جانے کس کس دُنیا میں اُڑ رہی تھی۔ اُس کا بدن جل رہا تھا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ لُو لگ گئی تھی۔

اُس کے گھر آدمی دوڑ گیا۔ گھنٹہ بھر میں دھنیا دوڑی ہوئی آپہنچی۔ سوبھا اور ہیرا پیچھے پیچھے کھٹولے کی ڈولی بنا کر لا رہے تھے۔

دھنیا نے ہوری کا بدن چھوا تو اُس کا دل دھڑک اُٹھا، چہرہ اُتر گیا، کانپتی ہوئی آواز میں بولی، "کیسا جی ہے تمہارا؟"

ہوری نے مضطربانہ اور مجنونانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا "تم آگئے گوبر، میں نے منگل کے لئے گائے لے لی ہے۔ وہ کھڑی ہے، دیکھو!"

دھنیا نے موت کی صورت دیکھی تھی۔ اُسے پہچانتی تھی۔ اُسے دبے پاؤں آتے بھی دیکھا تھا اور آندھی کی طرح آتے بھی دیکھا تھا۔ اُسکے سامنے ساس مری، سسر مرا، اس کے دو بچے مرے، گاؤں کے پچاسوں آدمی مرے۔ دل میں ایک دھکا سا لگا۔ وہ بنیاد جس پر زندگی قائم تھی، گویا ہٹی جا رہی تھی۔ لیکن نہیں، یہ صبر کرنے کا وقت ہے، اُس کا اندیشہ بے بنیاد ہے، لو لگ گئی ہے، اُسی سے بے ہوشی ہے۔ اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر بولی "میری طرف دیکھو، میں ہوں، کیا مجھے نہیں پہچانتے؟"

ہوری کو کچھ ہوش ہوا۔ موت قریب آ گئی تھی۔ آگ جل اُٹھنے والی تھی۔ دھواں دور سا ہو گیا۔ دھنیا کو بیکسانہ انداز سے دیکھا۔ دونوں آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے نکل پڑے۔ کمزور آواز میں بولا۔ "میرا کہا سُنا معاف کرنا دھنیا! اب جاتا ہوں۔ گائے کا ارمان من ہی میں رہ گیا۔ اب تو یہاں کے روپے کریا کرم میں لگ جائیں گے۔ رو مت دھنیا! اب کب تک جلائے گی؟ سب طرح کی دُرگت تو ہو گئی۔ اب مرنے دے!"

اور اُس کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ اُسی وقت ہیرا اور سوبھا ڈولی لے کر پہنچ گئے۔ ہوری کو اُٹھا کر ڈولی پر لٹایا اور گاؤں کی طرف چلے۔

گاؤں میں یہ خبر ہوا کی طرح پھیل گئی۔ سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ ہوری چارپائی پر پڑا شاید سب کچھ دیکھتا تھا، سب کچھ سمجھتا تھا، مگر زبان بند ہو گئی تھی۔ البتہ اُس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو بتلا رہے تھے کہ موہ کا بندھن توڑنا کتنا مشکل ہو رہا ہے۔ جو کچھ اپنے سے نہیں بن پڑا اُسی کے دُکھ کا نام تو موہ ہے۔ ادا کئے ہوئے فرائض اور پورے کئے ہوئے کاموں کا کیا موہ؟ موہ تو ان بیکسوں کے چھوڑ جانے میں ہے جن کے ساتھ ہم اپنا فرض نہ نبھا سکے، اُن ادھورے منصوبوں میں ہے جنھیں ہم پورا نہ کر سکے!

مگر سب کچھ سمجھ کر بھی دھنیا اُمید کے مٹتے ہوئے عکس کو پکڑے ہوئے تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مگر مشین کی طرح دوڑ دوڑ کر کبھی آم بھون کر پنا بناتی اور کبھی ہوری کے بدن پر گیہوں کے چوکر کی مالش کرتی۔ کیا کرے پیسے نہیں ہیں ورنہ کسی کو بھیج کر ڈاکٹر بُلاتی۔

ہیرا نے روتے ہوئے کہا "بھابی دل کڑا کرو۔ گئو دان کرا دو، دادا چلے!"

دھنیا نے اُس کی طرف حقارت سے دیکھا۔ اب وہ دل کو اور کتنا کڑا کرے؟ اپنے شوہر کے ساتھ اُس کا جو دھرم ہے کیا یہ اُس کو بتانا پڑے گا۔ جو زندگی کا ساتھی تھا اُس کے نام کو رونا ہی کیا اُس کا دھرم ہے؟

اور کئی آوازیں آئیں "ہاں گئودان کرا دو، اب یہی سمے ہے"۔

دھنیا مشین کی طرح اُٹھی۔ آج جو سُتلی بیچی تھی اُس کے بیس آنے پیسے لائی اور ہوری کے ٹھنڈے ہاتھ میں رکھ کر سامنے کھڑے ہوئے داتا دین سے بولی "مہاراج! گھر میں نہ گائے ہے، نہ بچھیا، نہ پیسہ۔ یہی پیسے ہیں۔ یہی ان کا گئودان ہے!"

اور غش کھا کر گر پڑی۔